

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

نومبر 2014

عمران علی
معارضہ

PDFBOOKSFREE.PK

لوہو بول گیا

جب کیئر ویلے تو LOVE بولی جاتا ہے



Care
Natural Honey
Lotion



جو مہلتا ہے، رنگدار و فاداکس سانس،
دیہ ہے ٹرپل سس مکین کی پروکشن

کیئر سے بہتر کیا



پتھر ہی، آسمان آتی، ملک پروٹین،
ایہ ویرا اور ملی وٹا میڈ LOVE



آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

قارئین



بابر نعیم



ڈاکٹر شیر شاہ سید

بدیہی معاشرے میں جب راتم
کا انوکھا طریقہ واردات

مقدر سے لڑنے والے ایک
بے مثال جوڑے کی بے کسی کا ماجرا



غلام قادر



محمی الدین نواب

سوکھے پتوں کے مانند ٹوٹے ہوئے
ان کا اعتراف بخش

ایک چوڑی روپ کبھی جھاڑ کبھی چوپچوبت کی
عنایتوں، فاقوں اور قاتلوں کا ایک نل با سلسلہ



منظر اماء



رضوانہ ساجد

دور روزگار کی تلاش اور در بدر ہو کر
منزل پالینے کا عبتیر اشرانداز

نمرود سے ٹکرانے اور اللہ کی آزمائشوں پر پورا
اترنے والے رحلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات



ادارہ



ڈاکٹر ساجد امجد

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیف، چٹکے
اقتباسات، مسکرائش اور تہنیت سب کچھ آپ کے لیے

ایہوں کے چہو کے میں زندگی تمام کر کے
والی ایک لٹنی حسین کی داستان رنگارنگ

پبلشر و پروڈیوسر: ذیشان رسول • مقام: ۱۴ اشاعت: گراؤنڈ فلور 63-3 فیزل آباد ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

English

سر نہ کھجائیگی Healthy ہو جاؤ گی!



facebook.com/snscares

5 روپے میں جوڑیں اور لکھنوں سے مکمل نجات

راہ گبر

میں گلیوں سے گزر رہا ہوں، بازاروں میں چلتا چلا جا رہا ہوں، چوراہوں پر بٹ رہا ہوں۔ میرا ذہن اور میرا اردو نہیں چل رہا۔ بس میرے ہیر چل رہے ہیں۔ یعنی میرے نیچے چل رہے ہیں، میری ایڑیاں چل رہی ہیں۔ میں لاہور، کراچی، پشاور اور پشین کا کوئی بھی ایک آدمی ہوں۔ کوئی بھی آدمی، جس کا کوئی نام نہیں ہے، جس کا کوئی پتا نہیں ہے۔ مجھے کسی بھی نام سے پکارا جاسکتا ہے۔ میں رات گئے کسی بھی فنٹ پاتھ کے کنارے پڑا ہوا مل سکتا ہوں۔

جس طرح میں نے اپنے آخری جوتوں کو ان کے تلے گھسنے اور تسوں کے ٹوٹنے کے بعد اپنے پیروں سے اتار پھینکا ہے اور اب میرے تسوں کے نیچے کوئی چیز آئیں ہے، اسی طرح میرے پیروں کے نیچے کوئی ایسی زمین بھی نہیں ہے جس سے میرے پنجوں، میرے تسوں اور میری ایڑیوں کا کوئی موردنی رشتہ ہو۔ میں نے اپنی زمین اپنے تسوں کے نیچے سے نکال باہر کی ہے۔ اب میں اپنی زمین پر نہیں، روئے زمین پر چلتا ہوں۔

یہ محنت اور مشقت کے شہر کی ایک صبح ہے، ایک دوپہر ہے، ایک شام ہے۔ دھات کے بدن اور گوشت پوست اور ہڈیوں کے قامت دوڑ رہے ہیں۔ چاہے ان میں سے کچھ دوڑتے دکھائی نہ دیتے ہوں۔ پر وہ سب دوڑی تو رہے ہیں، چاہے اپنے باہر دوڑ رہے ہوں یا اپنے اندر۔

مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو ان راہ گیروں پر رشک آتا ہے جنہیں کہیں پہنچنے اور کہیں سے واپس آنے کی جلدی ہوتی ہے۔ میں کوئی ایسا شہر کی نہیں ہوں جس کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ مجھے کوئی بھی ضروری کام نہیں ہے اور اگر سچ پوچھتے ہو تو مجھے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ہیر چلنے کے لیے ہیں اس لیے میں اپنے پیروں پر چل رہا ہوں۔ اگر ہیر سر کھانے کے لیے ہوتے تو میں ان سے اپنا سر کھجا رہا ہوتا۔ میں تو بس یونہی چلتا چلا جا رہا ہوں۔

یہاں مجھے اپنی زبان کے ایک بہت بڑے شاعر کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ یہ شعر مزاح اور ظرافت کی شاعری کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شاعر نے یہ شعر اپنے دل کی بہت سلیمن حالت میں کہا تھا یعنی کہا ہوا مگر شاعر کو یاد اس کے دل کی سنگین حالت کیا۔ بس چپ رہو، کچھ حکومت۔ وہ شعر یہ ہے

یہ جو پڑا ہے سایہ دیوار یار میں
فرماں روئے کشور ہندوستان ہے

جان لیا جائے کہ میں بھی فرماں روئے کشور ہندوستان ہوں۔ تم کہو گے کہ اسے شخص تو بھنگ پی گیا ہے۔ میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ تم بھنگ پی گئے ہو۔ تم۔ ہاں، تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں بھنگ پی گیا ہوں۔ سنو! میں تو اس دن سے بھنگ پیے ہوئے ہوں جس دن ہمارا آدمی، ہمارا شاعر، ہمارا شاہ، ہمارا پیر و مرشد اور ہمارا درویش اپنے ویران تکیے، لال قلعے، کچھوڑ کر اپنے دادا کے مقبرے میں جا بیٹھا تھا۔ میں نے پہلی بار اسی دن بھنگ پی گئی اور اسی رات تہہ بہہ بیرم خان پر لڑھکایا تھا۔ میں نے پہلی بار ایک جوہڑ کو جتنا کھجا تھا۔ میں نے اپنے جوتے پیروں سے اتار پھینکے تھے اور میں نے زمین کو اپنے تسوں کے نیچے کھینچ لیا تھا اور بس یونہی چل پڑا تھا اور رات کے دوسرے پہر پنچہ شریف کے دروازے کے سامنے، سلام کیا تھا۔ ”عشق اللہ“ مگر جواب میں ”مدد اللہ“ نہیں سنا تھا۔

بھول جاؤ، سب کچھ بھول جاؤ اور دور کی بات کی طرح اپنے دھیان میں بھی نہ لاؤ کہ تم پہلی بار کب لڑھکائے تھے اور کب راہ سے راہ ہوئے تھے اور وہ یوں کہ زمانے کے راستوں میں لڑھکاتا ہی تمہارا نصیب ہے اور جب بھی کھر سے باہر نکلا کرو تو اپنے دائیں اور بائیں کی طرف کی دیواروں کو دھیان سے پڑھتے ہوئے چلا کر دو کہ یہ دیواریں ہی تمہارا نصاب ہیں۔ ان دیواروں پر حکمتیں، بصیرتیں اور ہدایتیں رقم کی گئی ہیں اور رقم کی جاتی رہتی ہیں۔

چشم بد دور کہ تمہارا ہی نصاب تمہارے نو جوانوں نے جو یز کیا ہے۔ چشم بد دور کہ تمہارے نو جوان جامد زیب ہی نہیں، اپنے وقت کے جامد سب بھی ہیں۔ اسی نصاب میں جو سب سے قیمتی نکتہ تعلیم کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جہاں بھی رہو، وہاں نہ رہو۔ میں گلیوں اور بازاروں میں چلتا چلا جا رہا ہوں۔ میں کہیں سے بھی دیر کر کے نہیں چلا ہوں اور نہ مجھے کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔ میں تو بس چل رہا ہوں، چلتا چلا جا رہا ہوں..... چلتا چلا جا رہا ہوں اس لیے کہ ہیر چلنے کے لیے ہیں۔





محترم قارئین
السلام علیکم!

نومبر 2014ء کا گزشتہ شمارہ جاتے جاتے سال کا احساس دلارہا ہے۔ گزشتہ دنوں مسلمانانِ عالم نے حج کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ عید قرباں کی خوشیاں بھی منائیں، امید ہے کہ سب نے اپنے ارد گرد نہ صرف ضرورت مندوں کا خاص خیال رکھا ہوگا بلکہ رشتے داروں کا بھی حق اپناتیت ادا کرتے ہوئے روئے ہوؤں کو منایا بھی ہوگا..... یونکہ حج بیت اللہ سے بھیجی کا جو عید قرباں سے نفس کشی کا جو درس ہمیں ملتا ہے وہی انسانیت کی معراج ہے۔ عہد حاضر میں تصنع بناوٹ جس شدت سے ہماری زندگی میں شامل ہوگئی ہے، اس نے دنیا کے سمٹ جانے کے باوجود لوگوں کو ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا ہے لیکن عید کا دن دنوں سے کم دور تھیں دھونے اور پاس آنے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ جس طرح سیلابی ریلے کھڑی فصلیں، جتنی ساز و سامان اور جہاز اپنے ساتھ بہا لے جاتے ہیں اسی طرح آپس کے تعلقات میں بد اعتمادی، جذبات میں کھوٹ اور لیکن دین میں فریب کے سیلاب ہر رشتے کی بنیاد ہلا دیتے ہیں۔ اگرچہ ان باتوں کا تعلق نہ تو سیاست سے ہے اور نہ ہی حکومت کے فرائض میں رہتوں کی اصلاح شامل ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ایسے جہت و جاہل کی تخلیق جو فرد واحد کے انفرادی رویے سے ہوتی ہے، وہ جس طرح پورے معاشرے پر اثر انداز ہو سکتی ہے اس سے بہتر بن شہری، کاروباری معاملات میں دوستی، معاشی ترقی اور دوستانہ مخلوق میں مثبت رجحانات پر روش پانے لگتے ہیں۔ بے شک بات تو بہت معمولی ہے مگر اس کے نتائج غیر معمولی نکل سکتے ہیں بشرطیکہ اس پر توجہ کی سے عمل کر لیا جائے..... حالیہ دنوں میں انجمنیہ باتوں سے دوری کی بنا پر کراچی کے مختلف علاقوں میں ماحول کی اتاری نے جو تباہی پھیلائی ہے، اس سے کتنے ہی گھر اٹھ گئے۔ شہر میں کھلے عام فرقہ خیز ہونے والی ایسی شہر آپ سے کتنے گھر دس میں صاف بچ گئی۔ کئی گھر انوں کے واحد تھیل بھی مرنے والوں میں شامل تھے۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے لیکن دہشت گردی، ہنگامی اور بدعنوانی تو جیسے دہشت گرد بن گئی ہے۔ کس طرح شراب عام کو بے آسانی دستیاب ہے..... لاٹو قانونیت کی ہے بڑی بڑی مثالیں سیاس دانوں کو مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ مضمون جانوں سے پھیلنے کی سلسلہ آخر تک جاری رہے گا..... حادثات رونما ہونے سے پہلے انھوں کا بند کر لیتا، حادثات رونما ہونے کے بعد نوٹس لیے جانے کے بیانات کا دھوم دھڑکا اور پھر فائل بند۔ قصہ ختم۔ یہ زہر پلا رہا ہے تو کتنی تسلیوں کی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔ اسے رب العزت ہماری سر زمین کو اپنے حفظ و امان میں رکھ۔ اس پر لسنے والوں کو یکدم ہدایت دے اور آفات سے بچائے رکھ (الہامی آئین)..... انجمنیہ دعاؤں کے سامنے ہم چلتے ہیں اپنی خوبصورت مخلوق کی جانب جہاں کرتی ہے پیارے پیارے دوستوں سے ملاقات۔

محمد خواجہ، کوکنی، کراچی سے تشریف لائے ہیں "سورق پر دہشت کا پس منظر، درخت اور اس سے سہارا لیے حینہ سوچ میں غرق انتظار راہ۔ انشائیہ میں جون ایلیا جو کئی لکھتے ہیں دل کو لگتا ہے۔ کیا اس ملک کو کبھی سکون اور ترقی ملے گی۔ ایک بے سکونی ہے جو تم ہونے میں نہیں آ رہی ہے۔ بچپن سے بڑھاپا اگر کیا ہی سننا ملک ناکہ حالات سے گزر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس سے بدترین ناکہ حالات بھی نہ ہوئے۔ دولت مند اور مراعات یافتہ طبقہ میں گمراہ ہے۔ نوجوان نسل تعلیم سے بے بہرہ۔ معیار تعلیم دو طرح کا، امراء کے لیے الگ غربا کے لیے الگ۔ موز سائیکل، موبائل اور کھیلوں کے کھیلانی بچہ کیا ملک کے مستقبل کے معمار بن سکتے ہیں۔ قدرتی آفات، سیلاب، انڈیا اپنا فائو پانی سیلاب کی شکل میں چھوڑ دیتا ہے، ہم ڈیم بناتے پر تیار نہیں۔ ایک چوٹھی جنگ ہے۔ خدا اس مملکت خدا داد پر خاص رحم فرمائے، آئین۔ مسافر دیوانہ کو کرسی صدارت بہت مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ مدلل اور عمدہ رہا لیکن نام کو بج لکھ دیں۔ اعجاز احمد راجل کے تبصرے مختصر کرنا چاہتا ہوں۔ چندی احمد کوکنی والے بھی اچھے انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔ محمد تھریف اللہ نازی، ادھی خان توحیدی کے تبصرے قابل تشریف ہیں۔ تصویر زوال، بڑی عمدہ تاریخی کہانی تحریر کی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کا دور کوکنی معمولی نہ تھا۔ سلطان سلیمان نے ترک افواج سے یورپ کو روند ڈالا۔ لیکن سلطانوں کی عیاشیاں، شہرت سے غور کشیز اور کینیز، ان سے اولاد ہی محلاتی سازشوں کا گڑھ بن کر سلطنت کی تباہی کا باعث بنی ہے۔ قید خانہ، بے ایک عجیب سیارہ اور عجیب و غریب دنیا کی کہانی ہے۔ ایک واحد زندہ شہر۔ ایک جیل خانہ لیکن انسانی جبلت میں آزادی اور پرسکون زندگی کا حصول۔ تسلی شدہ یہ مشقت اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک نئی دنیا آباد کر لی۔ ستاروں پر کمنے، رسلے کی شاہکار داستان ہے۔ ایک حوصلہ مند اور جوش انسان کو ایک تجربہ کار مل گیا۔ ایسا استاد جو لادای اعصاب اور جو رکھتا ہے۔ کہانی میں ایسی دلچسپی اور ربط و ضبط کہ کہانی کی قطعہ ختم ہوجاتی ہے اور وقت ختم جاتا ہے۔ نیکی آباد، ملک مسافر حیات کے کارخانے لا جواب۔ لیکن اس کہانی میں وہ سنسنی اور درود و دھوپ بھی۔ ایسا لکھ کوکنی انجمنیہ طاقت سب کچھ مل گئی تھی، خوف، ایک بہت مختصر اور بے رنگ کہانی۔ ایک لڑکی لڑکے کو عجیب طرح بے خوف بنا کر نکلتی گئی۔ اس نے غریب کا دامار چایا اور وجائے ہوئے چہرے سے بچانے کے لیے ہنسا ہوا اور مذہبورتا نہیں ماسک۔ محفل شعر و سخن، سب سے پیارا شعر نیم شمس صدیقی کا چہرہ جاری زاہد اقبال تمام اشعار اپنی جگہ بہت پیارے، ایک عجیب لطیف سا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ وعدہ تو کیا ہوتا، ڈاکٹر صاحب نے بڑی دلگیر کہانی لکھی۔ ایک شخص اپنی بیوی کی طرف سے ایک چھوڑ دینا سے کہ وہ ایک خراب عادت شراب پینا نہیں چھوڑے گا۔ یہاں ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ شخص پاگل تھا۔ ایک چھوڑا بیٹھا تھا۔ تقدیر، ارستہ عزت دار، سختی، دیانت دار تھا اور قدرت اس سے بے چارہ تھی لیکن اس نے تقدیر سے نہیں قدرت سے نکل لی۔ انجام، خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ دیدہ و نظر، امجد رئیس صاحب



نے جنگ کی ہولناکی پر کہانی تحریر کی۔ جنگ کے اختتام پر بڑی اندوہناک کیفیت، دودھوتوں اور دھواں بھائیوں کی کہانی۔ دوست نے اپنے دوست کی تکلیف اور زخموں کا حال دیکھتے ہوئے اسے زندگی سے نجات دے دی۔ شہادت، ایک پیار بھرے دل رکھنے والے بوڑھے شخص کی داستان حیات۔ اپنی بیٹی پر سب کچھ بچھاؤ کرنے والا شخص اپنی ہی اولاد کے ہاتھوں بھجروں ہو گیا۔ حضرت ابراہیم، رضوانہ ساجد نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بہت اچھی تحریر لکھی ہے۔ یہ اس کا دوسرا حصہ ہے بات یقین سے کہہ سکتا ہوں حضرت ابراہیم کی پوری سوانح حیات شاید ہی کسی مسلمان کو پڑ یاد نہ ہو۔ احتساب، مشیر ادیب صاحب نے پرتاشیر کا تحریر فرمائی ہے۔ یہ شمارہ ہی آخری کہانی تھی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں یقین سے لکھ رہا ہوں کہ شمارہ مکمل ہوا۔ ایک انسان جو اس قدر نقد و تحسین سے حالات کا مارا ہو جسے قدرت نے اتنا بڑا اور عظمت والا انسان بنایا۔ چاہتا تو پوری طرح انتقام لیتا اور اپنی عقلمندی میں بے تحاشا اضافہ کرتا۔ یہ وہ 24 سال اپنے باپ کی خدمت میں گزارا۔ اس عظیم انسان نے سب کچھ کھوکھلی اپنے غیر کو زندہ رکھا۔ کس نہیں، ہمیشہ کی طرح لا جواب، حراج بھی ہے۔ نصیحت آئیز، حکایتیں اور خوبصورت باتیں۔ واقعی ان سب کو چھنا اور ترتیب دینا بھی ایک انہی کمال ہے۔“

محمد قاسم رحمان، ہری پور سے چلے آئے ہیں۔ ”سپنسز سے رشتہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ اصل میں، جب میں کسی کتاب ایشال پر جاتا تو

جاسوسی اور سپنسز کو سب سے نمایاں دیکھتا۔ ایک مرتبہ میں نے سٹور میں سے ان کو نمایاں رکھنے کی وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ یہ بہت معیاری رسالے ہیں اس لیے لوگ انہیں خریدنے کے لیے بچپن ہوتے ہیں۔ میں نے بھی دونوں رسالے خرید لیے تھے۔ مسلسل پڑھ رہا ہوں۔ اکتوبر کا سپنسز علی علی ملا میرے پونہ بندہ تبصرہ نگاروں میں طاہر بھگت، سید اکبر شاہ، ادریس احمد خان، قدرت اللہ ناز، اعلیٰ اور نصیر الرحمن شامل ہیں۔ سید اکبر شاہ آپ میرے نکاح ٹیوٹ ہیں۔ لیکن میں بھی 10th کلاس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ خط لکھنے کی جلدی کی وجہ سے اب تک ماری، ستاروں پر کندہ اور کچھ اشعار پڑھ چکا ہوں۔ مشکل انکس کی داستان بھی حسب معمول زبردست ہے۔ میرا ایک دوست اسامہ ملک جو جاسوسی اور سپنسز کا ریا ہے اس کی طرف سے سلام قبول کریں۔“

مستین سلطان، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ ”سپنسز سے وابستگی کو ایک وقت قبل بیت گیا۔ شمارہ بروقت ملنے کے باوجود زندگی کی مصروفیات کی وجہ سے میرے الفاظ مختصر قلم خاں کی روایت پر بڑھانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اکتوبر کا شمارہ اپنی تمام رعایتوں کے ہمراہ چلائی تو دوپہر میں روح افزا کے مٹھنے کے طائر مشروب کے مانند ملا سب نائل کتا پی چہرہ برکیش آنکھیں، چاند کا کھڑا، حسین کھڑا آ کر جی کے کن معصومی کا عمدہ انتخاب۔ عید الاضحیٰ کے حوالے سے یہ اپنا تمام اپنی خوشیوں میں سب کو شریک کیجیے گا۔ سچے موتیوں کی لڑی جون ایلپا کا انشائیہ اندازہ قابل تحریف۔ ادارے میں موجودہ حالات پر لکھی گئی آپ کی باتیں قابل غور۔ سیلاب زدگان کی حالت زار پر دل پول۔ دھرنے اور جلوس کا اہوت نہ جانے کس کس کو ٹھٹھے پھانسی؟ یا پلڈن برادر ابراہاروت کو خصوصی سلام۔ تصوف کے صفحات کا حسین جعفر رضوانہ ساجد کی حضرت ابراہیم علیہ السلام دل و دماغ کو مغل و منور کر گئی۔ تاریخ کے اوراق سے اچھا اقبال کا انتخاب تصویر زوال بہت عمدہ۔ کاشف ذہیر کی قید خانہ سٹ بیرو اور پوری پہ مشکل سیرا کہانی کہانی رہی۔ بھجوتوں کے قہر بھجوتوں کے دہشتا طاہر جاوید مغل کی ستاروں پہ کندہ مغل جی کے شان ایلپا خان الفانقا قہر کرنے سے کس قدر قاصر۔ تجویر ریاض کی انگریزی ادب سے فیضی امداد دانش کی جان بلی گئی اور جبیک و دیگر لوگوں کی موعجہ ہوئی۔ ملک مسفر حیات کی نیکی آدا بھی رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی وعدہ کوہا میں بھجوتوں کے اسیر گئی کی چاہ میں فقیر اقبال کی شراب نوشی کی سخت مذمت۔ محی الدین نواسی کی ماری کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی ہے۔ اویس علی کی تقدیر میں بدینت چہرہ ارشد کے ساتھ بہت اچھا ہوا۔ جنگی حالات کی مکاشا اچھرہ کش کی دیدہ تر طول کر گئی۔ اثر نعمانی کی دلکش تحریر طریقہ کار سفری معاشرے کی پولیس اپنی عوام کے لیے خادم ہمارا پولیس عوام کے لیے وبال جان۔ نقار تفر کی شہادت میں مطلب پرست بیٹی جی اپنے بوڑھے ضعیف باپ کا بے باکی احتفال کرتی رہی، فتنہ ناک کہانی۔ محفل شعر و سخن عمدہ رہی۔ کس نہیں محفل ذکر کیا۔“

رضوانہ تنولی کریڈٹ، اورنگی ٹاؤن، کراچی سے محفل میں شریک ہیں۔ ”16 تاریخ سے خاص اہمیت اور پیار اس خوب صورت تاریخ کو محبوب سپنسز جیج کے اساتذ کی نمایاں زینت بن کے عاشقان کا شہر ہوتا ہے۔ اکتوبر کے سروقہ بھری زلفوں والی نازنین، دلچسپی کے لیے عرض کروں گا۔ نصیب جن کو تیرے رخ کی دیدہ ہوتی ہے، وہ خوش نصیب ہیں خوب انجی عید ہوتی ہے۔ مجاز تقدس میں لائوس فرزند ان تو حید اسلام کی لبیک اللہ لبیک لبیک کی کریم ساتوں کے وقت میرے ”وہا ناچھ اور لب پیارے پاکستان کی سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ ادارے میں آپ کی باتیں روم فرسا حقیقت ہیں۔ ممدات کا فقدان مسافر دیوانہ کے حصے میں آیا۔ دلکش انداز میں لکھا گیا تبصرہ قابل تحریف ہے۔ سہاگل۔ بھائی ابراہاروت شادی کی مبارک باد۔ زہیر حسین آپ کی فرمائش مرا بھجوتوں پر بھیجے شامل محفل۔ مسٹر تبصرہ نگار نصیر عباس بار اور بار عباس کی محسوس ہوئی۔ علی محمد یوسف سانول محفل میں خوش آمدید۔ پیارے دوست احسان عاجز کا انگریز ہوا صحت یابی کے لیے دعا گو۔ کہانیاں پر ابتدا محبوب تحریر سپنسز کے ابتدائی صفحات اچھا اقبال کی ”تصویر زوال“ کے لیے۔ عمدہ پیرائے میں لکھی تحریر کس کو بھائی۔ کاشف ذہیر کی ”قید خانہ“ سٹ بیرو کی دلکش بار اور ہوئی اور کچھ لوگوں کے ساتھ رومی کو سیرا کے قید خانے سے لانے کے ساتھ اپنے سے شہر کو آ کر نہ میں کامیاب ہو گیا۔ پیارے طاہر جاوید مغل کی ستاروں پہ کندہ محبت کے لطیف جذبات والوں کے لیے اہمیل حق۔ تجویر ریاض ”شبی امداد“ کے ساتھ اچھے رہے۔ سراغ رساں مگر گوری کوڑا لپٹی چاہیے گی اور سارہ کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ لپٹی تو اچھا ہوتا۔ ملک مسفر حیات اپنے روایتی انداز میں ”نیکی آباد“ کے سہراہ جلوہ گر ہوئے بہت عمدہ۔ محفل شعر و سخن میں ڈاکٹر گل گوڑا، رمضان بادشاہ، ہادیہ ایڈ ماہا ایمان، ادریس احمد خان، ابراہاروت، احمد خان تو حید، محمد اقبال، محمد اشفاق سیال کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ”وعدہ کوہا ہوتا“ اقبال، شبنم کی بات مان لیتا تو بجز رہتا۔ ویسے شبنم کا رقص میں ملیں ہونے کا پڑھ کے خوب لطف آیا گو یا کچھ اچھا لپٹی۔ اویس علی کی ”تقدیر“ چہرے ایمان اور سٹ کے ساتھ جو ہوا اچھا ہوا۔ آنسوؤں کی کہروں میں ڈوٹی اچھرہ کش کی دیدہ تر عبرت اثر منظر کوڑی کی حالت نے افسردہ کر دیا۔ رضوانہ ساجد کی خوب صورت تحریر حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت عمدہ رہی۔ اثر نعمانی کی ”طریقہ کار“ دلکش ادب سے ایک شاہکار ناستوری آف دی مٹھ ثابت ہوئی۔ نقار تفر کی ”شہادت“



جذباتی احساس کا شکار، رشتوں کا عجیب گوگردھند اچھنی کی مطلب پرستی، شفیق باپ کی محبت اچھی کہانی رہی..... آخری صفحات کا خصوصی جوش صبر ادیب کی "مستجاب" عہدگی سے سسکس کا حق ادا کر گئی..... کترتیں بھی معیاری رہیں کستوری لگا کے..... گویا اکتوبر کا شمارہ سرورق سے پس ورق تک بہترین رہا۔"

✽ محمد یوسف سانول ساکن میکسن، نور پور قریل ضلع خوشاب سے ملے آ رہے ہیں "سب سے پہلے میں ادارے کا مفکور ہوں۔ خط شائع ہونے کی بہت خوش ہوئی۔ پہلی طرح سرورق بہت ہی دیدہ زیب تھا۔ اس کے بعد سیدھا محفل شعر و سخن میں جہاں تمام دوستوں کے انتخاب اچھے لے لیکن محمد قدرت اللہ نیازی کا انتخاب بہت ہی اچھا تھا۔ اس کے بعد محفل صاحب کی "ستاروں پہ کندہ" بھیگی اور تار پر لٹکتے رہے لیکن کریں کے عادل کی پٹائی کے رسل اور یو پی کی ملاقات، گاؤں کے حالات، عادل کا سرور کے ساتھ کامیابی کی طرف سفر، شہزادی کا گم ہونا، قاضی و کاؤنٹیل راک پھٹنا، ہمایوں کا عادل کو اپنے حالات سے آگاہ کرنا، عادل کا اچانک بیمار ہونا اور پھر یو پی سے پیچھے رہنا اور آخر میں جو اینڈ تھا امان..... یقین کریں کہ ایسا لگتا ہے کہ میں ان کے کرداروں کے ساتھ ساتھ ہوں۔ بانی شمارہ زیر مطالعہ ہے وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھ نہیں پا رہا کیونکہ میرا ایک عزیز دوست C.M.M میں ایڈیٹ ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں ادارے کے توسط سے قارئین سے دعا کی جا چکی ہے کہ خدا میرے بھائی کو صحت یاب کرے۔ امید ہے سابقہ معیاری طرح اس بار بھی شمارہ اچھا ہوگا۔"

✽ یوسف مرزا، اہل ان سے تبصرہ کر رہے ہیں "میرے دراز کے بعد اکتوبر 2014ء کا دلچسپ شمارہ شہزاد اور کھن دور میں تفریح کا سامان لیے سامنے ہے۔ نائل پر حسینہ شہزاد کو دیکھا تو حیر زدہ ہوئے۔ روشنی کے مطابق سب سے پہلے جون الیا کا انشا ہے پڑھا تو بہت کچھ سوچنے لگے کھن کو ملا۔ آگے پہنچے محفل یاراں میں توب سے پہلے تخت پر بیٹھے مسافر دیوانہ صاحب کو برا بھلا کیا پایا۔ تمام خطوط کے مطالعے کے بعد اپنے پیارے رائے ظاہر جہاں مہل صاحب کی کاوش کو کھلا۔ محفل صاحب اسٹوری میں عادل اور شہزادی کے ساتھ ساتھ خود انفریج کے لیے مذاق بھی دیجیے۔ مجموعی طور پر اسٹوری پلاٹ عمدہ اور جاندار ہوتا جا رہا ہے۔ نواب صاحب کی قسط اور کہانی میں جہاں مزید اپنی تگ و دو میں مصروف ہے، وہاں مراد اور نجوب کی دیوانگی بھی عروج پر ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ آگے بڑھے صفحہ صاحب کا کس پڑھا اور ایک ہی نشست میں مکمل کیا۔ شافق زبیر کی قید خانہ پر دم جوبہت عمدہ اور لاجواب تحریر تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی کہانی نے بیشک کی طرح حیر زدہ کیا۔ یقیناً یہ کہانی بہت سے ذہنوں پر اچھے نقش چھوڑے گی۔ بانی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ میری طرف سے تمام حاجیوں کو جیت جیت اللہ کی معادرت پر مبارکباد۔ یاد آؤ اس۔ آخر میں اس رسالے کی وساطت سے اس عزم کا اظہار کرتا جاہوں گا۔ سیلاب کی تباہ کاری کی وجہ سے جہاں پوری قوم سیلاب زدگان کا ساتھ دے رہی ہے، حتیٰ الوسع میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پاکستان اور اس میں بسنے والی پوری قوم کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔"

✽ بشری افضل، بہاولپور سے پہلی آ رہی ہیں "21 ستمبر کو سسپنس ملا۔ نائل پر صنف نازک کا راج تھا۔ ذکر صاحب دیکھ لیں کہیں صنف مخالف بنائے نہ کر لیں۔ رات اچھی سمجھا جا رہے ہوں کہ میری نظر آ رہی ہے۔ اسٹائل بھی خوب صورت ہے، مجموعی طور پر نائل ایک ہی نظر میں بھائیو، دیکھنے کا انداز تو دل میں اثر کیا۔ مرحوم جون الیا نے ایک صفحے میں پوری کہانی مکمل کر دی۔ اپنی محفل میں پہنچے، بالکل نئے نئے حالات کی بہترین منتظر کی ہے، محفل میں کی مسافر کو کرسی صدارت پر بیٹھ دیکھا۔ یہ تو لکھنے والے کا نام ہے ارے واقعی آپ کا نام مسافر ہے یا محفل ہے، بہر حال مبارک ہو۔ ٹھیک لکھی صاحب کا کس نے دل دکھا یا ہے جو ناراض ہیں۔ یعنی اصل ناموں سے لکھا کریں، اچھا محفل میں دعاؤں میں یاد رکھنے کا شہرہ ہے۔ (وعدہ تو کیا ہوتا) واقعی اگر جھوٹا وعدہ ہی کر لیں تو شہنشاہ کے ساتھ جو ہوا نہ ہوتا۔ اگر قسمت میں ہوتا تو لی جاتے محفل شعر و سخن میں ڈاکٹر علی گور جانی کا شعر پڑھ لیا۔ (خند) ایک لڑکی نے جتنی خوب صورتی سے مسافر کو بےوقوف بنا کر لٹا دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات پڑھے۔ عید النبی کے موقع پر یہ ایمان افروز واقعات پڑھے اچھا لگا۔"

✽ مہرین ناز، حیدرآباد سے محفل کی زینت بنی ہیں "اے خدا میرے بے بدخواہ کے اندر سے خیر کو اس طرح اہمارہ جس طرح تمہارے درخت میں لال پھول پھوٹ پڑتے ہیں۔ ہم بائیں بنانے والے سوائے بائیں بنانے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ ہم زندہ قوم ہیں اور زندگی تک ہی دوسروں کو یاد کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے صرف قلم کی طاقت سے ارباب اختیار کو کئی مثبت حکمت عملی پر عمل کرتے ہیں۔ شاید ان کے پاس یہ باتیں (جو ہم باپ یا آج کا بزرگ رسالہ ابتداء میں سر کر رہا ہے) پڑنے کا وقت بھی نہیں۔ یہ تو قہر خانے میں طوطی کی آواز کا ہم بدلے بھی نہیں شاید پاکستانیوں کی خوبی اول ہے، کچھ کریں یا نہ کریں شور ضرور مچ جائے گا۔ ہمارا جگ بھاتا سسپنس ڈائجسٹ 16 ستمبر کو لی لگیا۔ سرورق پر ڈیڑھ کی شرارتی آنکھیں اچھلی گئیں۔ انشا میں جسے جون الیا کا انداز اور قوت برداشت لفظ لفظ سچ ادا رہی میں ادارے والوں نے آخر کار ہر تہرہ نگاروں کو مکمل منہ تسلیم کر لیا۔ محفل میں وارد ہونے تو دیوانے مسافر سے واسطہ پڑا۔ قصہ بڑے پڑے محفل میں شرکت کی دعوت میں نہ دی تھی، آپ کو۔ انوک کمار آپ دہلی سے ہمارے لیے ایک سوغات لائے ہیں۔ کہانیاں تمام مصنفین کی محنت کا ثمرہ ہیں جو ان تھوٹے ہیں مگر ادارے والوں کے سلیکشنز ہمارے مزاج آشنا ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی وعدہ کیا ہوتا تھا، ام انشائٹ کا ایک اور نقصان ایک ایک محنت کرنے والی لڑکی شہنشاہ کی زندگی جانی کی طرف چلی گئی۔ ساتھ مرد کی خود غرضی بھی سامنے آئی۔ آخری صفحات ہمارے سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں اور ہمیں بھی باپ بھی نہیں ہوئی۔ اس بار تو شہنشاہ کی شخصیت کس طرح حاصل کی، ذہن بردست۔ شرمات، بے لگام مغربی حاضر نے کی بڑی خامی، جتنی بھی بیانیہ اپنے والدین کو بھی دھوکا دینے سے باز نہیں آتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دوسرا بھی معلومہ میں اضافہ کر لیا۔ درختانہ ساجد، جزائے خیر۔ ابتدائی صفحات پر راج اقبال صاحب تصویر زوال کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ تاریخ کے الٹ پھیر کا دھن چکر بدلنے چہروں کے درمیان تخیل و شیریں واقعات کی ترتیب بہترین رہی۔ شہزادی مہرماہ سلطان، شہزادہ یازدہ اور سلطان سلیمان خان کے کردار پسند آئے۔ محفل شعر و سخن اپنے جو بہن چرمی۔ نقیر عباس باور و رضوان خوبی کے مرسلے اچھے لگے۔"



✽ اور لیس احمد خان، ناظم آباد کراچی سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں۔ سہنس کے دیدار سے مستفید ہوئے گویا کہ عید سے پہلے عید ہوئی۔ سرورق اپنی مثال تھا۔ انشا ہی علم و حکمت کے شہ پارے سے موتی بنے۔ اور ایسے میں حالات و واقعات نوے آگاہ ہوئے۔ جہاں مسافر اور وہ بھی دیوانے خیران سے ملاقات ہوئی، مبارکباد۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کندہ پرچی۔ جو گناہوں و گنہگاروں کے ساتھ اپنا سفر جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ اس کے بعد انجیل اقبال صاحب کی تصویر زوال سے نبرد آزما ہوئے۔ انجیل اقبال کا قلم بلا شجر ہیرے سے نظر میں ہٹانے نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ تحریر ختم ہو جائے۔ تیری کہانی ماروی بھی الہ الدین نواب کی ماروی بھی جواب بھی پڑے پھر کچھ کر دیتی ہے۔ کاشف زبیر کی قید خانہ دہلی کا کھوجی۔ غیبی امداد نے بھی سناڑ کیا۔ ملک صاحب کی گفتگوں کے ہیر پھیر کے ساتھ نیکل آباد بھی گئی۔ خندہ میں کبھی ایک کبھی نے کیا خوب جھنڈ یا مزہ آیا۔ معیاری اشعار نے بھی لطف سے ہنسا کر کیا۔ ڈاکٹر شامیہ صاحب کی وعدہ تو کیا ہوتا، کیا خوب تحریر بھی۔ تقدیر بھی اچھی لگی۔ دیر و ترقی جلد باری میں کیا فیصلہ بھی بھی نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ انوار زبیر سے بھی کچھ شہ پاروں نے بھی کافی ملاحظہ کیا۔ روح کو جلا بخشنے والی ایمان کو مسکھ کرنے والی تحریر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات و واقعات نے بھی آگاہی کا دروازہ کھولا کہ جو مسلسل دو اقساط کے ساتھ سلسلہ جاری ہے۔ اثر نعمانی کی طریقہ کار کے متعلق بھی تقدیر کی طرح کا تاثر قائم ہے۔ محتاط اندازہ ہے۔ شہادت میں ایک باپ کو بے وقوف بنانے والی اولاد کی کہانی تھی۔ جو حقیقت سے قریب تر نظر آتی کہ اولاد اپنے ماں باپ کو جان ہونے پر بے وقوف سمجھتی ہے۔ کہانی احتساب ایک بہتر نہ کہانی تھی۔ آنے والی عید الاضحیٰ کی تمام عالم اسلام مبارکباد۔

✽ محمد جاوید جھیل علی پور شریف لائے ہیں۔ ”ستر مکتبہ کی بارش سے دھلی اعلیٰ چوہ کی تمنا سے تھمتا ہے سپید رخساروں پر لمبیدیاں کر دتی ہوئی تا فرمان زلفیں سفید پری کے کمر سے سرخ نیوں پر چلتی ہوئی چٹیل مسکان اور مست مست شونی سے بھر پور بخور بخوری آنکھوں پر تہی ہوئی سیاہی چٹکی چٹکی دو دھاری تلوار کی تیز دھار سے جب سہنس کے اسیر کے قلب کو قاش قاش کر گئیں، واللہ ہماری بے تاب نگاہوں کی بے تاب تپتیاں بے تابا نہ انداز میں شروع حسینہ کے شل ہجر سے برابر بخور دھیں رہیں، اف۔ روحانی راہنما جون ایلیا کا انشا یہ اور انکل جان کا نصیحت آمیز ادارہ پڑھا اور یہ سوچ کر چل پڑے کہ ابھی ہمارے علاوہ کسی کا بھی سادھرنے کا موڈ نہیں، بات کرو حق کی۔ شیخ ارباب کے قلب سے لوح دل پر رقم کاوش چند ترانی میں محصور دہلی روح کو مضطرب اور لگا ہوں کو ہم ناک کر رہی کہ آنکھوں کے پھول شبنم کی بوندوں پر سج گئے، خوب صورت خواب دیکھنا پڑا کچھ کا حق ہے مگر جاگتی آنکھوں کے پرہیزہ حقیقت بتائیں کرتے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اثر نعمانی کی تلاش طریقہ کار میں قانون فاعل اور جرم متوقع ظہر۔ انفس کے عشق حسن کی خمیسی جابر شرط نام کر حسن سے مثال کی سلطنت کا شہنشاہ بن گیا۔ یہ خیالات تحریروں کے شیر ذاکٹر شہزادہ سید کی کاوش وعدہ کیا ہوتا ہے کیے ہیں، دیدہ تر میں زندگی کھل چنچر قدموں کے فاصلے پر محروم کوڑی سے درگاہ کی موت کے خواہش مند کوڑی کو موت نے اپنے دامن میں سیٹ لیا۔ تقدیر بھی کبھی تمھارا لیے ہی عیاں یک مذاق کرتی ہے۔ ستاروں پر کندہ دل کی برسوں دنیا میں بگڑا۔ پر کرنے میں تا کا سیاب نہیں رہی، حصول زبرائے زن کی جاں تو ڈنگ و دو میں مسلسل معروف شہزاد کی شہزادہ عادل ناقابل تخریب چوٹی کو چھین کر لیو پھونک دے کر سر کر لے گا تاہم مقبول قلم کا طاہر جاوید مغل سے کچھ بعید نہیں کہ کب کوٹنے قاری کی سوچ کے برعکس چال چل جائیں۔ غیبی امداد ایک شخص کی حادثاتی موت کی انفرادی کے لیے خوشحالی کے نتیجے بن گئی۔ غریب کی محبت بھی غریب کی طرح مجبور و مقبور رہتی ہے مگر مرادی کا مراد غربت و محرومیت کی چٹکی چیتا ہوا عزم و فریب میں بلکہ مہلک موت کے طوق سے زندگی جہنم کر دیتے اور جلا جان باز سافرن پڑے کچھ۔ ہم ماروی کا سفر مراد محبت محبوب مہلک معیشتیں موت کے سنگ سنگ جاری و ساری ہیں۔ نیکی آباد میں اگر مصدول کو پھونکی ہی نیکی کی جزا تو وہ پادشہ فقیر مراد کے ساتھ دل لگی کی ناقابل فراموش سزا بھی ہے۔ انگلش کہانیوں کے مترجم کاشف زبیر کی دریافت قید خانہ جھیر کی کہانی ثابت ہوئی کہ بے توقیر بھی مغرب کا دیر و خاصہ ہے۔ تقدیر میں دشمنوں سے برسرِ پیکار دکھایا گیا ہے۔ شہادت بننے کے ہاتھوں بے بس باپ کی کہانی پڑھ کر دکھادو، ہر مشن کی بے شکستہ فیر مراد کے ساتھ دل لگی کی ناقابل تدبیر و تقدیر کے درمیان آگے بڑھنا پھونکی و تدبیر ہار گئی۔ خندہ فر فریڈ کو کھنکی کا چندھوں کا انوکھا ساتھ اور خندہ ہمیشہ یادگار ہے۔ کاشف شعر و سخن میں شاعروں نے تو گویا آگ میں پھول کھلا دیے لیکن شہزادہ سباز احمد اور ریاض شہر کے شعروں کے پھول کی خوشبو تول میں اتر گئی۔ ہر زوال کو روح اور ہر روح کو زوال قانون مشیت ایزدی سے، سلطنت دہلی نے کتنی قاتل سے تنزیل کی جانے دیکھتے ہوئے سفر کا احوال اچھا لگا۔ دنیائے ادب کے معروف قلم کار علیہ الحق کی موت کا پڑھ کر دل کو جھکا سا لگا۔ اس دیکھنے سے ابھی پھلتے ہی نہ پائے تھے کہ ایک اور سانحہ ارتحال ہماری منتظر نگاہ خیر جانے تا تو ہے ہی یہاں سے یا پھر اس جہان سے۔ دونوں مرحومین کی مغفرت کے واسطے اللہ پاک کی بارگاہ میں ہاتھوں کے مشکول بلند کیے۔“

✽ شانہ حسن، لاہور کینٹ سے تبصرہ کر رہی ہیں ”زندگی کی گونا گوں مصروفیات کے باوجود اپنے سہنس ڈائجسٹ سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ اکتوبر کا سہنس 16 تبصرہ کو ہی لکھا، سرورق کی حسینہ درخت کا سہارا لیے حسین مسکراہٹ کے ساتھ پندرہ آئی۔ ایلیا صاحب کے اندازہ سے ہمیں بہت کچھ اندازہ ہو گیا۔ اور ادب کی ہوردانہ باتیں دل میں اتر گئیں، عقل مندوں کی محفل میں دیوانوں کا راج ہے، ہمارے ملک کی زندہ مثال ہے، پھر کبھی مبارک باد شوکت شہر یاری قسمت کھل گئی کہ وزارت مل گئی۔ لگتا ہے 2015 تک اس محفل پر 14، 12 سال کے بچے ہی قبضہ کر لیں گے، اشوک کمار صاحب دہلی کی بیروں سے تھے۔ ان مقبول برادر اور اچھے تبصرے کے ساتھ کئی دنوں بعد نظر آئے۔ رمضان پا شا انکل جی ہم نے آپ کو گویا یاد کیا تھا۔ اللہ آپ کو بھی عطا کرے۔ آغا بھائی آپ بھی محفل میں حاضر ہو کر ایں۔ صفحات اول میں انجیل اقبال صاحب تصویر زوال کے ساتھ حاضر ہوئے۔ کہانی لاگت ہو گئی۔ شہزادہ مہر سلطان، خرم سلطان، فرہاد یا شا کے کردار خوب تھے۔ سلطان سلیمان جیسے فرمان روا، کاش زبیر کے دور میں بھی ہوتے۔ نیکی آباد ملک مصفر حیات صاحب کی شاندار اسٹوری تھی، ان چھوٹی چھوٹی نکلیوں سے ہمیں بڑے جتنے ہیں۔ طریقہ کار میں اثر نعمانی صاحب ایک عجیب کی کہانی لائے۔ شہادت میں نظارت فیر نے مغربی معاشرے کی ایک اور خرابی کی کٹنا دیکھی کی۔ وہاں کے بچے بھی اپنے والدین کو کھوکھو دیتے ہوئے نہیں شرماتے لیکن ان کا انجام برا ہوتا ہے۔ جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کندہ جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، اس میں اور کتنا جا رہا ہے۔ نیا حصہ پرانے سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے، مغل صاحب زود قلم اور زیادہ، اس بات شہزادہ بھی



کہاؤں تک پہنچ گئی۔ باروی بھی الدین نواب صاحب اپنا اسٹائل لے کر آتے جا رہے ہیں جو ان کی کہانیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ یہ قسط پسند آئی ہے۔ ڈاکٹر شہزاد سید کی وعدہ تو کیا ہوتا، دل پسند اسٹوری بھی۔ سر دی جفا صورت کی فقا، خامی شرب شیم کی محبت اس کو برائی سے روک رہی تھی مگر اس اچھائی نے خود اس کی زندگی خراب کر دی۔ احتساب، دل کو چھو لینے والی لا جواب تحریر یہ صغیر ادیب بہت دنوں بعد اس کے پھر بھی قارئین سہنس کے دل جیت لیے۔ شیوخ طاہر کیسے لے کہانی نو تار سے آگے بڑھتی گئی۔ استاد مسند اور شاہی والا احمد زبردست، ہاڈنیت کا کردار بھی دل کو ہلایا۔ رضوانہ ساجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احوال زندگی کا دوسرا حصہ حیدر قراب آج ہم زم کے متعلق معلومات میں اضافہ کر گئی۔ اللہ پاک ان کو جزائے خیر عطا کرے۔ محفل شعر و سخن بہترین تھی۔ سر سبطی اچھے لگے۔ اکوڑ کا سہنس بیٹھ ابن بیٹھ رہا۔“

✽ عاطف شاہین 18، اڈاروتی سے دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضریں۔ ”جنہوں نے یاد رکھا ان کا شکر ہے اور بھلا دینے والوں سے لگائیں، جب وطن عزیز کے حالات کی وجہ سے غمگین ہیں عین اسی وقت سہنس کی حاضری باعث سکون ہے۔ کل کی پرنس توجہ دی طور پر توجہ رہے۔ انشاء میں جو نوا الیاء ارادہ ذکر کر رہے ہیں جن میں احساس نام کی چیز معدوم ہو چکی ہے۔ شاید اس قوم کے مقدر میں صرف مظالم کو برداشت کرنا ہی ہے۔ خطوط میں صدارت مسافر کے حصے میں آئی، مبارک۔ اجتماعہ تھا ملحق رحمان جو کہ میرے بھائی وارث علی (ابرار وارث) کے شاگرد ہیں، کدول کی اتھاہ گمراہیوں سے well come اور یوٹیشن لینے پر مبارک۔ علی الحق کی وفات پر اہل خانہ سے تعزیت اور صبر و استقامت کی درخواست۔ اللہ عظیم الحق کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ کہانیوں میں باروی کو پڑھا۔ مراد کے لیے لکھ کر اب پھر مارنے کے مترادف ہو گیا ہے۔ محبت بھی کی کیا کرواتی ہے۔ مراد اب کروڑوں میں کھینے والا ہو چکا ہے۔ ستاروں پر کندہ پڑی۔ پچھلی اقساط سے قدر سے بہتر تھی۔ میری طاہر جاوید صاحب اور الدین صاحب سے گزارش ہے کہ پلٹیز اسٹوری میں کچھ دوسرا بھی لکھیں۔ بس الیٹن ہی الیٹن ہے۔ محفل شعر و سخن میں ابرار وارث، قدرت اللہ، مہرین ناز اور انجلا احمد کے اشعار دل کو لگے۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔“

✽ علی رحمن، سندیلینا نوالی سے تعریف لائے ہیں۔ ”ماہ شمارہ اکوڑ معمول سے کافی ہٹ کر 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر بنی دیہاتی لڑکی ہاتھ لکھ کر چھٹی اور پچیس بلا رہی تھی ہم نے صاف انکار کیا۔ جون الیاء کا انشائیہ انداز وہ کہیں نہیں آتی پھر خطوں کی محفل میں پہنچے۔ اپنا پہلا خط شائع ہونے کی خوش ہوئی۔ مسافر یوانہ صاحب آپ کی طبیعت پر پھل ہے جبکہ میں طیر یا بخار ہو گیا اس لیے رسالہ اتنا پڑھا نہیں گیا۔ حیدر ہاون کی والدہ واللہ جنت الفردوس میں جگہ دے۔ کہانیوں کی ابتدا طاہر جاوید محفل کے خوب صورت ناول ستاروں پر کندہ کی۔ دعا ہے نوبل راک پر عادل پہنچے اور یو پڈ ٹھکست ہو۔ ہمایوں کی دکھ بصری کہانی پڑی۔ ماکانے نازادہ زندہ تھا اور کھینے سے شہزادی کو گواہ کیا۔ باروی میں مرید کا انجام اچھا ہو گیا۔ سیٹھ رحمداری سے سودا کر لیا۔ پشاور شہزاد کا انجام بھی اچھا ہو گیا۔ بخار کی وجہ سے آدھا رسالہ رہتا ہے۔ محفل شعر و سخن اچھی رہی۔ ویسے تمام دوستوں کے شعرا اچھے تھے مگر مہرین ناز، ابرار وارث، رمضان پاشا اور محمد قدرت اللہ نازی کے شعر بہتر تھے۔ اس میں علی کی کہانی میں رازت کے ساتھ اچھا ہو گیا۔“

✽ عظیم، راج، داؤد اڈا سکندر پور سے محفل میں تشریف لائے ہیں۔ ”ہم سہنس باقاعدگی سے نہیں پڑھتے مگر جب بھی ہمارے بھائی گھر ہوں تو یہ موقع قیصر آ جاتا ہے۔ میں طیر اٹھل کی کہانی بہت اچھی لگی ہے اور ہم بھائی سے پچھ پکرس کہانی کولاڑی پڑھتے ہیں اور دیکھی تو اگر بھائی بارہنہ جاسیں تو ہم میں سے ایک وائس روم میں بند ہو کر پڑھتا ہے اور دوسرے کو بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی پڑھنے والوں کی نوک جھوک بھی اچھی لگتی ہے۔ ابھی ہم صرف طاہر لکھل کی کہانی ہی پڑھا ہے۔ میں کیکو ایک ہفتے تک تو رسالے کو ہاتھ لگا کر ناگہانی ناگہان ہوتا ہے۔ اب اجازت اگلی بار مزید کہانیوں پر تبصرہ کریں گے۔“

✽ انجلا احمد راجیل، مای، ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”ہم تبصرہ کی جستجو میں خوب دیکھتے رہتے ہیں، خواب ہماری آنکھوں کا آٹا شور اور خواہشوں کا اساس ہوتے ہیں اور آٹا بھلا کے عزیز نہیں ہوتا۔“ میرے خوابوں کی تعبیر 19 تبصرہ کو آخر پوری ہوئی اور میرا آٹا بھلا بھی مل گیا۔ سرورق پر مجھ بے ڈنڈاڑ کمال مسرور کاغذ نمونہ ہے۔ جون الیاء صاحب کا اندازہ لا جواب رہا۔ یقیناً ہمیں اپنی توت برداشت کا اندازہ لگنا چاہیے۔ ادارہ میں اس دفعہ محفل مندوں کو واضح اشارے دے گئے مگر کیا کریں گی۔ سخت شای پر ہمارے یہ شعر کے مسافر یوانہ صاحب کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ آپ کا مجھے محفل صاحب کا دیوانہ کہنا بہت اچھا لگا اور بے اختیار منہ سے نکل گیا اب تو دیوانے بھی تم کو دیوانہ کہتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنے محبوب قلم کا طاہر جاوید محفل صاحب کی بے خیر تحریر ستاروں پر کندہ پڑی، مگر طوط بات سے اس قدر مغلوب ہوئے کہ انھیں تم ہو گئیں۔ عادل کا کردار تو گویا مندرائیں سے۔ یوں لگتا ہے ہم نے نوبل راک کے سامنے بیٹھ کر یہ مارے منظر دیدہ ترے دیکھے ہیں۔ باروی بھی اس دفعہ کی ہر بہت درسی، مراد علی تو چھایا ہے جبکہ محبوب علی چاند بھی اپنی راہیں صاف کرنے کا سوچ رہا ہے یہ محبت ہوتی ہی ایسی ہے۔ آخری صفحات پر شصت و ستھریاں ادب کی ناقابل فراموش روداد دل کی آنکھوں سے پڑی۔ لفظ کرب و ذات کی غماز سطر سطر درد و دل کی ہر پور دعا کی کرتی بیشکی داستان زلیت محبت اور صبر و استقامت کی عمدہ مثال ہے۔ ابتدا کی صفات پر انجلا اقبال صاحب کی آمد مبارک رہی۔ نہ جانے کیوں انسان انہوں نے استاد کر کے دھوکا کھا جاتا ہے۔ ملک مسافر حیات کی ڈاڑی سے لٹی لٹی، کٹی آدھی سبق آموز تحریر دی خوشی کا باعث بنی بلاشبہ نیکی بھی راہیں نہیں جاتی۔ ڈاکٹر شہزاد سید کی وعدہ تو کیا ہوتا ام الغنایات کی تباہ کاریوں پر پنی پرنس زورخیر ریست رہی۔ دیدہ تر بھی بہت اچھی لگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح حیات ایمان کو جلا بخشنی گئی۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے اور ان کا ساتھ بھی دیتا ہے۔ شہ مات کے رشتوں کے ساتھ دھوکا کرنے والے ایسی سکھ کی نہیں کھاتے۔ محفل شعر و سخن میں مہرین ناز کا شعر حیرت رہا۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا لگا۔“

✽ ماہ تاب گل رانا، راجن پور سے محفل کی زینت بنی ہیں۔ ”سہنس ڈائجسٹ میں دوسری مرتبہ حاضر ہو رہی ہوں، جاسوسی میں کچھ عرصہ تک



باقاعدگی سے خط لکھتی رہی ہوں۔ ہجر میری شادی ہوگئی تھی اور جہاں ہوئی وہ ایک دیہات ہے جہاں پوسٹ آفس نہیں ہے سو شادی کے بعد مشکل ایک دو مرتبہ خط لکھ بائی لیکن جاسوسی، سسٹمز، مرکز گزشتہ سہ ریڈرپ برقرار رکھی اور تقریباً ہر ماہ خط بھی لکھے جو کہ کچھ جوابات بھی بنا کر میری الماری کی زینت بن گئے لیکن اس مرتبہ تو میں نے سوچ لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے خط لکھتا ہے۔ اپنا پیارا سسٹمز 20 تاریخ کو ملا۔ سرورق کچھ خاص نہیں۔ جو ماڈل سرورق ہے سبھی ہوئی تھی اس سے ابھی شکل تو آئیے میں نظر آ جاتی ہے۔ (ماشاء اللہ..... خوش فہمی تو نہیں ہے کہیں؟) فخرت میں کاشف زبیر اور اثر نعمانی (مجموع) کا نام دیکھ کر خوش ہوئی۔ انشائیہ اور انکل جی کا ابتداء پڑھ کے ادا سی نے ان کچھ اور تو کتنے صفحے تھروں میں پناہ لی۔ محفل میں کچھ سے لوگ نظر آئے اور کچھ پرانے غائب۔ کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے مسافر دیوانہ مبارکباد۔ کرسی وزارت پر شوکت شہر کا قید خانہ تھا۔ لیکن ان کو دیکھ کر ہے کہ بروقت عمر یاد آگئی اور پھر جینڈر تو آئی، آئی لیگی ہوئی؟ آج سہ۔ بخاری! آپ بہت اچھا لکھتی ہیں اور باقی خطوط میں انکا ذرا سہل نہیں، مہربان، ناہم، صبور، معاویہ کے خطوط پسند آئے اور بشری افضل! آپ کا تبصرہ اچھا لکھ لیکن اس میں آپ کا وہ مخصوص انداز نظر نہیں آیا اور اس مرتبہ محفل میں دو ناگزری میرا مطلب ہے کہ ایک دوسرے کے پوائنٹ پکڑ کر تبصرے کرتا، ایسا کچھ نہیں تھا اور انکل جی کے کراے جوابات۔ پرانے دوستوں میں ماہایمان، تبصرے جاس پر صاحب کی کئی محسوس ہوئی۔ ساری پر یاں کہاں کوئی ہیں۔ جلدی سے واپس آئیں۔ یہاں بہت سے تبصرہ نگار بھی موجود ہیں لیکن وہاں دو چیزوں کی کمی شکت سے محسوس ہوئی۔ ایک آپ کی قیمتی اور دوسرا آپ کے مزے مزے کے جوابات۔ خیر اپنی محفل سے فارغ ہو کر کہاں کا رخ کیا تو ابتدا کی صفحتا۔ اف! یہ ہے اسطلاح ہر جگہ چھایا ہے۔ کوئی ایسی جینڈر نہیں کہ جہاں سلطان سلیمان، مہر، سلطان اور خرم سلطان کا دیدار نہ ہو۔ کاشف زبیر صاحب کی قید خانہ بہترین کہاں تھی؟ کیا زمین پر بھی کچھ عرصے بعد یہی حالات ہوں گے؟ پھر پیچھے جی اپنے ہر لکھنے پر مصنف جناب طاہر جاوید غفل صاحب کی ستاروں پر کندہ ہے۔ بلاشبہ شاہکار تحریر ہے اور یہ مکمل انکل اتنے بہادر اور پختہ مزاج والے ہیرو تھے کہ ان کے ڈھونڈ لاتے ہیں اور شکر ہے کہ اس تحریر میں غفل صاحب کی دوسری تحریروں کی طرح ہر کوئی شادی شدہ نہیں ہے۔ بہر حال تحریر زبردست ہے۔ خاص طور پر ہمایوں کا کردار دلچسپ ہے۔ آخری صفحتا پر احتساب بلاشبہ ایک زبردست تحریر تھی۔ بہت ہی اچھی۔ کافی عرصے کے بعد اس طرح کی کوئی تحریر پڑھی۔ طریقہ کار بھی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ اس کو پڑھ کے محاورہ یاد آیا۔ اتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ دیدہ و طرف خدا یا۔ بہت دلہندہ و تحریر تھی۔ پڑھ کے بہت عجیب سی کیفیات نے گھڑ لیا۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ شاہرہ بہترین تھا اور انکل جی! مزید لکھنے سے معذرت کہ میری بیٹی ن!، انہاں شروع۔ جی ہاں میری زندگی کا سب سے حسین لمحہ میری سات ماہ کی بیٹی زینب نور (اللہ آپ کو بیٹی کے سنگ خوش رکھے)“

محمد قدرت اللہ تازی، حکیم خان، وغیرہ سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”اکتوبر 2014 کا شمارہ ایک گرم دھوپ میں موصول ہوا۔ جینڈر بارظلموں کی ویب لک رہی تھی۔ جون المیا تو کم کر برداشت کا اندازہ لگائے میں بلکان ہوئے جارہے ہیں۔ تو کب کر برداشت کا اندازہ اس سے لگا یا جاسکتا ہے کہ پچھلے 67 سال سے کی بار میں سیلاب سے دوچار ہونا پڑا مگر بحال ہے کہ ہم نے کوئی ڈیم بنانے کی کوشش کی ہو۔ پاکستان کو عالمی عدالت انصاف میں پھیلے دنوں جس ملک کا سامنا کرنا پڑا وہ سب ہی کو حلوں سے اندازے موقوف اختیار کیا کہ پاکستان سارا پانی ضائع کر دیتا ہے اس کے پاس ذخیرہ کرنے کی کئی محاسن ہیں عیسائی اور پانی سمندر میں جاگرتا ہے وہ پانی ہم ڈیم بنانے کا کام میں لارہے ہیں تو ان کا کیا حرج ہوا؟ اور بھارت کے اس موقف کو قبول کر کے فیصلہ اس کے حق میں دے دیا گیا۔ محفل یار! اس میں ایک مسافر کو کرسی صدارت پر استراحت فرماتے پایا۔ ابراہاروارث! باز تو ہم بھی نہیں آتے، اس لیے محفل میں موجود ہوتے ہیں بس یہ ہے کہ چھپ چھپ کر پڑھنا پڑتا ہے علی رحمان! خوش آمدید۔ ہر سال میں یہ حال ہے تو آگے کیا ہوگا۔ صفر بھائی کاٹ ڈالنا غلط اور اس کی قیمتی کاٹ دیتی ہے۔ محمد یوسف سانولی خوش آمدید۔ سسٹمز کی محفل کو بروقت سننے سے نمبر ملتے رہتے ہیں یہ سسٹمز کے منتظمین کی محنت کا صلہ ہے۔ ابن مقبول! آپ کا انداز بیان پسند آیا۔ بشری افضل! ہم آپ کے ”نہ خیال“ میں، نوک جھوک شامل ہوتی چاہیے۔ ذرا طبعی گور جانی! آپ کے دوست جیسے ہزاروں خاموش قاری موجود ہوں گے، ان کی محبت سسٹمز نے متاثر کیا۔ ستاروں پر کندہ میں عادل کو باغیڑی چوٹی پر لے جانے کی وجہ اس بار سامنے آگئی۔ نوئل راک پر تمام کرداروں کو فتح کیا جا چکا ہے، لکھ پڑ اور عادل میں مقابلے نے کہاں میں سسٹمز مزید پڑھا دی ہے یقیناً عادل فاتح ہوگا۔ مالک نے زاہد کی کارروائیاں پھٹم نہیں ہوئیں۔ وہ سکتے سے اٹھا اور سیدھا عادل کی راہ پر لگ کر گاؤں پہنچ گیا اور دونوں سبب افراد کی موجودگی میں شہزادی کو آٹھو کر کے لے آیا۔ امید ہے اگلی قسط آخری ہوگی۔ (جی بالکل درست فرمایا) راری میں مراد اور مریدی کی جنگ جاری ہے۔ مراد کی بار اسے ڈک پہنچا چکا ہے، دوسری طرف محبوب کے متعلقین اسے نئی راہ پر لے چکے ہیں۔ کہاں بہتری کی طرف گامزن ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ایچ اقبال نے تصور پرواز لکھ کر میرا سلطان ڈراما سیریل دیکھنے والوں پر احسان کیا جو سلطان سلیمان کے ہی حلق سے کاشف زبیر کی قید خانہ مستقبل بعید کے بارے میں لکھی جانے والی سائنس فکشن اسٹوری تھی۔ سٹیری کی جدوجہد متاثر نہ تھی۔ سلیم انوری محمد سبھی کے بارے میں جو خیالات فریڈ وکس تھے بہت فطری تھے محفل شعر و سخن میں جس کا انتخاب سب سے زیادہ پسند آیا وہ ہے جبران احمد ملک۔ ”روئے روتے ہم سے بھی کہو یا یوں ہوتم“ وہاں کیا بات کہی ہے عالم۔ اثر نعمانی کی دراز طریقہ کار میں اپنی پاکستانی پولیس کے طریقہ کار کی جھلک واضح نظر آئی۔ آخری صفحتا پر شمسغیرا دیب احتساب کا ختمہ لکھ کر آئے۔ بہت زبردست تحریر تھی۔ طوالت کی وجہ سے ایک نشست میں ختم کرنا تو ممکن نہ تھا لیکن اسے اوجھڑا پھوڑا کر اٹھنا مشکل ثابت ہوا۔“

محمد رمضان، پاشا گلشن، اقبال، کراچی سے تعریف لائے ہیں۔ ”اکتوبر 2014 کا سسٹمز کا گیت اب بہت عمدہ تھا۔ انشائیہ حسب روایت تلخ و ترش تھا۔ آپ کے خطا، محفل میں پہلی بار آنے والے صاحب تبصروں میں بھی پہلے نمبر پر ہیں۔ موصوف دیوانے بھی ہیں اور سرفار بھی تبصرہ اچھا تھا۔ مبارکباد۔ محفل میں آپ نے نوک جھوک پر پابندی لگا کر اچھا نہیں کیا۔ (کسی کی عزت نفس مجروح ہو..... یہی تو اچھا نہیں) اتنا شمارے کی فہرست لکھنا سب کی سب بہت اچھی تھی، خاص کر قید خانہ مجھے بہت پسند آئی۔ نقد دوسرے نمبر پر تبصرے پر دیدہ و تر۔ ستاروں پر کندہ راری کی اس ماہ آستانہ بہت ہی دلچسپ تھی، مگر میں ماموری نو یا دہرہ نوں گا۔ نیکی آباد اس مرتبہ ملک صاحب کو مجرموں کو قاتل بنانے کا موقع نہیں ملا، ایسا پہلی بار ہوا ہے، کہاں اچھی تھی۔ شامت نے بھی پور نہیں



کیا۔ اشعار کی محفل میں ماہایمان، ڈاکٹر ناہید اختر اور اعجاز احمد رحیل کے اشعار قابلِ داد ہیں۔ آخری صفحات کی کہانی احتساب کے بارے میں کیا لکھوں، اس کے مصنف کا نام ی کانی ہے۔ شمس میرادیب۔“

✽ مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے چلے آ رہے ہیں۔ ”اکتوبر کا سنسنی جون المپیا کی زبردست تحریر سے شروع کیا۔ ہوا قیام چاروں طرف سے مصائب کا شکار ہے۔ آپ کی محفل میں دل پسند خطوط ہیں اور سب ہی اچھے ہیں۔ سدرہ بانو ناگوری۔ خوب لکھ رہی ہیں۔ سعدیہ بخاری صاحبہ کا تبصرہ بھی چمکا تھا۔ مسافر دیوانہ صاحب امید ہے کہ آپ کی طبیعت اب تسکین ملے گی۔ ایچ اقبال صاحب تاریخ کے اوراق سے دلچسپ رواد بیان کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ شمس میرادیب صاحب کا احتساب بہت اچھی تحریر ہے مگر انجام کچھ عجیب سا لگا۔ ستاروں پر کندہ اپنی بول چال پر ہے۔ ہاں لوگ تو ہیں کہ جن کا حوصلہ اور ہمت انہیں بلند یوں پر لے جاتا ہے اور انجام کار قدرت انہیں ان کا گوہر مقصود عطا کرتی ہے۔ اچھی قطع کا شدت سے انتقاد ہے۔ نیکی آباد ملک صاحب کا زبردست کارنامہ، یہ تحریر میرے تک یاد رکھی جائے گی۔“

✽ محمد اکبر تاج، کوہرا سے محفل میں حاضر ہیں۔ ”اکتوبر کا خوب صورت شمارہ ہاتھوں میں آیا تو بہت خوشی ہوئی کیونکہ میں پہلے ہی اپنے ذرائع سے پتا چل گیا تھا کہ ہمارا تبصرہ شائع ہو گیا ہے۔ سرور بھی اس وعدہ بہت پسند آیا۔ انشائیہ اور ادارہ پر پڑھنے کے بعد اپنی محفل میں حاضری دی۔ ساہیوال کے مسافر دیوانہ صاحب کرسی صدارت پر براجمان نظر آئے۔ آپ کے ظاہر جاوید غل صاحب اور بھائی اعجاز احمد رحیل کے بارے میں خیالات پڑھ کر خوشی ہوئی۔ محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ بھی عمدہ رہا۔ اعجاز احمد رحیل بھائی آپ کا انداز تحریر سن کر بھائی۔ تصور یہ زوال ماضی کی داستان ایچ اقبال نے خوب صورتی سے بیان کی۔ شہزادی مہر ماہ سلطان اور کامل کا کردار اچھا لگا۔ ستاروں پر کندہ نے تول جیت لیا۔ عادل کی ہمت اور ظاہر جاوید صاحب کے اعزاز بیان کو داد دیتے ہیں۔ عینی امداد بھی بہترین انشوری ہے۔ ملک صفدر حیات کی نیکی ایک آبادیت انشوری ہے۔ سچ ہے نیکی ایک ایسا تجربے جس کی چھاد ضرورتی ہے۔ ماروی بھی ایک کانی ترقی کر گئی ہے۔ سراد علی تو چھادوا بن گیا ہے۔ وعدہ نو کیا ہوتا بھی عمدہ تحریر ہے۔ ہمیں انہوں سے وعدے کر لینے چاہئیں۔ انشورمانی صاحب کی طریقہ کار بھی بے مثل تحریر ثابت ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ محفل شعر و سخن میں اعجاز احمد رحیل اور مہرین ناز کے انتخاب عمدہ رہے۔“

✽ رانا حبیب الرحمن، سینٹرل جیل لاہور سے محفل میں شریک ہیں۔ ”میرے خط لکھنے کی تو کئی وجوہات ہیں لیکن ان میں ایک تو سنسنی سے وہ محبت ہے جو ہم براہِ پرہیزگار اس کا اظہار کرتے ہیں، دوسری وجہ دوست جو اسے پڑھتے اور اس میں اپنی چاہت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ تیسری وجہ صوبہ پنجاب میں سلاب کی تباہ کاریاں، پانی کا سلاب، بجلی کے بلوں کا سلاب، معیشت کی تباہ کاری کا سلاب۔ روزگار کی تباہ کاری اور غربت کا سلاب۔ ایشیا کی ہنگامی اور لوفو شنگ کا سلاب۔ جرائم کا سلاب اور دھوکا کا سلاب۔ نئے اور سو مانوں کا سلاب۔ اتنے زیادہ سلاب ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک کتاب لکھوں جس کا عنوان سلاب کی تباہ کاریاں لکھوں اور ہر سلاب کی مکمل تفصیل لکھوں۔ پنجاب میں پچھلے دنوں چند شہروں کے علاوہ تمام پنجاب ڈوبا ہوا تھا۔ میرے خیال میں پاکستان ایک برائی کی ایسی دیک ہے کہ اس میں سے چاول ختم ہونے کا نام نہیں ہے سبیل کر کھا رہے ہیں۔ اس قدر کی آفت سے بچاؤ والے وعدے کرنے والے نہیں کس شے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ستاروں پر کندہ، احتساب اور ماروی بہت پسند آئیں۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ مسافر دیوانہ کون ہے بتائیں۔ دشت خیال کیوں ہے بتائیں، یہ نام شریک کی کہانی کا ہے۔ ابراہوراث، سعدیہ بخاری، علی رحمن، حمید احمد ملک، رمضان پاشا، مہرین ناز، قدرت اللہ، نیاز کی تبصرے پسند آئے۔ محفل شعر و سخن میں فہم شمس، شبیر احمد بخٹی، مہرین ناز، ناہید ایمان، مدیحہ جیس اور ناز پری کے اشعار پسند آئے۔“

✽ اطہر حسین، ریڈیو کراچی سے حاضر ہوئے ہیں۔ ”اکتوبر کا سنسنی جب ملا تو عجیب کی راحت ملی۔ تاہم ایلیا صاحب کا انشائیہ پڑھا تو ہم بھی ”اندازے“ لگنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ ادارے کو پڑھ کر افسردہ ہو گئے کہ جانے کون ہو گا کوئی قلمس راہنما ملے گا۔ ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ سرحد پر بھارتی جارحیت، بڑھتی جارہی ہے اور بھارت بدست باجی کی طرح اپنی سرکشی دکھا رہا ہے۔ جانے اس کے عزائم کیا ہیں مگر نقصان تو عام آدمی کا ہی ہو رہا ہے۔ سچی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ بہر حال اللہ پاک ہمارے ملک کو حفظ و امان میں رکھے۔ کہانیوں میں پہلے ستاروں پر کندہ پڑھی۔ محفل صاحب کی تحریر دلوں پر اثر کرتی ہے اور یہی ایک انٹری قابلیت کا ثبوت ہے۔ ان کی تحریر جب تک مکمل نہ پڑھ لی جائے، اسے اچھا اور چھوڑنا ممکن لگتا ہے۔ ماروی میں کچھ خاص مزہ نہیں یوں تو کئی الدین نواب کا نام بہت بڑے مگر نہ جانے کیوں ماروی میں وہ بات نہیں جو ان کی کہانیوں میں ہوتی ہے جو حالات و واقعات بیان کیے جا رہے ہیں وہ غیر حقیقی سے لگتے ہیں یہ ہماری ناقص رائے ہے۔ خیر..... ایچ اقبال کی تصویر زوال بڑی عمدہ تاریخی کہانی تھی۔ قید خانہ کشف ذہیر صاحب کی بہترین تحریر تھی جس میں انسانی جبلت کے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ انسان کو بھلے آسانست میسر ہوں مگر آزادی کے حصول کے لیے وہ آسانست کو بھی ٹھکراتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی نیکی آباد دس گز ارے لائق تھی۔ جھڈی بس ٹھیک تھی۔ وعدہ نو کیا ہوتا دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ رضوانہ ساجد نے حضرت ابراہیمؑ کے واقعات بیان کیے۔ جنہیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا اور قربانی کی عقیم مثال مل گئی۔ دیدہ تر میں جنگ کی تباہ کاریوں سے آگاہ کیا گیا اور ایک دوست نے اپنے دوست کی تکلیف قسم کی۔ شرمات بہتر کہانی تھی۔ شمارہ کی آخری کہانی شمس میرادیب صاحب کے قلم کا شاہکار تھا۔ بشو کے حالات زندگی نے آنکھوں کو کم کر دیا۔ لیکن اس نے ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کیا اور معاشرے کو نیکہ دکھایا۔ بہترین تحریر تھی۔ کترین بھی اچھی تھیں۔ مجموعی طور پر شمارہ بہترین تھا۔“

✽ ہارون تبصرکس۔۔۔ مردان سے تشریف لائے ہیں۔ ”سرور کے آنکھیں چار ہو گئیں تو میں حیران ہونے لگا۔ ارے ذاکر اکل، یہ کیا..... میرا سنا صاحبہ، سونے پہ ساگا صاحبہ کی آنکھوں میں سرمہ ملائی..... میں بے اختیار کھٹکتا لگا۔“ اگر تیری آنکھوں میں کامل نہ ہوتا۔ ویلڈن ذاکر



انگل سرخست جناب اعجاز احمد راسل بھائی کے ہم سفر مہاراجہ دیوان صاحب ٹھہرے۔ موصوف کے لکھنے کا انداز: بنا چھاگا۔ دیگر پختہ تہرہ نگاروں کی طرح جناب بھی پختہ قلم کے مالک رہے۔ مبارک باد قبول ہو بھائی۔ جناب اور میں احمد خان صاحب! آپ کی صحت اب کیسی ہے؟ ابتدائی صفحات پر سن پندرہ سترہ سچ اقبال صاحب کی سلطنت عثمیہ کے پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی..... سلطان سلیمان عالی شان کے دور کے حالات و واقعات سے کافی حد تک آگاہی حاصل ہوئی۔ سلطان خرم کی خود سری اور شہزادی ہیرا ماہ سلطان کی بی بی سی..... واہ واہ۔ ادارے سے درخواست ہے کہ کئی بار سلطنت عثمیہ کے ہیرو یعنی خرم الدین بار برسہ کے معزکوں اور یوپ کے خلاف بحری جنگوں پر تقویری سی روشنی ڈالی جائے۔ ستاروں پر کنداس بافل ایکشن میں رہی۔ اپنا چلاک معصوم کرشل وحشی لوہے کے بنجرے میں کیوں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ میرے خیال میں عادل نوبل راک جیتے گا پڑا پھڑ کرشل کو کھودے۔ یہی تو فعل صاحب کے قلم کا خاصہ ہے۔ اس بار ملک صفدر حیات صاحب بھی کافی ایکشن میں نظر آئے۔ تاجے کی موت کا قطعی دکھ نہیں ہوا۔ وہ دکھ تو اگر مصنف کو کچھ ہوتا اور کچھ ہوتا، لیکن اسے جو یاد رہی اور پھر ملک صاحب کے ہوتے ہوئے مظلوموں اور معصوموں کو دکھ کر بیچنے کا ڈاکٹر شہزاد صاحب کی وعدہ تو کیا ہوتا تھا، بہت اچھی رہی۔ نواب صاحب کی ماری نے آپ خوب ریس کھڑی ہے۔ مراد کے مقابلے میں محبوب صاحب بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ ماری محبوب صاحب کی ہے اور مرید مراد کی ہے۔ یہ ڈائلاگ دو لڑکے جب مرید نون پر "بیلو" "کون؟" "مراد کہتا ہے" "تمہاری موت"..... اسلامی صفحات پر رضوانہ ساجد صاحبہ کے قلم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح حیات نے تورا کے رکھ دیا۔ وہ منظر قابلِ رنج تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت جابرہ بی بی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قتل و قحط میں چھوڑ کے جانے لگے۔ رتو کا جہرہ پیچھے سے ان کا دامن پکڑ لیتی ہیں اور قدموں سے لپٹ جاتی ہیں۔ حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ میرے دوست کا حکم ہے۔ بے اختیار آسو چھلک پڑے اور ڈائجسٹ کے صفحات پر جذب ہو گئے۔ آخری صفحات پر اس بار سات سمندر پار سے فیورٹ رائٹر جناب شبیر ادیب صاحب حاضر خدمت رہے۔ ہوس، لالچ، خود غرضی اور مطلب پرستی کی تصویریں، آخر پر احتساب، اگلی درجے کی تحریر تھی۔ بشو کے بچپن کے حالات اور پھر استاد سمندر اور زینت سے دوستی اور جدائی..... شبیر ادیب صاحب کو دونوں باتوں کی سلامی۔“

✽ کا مران خالد، ملتان سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”سپنس اس دفعہ 15 تاریخ کو موصول ہوا مگر تم مجھے کہ نہیں اس کے لیے کتنی مشکلات سے گزرتا پڑا۔ ایک دفعہ ایک اسٹال پر پہنچے تو یک اسٹال والے نے معذرت چاہی کہ سپنس ختم ہو چکا ہے۔ مرتے کی مانند کرتے کے مصداق شدیدہ گرمی میں پیدل چلتے ہوئے دوسرے یک اسٹال پہنچے اور جب گھر پہنچے تو ہمارا حلیہ بڑا پکا تھا۔ خیر خدا شربت بی کے ہماری جان میں جان آئی۔ آؤ دیکھنا تباہ و برباد ہی وقت سپنس لے کے بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے شبیر ادیب کی کہانی ہے پڑھنا شروع کیا۔ یقین جانے، ساری کتاب ان ہی بھر میں نو چکر ہو گئی۔ مزہ آ گیا۔ کہانی نے اپنے محرر یوں پکڑ کر ختم ہونے تک اس میں کم رہے۔ ہوش تھا آپ یا جب اسی نے کھانے کے لیے بلایا اور ہم نہیں اٹھے تو تھری کھری ستائیں۔ خیر مجبوراً اگلے دن زہر مارا یا جلدی جلدی الٹا عید کا کھانا کھا یا اور پھر ان پہنچے سپنس کے پاس۔ بس پھر کھا، کمرے کی کنڈی لگائی اور دوسرے ہانک لگائی کہ کوئی نہیں بلانے یا ڈسٹ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ باہدوات آرام فرما رہے ہیں۔ دوسری کہانی پر پڑھ کر ماضی صاحب کی پڑھی۔ طاہر صاحب کے کیا کہنے۔ ان کی تحریر میں تو پتا نہیں کیا مثال ہوتا ہے کہ بندہ ساکت و صامت سکتے دوسرا کہانی میں یوں کم ہوتا ہے کہ دو بار وہاں سی کے لیے خود کو کافی دیر تک کپڑا کرتا پڑتا ہے۔ چھوٹی کہانیاں بھی لا جواب تھیں۔ ماری دم نے پڑھی نہیں کیونکہ ماری پڑھ کر بوریت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ معذرت کے ساتھ، جموئی طور پر شاعر لا جواب تھا۔

✽ شاہین تقسیم، حیدرآباد سے لکھتی ہیں۔ ”سپنس کا شمار ایک کزن نے ہاتھوں میں تھا۔ یوں تو ہم نے کبھی سپنس نہیں پڑھا مگر جب پڑھنے بیٹھے تو ایسے کم ہونے کے دکھانے کا ہوش نہ پینے کا اتفاق کہ رسالہ کھولا تو سب سے پہلے ستاروں پر کندہ پڑھنا شروع کی۔ بس پھر کھا تھا۔ کہانی کے محرر میں ایسے کھوئے کہ پھر پتا نہ چلا کہ کب کہانی ختم ہوئی کہانی پڑھ کر ہم نے اپنی کزن کو فون کیا اور اس سے پچھلے شاعروں کی بابت معلوم کیا کہ آیا اس کے پاس موجود ہیں۔ اس کا جواب ہاں میں سن کر دل کو طمانیت پہنچی کیونکہ میں طاہر ماضی صاحب کی کہانی کی پچھلی قطبیں پڑھی ہیں۔ نہ جانے کیا جنون سوار ہو گیا۔ یہ کبھی ڈائجسٹ کے لیے میرا پہلا خط ہے اور میں ستاروں پر کندہ پڑھ کے خط لکھ رہی ہوں۔ میرے خیال میں اس طرح کی تمنا پر پے کی جان ہوتی ہیں اور بلاشبہ اپنی الگ اہمیت رکھتی ہیں۔ ماری پڑھی مگر ستاروں پر کندہ کے آگے پچھلے پچھلی سی تھی۔ رضوانہ ساجد کی تحریر میں ایمان افروز واقعات پڑے۔ بہت اچھا لگا۔ شبیر ادیب کی کہانی پڑھی۔ کیا شاندار تحریر تھی۔ ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ خطوط کی پھل دیکھی اور تمام لوگوں کے خطوط پڑے۔ اب لکھے اہل خانہ بھی پڑھوں گی۔ شاید جیل جائے۔ ویسے سپنس میں کہانیاں کا معیار بہت ہی اچھا ہے۔ ہر کہانی پچھلے و چھوٹی ہو یا بڑی، اپنے آپ میں بیٹلس ہے۔ گو کہ مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں مگر جب رسالہ پڑھنے بیٹھی تو گئے ہاتھوں شاعری بھی پڑھ ڈالی۔ یقین جانیں پچھلی دفعہ شاعری پڑھنے میں بوریت نہیں ہوئی۔ بہت اچھے اشعار تھے۔ یقیناً اس قسم کا معیاری رسالہ لکھنے میں ادارے کے تمام اراکین کی محنت شامل ہے۔ رسالہ پڑھ کے ہم کافی دیر سوچتے رہے کہ کاش ہم بھی ادارے کے اراکین میں شامل ہوتے۔ میں سپنس کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ اس نے ہمارے اندر سوئے ہوئے مطالعے کے حقوق کو بیدار کیا۔ اب ہم اپنی کزن سے پچھلے شمارے منگوا کر ستاروں پر کندہ کی پچھلی تمام قطبیں پڑھیں گے۔ چھوٹی کہانیاں کچھ پڑھی ہیں لیکن جو پڑھی ہیں وہ تمام کی تمام بہت اچھی ہیں۔ اللہ پاک سپنس کو مزید ترقی دے آمین۔ امید ہے کہ ہمارا خط آپ ضرور شامل کر دیں گے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نام سے مجھ میں شامل نہ ہو سکے۔
انجم فاروقی، ساحلی، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ ایم افضل کھرل، تحصیل ضلع، نکانہ صاحب۔ محمد رمضان ساحلی، پشاور۔ محمد رشید سیال، روہڑی ضلع سکھ۔
اقبال فتح لاہور۔ ناصر رضا، مہجروالہ۔ منصور احمد کراچی۔ کامران واس، حیدرآباد۔ انصار حسین، ملتان۔ حمید رضا، کوئٹہ۔ مشتاق خان، اسلام آباد۔

لوارث لوارث

الیاس سیٹاپوری

کامیاب وہی رہتا ہے جو جانے والے کل کے آئینے میں آنے والے
کل کا عکس دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو...
اگر یہی بات ایک سلطنت سے دوسری سلطنت کے بارے میں
کہی جائے تو یہ جانے ہوگی لیکن افسوس... تاریخ کے مطالعے
سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام حکمرانوں نے تقریباً یکساں روش ہی
اختیار کی اور وہی حال ان کے اعمال کا رہا۔ انیس بیس کے فرق سے
سازشیں بھی وہی رہیں اور عنایات کا انداز بھی ویسا ہی رہا۔ اسی لیے
سمٹنے والی بساط کی پرچال پھر سے بچھائی جانے والی بساط میں ذرا
تھ انداز سے منتقل ہو گئی۔ زیر نظر تحریر میں بھی ایک ایسے وارث کے
متعلق انکشافات ہیں جس کا کوئی وارث ہی نہ تھا۔ یہ تاریخ کی عجب منطق
تھی کہ اس کا ایسے حالات میں جنم ہوا کہ رفتہ رفتہ پیش آئے والے واقعات نے ذرے
کو افتاب بنا ڈالا۔ یہ تقدیر بھی عجب شے ہے کسی پر اتنی مہربان کہ فرش سے
عرش پر پہنچا دے اور کسی سے اتنی پریشان کہ زمین سے بھی پاتال میں دھکیل دے۔
گزشتہ ماہ و سال کے نشیب و فراز کا یہی اظہار تاریخ کہلاتا ہے جس کا ورق ورق
جب کھلتا ہے تو پڑھنے والی آنکھوں میں حیرت کا رنگ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

عبداللہ کا تعلق بھی اسی شاہی خاندان سے تھا اور وہ
کرمان کے ایک غیر معروف قصبے میں نہایت روکھی پھینکی اور
عسرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اور
ہوش سنبھالتے ہی اپنے چھوٹے سے خاندان کو محرومیوں کا
شکار دیکھا۔ ذرا ذرا سی خواہشیں اسے ذلیل و خوار کر دیتی
تھیں۔ اس نے اپنے باپ سے یہ سن رکھا تھا کہ کبھی اس کے
آپاؤ اجداد عالم انسان کے سب سے بڑے حکمران تھے اور
بادشاہوں کا عمل و نصب ان کے ادنیٰ سے اشاروں پر
موقوف ہوتا تھا لیکن آج یہ ساری باتیں ہوائی کی محسوس ہوتی
تھیں۔ باپ نے مرے وقت اپنی سب سے قیمتی شے شجرہ
نسب اس کے حوالے کیا تھا اور تاکید کیا تھا کہ بیٹے عبداللہ!
اس کی تو اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرے گا اور معلوم نہیں

پریشان حال عبداللہ کا نسب خلفائے عباسیہ سے مل
جاتا تھا لیکن جب اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے ساتھ ہی
بغداد اور عالم اسلام کو پریشانی اور انتشار میں مبتلا دیکھا۔
چنگیز خاں ماوراء النہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر واپس گیا تو
کچھ عرصے بعد اس کے پوتے ہلاکو خاں نے بغداد کو انسانی
خون کے سمندر میں ڈبو دیا۔ شان و شوکت رکھنے والے
خاک و خون میں لٹا دیے گئے۔ خلیفہ معظم باللہ کو قائلین میں
لپیٹ کر اس طرح ہلاک کر دیا گیا کہ اس کے خون کا ایک
قطرہ تک زمین پر نہ گرا۔ شاہی خاندان تباہ و برباد کر دیا
گیا۔ زیادہ تر مارے گئے جو زندہ بچ گئے، انہوں نے قرب
وجوار کے شہروں اور ملکوں میں پناہ لی اور ایک عام آدمی کی
طرح گم نامی پر قناعت کر لی۔



میزبانی کا ثواب بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی نیکی ہے جو تیری ناقص عقل میں نہیں آتی۔“

بیوی نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور بچے کو گود میں اٹھالیا۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”یہ کیا..... ہے تو کر کیا رہی ہے؟“ بیوی نے جواب دیا۔ ”اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی، جب تک میں اپنے باپ کے گھر رہی کسی کا ایک وقت کا بھی احسان نہ اٹھایا اور اب جب میں اپنے گھر کی ہو چکی ہوں تو میرے تیرے گھر کے کٹڑوں پر زندگی گزاروں..... نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے سے نہیں ہو سکتا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”اگر تو نے مجھ سے لے لے گی کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو اور بات ہے ورنہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک عورت اپنے شوہر کا حکم نہ مانے۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”میں تمہارا ہر حکم مان سکتی ہوں لیکن تمہاری موجودگی میں دوسروں کے کٹڑوں پر زندہ رہنا ہرگز پسند نہیں کروں گی۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”تیری مرضی، میں یہ معاملہ تیرے خاندان والوں کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ جو فیصلہ کریں گے اس پر تو رضامند ہو جائے گی؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن مجھے نظر تو یہی آتا ہے کہ... اب ہم دونوں زیادہ دن تک ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

عبداللہ اپنی بیوی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور اس کی گود کے بچے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ بیوی کو دیکھتا اور بھی بچے کو۔ اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی، خوف ناک جنگ۔ ایک طرف طبیعت کی کنجوی تھی، بخل تھا اور دوسری طرف بیوی بچے کی محبت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسے چھوڑے اور کسے پکڑے۔

بیوی نے ترشی سے کہا۔ ”میرا راستہ کیوں روکے کھڑے ہو؟“

عبداللہ نے اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ لیے اور غیر جذباتی آواز میں بولا۔ ”اب تم جاسکتی ہو اور میں نہایت غور فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بیوی اور بچے کے بغیر تو میں زندہ رہ سکتا ہوں لیکن درہم و دینار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنے مستقبل کے لیے دولت جمع کرنی ہے۔ مال و زرا کٹھا کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ بچت کروں۔“

بیوی آگ بگولا ہو کر غصے میں باہر نکل گئی۔ بڑبڑاتی ہوئی بولی۔ ”بخیل انسان اگر بیوی بچے اتنے ہی غیر ضروری

کب یہ تیرے کام آجائے۔ باپ مر گیا، اس نے کسی غریب خاندان میں شادی کر لی۔ گزر اوقات کے لیے اس نے مدد کی کا پیشہ اختیار کیا۔ قصبے میں غربت زیادہ تھی ثروت کم۔ لوگ جو کچھ دے دیتے اسے صبر و شکر سے بول کر لیتا اور جو کچھ ملتا اسے بہت ہی احتیاط سے خرچ کرتا۔ اس احتیاط نے بخل کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ یہ عادت فطرت ثانیہ بن گئی۔ وہ اپنی خواہشوں کو دبانے لگا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ خرچ کرنا ہی بھلا بیٹھا اور اس کی کوشش یہ رہنے لگی کہ اگر اس کی خواہشیں کسی طرح خرچ کیے بغیر ہی پوری ہو جائیں تو بہتر ہے ورنہ اپنی آخری پر صبر کر لیا جائے۔ قصبے والوں کو جب عبداللہ کی اس عادت کا علم ہوا تو وہ مل جل کر اس کی خواہشیں پوری کرنے لگے۔ عبداللہ کی بیوی غریب خاندان کی ضرور تھی لیکن غیرت مند تھی۔ اسے اپنے شوہر کی یہ عادت بالکل پسند نہیں تھی۔ شروع شروع میں تو اس نے اپنے شوہر کی اس عادت کے خلاف احتجاج کیا لیکن جب اس کا یہ احتجاج بے اثر ثابت ہوا تو اس نے پُر سکوت منفی رویہ اختیار کیا۔ وہ عبداللہ کی بیوی ہونے کے باوجود ذہنی طور پر اس سے دور ہوتی چلی گئی۔

عبداللہ نے یہ دلچسپ روش اختیار کی کہ وہ خود کو خرچ سے بچانے کے لیے قصبے والوں کا مہمان بننے لگا۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ آج کا کھانا قصبے کے بوڑھی کے گھر تو کل کا کھانا لوہار کے گھر، پرسوں کا کسی دکاندار کے پاس۔ اس نے مہینے کے تیس دنوں کو تیس گھرانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس طرح وہ کسی گھر پر وبال نہیں بنتا تھا۔ لوگ شرف میزبانی پر بہت خوش ہوتے لیکن اس دوران ایک نئی مصیبت اچھ کھڑی ہوئی۔ اس کی بیوی نے شوہر کی اس عادت کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

اس نے کہا۔ ”میں اس بھیک میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔“

عبداللہ نے حیران ہو کر سوال کیا۔ ”کیسی بھیک؟ کہاں کی بھیک؟ یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“

بیوی نے تنک کر جواب دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں تم اسے بھیک مانگنا کہو یا نہ کہو لیکن یہ طے ہے کہ یہ کام بھک مکلوں ہی کا ہے اور اس کام میں، میں تمہاری شریک نہیں ہو سکتی۔“

عبداللہ کو غصہ آگیا، چیخ کر بولا۔ ”نہ بن میری شریک کار..... اری بد بخت! ہم کسی کو شرفِ مہمانی بخش کر اسے

اگر تو چاہے تو میں اپنا شجرہ نسب بھی تجھے دکھا سکتا ہوں۔“
سیاح نے بے دلی سے کہا۔ ”میں تیرا شجرہ نسب دیکھ کر کیا کروں گا لیکن تجھے ایک شاندار مشورہ ضرور دوں گا۔“
عبداللہ نے پُرشوق لہجے میں کہا۔ ”کیسا مشورہ.....“
ذرا میں بھی تسونوں؟“

سیاح نے جواب دیا۔ ”اگر تجھ میں سیر و سفر کی ہمت ہے تو ہندوستان چلا جا، زندگی موت کا کوئی بھر و سانہیں، وہاں کا بادشاہ محمد غفلت عباسی خلیفہ کی بڑی عزت کرتا ہے اور تو چونکہ عباسی خاندان ہی کا ایک فرد ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ بادشاہ تجھے اتنا نواز دے گا کہ اتنا تیرے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا۔“

عبداللہ نے معصومیت سے پوچھا۔ ”کیا ہندوستانی بادشاہ میرے افلاس کا علاج کر سکتا ہے؟“
”بالکل کر سکتا ہے۔“

عبداللہ خیالی محل تعمیر کرنے لگا، پھر پوچھا۔ ”کیا وہ بہت زیادہ فراخ دل ہے؟“

سیاح نے جواب دیا۔ ”خیال اور تصور سے زیادہ..... تو وہاں چلا جا لیکن شرط یہی ہے کہ تو اپنا شجرہ نسب بھی اپنے ساتھ لیتا جا، اگر تو بادشاہ کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ تیرا شجرہ نسب درست ہے تو اتنی زیادہ دولت اور عزت حاصل کر لے گا کہ اتنا تیرے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔“

خاندان کے کئی بڑے بوڑھے عبداللہ سے الجھ گئے اور اسے طلاق دینے پر مجبور کرنے لگے۔ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت تک طلاق نہیں دوں گا جب تک میری بیوی خود طلاق کا مطالبہ نہیں کرے گی۔“

کسی بزرگ نے عبداللہ کے سر سے دریافت کیا۔ ”لو کی کیا کہتی ہے؟“

سر نے جواب دیا۔ ”وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“
بڑے میاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تب پھر کیا ہے، دونوں کو آسنے سانے کھڑا کر کے طلاق نامہ لکھو الو۔“

کچھ دیر بعد دونوں ایک چھوٹی سی چوٹی میں جمع ہو گئے۔ ان کے دائیں بائیں خاندان کے بزرگ کھڑے ہو گئے۔ لڑکی کا باپ جلاد کی طرح ان دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ عبداللہ کا بچہ اس وقت بھی ماں کی گود میں تھا۔

بچے کے ناتانے بے آواز بلند کہا۔ ”زبیدہ! ہم خاندان کے بزرگ تیرے خیس شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن تیرا شوہر عبداللہ کہتا ہے کہ جب تک تو خود اپنی زبان

ہیں تو اب میں اس گھر میں قدم تک نہ رکھوں گی، چاہے تو کتنی ہی خوشامد کیوں نہ کر لے۔“

بیوی، بچے کو لے کر چلی گئی۔ عبداللہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تو تنہائی کا احساس اسے ستاتا رہا، آخر اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل گئی۔ بولا۔ ”ارے واہ، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، آخر بیوی بچے کے بغیر بھی تو رہ چکا ہوں۔ بس عادی ہونے کی بات ہے، رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤں گا۔“
بیوی کی عدم موجودگی میں عبداللہ نے اپنے منصوبے پر بڑی دیانت داری اور کنگن سے عمل کیا۔ پچیسویں دن کا کھانا بیوی کے گھر والوں میں کھانا تھا۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق اپنی سرسراں پہنچ گیا۔ اس کا سر دادا کی آمد سے پہلے ہی مطلع ہو چکا تھا۔ اس نے عبداللہ کے پہنچنے سے پہلے ہی خاندان والوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔

عبداللہ پہنچا تو ہر ایک نے خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا لیکن اس کے سر نے کراہیت سے منہ پھیر لیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں نے خوش گپیاں شروع کر دیں۔ ان میں سے بعض عبداللہ کی بیچو بیچ میں مشغول ہو گئے۔ ان مہمانوں میں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا جو ہندوستان کی سیر کر کے وہاں واپس پہنچا تھا۔ خاندان والوں نے عبداللہ سے پوچھا۔ ”عبداللہ! کیا تو بنا سکتا ہے کہ اپنی بیوی اور بچے کے بارے میں تیرے کیا ارادے ہیں؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں ان کے بارے میں نہیں سوچا کرتا، جو اپنا راستہ بدل کر شوہر کا ساتھ اور گھر چھوڑ دیا کریں۔ میری بیوی نے بھی یہی کیا اس لیے میں بھی یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔“

سر نے کہا۔ ”تم میری بیٹی کو طلاق دے دو۔“
عبداللہ نے پوچھا۔ ”یہ مطالبہ تیرا ہے یا تیری بیٹی کا؟“
”میرا بھی اور میری بیٹی کا بھی، کیوں؟“

عبداللہ نے کہا۔ ”میں اپنی بیوی سے خود معلوم کروں گا اگر وہ طلاق کی ضد کرے گی تو میں طلاق بھی دے دوں گا۔“
ہندوستان کے سیاح نے ہنس کر دریافت کیا۔ ”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“

سر نے اعلان کیا۔ ”میں اپنی بیٹی کے لیے اس سے طلاق کا مطالبہ کر رہا ہوں۔“

سیاح نے دریافت کیا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ عبداللہ خلفائے نبویؑ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟“
عبداللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ بالکل درست ہے۔“

طلاق نہیں لوں گی۔ مجھے دوسری شادی نہیں کرنی ہے پھر طلاق لے کر کیا کروں گی۔ ہاں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ عبداللہ سے انتہائی محبت کرنے کے باوجود جب تک یہ اپنی خست ترک نہ کر دے، اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔“ پھر اپنے باپ اور دوسرے بزرگوں کی طرف سرسری نظر ڈالی۔ پوچھا۔ ”میرے بزرگو! میرا خیال ہے میں اپنے خاندانی وقار کو اس طرح بھی برقرار رکھ سکتی ہوں۔“

زبیدہ کے باپ نے کہا۔ ”تو یسوی حماقت کی بات کر رہی ہے زبیدہ! کیا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نہیں سنا کہ اگر تجھ سے یہ کہا جائے کہ فلاں پہاڑ نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو اس پر یقین کر لینا مگر اس پر ہرگز یقین نہ کرنا کہ کسی آدمی کی فطرت بدل گئی۔“

زبیدہ نے سوگوار سے جواب دیا۔ ”اس قول سے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میری فطرت بھی نہیں بدلے گی، میں نہ تو اس شخص شخص کے پاس رہ سکتی ہوں اور نہ ہی طلاق لے کر دوسری شادی کر سکتی ہوں۔“

عبداللہ کچھ دیر کھڑا بیوی کی پشت پر نظریں جمائے رہا پھر اس کے قریب جا کر اس کے سر کو بوسہ دیا، بولا۔

”زبیدہ! میں بھی تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر خست میری فطرت نہیں ہے تو میں اس عادت کو ترک کرنے میں کسی نہ کسی دن ضرور کامیاب ہو جاؤں گا اور تجھے ایک بار پھر اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کروں گا اور اگر بالفرض محال میں اپنی فطرت نہ بدل سکا تو میں تیری ہی طرح تجھے یہ یقین بھی دلا دوں کہ میں بھی دوسری شادی نہیں کروں گا۔“

اس کے بعد عبداللہ نے اپنے بچے کو گود میں لے کر جی بھر کے پیار کیا اور بیوی کو دیکھے بغیر چپ چاپ چو پال سے باہر نکل گیا۔

عبداللہ کے کئی دن بڑی پریشانی اور کرب سے گزرے۔ وہ کبھی ٹھیلے لگتا، کبھی لیٹ جاتا، کبھی تھقبے کی گلی کوچوں میں بے مقصد آوارہ گردی کرنے لگتا۔ کئی بار زبیدہ اور اپنے بچے کا خیال آیا اور پاؤں خود بخود اس طرف اٹھنے لگے لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور اپنے کلیہ اعتزاز میں منہ ڈھانپ کر پڑا۔ اسے دونوں ہی باتیں محال نظر آرہی تھیں۔ وہ نہ تو بخل ختم کر سکتا تھا اور نہ ہی زبیدہ اور اپنے بچے کو چھوڑ سکتا تھا پھر کیا ایک اسے ہندوستان کے سیاح کا خیال آگیا۔ وہ اس کی تلاش میں نکل گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد ایک طبیب کے مطب میں مل گیا۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔

سے طلاق کا مطالبہ نہیں کرے گی تیرا شوہر تجھے طلاق نہیں دے گا۔ اس لیے ہم خاندانی بزرگ خاندان کی عزت و وقار کے نام پر تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ تو اپنی زبان سے بھی طلاق کا مطالبہ کر دے۔“

زبیدہ خاموش کھڑی اپنے شوہر کی صورت دیکھتی رہی۔ عبداللہ بھی بڑی حسرت سے اس کی صورت لگتا رہا۔ اس وقت اس کے پائے ثبات میں لرزش سی آگئی تھی۔ بیوی اور بچے کی محبت غالب آ رہی تھی۔

زبیدہ کے باپ نے اصرار کیا۔ ”زبیدہ! کیا سوچ رہی ہے؟ وقت مت ضائع کر، یہ خیس لو جوان بالآخر تجھ سے بھی بھیک منگوادے گا۔ تو اس سے طلاق کا مطالبہ کر دے۔“

عبداللہ نے زبیدہ کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جلدی سے بول پڑا۔ ”زبیدہ! کیا تو واقعی طلاق چاہتی ہے؟“

زبیدہ نے جواب دیا۔ ”میں دوسروں کے ٹکڑوں پر زندہ رہنا پسندتی چاہتی۔“

باپ نے بے چینی سے کہا۔ ”فضول باتیں نہ کر، سیدھی سادی طلاق کی بات کر۔“

زبیدہ نے عبداللہ سے کہا۔ ”اگر تم یہ وعدہ کرو کہ مجھے اور میرے بچے کو عزت و آبرو سے رکھو گے تو میں طلاق کی بات نہیں کروں گی۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”زبیدہ! میں جو کچھ بھی پس انداز کروں گا، وہ مستقبل میں تیرے اور تیرے بچے ہی کے کام آئے گا۔“

زبیدہ نے جڑ کر کہا۔ ”عبداللہ! معلوم نہیں تم اتنی نادانی کی بات کیوں کرتے ہو۔ جو رقم آج کام نہ آسکی، وہ پس انداز ہونے کے بعد کحل کس طرح کام آئے گی؟“

زبیدہ کے باپ نے غصے سے کہا۔ ”میں بھری ہوں گا کہ تو فضول باتوں میں خودخواہی ہم سب کا وقت برباد کر رہی ہے۔“

زبیدہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ عبداللہ نے کہا۔ ”اگر تو واقعی طلاق چاہتی ہے تو میں انکار نہیں کروں گا کیونکہ ابھی ابھی اچانک مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ میں تیری دل فشنی نہیں کر سکتا۔ میں تجھے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

زبیدہ نے رو پاؤں آواز میں کہا۔ ”خوب، اپنی ہر بات کی تم اپنے عمل سے تردید کیے جا رہے ہو۔ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو اور مجھ سے در پوزہ گری بھی کروانا چاہتے ہو۔“

ایک کین سال بزرگ نے پیش میں کہا۔ ”لڑکی! تو سیدھی طلاق کی بات کر، اب ان فضول باتوں کا وقت نہیں رہا۔“

زبیدہ نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا، بولی۔ ”میں

بھرا دل اپنے سینے میں ضرور رکھتا ہوں۔“
وقائع نویس نے ازراہ مذاق کہا۔ ”میں تیرے محبت
بھرے دل کا ذکر بھی شاہی ڈاک میں کر دوں گا۔“

عبداللہ نے وہ دن آرام میں صرف کر دیا۔ مقامی
لوگ اس سے ملنا چاہتے تھے لیکن وہ تکان اور پریشانی کی
وجہ سے کسی سے بھی نہ مل سکا۔

ایک دن وقائع نویس نے اس سے پوچھا۔ ”تیری
آمد کی اطلاع اور دوسری تفصیلات بادشاہ کو لکھ کر بھیج دی گئی
ہیں، اب تو یہ بتا کہ تیرے حالات اور تفصیلات میں کوئی
ایسی بات تو نہیں رہی ہے جو نہایت اہم ہو اور جسے تو سہو آنہ
بتا رہا ہو؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، ایک نہایت ضروری
بات میں تیرے علم میں لانا بھول ہی گیا تھا۔ تو بادشاہ کو مطلع
کر دے کہ میرا تعلق خلفائے بنو عباسیہ کے خاندان سے
ہے، میں نے سنا ہے کہ بادشاہ اس خاندان کی بڑی عزت
کرتا ہے۔“

وقائع نویس نے جواب دیا۔ ”تو نے بالکل صحیح سنا
ہے لیکن کیا تو نے بادشاہ کی بابت کوئی اور ضروری بات بھی سن
رکھی ہے؟“

عبداللہ نے کہا۔ ”یوں تو میں نے بادشاہ کی بابت
معلوم نہیں کیا کچھ نہ رکھا ہے مثلاً یہ کہ بادشاہ عباسی خاندان
کے افراد کی بڑی عزت کرتا ہے، پر دیہیوں کی قدر کرتا
ہے۔ بادشاہ کی ذات مجموعہ اضعاف ہے۔ بادشاہ سخاوت اور
داد و دہش میں.....“

وقائع نویس نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”یہ ساری
خصوصیات اور اوصاف تو ایک زمانہ جانتا ہے لیکن ایک ایسی
صفت جس سے سبھی واقف تو ہیں لیکن اسے ذہن اور حافظہ میں
محفوظ نہیں رکھتے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب تو بادشاہ سے ملاقات
کرے تو تجھے بادشاہ کی اس صفت کا علم بھی ہونا چاہیے۔“

عبداللہ نے سوالیہ نظروں سے وقائع نویس کو دیکھا
اور دہمی آواز میں سوال کیا۔ ”وہ کون سی صفت ہے جس کا علم
تیری نظر میں اتنا زیادہ ضروری ہے؟“

وقائع نویس نے جواب دیا۔ ”یہ صفت کہ ہمارا
بادشاہ حد درجہ عادل اور راست باز بھی ہے۔ تو کہتا ہے کہ تیرا
تعلق خلفائے بنو عباسیہ کے خاندان سے ہے اور تو آیا ہے
کرمان کے کسی غیر معروف قصبے سے۔ اگر تو اپنے دعوے کو
سچ ثابت نہ کر سکا تو بادشاہ تیرے حق میں فریضہ اجل بھی
ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ جموں کو معاف نہیں کرتا۔“

سیاح نے کہا۔ ”کہو کیا سوچا ہے تم نے؟ اگر تم واقعی
ہندوستان جانے میں دلچسپی رکھتے ہو تو جلدی نکل جاؤ،
بادشاہ تمہاری قدر کرے گا۔“

عبداللہ نے ہچکچاہٹ سے جواب دیا۔ ”میرے
پاس جانے کے لیے خرچہ نہیں ہے۔ اس کا انتظام کر لوں تو
جانے کا ارادہ کر دوں۔“

سیاح نے کہا۔ ”سفر کا ارادہ کر لو، سارے کام خود
بخود ہو جائیں گے۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”خود بخود کہاں سے ہو جائیں
گے سارے کام؟“

سیاح نے بحث کرنا فضول سمجھا اور اس کے پاس سے
ہٹنے لگا، بولا۔ ”دیکھو عبداللہ! میں تو بس ایک ہی بات جانتا
ہوں کہ تم کہتے ہی منصوبے بنا لو، کام نہیں ہوگا اور ہوگا تو اس
طرح ہو جائے گا کہ تمہاری اپنی عقل حیران رہ جائے گی۔“

عبداللہ کو دولت کی ہوس ہندوستان جانے پر
اکسارتی تھی لیکن جب یہ سوچتا کہ اگر ہندوستان میں اس کی
قدر نہ کی گئی اور بادشاہ نے اسے اذن باریابی ہی نہ بخشا تو
اس کا کیا حشر ہوگا لیکن سیاح نے بادشاہ کی دریاوری اور عباسی
خلفاء سے محبت و عقیدت رکھنے کا کچھ ایسے سحرانہ انداز میں
ذکر کیا کہ عبداللہ ہندوستان جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے
رواگنی سے پہلے بیوی اور بچے سے محض اس لیے ملاقات نہیں
کی کہ کہیں اس کے ارادے میں ضعف نہ پیدا ہو جائے۔
اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اگر قسمت نے
یاوری کی اور بادشاہ کی نوازشوں اور مہربانیوں نے اسے کسی
لااق کر دیا تو وہ زبیدہ اور بچے کو وہیں بلوا لے گا۔

عبداللہ پہلے تو ایک قافلے کے ساتھ قندھار پہنچا، اس
کے بعد وہ برصغیر میں داخل ہو گیا پھر اس نے دریائے سندھ
عبور کیا۔ دریائے دوسرے کنارے پر بادشاہ کا وقائع نویس
اس کا منتظر کھڑا تھا۔ عبداللہ سے اس وقائع نویس نے
دریافت کیا۔

”اس ملک میں تمہارا کوئی عزیز، رشتے دار ہے یا
نہیں؟“

”اس ملک میں میرا کوئی بھی نہیں۔ میں تنہا انسان
ہوں جسے بادشاہ کی پردیس نوازی یہاں بھیج لائی ہے۔“
وقائع نویس نے سرگوشی میں سوال کیا۔ ”تو تنہا ہے یا
کوئی اور بھی ہے تیرے ساتھ؟“

عبداللہ نے تنک مزاحی سے جواب دیا۔ ”میں کس
طرح بتاؤں کہ میں اس ملک میں بالکل تنہا ہوں۔ بس محبت

قبولیا بی ہش جائے۔“

بادشاہ نے ان میں کا ایک تھان لے کر ادب سے پہلے تو اسے بوسہ دیا پھر سر پر رکھ لیا اور آخر میں کا ندھے پر ڈال کر اس طرح زمیں بوس ہو کر عبد اللہ کو سلام کیا جس طرح دوسرے لوگ بادشاہ کے ساتھ کیا کرتے تھے پھر بادشاہ کے اشارے پر خالی گھوڑے پیش ہوئے۔ بادشاہ نے ایک گھوڑے کی لگام پکڑ کر سائیس کے انداز میں عبد اللہ کی خدمت میں پیش کیا اور درخواست کی۔ ”آپ اس پر سوار ہو جائیں۔“

عبد اللہ نے پہلے تو کسی قدر پس و پیش کیا پھر بادشاہ کے اصرار سے مجبور ہو کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ بادشاہ نے عبد اللہ کے گھوڑے کی راکب پکڑ لی۔

عبد اللہ نے عاجزی سے کہا۔ ”بادشاہ کو اپنے امراء کے سامنے میری اتنی تعظیم نہیں کرنی چاہیے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”یہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے امراء بھی آپ کی اتنی ہی تعظیم کریں۔“

عبد اللہ نے کہا۔ ”بادشاہ یا تو خود بھی گھوڑے پر بیٹھ جائے ورنہ میں نیچے اتر پڑوں گا۔“

بادشاہ گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔

بادشاہ اپنے گھوڑے کو عبد اللہ کے گھوڑے کے قریب لے گیا اور اس کے بائیں طرف برابر میں کھڑا ہو گیا۔ شاہی چھتر بردار آگے بڑھے اور چھتر کو اس طرح کھڑا کر دیا کہ بادشاہ اور عبد اللہ، دونوں ہی اس چھتر کے نیچے آ گئے۔

یہاں بادشاہ نے تواضع کے طور پر اپنے ہاتھ سے عبد اللہ کو پان کا بیڑا پیش کیا۔ عبد اللہ کے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا اعزاز تھا، کیونکہ بادشاہ اپنے ہاتھ سے کسی کو پان نہیں دیتا۔ بادشاہ نے پان پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں خلیفہ ابوالعباس سے بیعت نہ کر چکتا تو آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا۔“

عبد اللہ نے جواب دیا۔ ”میں خود بھی ابوالعباس کے ہاتھ پر بیعت ہوں۔“

بادشاہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عبد اللہ نے کہا۔ ”رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جس نے بنجر زمین کو زندہ کیا یعنی آباد کیا وہ زمین اس کی ملکیت ہوتی ہے۔ بادشاہ کے احسانات نے ہمیں از سر نو زندہ کیا ہے، اب ہم آپ کی رعایا ہیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اسی باتیں نہ کیجیے کیونکہ میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔“

عبد اللہ وقتی طور پر خوف زدہ تو ضرور ہو گیا لیکن پھر اپنے شجرہ نسب کی موجودگی سے ایک توانائی اور قوت بھی محسوس کی۔

واقعہ تو یوں نے بادشاہ کو مطلع کر دیا کہ عبد اللہ بخدا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات غلط ہو لیکن ایک ادنیٰ واقعہ تو یوں عبد اللہ کے اس دعوے کی تردید یا تصدیق نہیں کر سکتا۔ کہاں بخدا کا شاہی خاندان اور کہاں ہندوستان کا ایک معمولی واقعہ تو یوں پھر بھی اس ناچیز نے عبد اللہ کو حضور والا کی عدالت اور سیاست سے خبردار کر دیا ہے۔ واقعہ تو یوں کے پرچے نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ بادشاہ نے ایک خط اپنے ہاتھ سے عبد اللہ کے نام لکھا اور درخواست کی کہ وہ کسی توقف کے بغیر دہلی آجائے۔ راہ خرچ کے لیے تیس ہزار دینار بھیج دیے۔ عبد اللہ فوراً ہی چل پڑا۔ وہ حیران تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا ہے، نہیں یہ خواب تو نہیں ہے۔

دہلی سے تقریباً نوے میل دور سیرسا میں قاضی کمال الدین صدر جہاں، فقہاء کی جماعت کے ساتھ عبد اللہ کے استقبال کو پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ صدر جہاں نے عبد اللہ کو ایک شاندار محل میں ٹھہرایا اور نہایت عقیدت و احترام سے اس کا شجرہ نسب ملاحظہ کیا پھر اسی وقت بادشاہ کی خدمت میں اپنا آدمی روانہ کر دیا کہ عبد اللہ واقعی خلفائے بنو عباس ہی کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ جواب میں بادشاہ نے امیروں کی ایک دوسری جماعت بھی عبد اللہ کے استقبال کے لیے روانہ کر دی پھر جب عبد اللہ اپنے استقبالیوں کے ساتھ دہلی کے قریب مسعود آباد پہنچا تو وہاں بادشاہ محمد تعلق بھی اپنے امراء کے ساتھ اس کے استقبال کو پہنچ چکا تھا۔ عبد اللہ بادشاہ کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا اور پایادہ بادشاہ کی طرف بڑھا۔ فرط ادب اور حالت اضطراب میں بادشاہ بھی اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ عبد اللہ بادشاہ کے قریب پہنچتے ہی احتراماً زمیں بوس ہو گیا، جواب میں بادشاہ نے بھی یہی کیا اور وہ عبد اللہ کے دربار میں بوس ہو گیا۔ وہ ایک عجیب منظر تھا جسے نہ تو پہلے کسی نے دیکھا اور نہ بعد میں بھی دیکھا گیا۔ بادشاہ اور عبد اللہ آٹنے سامنے زمیں بوس ہو کر ایک دوسرے کا احترام کر رہے تھے۔ زمیں بوسی کے بعد عبد اللہ نے بادشاہ کی خدمت میں کپڑوں کے چند تھان پیش کیے، بولا۔ ”ہندوستان کے عظیم فرماں روا کی خدمت میں ماضی کے حکمران بنو عباس کے ایک عاجز، درماندہ و آوارہ شہزادے کا یہ حقیر سا نذرانہ..... اسے شرف

جو کسی حکمران وارث کو مل سکتا تھا۔ اس کے در پر حاجت مندوں کا بجوم رہنے لگا۔ لوگ اس سے سفارشوں کے طالب ہوتے لیکن عبداللہ کسی کے بھی کام نہ آتا۔ امراء اور اعلیٰ عہدے دار اس کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے جس سے اس کی دولت و ثروت میں دن رات اضافہ ہوتا رہتا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع ہو گیا تھا۔ غیر ملکی تاجروں کی خدمت میں بڑے قیمتی نذرانے پیش کرتے۔ یہ نذرانے خفیہ طور پر رشوت کی جگہ دیے جاتے تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ شخص بڑا خوش نصیب سمجھا جاتا جس کا کوئی کام عبداللہ کے ہاتھوں ہو جاتا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر عبداللہ اپنے کمرے میں چلا گیا جو محل کے باغ کے سامنے بنا تھا۔ یہاں ایک بڑی سی کافوری شمع روشن تھی۔ عبداللہ اس کی روشنی میں اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ پڑھ رہا تھا۔ اسے ہارون رشید اور اس کے ورثاء کی شان و شوکت اور ترک و احتشام کی تفصیل پڑھ کر غصہ آ رہا تھا۔ ان کی داد و دہش اور جشن طرب کی رودادیں عبداللہ کے دل پر گھونٹے لگا رہی تھیں۔ وہ سوچتا اس کے آباؤ اجداد کتنے فضول خرچ تھے۔ اس کے خیال میں ان کی یہ فضول خرچیاں ہی تھیں جو آج ان کے ورثاء کو بڑی کوڑی کے محتاج شاہان عالم کے درباریوں میں صدقہ و خیرات وصول کر رہے ہیں۔ اچانک اس کے ایک غلام نے اسے مطلع کیا۔

”جناب والا! ایک خراسانی تاجر اذنِ باریابی کا طالب ہے؟“

عبداللہ کے چہرے پر ایک چمک سی پیدا ہو گئی، پوچھا۔ ”یہ اس وقت خراسانی تاجر کیوں آیا ہے؟ کیا تو نے اسے یہ نہیں بتلایا کہ مابدولت ہرکس و ناکس سے ملنا کوارا نہیں فرماتے؟“

غلام نے خوشامد سے کہا۔ ”اس چیز نے حسبِ معمول یہ بات کہہ دی تھی لیکن خراسانی تاجر نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس کا ایک ضروری کام بادشاہ سے آپڑا ہے۔ وہ آپ کے سوا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔“

عبداللہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال میں اس کی کوئی سفارش اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک میں مطمئن نہ ہو جاؤں۔“ پھر ہاتھ کے اشارے سے غلام کو ذرا اور قریب بلایا اور سرگوشی میں پوچھا۔ ”خراسانی تاجر اپنے ساتھ میرے لیے کیا لایا ہے، کچھ معلوم ہے؟“

غلام نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا کچھ علم نہیں لیکن

اس کے بعد یہ لوگ ان خیموں کی طرف بڑھے جو ان سب کے لیے الگ الگ نصب کیے جا چکے تھے۔ ان میں بادشاہ کا خیمہ دور ہی سے امتیاز کیا جا سکتا تھا۔

شاہی سراچ (خیمہ) کے سامنے پہنچ کر بادشاہ رک گیا اور اپنے گھوڑے سے اتر کر عبداللہ کی رکاب تھام کر درخواست کی۔ ”آپ گھوڑے سے اتر کر شاہی سراچ میں تشریف لے چلیں۔“

عبداللہ گھوڑے سے اتر پڑا اور شاہی سراچ میں چلا گیا۔ بادشاہ نے اپنے لیے الگ خیمہ نصب کروایا وہ رات ان سب نے یہیں گزار لی۔ دوسرے دن دارالخلافہ میں داخل ہوئے اور سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان قطب الدین خلجی کا تیار کردہ سیری کا محل عبداللہ کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ اپنے امراء کے ساتھ اس محل میں خود گیا۔ محل کو ساز و سامان سے پاٹ دیا۔ سونے چاندی کے برتنوں کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ چار لاکھ دینار بھی دیے گئے، لونڈی اور غلام بھی پیش کیے گئے۔ سیری کا پورا علاقہ باغوں، مکانوں، زمینوں اور گوداموں سمیت عبداللہ کی جاگیر میں دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ سودیہات بھی دیے گئے۔ دہلی کے مشرقی حصوں کی حکومت بھی پیش دی گئی۔ تیس زرین خنجر زینو سمیت عبداللہ کو عطا ہوئے۔ ان کا چار ادا نہ روزانہ سرکاری گودام سے مقرر ہوا۔ عبداللہ کے لیے بادشاہ کا حکم تھا کہ جب یہ بادشاہی محل میں آئے تو گھوڑے سے ہرگز نہ اترے اور جہاں تک بادشاہ کی سواری جاتی ہے عبداللہ بھی جا سکتا ہے۔

عبداللہ پھولا نہ سہا تھا۔ اسے خلاف توقع جو کچھ مل گیا تھا، اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بادشاہ کا دل سے مطیع و فرماں بردار ہو گیا۔ یہاں اسے جب بھی اپنا ماضی یاد آتا تو وہ گھبرا کر سوچنا بند کر دیتا۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ وہ اپنے تکلیف دہ ماضی کو اپنی یادداشت اور حافظے سے نکال پھینکنا چاہتا تھا لیکن اپنی ان کوششوں میں وہ اس وقت بالکل ناکام ہو جاتا جب تصور کی آنکھیں سو گوارز بیدہ کوشا کی نظروں سے گھورتا ہوا دیکھ لیتیں۔ وہ تملتا جاتا اور دانت چیں کر کہتا۔ ”زبیدہ! اب میں دہلی میں بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا تو مجھ سے واقعی محبت کرتی تھی۔ اگر تجھے مجھ سے محبت ہوئی تو آج تو میرے ساتھ دہلی میں مقیم ہوئی اور میری بے پایاں خوشیوں میں سے اپنا حصہ وصول کر لیتی۔“ پھر سوچتا کہ زبیدہ اور بچے کو اپنے پاس دہلی بلوالے لیکن پھر خرچ پر نظر ڈالتا تو حوصلہ پست ہو جاتا۔

عبداللہ کو اب کوئی غم نہ تھا۔ وہ سارا ایش میسر آ گیا تھا

نہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“
تاجر نے گھڑی کے اندر سے نکلنے والے ریشمی تھان کو عبداللہ کے قدموں میں ڈال دیا اور اس کے بعد باری باری قیمتی نگینے، روبال، مہریریں اور بعض ایسی چیزیں جو بغدادی میں مل سکتی تھیں، انہماک اور شوق سے عبداللہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔

عبداللہ نے دریافت کیا۔ ”مجھے سے کوئی کام؟“
تاجر نے جواب دیا۔ ”میں نانا بغداد سے آیا ہوں، یہاں کے مقامی تاجر مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ اسی حسد میں مجھ پر یہ الزام عائد کر دیا گیا کہ میں بادشاہ کے خلاف کسی سازش میں شریک ہوں اور باہر سے گھوڑے لاکر باغیوں کو مضبوط اور منظم کر رہا ہوں حالانکہ میں گھوڑوں کا نہ تو تاجر ہوں، نہ ہی کسی ایسی سازش کا علم رکھتا ہوں جو بادشاہ کے خلاف ہو رہی ہو۔“

عبداللہ نے بے مروتی سے کہا۔ ”پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس چیز کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، اس میں تیری شرکت کا الزام عائد کر دیا جائے؟“

تاجر نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”جناب! یہ مجھ پر تہمت ہے، الزام ہے، بے بنیاد الزام۔ بادشاہ کے آدمی میری تلاش میں ہیں، میں معلوم نہیں کس طرح چھپتا چھپاتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں پناہ چاہتا ہوں اور سفارش بھی۔ آپ بادشاہ سے میری سفارش کر دیجیے۔“

عبداللہ نے اپنے غلام کو آواز دی۔ ”قطب الدین، تاجر کے تحائف اندر لے جا۔“

جب قطب الدین تحائف سمیٹنے آیا تو عبداللہ نے اسے ڈانٹا۔ ”میں نے تجھے ہمیشہ یہی نصیحت کی ہے کہ جب تجھے تحائف آ یا کریں تو انہیں میری نظروں کے سامنے سے فوراً ہٹا دیا کر کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میں ان تحفوں کی طمع میں لوگوں کے غلط سلط بھونے سے کام کرا دیا کروں۔“

غلام قطب الدین تاجر کے تحائف سمیٹ کر اندر لے گیا۔ عبداللہ نے ایک بار پھر لڑکی کو نظارہ اچھتی مگر نہایت گہری اور ہوس زدہ نظروں سے دیکھا، بولا۔ ”تیرے تحائف اور نذرانوں کا بہت بہت شکر ہے۔ اب ایک بات اور بتا دے۔ تو نے یہ تحائف مجھے نذرانے کے طور پر پیش کیے ہیں یا رشوت سمجھ کر؟“

تاجر نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو رشوت کس طرح دے سکتا ہوں۔ یہ سب کچھ میری طرف سے ہدیہ عقیدت تھا۔“
عبداللہ نے کہا۔ ”تب پھر اپنے بارے میں میرا

تاجر کے ساتھ ایک غلام بھی ہے جس کے کاندھے پر ایک گھنٹری رکھی ہے اور ایک عورت بھی ہے جس کی میں اندھیرے کی وجہ سے صورت نہیں دیکھ سکا کہ وہ بوڑھی ہے یا جوان ہے، مسکین ہے یا بد صورت۔“

عبداللہ نے کسی قدر تامل سے اجازت دی۔ ”اچھا تو اسے اس کمرے میں بٹھا جو محل کے دروازے کے قریب ہے تاکہ اسے رخصت کرنے میں دیر نہ لگے، میں آتا ہوں۔“

عورت کے خیال نے عبداللہ کو ذرا مستعد اور پھر تیلنا بنادیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو یا۔ لباس کسی قدر میلا تھا، اسے تبدیل کیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سرو اور ڈانڈھی کے بالوں کو درست کیا۔ آنکھیں پھینکی پھینکی بے رونق سی محسوس ہوئیں تو ان میں سرے کی سلائی سے تازگی پیدا کی گئی۔ خشک بالوں میں تیل پڑ گیا، شانے پر طلیسان اس طرح ڈال لی کہ طلیسان کے دونوں سرے گردن کے آس پاس سے گزر کر سینے پر آ رہے۔

کچھ دیر بعد بن کنور کر جب عبداللہ خراسانی تاجر کے روبرو پہنچا تو سب سے پہلے عورت کی طرف دیکھا اور اس کا دل زور زور سے اس طرح دھڑکا تو کیا سینے سے باہر نکل پڑے گا۔ تاجر نے ادب سے سلام کیا اور عبداللہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ عبداللہ نے اس میں بائیس سالہ لڑکی کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ ہوش رہا حسن اور سرو و جیسا قد، بڑی بڑی آنکھیں، وہ بھی عبداللہ کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چالاک تاجر اپنے دل میں خوش تھا کہ نشانہ خطائیں ہوا۔ اس نے اپنے غلام سے گھنٹری لے لی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔

”حضور والا! ابھی ملتان ہی میں تھا کہ پتا چل گیا کہ آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں بغداد سے آیا ہوں۔ مجھے یہاں یہ عجیب بات معلوم ہوئی کہ اہل ہند تمام غیر ملکی تاجروں کو خراسانی کہتے ہیں۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”صرف تاجروں ہی کو نہیں بلکہ تمام غیر ملکیوں کو خراسانی کہتے ہیں۔“
تاجر اپنے ہاتھ اس طرح لٹکے لگا گیا انہیں دھو رہا ہے، بولا۔ ”اگر حضور اجازت دیں تو گھنٹری کھول دوں اور آپ کے لیے جو حقیر سے نذرانے لایا ہوں، پیش کر کے فخر و سعادت حاصل کروں۔“

عبداللہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تاجر بڑے لسان ہوتے ہیں، ہوا بھی ابھی گھنٹری کھولے جارہا تھا لیکن اب اس کی اجازت طلب کر رہا ہے، کوئی مضائقہ

Stillman's® Beauty

Get Noticed!®

اسٹیمینز اسکن بلیچ کریم اور
اسٹیمینز اسکن برائٹننگ سوپ کا باقاعدہ استعمال
آپ کی جلد کو نکھار کر اسے گورا اور خوبصورت بنائے۔
اب آپ جہاں بھی جائیں ہر ایک کی نظر آپ پر جائے



نقل سے خوشیار اور اسٹیمینز سڈ براؤڈ کاؤنٹریز میں ہر گھر میں، راولپنڈی، لاہور، کراچی، اسلام آباد، پشاور اور دیگر شہروں میں دستیاب ہے۔ اسٹیمینز بھارتی کمپنی کی ملکیت ہے۔ اسٹیمینز بھارتی کمپنی کی ملکیت ہے۔ اسٹیمینز بھارتی کمپنی کی ملکیت ہے۔



www.stilman's.pk



/Stillmans-Beauty-Pakistan



Contact us on 0800-00700

عبداللہ نے کہا۔ ”تب پھر تو یہیں رہ اور اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر۔“

عبداللہ نے تاجروکرات گزارنے کے لیے جو کمر دیا تھا، اسے باہر سے مقتل کر دیا اور اپنے کمرے سے قتل کمرے میں خیزران کو بٹھرایا۔

اس رات عبداللہ بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ وہ سونے کی کوشش کرتا مگر نیند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ برابر کے کمرے میں کئی شخصیں روشن تھیں حالانکہ خود عبداللہ کے کمرے میں صرف ایک شمع جل رہی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ خیزران کے کمرے میں جائے اور ایک کے سوا ساری شخصیں بچھا دے کیونکہ یہ صریحاً فضول خرچی تھی، مگر اسے جا اسراف۔ وہ دیر تک خیزران کے کمرے میں جانے اور نہ جانے کے شش و پنج میں مبتلا رہا۔ بالآخر وہ بستر سے اٹھا اور آہستہ آہستہ خیزران کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ خیزران نے دروازے اندر سے بند نہیں کیے تھے۔ ذرا سے دباؤ سے کھل گئے۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ خیزران مسہری پر دراز دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ وہ خیزران کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تنہا کے اتار چڑھاؤ سے سینہ زیر و بم میں مبتلا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں پر پہوٹوں کی نقاب پڑی تھی۔ عریاں بازو اتنے حسین اور صاف تھے گویا ان پر میدہ چھڑک دیا گیا تھا۔ سرخ و سفید رخساروں پر سیاہ بالوں کی لٹیں صبح و شام کے سنگم کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ وہ اتنی گہری نیند میں تھی کہ اس کے ہاتھ نہیں تھے پیر کہیں۔ پہلے تو عبداللہ کے جی میں آئی کہ ایک شمع کے علاوہ ساری شخصیں بچھا دے لیکن پھر اس خیال سے باز رہا کہ اس کی یہ حرکت خیزران کو بری نہ لگ جائے۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد اس نے تپائی پیچھی کی اور اس پر بیٹھ کر خیزران کے حسن کا والہانہ انداز میں نظارہ کرنے لگا۔ اس چاند کے ٹٹے میں ایک سحر تھا، مقناطیسیت تھی کہ عبداللہ اس کے قریب، اس کے سامنے موجود رہنے پر مجبور تھا۔

پھر خیزران نے کروٹ لی اور کروٹ بدلنے کے ساتھ ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ نیم وا آنکھوں سے عبداللہ کو دیکھا اور پھر چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ عبداللہ نے تپائی چھوڑ دی اور خیزران پر جھک گیا۔

”خیزران! تو خوف زدہ مت ہو، یہ میں ہوں عبداللہ۔“

خیزران خوف اور گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

فیصلہ بھی سن لے۔ اگر تو نے کسی سازش میں حصہ نہیں لیا تو بادشاہ تجھے خود ہی چھوڑ دے گا۔ اگر تو واقعی خطا کار ہے تو بادشاہ سے معافی کی امید بھی نہ رکھ اور میں خود تاجروکرات سفارش کرنے سے رہا۔ اب تو چپ چاپ یہاں سے چلا جا کیونکہ میں کسی شاہی مجرم کو زیادہ دیر اپنے پاس نہیں روک سکتا۔“

تاجر نے فراخ دلی سے کہا۔ ”جناب! یہ میری کنیز خیزران ہے اللہ بہتر جانتا ہے کہ اسے شروع سے میں نے آپ کی امانت سمجھا ہے۔ اسے میں ایران سے آپ کے لیے لایا تھا لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے بادشاہ کی نذر کر دیا جائے کیونکہ میں آپ سے ہمدردی اور خلوص کی توقع لے کر آیا تھا جس سے میں محروم رہا۔ اگر میں معاف کر دیا گیا تو یہ کنیز آپ کی ملکیت رہے گی اور اگر معاف نہ کیا گیا تو بادشاہ کو مطلع کر دوں گا کہ وہ اپنی امانت آپ سے حاصل کر لے۔“

عبداللہ کے منہ میں پانی بھرا آیا۔ وہ خیزران کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تو مجھے یہ یقین دلا دے کہ تو بے گناہ ہے تو میں تیری سفارش کر سکتا ہوں۔“

تاجر نے جواب دیا۔ ”میں بے گناہ ہوں اور آپ کے بقول میری بے گناہی کے لیے کسی سفارش کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر آپ میری سفارش کرتا ہی چاہتے ہیں تو میری بے گناہی اور گناہ کا روی کا خیال کیے بغیر ہی کر دیجیے۔“

عبداللہ نے ذرا سکوت اختیار کیا، تاجر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خیزران سے بولا۔ ”خیزران! تو اس وقت تک اسی محل میں رہے گی جب تک میرے مسئلے کا فیصلہ نہ سنا دیا جائے۔ میں جا رہا ہوں۔“

عبداللہ نے سرا پر اٹھایا، بولا۔ ”بغدادی تاجر! ٹھہرو، تم آج کی رات اسی محل میں رہ جاؤ۔ کل بادشاہ سے مل کر سفارش کر دوں گا لیکن سفارش سے پہلے میں ایک بار پھر اس کی وضاحت چاہوں گا کہ اگر میری سفارش سے تمہیں رہائی مل جائے تو اس کے بعد یہ خیزران میری ہو جائے گی۔“

تاجر نے جواب دیا۔ ”میں تاجر ہوں اور تاجر قول کے دھنی ہوتے ہیں۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”اور اس کی وضاحت بھی کر دو کہ خیزران رشوت میں نہیں دے رہے ہو کیونکہ خدا کا فرمان ہے کہ رشوت لینے اور دینے والے جہنمی ہیں۔“

تاجر نے جواب دیا۔ ”میں نے خیزران کو تجھے کے طور پر آپ کے حوالے کیا ہے، اس کی وضاحت میں پہلے کر چکا ہوں۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”کیا تو نے کوئی خواب دیکھا ہے؟“
خیزران نے وحشت زدہ آواز میں پوچھا۔ ”آپ
یہاں اس وقت کیوں آئے ہیں؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”رات کو میں پورے محل
میں گھوم پھر کر خبر گیری کرتا رہتا ہوں چنانچہ جب میں تیرے
کمرے کے پاس سے گزر رہا تھا تو میں نے یہاں کئی شخصیں
روشن دیکھیں، اسے میں بے جا سراف میں شمار کرتا ہوں۔
میں تیرے کمرے میں ان شخصوں کو بچانے آیا تھا۔“
خیزران نے کہا۔ ”لیکن اندھیرے میں تو میرا دم ہی
نکل جاتا۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں ساری شخصیں تھوڑی
بجھاتا، ایک جلتی رہنے دیتا۔“
خیزران نے بے مروتی سے کہا۔ ”تو شخصیں بجھا کر
چلے جائے۔ یہ تپائی پریشانی کرا رہے تھے یہاں؟“
عبداللہ نے شرمندگی سے کہا۔ ”تو بڑی تیز مزاج کی
محسوس ہوتی ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اب تو میری ملکیت
ہے اور میں کسی بھی وقت تیرے پاس آ سکتا ہوں۔“

خیزران نے جواب دیا۔ ”ابھی آپ یہ نہیں کہہ سکتے
کیونکہ میری ملکیت مشروط ہے اور معلوم نہیں کہ میں آپ کی
ملکیت ہو جاؤں یا بادشاہ کی مٹھروں۔“
عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب تو میری ہی
ملکیت رہے گی کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ بادشاہ سے
سفارش کر کے تاجرو کو سازش کے الزام سے بری قرار دے
دوں۔ اس کے بعد تو علی الاعلان میری ملکیت ٹھہرے گی۔“
خیزران نے بدستور بے مروتی سے کہا۔ ”اچھا، اس
وقت تو آپ میرے کمرے سے تشریف لے جائیے، صبح
بات ہوگی۔“

عبداللہ نے ہنستے ہوئے شوشی سے کہا۔ ”جب کمرے
میں آیا تو تو خراٹے لے رہی تھی اور معلوم نہیں کتنی دیر سے
نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اب مجھے دیکھ، میں نے تو ابھی
تک پلک بھی نہیں جھپکائی اور پھر بھی یہ حال ہے کہ نیند کا
کوسوں پتا نہیں۔“

خیزران عبداللہ کی مداخلت سے تنگ آئی ہوئی تھی،
بولی۔ ”کیا مجھے اس بات کی اجازت دیجیے گا کہ میں۔۔۔
بے تکلفی سے باتیں کروں؟“
عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اجازت دینا کیا معنی،
اجازت ہے۔ میں خود بھی تکلف سے نفرت کرتا ہوں۔“
خیزران نے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کو

خیزران نے کہا۔ ”لیکن میں تو یہ سنی آئی ہوں کہ
راتوں کو یا تو چکا ڈڑ جاتے ہیں یا الو۔ انسان تو نہیں جاتے۔“
عبداللہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا، بولا۔ ”لڑکی! تو یہ تو بے، تو
کیا بک رہی ہے؟ عابد اور زہد بھی تو راتوں کو جا گتے ہیں۔“
خیزران نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں کیا جانوں
لیکن آپ تو نہ عابد ہیں نہ زہد پھر کیوں جاگ رہے ہیں؟“
عبداللہ نے ذرا پس و پیش کے بعد کہا۔ ”خیزران! تو
شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ہے۔ میری ایک بیوی تھی
اور ایک بچہ بھی لیکن اب یہاں دہلی میں کچھ بھی نہیں ہے۔
خیزران! تو یقین کر جب سے میں نے تجھے دیکھا ہے، معلوم
نہیں کیوں مجھے اپنی بیوی زہیدہ یاد آنے لگی ہے۔ اس کی
شکل بالکل تیری ہی طرح ہے۔“

خیزران نے کہا۔ ”اب تو اللہ نے بہت کچھ دے
رکھا ہے آپ کو، اپنی بیوی اور بچے کو بلوایجیے۔“
عبداللہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”خیزران! تو
نہیں سمجھتی میری بیوی بڑی فضول خرچ ہے۔ میں اسے
بلواتے ہوئے ٹھہراتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے
اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ یہاں آتے ہی دو دن میں
گنوا دے گی۔ اس لیے میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ میں
بیوی کو نہ بلواؤں۔“
خیزران کو جہاں آگئی۔ منہ کھل گیا، عجیب سے انداز
میں بولی۔ ”اب میں آپ سے کیا بات کروں، بات ہی ختم
ہو گئی۔“

عبداللہ نے لجاجت سے کہا۔ ”کیا میں ایک کے سوا
تمام میں بجھا دوں؟“
”بجھا دیں۔“ خیزران نے جواب دیا۔ ”لیکن
اندھیرے میں تو مجھے نیند بھی نہیں آئے گی۔“

عبداللہ نے عاجزی سے کہا۔ ”اگر تو نہیں چاہتی کہ
تیرے کمرے کی شخصیں بجھائی جائیں تو میں نہیں بجھاؤں گا۔
تو شوق سے جلائی رہ۔ اگر میں دوبارہ ایسی بات کروں تو جو
سزا مناسب سمجھتا دے دیتا۔ میری تو کچھ مجھ میں نہیں آتا کہ
میں کس طرح تیری دل شکنی کر سکتا ہوں۔“
خیزران نے کہا۔ ”آپ برابر میری دل شکنی کیے
جارہے ہیں۔ آپ کی میرے کمرے میں موجودگی مجھے صدمہ
پہنچا رہی ہے۔ کیا آپ یہاں سے جانا نہیں چاہتے؟“

بھی گزر جائے گا۔“

بادشاہ کو عبداللہ کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ عبداللہ کا گھوڑا بادشاہ کے سبز محل میں داخل ہو گیا۔ یہاں ہر چیز سبز تھی۔ دوپواریں، دروازے، پردے ہر چیز سبز تھی۔ عبداللہ کا گھوڑا محل کے اس حلقے تک چلا گیا جہاں تک بادشاہ کا تعظیم بجالائے۔ بادشاہ عبداللہ کو سامنے دیکھ کر تخت سے اتر پڑا اور عبداللہ کی تعظیم بجالایا۔ اس کے بعد ہاتھ پکڑ کر تخت پر اپنے برابر بٹھالیا، بولا۔ ”حضرت! آپ خوب تشریف لائے، میں تو آپ کو زحمت دینے ہی والا تھا۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”بادشاہ کو اس عاجز و ناتواں کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”آپ جب سے دہلی تشریف لائے ہیں، ملاحظہ فرما رہے ہوں گے کہ میں بادشاہ عادل ہوں یا ظالم۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تو بادشاہ کو عادل اور سخی دیکھا اور پرکھا ہے لیکن خدا خود فرماتا ہے کہ زمانے کی قسم انسان بڑے خسارے میں ہے۔ بادشاہ کی رعایا بڑی ناشکری ہے اور اس کا یہ ناشکر اپنی ہی اس کا سب سے بڑا خسارہ ہے۔“

بادشاہ نے افسوس سے کہا۔ ”لوگ مجھے ظالم کہتے ہیں حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ تادیب و تعزیر میں سختی اختیار کرتا ہوں۔ کیا مجرم خود اپنی ذات پر ظلم نہیں کرتا؟ وہ جرم کا ارتکاب کر کے مجھے سزا کا موقع دیتا ہے، تادیب پر مجبور کر دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو میں بھی اس کی تادیب سے باز رہوں۔ دنیا کا کوئی بھی عاقل اگر میرے اعمال کو غلطاً نہ ثابت کر دے تو میں اپنے اوپر عائد کردہ ظلم کی سزا سمجھتے کو تیار ہوں۔“

اسی وقت کسی نقیب کی آواز نے بادشاہ کو مطلع کیا۔ ”جہاں پناہ کا مجرم مسعود خاں حاضر ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”حاضر کیا جائے۔“

ذرا دیر بعد ایک نہایت خوب صورت نوجوان بادشاہ کے سامنے پابجولاں حاضر کر دیا گیا۔

بادشاہ نے عبداللہ سے پوچھا۔ ”یہ نوجوان آپ کو کیسا لگتا ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”مجھے تو نہایت معصوم اور بے گناہ نظر آتا ہے۔“

بادشاہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ غصے پر قابو پانے کی کوشش میں پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس نے قاضی کمال

عبداللہ کھیا کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”اچھا اب میں جاؤں گا لیکن اسے شوخ و دشر لڑکی، کل دن میں تجھ سے بہت ساری باتیں کروں گا تو باتوں میں مجھ سے نہیں جیت سکتی۔“ خیزران نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”کل کی کل دیکھی جائے گی۔“

عبداللہ نے جاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تمہیں بچھاؤں؟“ ”نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ تمہیں بچھانے سے میری دل آزاری ہوگی اور آپ میری دل آزاری کو کس طرح گوارا کریں گے۔“

عبداللہ نے کھپانے لپٹے کہا۔ ”اچھا، ساری شمعوں کو جلتا رہنے دے۔ تو بھی کیا یاد کرے گی کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔“

جب عبداللہ کمرے سے چلا گیا تو خیزران نے چپکے سے اٹھ کر اندر سے دروازے بند کر لیے اور ہنسی ہوئی بستر پر دراز ہو گئی۔

ساری رات عبداللہ کا بڑا برا حال رہا۔ اسے جب بھی یہ خیال آتا کہ خیزران کے کمرے میں کئی شمعیں فصول جل رہی ہیں تو دل کا برا حال ہو جاتا۔

خیزران یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ چلیے اس خنسی کو کسی طرح جلانے ستانے کا کوئی موقع تو ہاتھ آیا۔

صبح تاجر نے عبداللہ سے سخت شکایت کی۔ اس نے کہا۔ ”رات کمرے کو باہر سے مقفل کر دینے کی وجہ سے میں رات بھر بیت الخلا نہیں جاسکا جس سے میں بہت پریشان ہوا۔“

عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ایک رات کی پریشانی ہی کیا۔ اللہ نے جاہا تو آج میں بادشاہ سے ملوں گا اور اس سے تیری سفارش کروں گا۔ میرا خیال ہے بادشاہ میری سفارش نال نہیں سکتا۔“

”آمین، خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”جب تک میں واپس نہ آؤں، محل سے باہر نہ نکلتا۔“

عبداللہ نے صدر دروازے میں قفل ڈال کر قلعوں کو حکم دے دیا کہ کوئی بھی آئے، صدر دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔

تاجر نے جواب دیا۔ ”میں کس طرح آپ کے احسان کا بدلہ چکاؤں گا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”میں بتاؤں گا کہ تو میرے احسان کا بدلہ کس طرح اتارے۔ ابھی پریشان نہ ہو کیونکہ یہ زمانہ

الدين سے دریافت کیا۔ ”قاضی کمال الدین نے کہا اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا؟“

عبداللہ قاضی کو پہچان گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو عبداللہ کے لیے دہلی سے دو کسیر سناک استقبال کو پہنچا تھا۔ قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”شہزادے مسعود خاں نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔“

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”قاضی کمال الدین! تم مسعود خاں کو شہزادہ کہتے ہو۔ میں قاضی القضاۃ کو اتنا غیر محتاط نہیں سمجھتا تھا۔“

قاضی کمال الدین نے بہم کر جواب دیا۔ ”حضور والا! میں نے اسے شہزادہ طنزاً کہا ہے کیونکہ اس نے اپنے تحریری اقبال نامے میں خود کو شہزادہ ہی لکھا ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”اقبال نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔“ قاضی کمال الدین نے یہ آواز بلند اقبال نامہ پڑھ کر سنایا۔

”میں کہ شہزادہ مسعود خاں تغلق پر غیاث الدین تغلق کہ میری ماں دختر علاء الدین بھی تھی، اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنے برادر کلاں محمد شاہ تغلق کے خلاف سازش کی تھی کہ اسے قتل کر کے بغاوت کر کے اپنی راہ سے ہٹا کر خود بادشاہ بن جاؤں لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے اپنے جرم بغاوت کا اقبال کسی جبر و تشدد یا دباؤ کے بغیر کیا ہے۔“

عبداللہ نے غصے میں کہا۔ ”تو میرا بھائی ہے، سچ بتا کیا میں نے تجھ پر کوئی ظلم کیا؟ میں نے تیرے مرتبے اور اعزاز میں کبھی کوئی کمی کی؟“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں نے اپنے بادشاہ اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“

بادشاہ نے دریافت کیا۔ ”تیرے جرم بغاوت میں اور کون کون شریک تھا؟“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھیوں کی فہرست کمال الدین کے پاس موجود ہے۔ میں نے اس پر بھی اپنے دستخط کر دیے ہیں۔“

کمال الدین نے دریافت کیا۔ ”میں ہوں تیری تیار کردہ سازش میں کوئی غیر ملکی تاجر بھی شامل تھا اور تو نے اس کو اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ باغیوں کے لیے گھوڑے فراہم کرے گا۔“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھیوں کی فہرست کمال الدین کے پاس موجود ہے۔ میں نے اس پر بھی اپنے دستخط کر دیے ہیں۔“

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”قاضی کمال الدین! تم مسعود خاں کو شہزادہ کہتے ہو۔ میں قاضی القضاۃ کو اتنا غیر محتاط نہیں سمجھتا تھا۔“

قاضی کمال الدین نے بہم کر جواب دیا۔ ”حضور والا! میں نے اسے شہزادہ طنزاً کہا ہے کیونکہ اس نے اپنے تحریری اقبال نامے میں خود کو شہزادہ ہی لکھا ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”اقبال نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔“ قاضی کمال الدین نے یہ آواز بلند اقبال نامہ پڑھ کر سنایا۔

”میں کہ شہزادہ مسعود خاں تغلق پر غیاث الدین تغلق کہ میری ماں دختر علاء الدین بھی تھی، اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنے برادر کلاں محمد شاہ تغلق کے خلاف سازش کی تھی کہ اسے قتل کر کے بغاوت کر کے اپنی راہ سے ہٹا کر خود بادشاہ بن جاؤں لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے اپنے جرم بغاوت کا اقبال کسی جبر و تشدد یا دباؤ کے بغیر کیا ہے۔“

عبداللہ نے غصے میں کہا۔ ”تو میرا بھائی ہے، سچ بتا کیا میں نے تجھ پر کوئی ظلم کیا؟ میں نے تیرے مرتبے اور اعزاز میں کبھی کوئی کمی کی؟“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں نے اپنے بادشاہ اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“

بادشاہ نے دریافت کیا۔ ”تیرے جرم بغاوت میں اور کون کون شریک تھا؟“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھیوں کی فہرست کمال الدین کے پاس موجود ہے۔ میں نے اس پر بھی اپنے دستخط کر دیے ہیں۔“

کمال الدین نے دریافت کیا۔ ”میں ہوں تیری تیار کردہ سازش میں کوئی غیر ملکی تاجر بھی شامل تھا اور تو نے اس کو اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ باغیوں کے لیے گھوڑے فراہم کرے گا۔“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھیوں کی فہرست کمال الدین کے پاس موجود ہے۔ میں نے اس پر بھی اپنے دستخط کر دیے ہیں۔“

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”قاضی کمال الدین! تم مسعود خاں کو شہزادہ کہتے ہو۔ میں قاضی القضاۃ کو اتنا غیر محتاط نہیں سمجھتا تھا۔“

قاضی کمال الدین نے بہم کر جواب دیا۔ ”حضور والا! میں نے اسے شہزادہ طنزاً کہا ہے کیونکہ اس نے اپنے تحریری اقبال نامے میں خود کو شہزادہ ہی لکھا ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”اقبال نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔“ قاضی کمال الدین نے یہ آواز بلند اقبال نامہ پڑھ کر سنایا۔

”میں کہ شہزادہ مسعود خاں تغلق پر غیاث الدین تغلق کہ میری ماں دختر علاء الدین بھی تھی، اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنے برادر کلاں محمد شاہ تغلق کے خلاف سازش کی تھی کہ اسے قتل کر کے بغاوت کر کے اپنی راہ سے ہٹا کر خود بادشاہ بن جاؤں لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے اپنے جرم بغاوت کا اقبال کسی جبر و تشدد یا دباؤ کے بغیر کیا ہے۔“

عبداللہ نے غصے میں کہا۔ ”تو میرا بھائی ہے، سچ بتا کیا میں نے تجھ پر کوئی ظلم کیا؟ میں نے تیرے مرتبے اور اعزاز میں کبھی کوئی کمی کی؟“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں نے اپنے بادشاہ اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“

بادشاہ نے دریافت کیا۔ ”تیرے جرم بغاوت میں اور کون کون شریک تھا؟“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھیوں کی فہرست کمال الدین کے پاس موجود ہے۔ میں نے اس پر بھی اپنے دستخط کر دیے ہیں۔“

کمال الدین نے دریافت کیا۔ ”میں ہوں تیری تیار کردہ سازش میں کوئی غیر ملکی تاجر بھی شامل تھا اور تو نے اس کو اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ باغیوں کے لیے گھوڑے فراہم کرے گا۔“

مسعود خاں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھیوں کی فہرست کمال الدین کے پاس موجود ہے۔ میں نے اس پر بھی اپنے دستخط کر دیے ہیں۔“

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”قاضی کمال الدین! تم مسعود خاں کو شہزادہ کہتے ہو۔ میں قاضی القضاۃ کو اتنا غیر محتاط نہیں سمجھتا تھا۔“

قاضی کمال الدین نے بہم کر جواب دیا۔ ”حضور والا! میں نے اسے شہزادہ طنزاً کہا ہے کیونکہ اس نے اپنے تحریری اقبال نامے میں خود کو شہزادہ ہی لکھا ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”اقبال نامہ پڑھ کر سنایا جائے۔“ قاضی کمال الدین نے یہ آواز بلند اقبال نامہ پڑھ کر سنایا۔

”میں کہ شہزادہ مسعود خاں تغلق پر غیاث الدین تغلق کہ میری ماں دختر علاء الدین بھی تھی، اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنے برادر کلاں محمد شاہ تغلق کے خلاف سازش کی تھی کہ اسے قتل کر کے بغاوت کر کے اپنی راہ سے ہٹا کر خود بادشاہ بن جاؤں لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے اپنے جرم بغاوت کا اقبال کسی جبر و تشدد یا دباؤ کے بغیر کیا ہے۔“

کمال الدین گھبرا گیا، وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔
”آپ یہ بیکار سوال کیوں کر رہے ہیں؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میرا سوال بیکار یا فضول نہیں ہے بلکہ اس کی تین ایک خاص مقصد کا فرما ہے۔“

کمال الدین نے کہا۔ ”آپ ایک بات ذہن نشین کر لیجیے کہ مسعود خاں اگر قبائل جرم نہ کر لیتا تو اسے ایسی اذیتیں جھیلنا پڑتی جن کے مقابلے میں موت بہت آسان اور خوشگوار شے ہے۔ اس نے بچ کے بدترین عذاب پر جھوٹ کی آسان ترین سزا گوارا کر لی ہے۔ مسعود خاں نے اپنے بیان میں جو کچھ لکھا یا کہا ہے سراسر جھوٹ ہے۔ وہ بے گناہ ہے لیکن اگر کسی طرح بادشاہ کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ میں نے مسعود خاں کو بے گناہ کہہ دیا ہے تو بادشاہ مجھے بھی قتل کروادے لیکن یہ بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں اور اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ آپ اسے اپنے سینے کے نہاں خانے میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں گے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”بادشاہ نے مجھ پر احسان کیے ہیں، میں احسان فراموش نہیں بن سکتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں راقی قندار گیز کو خواہ مخواہ اختیار کروں۔“

کمال الدین نے متنبہ کیا۔ ”ہمیں جو تاجر اس سازش کے سلسلے میں مطلوب ہے، اسے کل شام آخری بار آپ کے محل کی طرف جانے دیکھا گیا ہے۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک غلام بھی تھا جس کے سر پر ایک گٹھری رکھی تھی اور غلام کے ساتھ ہی ایک خوب صورت نیزہ بھی جس کا نام خیزران بتایا گیا ہے۔ ہم سب پریشان ہیں کہ آخر یہ تینوں کئے کہاں؟ لیکن مسعود خاں کو قتل کر دینے کے بعد میں انہیں بھی تلاش کر لوں گا۔“

عبداللہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا، حیرت سے پوچھا۔ ”اس تاجر کو تم نے میرے محل کی طرف جانے دیکھا تھا، آخر یہ کس طرح ممکن ہے؟ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟“

کمال الدین نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آقا زادے! اس دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے اس تاجر نے آپ ہی کے محل میں پناہ لے رکھی ہو اور آپ کو اس کا علم نہ ہو۔“

”یہ ناممکن ہے، وہ میرے محل میں پناہ نہیں لے سکتا۔“
کمال الدین نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”وہ آپ کے علم میں نہیں، لاعلمی میں تو پناہ لے سکتا ہے۔“

عبداللہ پریشان ہوتا جا رہا تھا، بولا۔ ”میں تمہارے اس مفروضے کو نہیں مان سکتا۔“

کے قریب جب وہ بیٹھا تھا تو خیزران اسے کئی بار یاد آئی۔ وہ اس وقت بادشاہ سے تاجر کی سفارش کرنا چاہتا تھا لیکن پھر وہ دربار کا رنگ اور بادشاہ کے مزاج کا اندازہ لگا کے خاموش بیٹھا رہا۔

کمال الدین اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا عبداللہ کے قریب لے گیا، بولا۔ ”آقا زادے! میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

عبداللہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کمال الدین اس کے پیچھے پہنچ گیا تھا، عبداللہ نے پوچھا۔ ”مجھے تمہیں کچھ کہنا ہے؟“
”ہاں۔“ کمال الدین بالکل برابر پہنچ گیا۔
”ہمارے آس پاس کوئی اور تو نہیں ہے؟“

عبداللہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو وہاں صرف ایک ہی ہجوم نظر آیا۔ وہ ہجوم مسعود خاں کو چوک کے منتقل کی طرف لیے جا رہا تھا۔ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہاں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔“

کمال الدین نے رک رک کر کہا۔ ”آقا زادے! آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں آپ کی کتنی عزت کرتا ہوں۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، خوب جانتا ہوں لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

کمال الدین نے کہا۔ ”بادشاہ آپ کی بے حد عزت کرتا ہے۔ آپ نے غلطی سے مسعود خاں کو شہزادہ اور خوب صورت ترین نوجوان کہہ کر بادشاہ کی طبیعت میں ٹکدر پیدا کر دیا تھا۔ اگر آپ کی جگہ یہ باتیں میں کہتا تو آج میں قتل کر دیا جاتا۔ اس لیے آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔“

عبداللہ نے خفا سے جواب دیا۔ ”مجھے اپنی غلطی کا بعد میں احساس ہو گیا تھا اور آئندہ میں ان باتوں کا بہت خیال رکھوں گا۔“

کمال الدین نے کہا۔ ”حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ بادشاہ آپ کو کچھ بھی نہ کہے گا لیکن آپ کو احتیاط تو کرنا ہی پڑے گی۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”میں خیال تو رکھوں گا مگر میں ایک بات ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

کمال الدین نے کہا۔ ”پوچھیے، آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”مسعود خاں نے اپنے اقبال نامے میں جو کچھ کہا ہے، کیا وہ بالکل سچ ہے؟“

”مسعود خاں! یہ تمہارا آخری وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار اس مجمع کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر لو۔

مسعود خاں نے پہلے کمال الدین کی طرف دیکھا پھر
ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لوگو! میں بادشاہ محمد تغلق

تھا۔ یہ ظالم بادشاہ..... جو بد قسمتی سے میرا بھائی بھی

ہے، اسی درخت کے نیچے دو سال پہلے میری ماں کو سنسار کروا چکا ہے۔ بادشاہ نے میری معصوم ماں پر جنسی

بد اخلاقی کا جرم عائد کیا تھا۔ لوگو! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی ماں کی طرح بے گناہ اور بے قصور ہوں۔ مجھے

کمال الدین دوڑ کر مسعود خاں کے پاس پہنچ گیا اور

اس موذی اور فتنہ پرداز کی گردن۔ ورنہ اس کی تقریر سننے

مسعود خلیل نے خدا کے صواب و شاکر بننے کا طرہ

اپنا سر جھکا دیا۔ جلاد کا تلووار والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور جب

شہزادے کی لردن پر لڑا تو سر اور جسم علیحدہ ہو چکے تھے۔۔۔۔۔۔
 بریدہ جسم پھڑکنے لگا اور شہزادے کی ٹانگیں زمین پر گھسٹنے

لیکس۔ یہاں تک کہ ایڑیوں کی مسلسل رگڑ سے کچی زمین میں دو ننھے ننھے گڑھے سے بن گئے۔

کامیاب ہو

عبداللہ نے اپنے محل کا صدر دروازہ کھلوایا تو اسے یہ احساس ہو گیا کہ محل کی فضا کو یہ اسرار بنادینا اچھی بات نہیں

ہے۔ اسے کمال الدین کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ تاجر اور خنزیرانہ کار کے محل میں مسجود کی کمال علم کس اور کونہ نہ

لیکن کمال الدین کو ضرور تھا۔ وہ بدحواس، بھاگا بھاگا

عبداللہ نے پوچھا۔ ”تاجر کہاں ہے؟“

خیزران نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میں کیا جانوں، ہوگا کہیں مجھے کیا پتا۔“

عبداللہ لرز گیا، سہم گیا، پوچھا۔ ”کیا بادشاہ تلاشی لینے کی نیت رکھتا ہے؟“

”نہیں کیونکہ بادشاہ آپ کے محل کی تلاشی لینے کی

عبداللہ نے کہا، ”کمال الدین! میں اپنے محل جا رہا

تھالین تمہاری باتیں اتنی مزے دار ہیں کہ اب مجھے تمہارے ساتھ چوک تک چلنا پڑے گا۔“

کمال الدین نے جواب دیا۔ ”عزت افزائی، نوازش، عنایت، مہربانی، بندہ یروری۔“

عبداللہ کے دل و دماغ میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔

کسی وقت بھی ڈس سکتے تھے۔

دیکھا اور کہا۔ ”میں آپ کو کوئی مشورہ تو نہیں دے سکتا لیکن

ایک بات آپ کے علم میں ضرور لاؤں گا۔ اگر ہمارا بادشاہ، ماضی کے دوسرے بادشاہوں کی طرح رنگین مزاج اور

شوفین ہوتا تو یہ سازشی تاجر اس کنیز کو بادشاہ کی خدمت میں بطور رشوت پیش کر کے اپنی سزا معاف کروا لیتا لیکن افسوس

تو یہی ہے کہ ہمارا بادشاہ نہ تو شراب پیتا ہے اور نہ ہی عورتوں کا شوقین ہے اور ایسے کے دل میں جگہ بنانا آسان

کام نہیں ہوتا۔“

محسوس کیا کہ بادشاہ کے دل میں میری عزت نہیں رہی، میں

کمال الدین نے آہستہ سے کہا۔ ”چپ ہو جائیے، اس ملک کو چھوڑ دوں گا۔“

عبداللہ نے ایک موٹے تازے کالے کلوٹے کو تاحہ

قامت شخص کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ وہ تہ بند باندھے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں برہنہ لکڑی تھی۔ اس

حک میل بہت بڑا جہوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ ایک پیل

پوتے میں بہت بڑا بیوم اٹھا ہو چکا تھا۔ ایک بیوپس کے درخت کی جڑ کے پاس مسعود خاں کی ماؤف الدماغ کی

طرح ہذا، نجوم لوحیرت و عجب سے دیکھ رہا تھا۔ جلد اس کے

عبداللہ نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ ”تو اس وقت یہاں بالکل تنہا ہے؟“
 ”ہاں، یہاں میں بالکل تنہا ہوں۔ کیوں، کوئی خاص بات؟“

عبداللہ نے سراسیمہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر دروازے اندر سے بند کر لیے، بولا۔ ”میں اس وقت تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم انہیں بہت غور سے سنو اور اپنے فیصلے سے مطلع کرو۔“

خیزران نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ”ظاہر ہے کہ میں جن حالات میں آپ کے پاس آئی ہوں، ان میں سن ہی سکتی ہوں، بول نہیں سکتی۔“
 عبداللہ نے کہا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ تم بول بھی سکتی ہو لیکن اسی وقت جب تم میری تمام باتیں خوب اچھی طرح سن لو۔“

خیزران تن کر بیٹھ گئی۔ اس کے دونوں گھٹنے اٹھے ہوئے تھے اور دونوں پیروں کو اس نے اپنے ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ بڑے سنجیدگی سے عبداللہ کو دیکھ رہی تھی۔

عبداللہ نے کہنا شروع کیا۔ ”خیزران! آقا بغدادی تاجر بغاوت کی جس سازش میں ملوث تھا، اس کا سرغنہ شہزادہ مسعود خاں غفلت کھل گیا چکا ہے۔ اب بادشاہ کے آدمی تاجر کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ وہ بہت جلد یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

خیزران نے پوچھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“
 عبداللہ نے کہا۔ ”تو جانتی ہے کہ میں نے تاجر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ سے اس کی سفارش کر کے رہائی دلا دوں گا لیکن دربار میں پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ مجھے تاجر کی سفارش نہیں کرنی چاہیے۔ اب میں ایک ایسی مشکل میں پھنس گیا ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔“

”اپنی مشکل مجھے بتائیے، شاید میں اس کا حل نکال لوں۔“

عبداللہ کھٹکی باندھ کر خیزران کو دیکھتا رہا، بولا۔ ”کیا میں اپنے دل کی بات کہہ دوں؟“

”ضرور کہہ دیجیے، ڈر کم بات کا؟“

خیزران ہلکھلا کر ہنس دی، مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔ ”مجھ سے جو بھی ملتا ہے، اظہارِ عشق کرنے لگتا ہے۔ آپ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں۔ اب بتائیے میں کیا کروں؟“
 ”خیزران! میں کیا کہنا چاہتا ہوں، میں اپنا مطلب واضح نہیں کر پا رہا ہوں۔ کل رات تیرے آقا تاجر نے مجھ

سے کہا تھا کہ اگر میں اس کی سفارش کر کے رہائی دلانے میں کامیاب ہو گیا تو، تو میری ہوجائے گی اور اگر میں ناکام رہا تو تجھے اس کی وصیت کے مطابق بادشاہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

خیزران نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا، کیا آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے؟“
 ”نہیں کیونکہ میں نے اس کی سفارش ہی نہیں کی اور نہ اب کروں گا۔“

خیزران نے خوشی آمیز شوخ لہجے میں کہا۔ ”حب تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ میں خوش قسمتی سے بادشاہ کے محل میں پہنچ جاؤں گی اور یہی میری سب سے بڑی خواہش تھی۔“
 عبداللہ کا غصہ اور حسد سے برا حال ہو گیا، جل کے بولا۔ ”اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ بادشاہ کے محل میں تو عیش کرے گی تو یہ تیری خوش قسمتی ہی نہیں زندگی کی سب سے بڑی غلط فہمی بھی ہوگی۔“

خیزران کھڑی ہو گئی، عبداللہ کے سامنے تن کر سوال کیا۔ ”کیوں جناب! اسے آپ میری خوش قسمتی یا غلط فہمی کیوں سمجھ رہے ہیں؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اے تو اپنی خوش قسمتی سمجھ یا بد قسمتی کہ بادشاہ عیش نہیں ہے۔ وہ تجھے خود رکھنے کے بجائے کسی دوسرے امیر یا خدمت گار کے حوالے کر دے گا۔ اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ تو یہ جوانہ کھیل اور اس شخص کو قبول کر لے جس کی بادشاہ تک تعظیم بجالاتا ہے۔“

”اس شخص کا نام کیا ہے؟ کہاں رہتا ہے، کیا کرنا ہے؟“
 عبداللہ نے انکساری سے جواب دیا۔ ”وہ شخص تیرے سامنے کھڑا ہے، عبداللہ..... جو تجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز کرے گا۔“

خیزران نے عبداللہ کو سر سے پیر تک دیکھا، بولی۔ ”چہ خوب، آپ یہ بھول رہے ہیں کہ میں اپنی مرضی کی مالک نہیں ہوں۔ میں اپنی مرضی سے نہ تو کسی کو پسند کر سکتی ہوں اور نہ قبول کر سکتی ہوں۔ میں جس شخص کی ملکیت ہوں، وہی اس قسم کا کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”تو جو کچھ بھی کہہ رہی ہے، درست ہے لیکن تو یہ بھی تو سوچ کہ تو جانور نہیں ہے، انسان ہے۔ تیری اپنی مرضی بھی تو کوئی چیز ہے۔“

خیزران نے کہا۔ ”میں انسان ہوں اس لیے اخلاقی ضابطوں کی پابند ہوں۔“
 عبداللہ نے کہا۔ ”خیزران! میں تجھے یقین دلاتا ہوں

آئیے، کہاں تک مسہری کے نیچے چھپے رہیے گا۔“
اس آواز پر مسہری کے نیچے سے اچانک بغدادی تاجر
نمودار ہو گیا۔ عبداللہ اسے دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ خیزران کو
ڈانٹنے لگا۔

”خیزران! یہ کیا مذاق کیا ہے تو نے؟“
خیزران نے جواب دیا۔ ”میں نے کوئی مذاق نہیں
کیا۔ آپ کے آنے سے ذرا پہلے ہم دونوں کو یہ معلوم ہوا تھا
کہ ہماری تلاش و جستجو میں خاکروب چھوٹ چکے ہیں جو گھر
گھر جا کر یہ معلوم کرتے رہتے ہیں کہ کس کے ہاں کون سا نیا
آدمی آیا ہے اور وہ نیا آدمی کہاں سے آیا ہے، اس کی عمار اور
حلیہ کیا ہے۔ ہم دونوں نے اس خطرناک صورت حال کا اس
طرح مقابلہ کیا کہ انہیں اپنی مسہری کے نیچے چھپا دیا۔“
عبداللہ نے کہا۔ ”پھر بھی تیری نیت کچھ اور بھی ورنہ تو
مجھے اس کی مسہری کے نیچے موجودگی کے بارے میں ضرور
بتا دیتی۔ خیر، اگر ہم لوگ مذاق ہی کی کیفیت میں ہیں تو
ایک چھوٹا سا مذاق میں بھی کرگزدوں تو تم دونوں کو کوئی
اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

خیزران نے پوچھا۔ ”کیسا مذاق؟“
عبداللہ نے جواب دیا۔ ”قاضی کمال الدین کو شبہ
ہے کہ تم دونوں نے میرے محل میں منہ نہالی ہے۔ میں ازراہ
مذاق اس سے جا کر کہتا ہوں کہ ابھی ابھی جب میں اپنے محل
میں داخل ہوا تو میں نے بغدادی تاجر اور خیزران کو اپنے محل
میں روپوش دیکھا۔“

تاجر لرز گیا، سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”خدا کے لیے
ایسا نہ کیجیے، میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔“
اسی وقت ایک غلام بھاگا ہوا آیا، باہر ہی سے مطلع
کیا۔ ”حضور والا! قاضی کمال الدین تشریف لائے ہیں اور
وہ آپ سے فوراً ہی ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“
عبداللہ کے علاوہ دونوں ہی کے چہرے فق ہو گئے۔
تاجر نے قمرش آواز میں کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟ میں گرفتار کر لیا
جاؤں گا؟“

عبداللہ نے تاجر کو کوئی جواب نہ دیا۔ غلام سے
پوچھا۔ ”قاضی کمال الدین تنہا آیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی
اور بھی ہے؟“

غلام نے جواب دیا۔ ”قاضی کے ساتھ چار سپاہی
بھی ہیں۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”انہیں باہر فریکس میں بٹھا، میں آتا ہوں۔“
تاجر اور خیزران نے محسوس کیا کہ عبداللہ ذرا بھی

کہ تجھے عیش کروادوں گا، تیری خاطر اس دنیا کو جنت
بنادوں گا۔“

خیزران پھر ہنسنے لگی، بولی۔ ”کیا آپ مجھے صاف
صاف بات کرنے کی اجازت دیتے ہیں؟“

”ہاں، ہاں تو آزاد ہے، صاف صاف بات کر سکتی ہے۔“
خیزران نے جواب دیا۔ ”جناب! اگر آپ میرے
دل کی بات پوچھیں تو میں یہی کہوں گی کہ میں آپ سے ڈرئی
ہوں، کبھی نہیں ہوں، خوف زدہ ہو گئی ہوں۔“

”ڈرنے، ہنسنے یا خوف زدہ ہونے کا سبب؟“
”آپ ٹھہرے ایک شخص، بخیل انسان، میں فضول
خرج، بے جا اسراف کی عادی پھر ہم دونوں کس طرح سبکا
رہیں گے؟ کس طرح ایک ساتھ رہ سکیں گے؟“

عبداللہ، خیزران کے اس حملے سے چلکا گیا، گھبرا کر
بولا۔ ”میں تجھے فضول خرچیوں کی اجازت دے دوں گا۔
تیرے بے جا اسراف پر میری طرف سے کوئی پابندی نہیں
ہوگی۔“

خیزران نے کہا۔ ”میں کس طرح یقین کر لوں کہ کسی
انسان کی فطرت بھی بدل سکتی ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں مانتا ہوں کہ انسان کی
فطرت نہیں بدلی جاسکتی لیکن انسان قدر و اختیار کا پتلا ہے۔
یہ اپنے آپ کو وقت، حالات اور ماحول کے مطابق بدل بھی
لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے سارے مذاہب تا کام
ہو جاتے۔“

خیزران نے فرط جوش میں عبداللہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔
اسے اپنے رخسار پر رکھ کر دبا دیا۔ ”آپ بڑے ذہین
انسان ہیں۔ میں مان گئی کہ آپ کا تعلق خلفائے بنوعباس کی
نسل سے ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ میں اپنے آقا تاجر کو کس
طرح رخصت مند کروں؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”تو یہ مجھ پر چھوڑ دے۔
میں خود کوئی حل نکال لوں گا اس کا۔“

خیزران نے بے اختیار ہنسا شروع کر دیا۔ ہنسنے ہنسنے
دہری ہو گئی۔ عبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کبھی کس
بات کی؟“

خیزران نے ہنسنے ہوئے جواب دیا۔ ”میں سوچ رہی ہوں
کہ اگر ہماری باتیں تاجر نے دل میں کیا سوچے؟“

عبداللہ نے کہا۔ ”وہ کیا سوچے گا..... پرانگندہ اور
پریشان ذہن سوچ بھی کیا سکتا ہے۔“

خیزران نے تالی بجائی، بولی۔ ”اب آپ نکل

پریشان نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر زبردست طمانیت پائی جاتی تھی۔

خیزران نے تشویش سے پوچھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“
عبداللہ نے شریر مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”اب کیا ہوگا، کوئی نہیں جانتا..... نہ میں، نہ تم، نہ تمہارا مالک تاجر۔ بس خدا ہی جانتا ہے کہ اب کیا ہوگا لیکن اب جو کچھ بھی ہوگا، اس سے میں بالکل پریشان نہیں ہوں اور تم دونوں نے خود بھی میرے چہرے پر طمانیت محسوس کر لی ہوگی۔“
تاجر گڑگڑا لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے بچا لیجیے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”تم دونوں اپنے کمرے کو اندر سے بند کرلو، میں قاضی کمال الدین سے بات کر کے واپس آتا ہوں۔“
بقیہ باتیں پھر ہو جائیں گی۔ میری عدم موجودگی میں کوئی کتنی ہی کوشش کرے، تم دروازہ مت کھولنا۔“

تاجر نے پریشان لہجے میں کہا۔ ”اگر شاہی سپاہی ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آجائیں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”کس میں اتنی ہمت ہے کہ میرے محل کی تلاشی لے۔ خود بادشاہ تک اتنی ہمت نہیں کر سکتا۔“

عبداللہ کے جاتے ہی ان دونوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ قاضی کمال الدین، عبداللہ کو آتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ عبداللہ ایک شان بے نیازی سے بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”کیسے کیسے آتا ہوا؟“

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ اگر کسی وقت بغدادی تاجر آپ کے پاس آجائے تو آپ اسے ازراہ مہربانی میرے حوالے کر دیجیے گا۔“
عبداللہ نے کسی قدر برہمی سے جواب دیا۔ ”قاضی کمال الدین! میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ بغدادی تاجر میرے پاس پناہ لینے آئے گا؟“

قاضی کمال الدین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے آپ کے محل کے بھنگی سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ وہ بغدادی تاجر اور اس کی کنیز خیزران آپ کے محل کے آس پاس دیکھے گئے ہیں۔“

عبداللہ نے ہر روتی سے سوال کیا۔ ”آپ کو یہی کچھ کہنا تھا یا ابھی کچھ اور کہنا باقی رہ گیا ہے؟“
قاضی نے جواب دیا۔ ”اگر میری کسی بات سے آپ

کو دکھ پہنچا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔“
عبداللہ غصے میں کھڑا ہو گیا، نہایت بد اخلاقی سے کہا۔ ”اب آپ جا سکتے ہیں اور خیزدار جو پھر کبھی کسی ایسے ویسے کام سے میرے گھر آئے، کل میں بادشاہ سے بھی اس کی شکایت کروں گا۔“

قاضی کمال الدین اپنے آدمیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”میں آپ کو اپنا آقا قرار دیکھتا ہوں۔ بخدا میں یہاں کسی بری نیت سے نہیں آیا تھا۔ آپ بادشاہ سے میری شکایت کر کے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لیں گے، میں سمجھوں گا اپنے آقا زادے پر قربان ہو گیا۔“

قاضی کمال الدین اپنے چاروں آدمیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ ابھی وہ زیادہ نہیں دور پہنچا تھا کہ عبداللہ کا ایک غلام دوڑتا ہوا قاضی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”حضور والا! میرے ولی نعت فرما رہے ہیں کہ آپ اپنی ایک چیز وہیں چھوڑ آئے ہیں، اسے تو لے لیجیے چل کر۔“

قاضی نے اپنے حافظے پر زور دیا کہ وہ وہاں کیا بھول آیا ہے لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”تم یہیں رکو، میں ابھی آتا ہوں۔“

قاضی جب دوبارہ عبداللہ کے سامنے پہنچا تو وہ قاضی کو دیکھ کر مسکرائے لگا۔ قاضی نے اپنی جائے نشست پر بھولی ہوئی شے تلاش کی لیکن کوئی چیز نظر نہ آئی۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”قاضی کمال الدین! آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟“
قاضی نے اجنبی انداز میں کہا۔ ”میں اپنی جو چیز غلطی سے یہاں چھوڑ گیا تھا اسے لینے آیا ہوں۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”تمہاری چیز یہاں نہیں ہے اندر ہے۔ میرے ساتھ چلیے اور اسے لے کر واپس چلے جائیے۔“

عبداللہ، قاضی کمال الدین کو لے کر خیزران اور تاجر کے کمرے کے در پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے قاضی کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ یہاں بالکل خاموش کھڑا رہے، کسی بات پر بولے بالکل نہیں۔ پھر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے بعد پھر دستک دی، اندر بدستور خاموشی تھی۔ تیسری بار دستک دی اور کہا۔

”خیزران! یہ میں ہوں عبداللہ..... دروازہ کھولو۔“
فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ان دونوں نے اپنے سامنے قاضی کمال الدین کو دیکھ کر بڑی پریشانی محسوس کی۔
عبداللہ نے پہلے بغدادی تاجر کی طرف اشارہ کیا، کہا۔ ”یہ وہ شخص جو شہزادہ مسعود خاں کی سازش میں

کارکردگی اور وفاداری کی عزت حاصل کر سکتے ہیں۔“
تاجر گڑگڑانے لگا۔ ”عبداللہ! آپ مجھے اپنے
ہاتھ سے قتل کر دیں لیکن قاضی کمال الدین یا بادشاہ کے
حوالے نہ کیجیے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”یہ اس مذاق کا جواب ہے
جو تم دونوں نے مجھ سے کیا تھا۔“

قاضی کمال الدین نے عبداللہ کو علیحدہ لے جا کر
سمجھایا۔ ”آپ کے لیے یہ بالکل آسان ہے کہ اس تاجر کو
اپنے غل میں قید کر کے بادشاہ کو مطلع کر دیں۔ اس طرح
بادشاہ کی نظر میں آپ کی عزت اور وقعت کئی گنا زیادہ بڑھ
جائے گی۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”خدا نے مجھے پہلے ہی بڑی
عزت دے رکھی ہے۔ اس موقع سے آپ فائدہ اٹھائیں۔“

قاضی کمال الدین کچھ سوچنے لگا۔ عبداللہ کی تیز اور
معاملہ فہم نظریں اس کے چہرے پر گڑگڑائیں۔ کچھ دیر بعد
قاضی نے کہا۔ ”میں ایک شرط پر اس تاجر کو بادشاہ کے
حوالے کرنے کی ہمت کر سکتا ہوں۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”کس شرط پر؟“
قاضی نے جواب دیا۔ ”اگر آپ مجھ سے یہ وعدہ

شریک تھا۔“ پھر خیزران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا۔ ”اور یہ ہے اس تاجر کی حسین ترین کینیز خیزران۔“
قاضی کمال الدین نے متعجب لہجے میں دریافت
کیا۔ ”یہ دونوں آپ کے پاس کس طرح آئے؟“

عبداللہ نے کہا۔ ”قاضی کمال الدین! میں اپنے اس
تلخ لب ولیچہ پر شرمندہ ہوں۔ آپ کے ان چاروں
آدمیوں کے روبرو، میں ان دونوں کو آپ کے سامنے کیونکر
لا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے جو کچھ بھی کہا تھا، وہ ایک قسم کی
اداکاری تھی۔“

قاضی کمال الدین پریشان تھا کہ وہ ان باتوں کا
کیا جواب دے۔ عبداللہ نے کہا۔ ”دل نہ چاہنے کے
باوجود میں ان دونوں کو آپ کے حوالے کر دینا اپنا فرض
سمجھتا ہوں۔“

عبداللہ نے خیزران اور اس کے مالک بغدادی تاجر
کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر خوف اور دہشت
سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”اگر
آپ مناسب سمجھیں تو ان دونوں کو پھینک دیں کیونکہ
میں ان دونوں کو اس گھر سے اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔“
”آپ اس تاجر کو بادشاہ کے روبرو پیش کر کے اعلیٰ

ماہ اکتوبر کی بدلتی رتیں
تازہ شمارے کی نزاکتیں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

اولین صفحات ● ایک معصوم بچے کی زندگی کو لاحق خطرات مغرب پرستوں
کی ترقی کے ثمرات امجد رئیس کے قلم کی جادوگری

آوارہ گرد ● دکھ کھکے شہر کے تھیں ایک زلی اور انوکھی دنیا کی جھلک ... ہر ایک
کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹشی کی شمولیت

جواری ● احمد اقبال کے شہرِ قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نئے انداز

مغرب کے نالیے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیبی ماحول کی عکاسی اور محبت کی پھر وہ ناقابلِ فراموش کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● محبت کی ترقی کی نوکری کی قصہ گوئی کو مایوس لہجے ہے کیلیسیا کی محبت کی خوفناکی

دوسری کہانی ● سکرلو کی ایوان میں گھومنے والی گھومنے والی کا خوفناک کھیل سرورق کا لکھا رنگ



جینی
کتنی
جینی

آپ کے تہرے...
مٹوئے محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہانیاں

کہ خیزران کو اپنی امانت کے طور پر میرے ہی پاس رہنے دیجئے۔ جب اس تاجر کا معاملہ رفع دفع ہو جائے اور آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ مسئلہ ختم ہو گیا، آپ خیزران کو مجھ سے لے بیجے گا۔ ورنہ یہ یاد رہے کہ خیزران آپ کے گھر پہنچنی اور گھر کے کسی نہ کسی فرد نے حسد میں کسی نہ کسی طرح بادشاہ کو اس کی خبر پہنچادی تو پھر اس کا جو نتیجہ نکلے گا، اس سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔“

تاجر نے مداحلت کی، بولا۔ ”عبداللہ! میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اپنی خیزران کے لیے آپ کو یا بادشاہ کو منتخب کیا تھا لیکن آپ اس کا قاضی سے معاملہ کر رہے ہیں جبکہ اخلاقاً قانوناً یا اصولاً آپ کو اس کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ خیزران میری ملکیت ہے، جب تک میں زندہ ہوں میں ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔“

قاضی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اب تو ہے کہاں؟ پہلے تو، تو اپنا وجود ثابت کر۔ تو، تو شاہی آدمیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہو چکا۔ تیرے بعد خیزران کس کے حصے میں جائے گی، اس کا میں، عبداللہ سے بات چیت کر کے ابھی فیصلہ کر لوں گا۔“

تاجر اپنی جگہ سے اچھلا اور خیزران کا گلا دبوچ لیا، بولا۔ ”میں اس کا کام تمام ہی کیوں نہ کروں۔“

عبداللہ نے جست لگا لی اور تاجر کی پشت سے اس کی دونوں بغلوں میں اپنے ہاتھ ڈال دیے۔ عبداللہ کے دونوں ہاتھ تاجر کی بغلوں سے گزر کر شانوں سے ہوتے ہوئے گدی پر پہنچ کر مل گئے پھر اس نے پوری طاقت سے تاجر کی گردن جھکا دی اور تاجر کے دونوں ہاتھ باؤ بڑھنے کی وجہ سے پھیلنے چلے گئے جس سے خیزران کی گردن چھوٹ گئی۔ خیزران آزاد ہوئی ہی کرے میں بھاگ گئی اور اسے اندر سے بند کر لیا۔

اس دھیکامشتی میں عبداللہ کے غلام اور خدمت گار وہاں پہنچ گئے اور اس عجیب و غریب تماشے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ تاجر نے اپنے آس پاس محل کے خدمت گاروں کو جو دیکھا تو چیخا شروع کر دیا۔

”محل کے خدمت گارو! غلامو! میں بادشاہ کا باغی بغدادی تاجر ہوں۔ بادشاہ کو میری تلاش ہے۔ عبداللہ نے مجھے پناہ دی ہے مگر اس پناہ دینے کے عوض چاہتا ہے کہ میری خیزران کو.....“

عبداللہ نے بات پوری نہ ہونے دی اور اس کی گردن کو اتنے زور سے مروڑا کہ تاجر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

کر لیں کہ اس معاملے میں آپ اپنی زبان بند رکھیں گے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“

قاضی نے کہا۔ ”میرا مطلب واضح ہے۔ میں صرف تاجر کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ خیزران کو اپنے پاس رکھ لوں گا کیونکہ تاجر کے ساتھ خیزران کو بھی بادشاہ کے روبرو پیش کر دینے کا جو نتیجہ نکلے گا، وہ میں جانتا ہوں۔“

عبداللہ نے پوچھا۔ ”کیا نتیجہ نکلے گا، ذرا میں بھی تو سنوں؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”آپ خوب جانتے ہیں کہ بادشاہ دوسرے بادشاہوں کی طرح عیاش نہیں ہے۔ وہ خیزران کو خود تو رکھے گا نہیں، کسی نہ کسی امیر کے حوالے کر دے گا اور میں نہیں چاہتا کہ یہ پھول سا چہرہ اور حوروں جیسی معصوم شکل و صورت کی لڑکی کسی ایسے ویسے امیر کے حوالے کر دی جائے۔ اس کی صحیح قدردانی میں خود کر سکتا ہوں۔“

عبداللہ نے نشوونما تک لیجے میں کہا۔ ”لیکن بادشاہ کو تو خیزران کا علم ہو ہی جائے گا۔“

”ایسی صورت میں کہ اس سلسلے میں آپ خود بتادیں۔“

”میں بتاؤں یا نہ بتاؤں، تاجر اپنے بیان میں خیزران کا ذکر خود کرے گا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”تاجر کی زبان بندی کا میرے پاس علاج ہے۔“

”کیسا علاج، ذرا مجھے بھی معلوم ہو؟“

قاضی نے نہایت راز داری سے کہا۔ ”اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس کی زبان نکوا دوں اور دوسری یہ کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش ہی نہ کروں، خود ہی گل کروا دوں۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”زبان کنوائے کا عذر کیا پیش کیجیے گا؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”یہ کہ تاجر بادشاہ کو بری طرح گالیاں دے رہا تھا۔“

”اور قتل کا کیا جواز پیش کیجیے گا؟“

”یہ کہ تاجر گرفتاری سے پہلے سخت مزاحمت کر رہا تھا، مقابلے میں مارا گیا۔“

ان دونوں کی سرکوشیوں میں گفتگو جاری تھی کہ خیزران اور تاجر دونوں ہی ان کے پاس پہنچ گئے۔

عبداللہ نے قاضی سے کہا۔ ”تب پھر آپ ایسا کیجیے

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اس وقت وہ بہت ڈری سہی ہوئی ہے۔ اس نے کمرے کو اندر سے بند کر لیا ہے اور کچھ پتا نہیں کہ میرے کہنے سے کھولتی بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال میں کہہ کر دیکھتا ہوں۔“

عبداللہ نے بندھے ہوئے تاجر کو اپنے کمرے میں ہی پڑا رہنے دیا اور خود کمال الدین کو لے کر خیزران کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور دروازے کو تھپتھا کے آواز دی۔ ”خیزران! دروازہ کھول۔ تیرا آقا تاجر میرے کمرے میں بندھا پڑا ہے اور اب اس میں اتنا دم بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھول کر اپنے ماحول ہی کو دیکھ سکے۔“

خیزران نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی مغوم اور سرخ آنکھیں اس کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ قاضی کمال الدین نے لچائی ہوئی نظروں سے خیزران کی طرف دیکھا اور خوشامداندہ انداز میں پوچھا۔ ”تھیں زیادہ تکلیف تو نہیں پہنچی؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے۔ پہلے یہ تاجر میری محبت کا دم بھرا کرتا تھا پھر جب اس پر دقت پڑا اور اسے یقین ہو گیا کہ بادشاہ کے خلاف سازش کے جرم میں وہ معاف نہیں کیا جائے گا تو اس نے اپنے بچاؤ کی یہ تدبیر نکالی کہ مجھے رشوت کے طور پر اس شخص عبداللہ کے حوالے کر دینا چاہا اور پھر ابھی کچھ ڈرا دیر پہلے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ نہیں بچ سکے گا تو اس نے حسد میں مجھے ہلاک کر دینا چاہا یعنی مجھے..... جس سے وہ بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔“

قاضی کمال الدین نے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔ ”خیزران! اب تو بے فکر ہو جا، مطمئن رہ، اب تو جس شخص کے پاس رہے گی، وہ تجھے نہایت عزت و احترام اور محبت سے رکھے گا۔“

عبداللہ نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”خیزران! اب تو اندر سے دروازہ بند کر لے۔ ہم دونوں چلتے ہیں۔“

قاضی کمال الدین خیزران سے مزید باتیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اب وہ خیزران کی صورت ہی نہیں دیکھنا چاہتا تھا بلکہ اس کی لطف مزتم آواز بھی سننا چاہتا تھا، بولا۔ ”جناب! اب اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ خیزران کو اس وقت دلاسون کی ضرورت ہے۔ اگر ہم دونوں یہاں کچھ دیر اور بیٹھ جائیں تو کیسا رہے گا؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اب اس کی کوئی

قاضی کمال نے مشورہ دیا۔ ”اب اس کا مزید زندہ رہنا خطرناک ہے۔“

عبداللہ نے اپنے غلاموں کو حکم دیا۔ ”یہ باغی ہے، اس کی اتنی پٹائی کرو کہ اس کا کام تمام ہو جائے۔“ غلاموں نے تاجر کی پٹائی شروع کر دی۔ مکوں اور لاتوں کی یورش نے تاجر کو بے دم کر دیا۔ اس کی سانس اکھڑ گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ عبداللہ نے اسے رسیوں سے بندھوا دیا پھر اسے اپنے کمرے میں اٹھوا لے گیا اور غلاموں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ جب تجلیہ ہو گیا تو قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”جناب! اب اس کا زندہ رہنا بہت خطرناک ہے۔ میری تاجیز رائے میں اب اس کا ہلاک کیا جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ رات کے اندھیرے میں آپ اپنے آدمیوں کے ساتھ میرے محل کے سامنے تشریف لائیں۔ میں اس بندھے ہوئے تاجر کو اپنے محل کے صدر دروازے کے سامنے پٹیل کے درخت کے نیچے پھنکوا دوں گا۔ آپ اپنے آدمیوں کی مدد سے اس کا کام تمام کر کے اس کی لاش بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیجیے گا اور یہی یاد رکھائیے گا کہ باغی تاجر مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔“

قاضی نے تشویش سے پوچھا۔ ”اور خیزران..... اس کا کیا ہوگا؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”سردست وہ اسی محل میں رہے گی، بعد میں اسے آپ لے جائیں گے۔“

قاضی کو عبداللہ کا فیصلہ ماننے میں تامل تھا، متذبذب لہجے میں بولا۔ ”کیا میں یہ یقین کر لوں کہ اس معاملے میں جو کچھ طے پایا ہے، اس پر ہم دونوں اسی دیانت داری سے عمل بھی کریں گے؟“

عبداللہ نے کہا۔ ”آپ کا تو مجھے کوئی علم نہیں کہ آپ اپنے قول پر پورا بھی اتریں گے یا نہیں لیکن میں خود اپنے لیے بد بھدی سخت تاپند کرتا ہوں۔ خیزران آپ کی امانت ہے، جب چاہیں لے جائیں۔“

قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”مجھے آپ پر اعتبار ہے۔ اب ایک کرم اور کیجیے۔“

”ارشاد فرمائیے۔“

”میں خیزران کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔ ظالم نے غضب کی شکل و صورت پائی ہے۔“

پہنچا۔ وہاں بغدادی تاجرزخوں سے چور پڑا کر رہا تھا۔ قاضی نے اسے گرفتار کر لیا۔ تاجر جاں بے لب تھا۔ اس کا راستے میں ہی انتقال ہو گیا۔ دوسرے دن صبح قاضی کمال الدین نے شاہی محل دارسرا میں حاضری دی۔ ایک طرف سے قاضی کمال الدین لاش کے ساتھ دارسرا کے دروازے پر پہنچا، دوسری طرف سے عبداللہ پہنچ گیا۔

محل کے دروازے پر پہرے دار سپاہیوں کا پُرانہایت چاق و چوند اور مستعد اپنے فرائض انجام دے رہا تھا اور ایک طرف دروازے کے برابر نقارے بجانے والے بیٹھے تھے۔ دروازے کے سامنے ایک چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر کئی جلاد بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ لکڑی کے تھیلے تھے۔

نقاروں کے ذریعے محل کے اندر والوں کو مطلع کیا کہ قاضی کمال الدین اور عبداللہ پہلے دروازے پر آچکے ہیں۔ یہ لوگ یہاں سے گزر کر دوسرے دروازے پر پہنچے، وہاں بھی یہ عمل دہرایا گیا۔ تیسرے دروازے پر مستعد یوں نے ان کے نام لکھے اور اندر جانے کی اجازت دے دی۔

اندر بادشاہ بہت برہم بیٹھا تھا۔ وہ عبداللہ کو دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا اور عبداللہ کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ قاضی کمال الدین نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ بغدادی تاجر کی لاش دارسرا کے پہلے دروازے پر رکھی ہے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”یہ کس طرح ہلاک ہوا؟“ قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔“

بادشاہ نے بے یقینی سے کہا۔ ”ہوں، کیا توجہ بول رہا ہے؟“ قاضی کی جان نکل گئی، بولا۔ ”جی حضور والا! کس میں اتنی ہمت ہے کہ حضور کے سامنے دروغ بیانی کرے؟“

اس وقت بادشاہ کے سامنے چند دوسرے مقدمات بھی پیش تھے۔ بادشاہ کے سامنے دوسندھی مولوی بھی موجود تھے۔ ان مولویوں کے قریب ایک ترکی امیر کھڑا تھا۔ بادشاہ نے ترکی امیر سے کہا۔ ”تو گجرات کی حکومت سنبھال لے۔“ اور دونوں سندھی مولویوں سے کہا۔ ”اور تم دونوں اس امیر کے ساتھ جاؤ گے۔“

ایک سندھی مولوی نے پوچھا۔ ”ہم دونوں کے فرائض منصبی کیا ہوں گے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”گجرات کی رعیت تم دونوں کی ہوگی، تم دونوں جو کہو گے یہ امیر اس پر عمل کرے گا۔“ دونوں مولویوں نے بیک آواز کہا۔ ”یعنی ہم دونوں

ضرورت نہیں۔ اگر خیزران کو مزید تسلی دلا سوں کی ضرورت بھی محسوس ہوئی تو اس کے لیے میں جو یہاں موجود ہوں۔“ قاضی کمال الدین بہ مشکل وہاں سے ہٹا اور جاتے جاتے کہتا گیا۔ ”جناب! اپنے عہد کا خیال رکھیے گا۔“

قاضی کمال الدین چلا گیا تو عبداللہ خیزران کے پاس واپس گیا۔ اس نے خیزران سے پوچھا۔ ”اب توجہ بچتا کہ تو کس کے پاس رہنا پسند کرے گی؟ میرے پاس، سلطان تغلق کے پاس یا قاضی کمال الدین کے پاس؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”میں بادشاہ کے پاس تو اس لیے نہیں جاؤں گی کہ وہ عورتوں کا شوقین نہیں ہے اور قاضی کے پاس جانا اس لیے ناپسند کروں گی کہ اس سے میں واقف نہیں ہوں اور رہے آپ تو.....“

عبداللہ نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو میرے ساتھ رہنا پسند کرے گی؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات بھی نہیں۔ میں آپ کو اس لیے ناپسند کرتی ہوں کہ آپ بے حد کنجوس ہیں اور یہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں بہت زیادہ فضول خرچ ہوں۔ آپ مجھے برداشت نہیں کر سکیں گے۔“

عبداللہ نے جلدی سے کہا۔ ”تو اس کی فکر نہ کر۔ میں تیرے لیے شاہ خرچ بھی بن سکتا ہوں، تو مجھے موقع تو دے۔“ خیزران نے جواب دیا۔ ”میں سوچوں گی اور سوچے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گی۔“

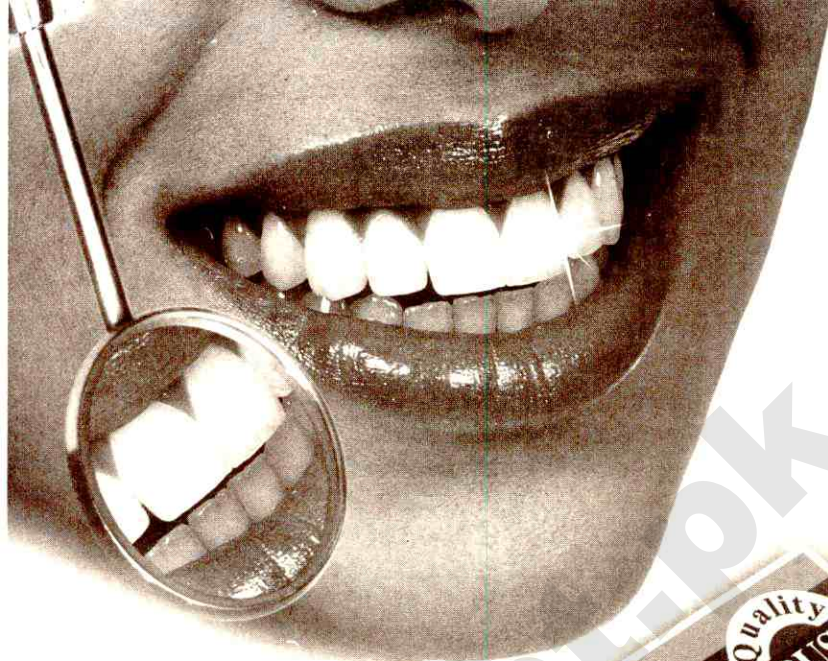
عبداللہ نے کہا۔ ”خیزران! میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میری بیوی تیری ہم شکل ہے اور تجھے دیکھ کر مجھے سکون ملتا ہے۔“

خیزران نے چڑ کر جواب دیا۔ ”آپ کی بیوی اگر واقعی میری ہی طرح ہے تو آپ اسے بالکیوں نہیں لیتے؟ اصل کے مقابلے میں نقل بیکار ہے۔ میں اپنے علاوہ کسی اور کے حسن کی تعریف سنا سخت ناپسند کرتی ہوں۔“

عبداللہ کھسکا گیا اور خیزران کو اس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

منصوبے پر اسی طرح عمل کیا گیا جس طرح عبداللہ کے ساتھ طے پایا تھا۔ قاضی کمال الدین نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ سازشی تاجر کا سراغ لگ چکا ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ ایک دن کے اندر ہی وہ زندہ یا مردہ حاضر کر دیا جائے گا۔ وہ منصوبے کے مطابق مغرب کے بعد چند معتبر آدمیوں کے ساتھ عبداللہ کے قصر کے سامنے پتھل کے درخت کے نیچے



دانت سفید چکاچک

اس امیر پر گواہ کی طرح مسلط رہیں گے اور جو بات دوست سمجھیں گے اسے بتا دیا کریں گے۔“

بادشاہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، پوچھا۔ ”تم دونوں نے کیا کہا، ذرا پھر سے دہرائو؟“

دونوں مولویوں نے بھر بیک آواز کہا۔ ”حضور والا! جس بات کو ہم درست سمجھیں گے، اسے بتا دیا کریں گے۔“

بادشاہ نے انہیں کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہیں دیا، بولا۔ ”مجھے تم دونوں کی نیت پر شبہ ہے۔ شاید تم دونوں نے اپنے دلوں میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لوگوں کا مال کھا کر اس پر دہی ترکی امیر پر اس کا الزام لگاؤ۔“

دونوں مولوی تھر تھر کانپنے لگے، بولے۔ ”اخواند عالم پناہ! بھلا ہماری یہ نیت نہیں ہے۔“

بادشاہ اور زیادہ جھنجھلا گیا، بولا۔ ”تم دونوں مجھے جھٹلاتے ہو؟“ پھر اپنے گرد و پیش موجود خدمت گاروں کو حکم دیا۔ ”ان دونوں کو اسی وقت شیخ زادہ نہادندی (جلاد) کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ بادشاہ کو جھٹلانے کے جرم میں عذاب کا مزہ چکھا دے۔“

خدمت گاروں نے اسی وقت ان دونوں مولویوں کو جکڑ لیا اور وہاں سے باہر بھیج لے گئے۔

اب بادشاہ قاضی سے مخاطب ہوا۔ ”قاضی کمال الدین! یہ کام تیرا نہیں تھا۔ تو نے ایک ایسا کام کیوں انجام دیا جو میرے کو تو ال کا تھا؟“

قاضی کمال الدین کی جان نکل گئی، سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”میں خود کو حضور والا کا ایک ادنیٰ غلام سمجھتا ہوں اس لیے بادشاہ کی ہر خدمت انجام دینے کی لگن رکھتا ہوں۔“

”قاضی کمال الدین! اپنی بکواس بند کر اور بغدادی تا جرم کی موت کی تفصیل میری زبان سے سننے کا موقع مت فراہم کر۔ میں ابن خلیفہ عبداللہ کا بے حد احترام کرتا ہوں اور انہی کے طفیل تجھے معاف کیا جا رہا ہے۔“ پھر عبداللہ سے کہا۔ ”اور خیر دان آپ ہی کے پاس رہے گی۔ یہ کیا قاضی ہے کہ ایک معمولی عورت پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔“

عبداللہ نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”مجھ پر بادشاہ کے یوں ہی کیا کم احسان ہیں کہ ہر روز ان میں چند نئے احسانوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔“

بادشاہ نے قاضی کمال الدین سے کہا۔ ”کل تیری عدالت میں میرے خلاف ایک مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔ خبردار جو تو نے اس سلسلے میں میرا احترام کیا۔ میں ایک

عام مدعا علیہ کی حیثیت سے تیری عدالت میں حاضری دوں گا اور تجھے یہ امید رکھوں گا کہ تو میرے مرتبے اور حکومت کی پروا کیے بغیر اس مقدمے کا فیصلہ کرے گا۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو اپنے فریضے سے غفلت اختیار کرنے کے جرم میں سزاوارا۔۔۔ بھڑے گا۔“

قاضی نے اب سے دریافت کیا۔ ”میں حضور والا کے احکام کی بجا آوری کے لیے ہر وقت حاضر اور آمادہ ہوں۔“

بادشاہ نے مزید حکم دیا۔ ”ابھی ابھی جب تو یہاں سے باہر جاے گا تو شیخ زادہ نہادندی (جلاد) سے ضرور مل لینا کیونکہ وہ دونوں مولویوں کو ذاتی میں دے رہا ہوگا۔ تم ان دونوں کو سمجھا دینا کہ اقرار جرم میں فائدہ ہے ہی فائدہ نہیں اور انکار میں نقصان۔“

جب قاضی کمال الدین آداب بجالا کے باہر چلا گیا تو بادشاہ نے عبداللہ سے کہا۔ ”مجھے آپ کی یہ بات بہت پسند آئی کہ بغدادی تاجر کو گرفتار آپ نے کیا اور بعد میں اسے ہلاک بھی آپ ہی نے کیا اور اس کا مینیائی کا سہرا قاضی کمال الدین کے سر باندھ دیا۔ بڑی فراخ دلائی بات ہے۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا اور اسی خوشی میں قاضی کو معاف بھی کر دیا۔“

عبداللہ نے عاجزی سے گردن جھکا لی، بولا۔ ”یہ بادشاہ کی بندہ نوازی اور خدمت شناسی ہے ورنہ میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”آقا زادے! میں آپ سے درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ شیخ زادہ نہادندی (جلاد) کے پاس سے ہوتے ہوئے جائے گا۔ میں ان بے ایمان مولویوں سے بہت ناخوش ہوں۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”بہت بہتر۔“

جب عبداللہ محل کے باہر آ گیا تو اس کے پہلے دروازے کے سامنے چوتھے پر اس نے نہادندی جلاد کو دونوں مولویوں پر جرح کرتے دیکھا۔ ان کے پاس ہی قاضی کمال الدین گھڑا تھا۔

نہادندی جلاد دونوں کو سمجھانے لگا۔ ”تم دونوں احق ہو۔ کیا تم نے ابھی تک یہ نہیں محسوس کیا کہ بادشاہ تم دونوں کی جان لینا چاہتا ہے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم دونوں اپنے جرم کا اقرار کر لو اور بادشاہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اپنی زبان سے کہہ ڈالو۔“

دونوں نے یکے بعد دیگرے جواب دیا۔ ”ہماری نیت وہی تھی جو بادشاہ سے عرض کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہم جو

ہے تو بڑے شوق سے انتظار کر، ورنہ میرے خیال میں اب یہ انتظار فضول ہے۔ بادشاہ کے مزاج سے تو، تو واقف ہی ہے۔“

قاضی نے کہا: ”بہر حال میں وقت کا انتظار کروں گا۔ آپ بھی انتظار کریں۔“

خل میں خیزران اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بڑی بے چینی سے دریافت کیا۔ ”میرا آقا کہاں ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”خیزران! خوش ہو جا کہ تیرا اس سے پیچھا چھوٹ گیا۔“

اس کے بعد پوری روداد سنادی۔ خیزران رونے لگی۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”آخر تو رویوں رہی ہے؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”میں اس کی غریب الوطنی کی موت پر آنسو بہا رہی ہوں۔ اس کے علاوہ بڑا فراخ دل اور حوصلہ مند شخص تھا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”خیزران! فراخ دل اور حوصلہ مند تو میں بھی ہوں لیکن ہاں فضول خرچی سے بڑی نفرت کرتا ہوں۔“

خیزران نے جواب دیا۔ ”اور یہ میری بد قسمتی ہی ہے کہ میں نے ہیرا گنوار پتھر حاصل کر لیا۔“

عبداللہ نے چڑکھا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہی ہے نا شکری عورت؟ کیا تو ابھی تک میرے آباؤ اجداد کو نہیں جانتی؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”میں عباسی خلفا سے خوب اچھی طرح واقف ہوں لیکن کیا یہ مناسب نہیں رہے گا کہ آپ آئندہ اپنے عظیم المرتبت بزرگوں کا ذکر نہ کریں۔“

”کیوں..... آخر کیوں؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ ان کی جو عزت بن چکی ہے، اسے قائم رہنا چاہیے۔ اگر آپ ان حالات میں فخریہ کسی اور کے پاس جا کر یہ نہیں کہ آپ کے آباؤ اجداد عالم اسلام میں حکمرانی کے فرائض انجام دے چکے ہیں تو وہ کیا نہیں گے؟“

عبداللہ نے چڑکھا۔ ”اچھا، اب یہ فیصلہ باتیں تو کرنیں، میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تجھے کسی اور کے حوالے ہرگز نہ کروں گا۔“

خیزران نے کہا۔ ”اچھا پھر یہ بھی سن لیجیے کہ میں بخل اور خست کو سخت ناپسند کرتی ہوں۔“

عبداللہ اس کے پاس ہی جا بیٹھا۔ اس نے خیزران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ ”تیرا ہاتھ بھی میری بیوی زہیدہ ہی کی طرح ہے بالکل اسی کی طرح..... شاید تو میری

کچھ بھی کہیں گے، وہ جھوٹ ہوگا۔“

نہاوندی جلاد نے کہا۔ ”انفوس کہ تم دونوں خود ہی یہ چاہتے ہو کہ میرے عذاب کا مزہ چکھو۔“ پھر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”ارے، ان دونوں کو میرے عذاب کا مزہ تو چکھانا۔“

نہاوندی جلاد کے چار ماتحت دونوں پر چھٹے اور انہیں چوتھے پر چت لٹا دیا۔ ذرا دیر بعد دو آدمی لال لال گرم انکارے کی طرح دھکی ہوئی دو ملیں لائے اور انہیں ان دونوں کے سینوں پر رکھ دیا۔ دونوں کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ ان کی دردناک چیخوں نے لوگوں کو لرزادیا۔ ذرا دیر بعد جب یہ سلیں ان کے سینوں سے ہٹائی گئیں تو ان کے ساتھ دونوں کے سینوں کی کھالیس تک اتر آئیں۔

اس کے بعد نہاوندی جلاد ہی کے حکم سے ان زخمی سینوں پر پیشاب اور راکھ ڈال دی گئی۔ دونوں بلبلانے۔ درد کی شدت سے ان پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ان دونوں نے بیخ زادہ نہاوندی کو مطلع کیا۔ ”ہم دونوں وہی بیان دینے کو تیار ہیں جو بادشاہ چاہتا ہے۔“

جلاد نے اسی وقت ان دونوں سے تحریریں لے لیں جن پر لکھا تھا۔ ”ہماری نیت وہی تھی جس کا بادشاہ نے اظہار کیا تھا اور ہم دونوں گناہ گار اور قتل کے مستحق ہیں۔ اگر ہم قتل کیے جائیں تو دین اور دنیا میں ہمیں کوئی دعویٰ نہ ہوگا۔“

نہاوندی جلاد نے اس تحریر پر ان دونوں کے دستخط لے لیے۔ اس کے بعد کہا۔ ”قاضی کمال الدین! آپ اس پر ذرا یہ تو لکھ دیجیے کہ یہ دونوں کسی جبر و اکراہ کے بغیر اپنے جرم کا اقرار کر رہے ہیں۔“

نہاوندی جلاد نے یہ تحریر اپنے قبضے میں کی اور دونوں کی گردنیں اسی وقت اڑا دیں۔

جب یہاں سے عبداللہ اور قاضی کمال الدین ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے تو قاضی نے کہا۔ ”آقا زادے! اب خیزران کا کیا رہے گا؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تو اسے تیری امانت ہی سمجھ کر رکھا تھا لیکن اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ کو یہ خبر ہوئی کہ خیزران تیرے حوالے کر دی گئی ہے تو تیری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔“

قاضی کے دل پر خیزران نے گہرا نقش چھوڑا تھا، بولا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن وقت کا انتظار تو کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کسی وقت بادشاہ ترنگ میں آکر مجھے اجازت دے دیں کہ میں خیزران کو اپنے پاس رکھ لوں۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اگر تو انتظار ہی پر آمادہ

بات کا یقین نہ کرے۔“

امیر زادے نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ نے کہا۔ ”امیر زادے! تو مدعی ہے میں مدعا علیہ، یہ عدالت کی کے ساتھ بھی رعایت نہ کرے گی۔ تو اپنا استغاثہ پیش کر۔“

امیر زادے نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ ”حضور والا! میں مدعا علیہ کے درباری امیر کا بیٹا ہوں۔ پچھلے ہفتے، مدعا علیہ نے بلا وجہ مجھ پر الزام لگایا کہ میں اس کے خد اوروں سے مل گیا ہوں۔ بس اسی دن سے میں گرفتار ہوں۔“

امیر زادے سے پوچھا گیا۔ ”تیرے اس الزام سے بادشاہ اگر انکار کر دے تو کیا تیرے پاس گواہ موجود ہیں جو تیرے استغاثے کی تائید میں گواہی دے دیں؟“

امیر زادے نے کہا۔ ”میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، درست ہے اور میں دو ایسے گواہ پیش نہیں کر سکوں گا جو عدالت میں حاضر ہو کر بادشاہ کے خلاف گواہی دیں۔ ہاں میرے پاس ایک گواہ ایسا موجود ہے جو میری طرف سے گواہی دے گا اور وہ کسی سے مرعوب ہونا تو گویا جانتا ہی نہیں۔“

قاضی نے کہا۔ ”اے حاضر کر۔“

امیر زادے نے بادشاہ کی طرف دیکھا، بولا۔ ”میرا گواہ بادشاہ خود ہے۔ عدالت بادشاہ سے کہے کہ یہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ بتائے کہ اس نے مجھے ایک بے بنیاد شبے پر قید کر کے لکڑی کی چھڑی سے پٹا کیوں؟“

قاضی کمال الدین نے بادشاہ سے پوچھا۔ ”کیا امیر زادے کا الزام درست ہے؟ مدعا علیہ محمد خلق خدا کو حاضر و ناظر جان کر کج سچ بتائے کہ امیر زادہ جھوٹا ہے یا سچا؟“

بادشاہ نے پشمرہ آواز میں جواب دیا۔ ”میری جیسی حیثیت کا آدمی جھوٹ بولنے کی ہمت تک نہیں کر سکتا۔ مجھے اقرار ہے کہ میں نے غلط فہمی میں اس امیر زادے کو قید کروا دیا تھا اور لکڑی کی چھڑی سے اس کی پٹائی کی تھی۔“

قاضی نے دریافت کیا۔ ”امیر زادے کو لکڑی کی چھڑی سے کہاں اور کن لوگوں کے سامنے پٹا لگایا تھا؟“

امیر زادے کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، بھراکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”بھروسے دربار میں، شرکائے دربار کے سامنے۔“

قاضی نے بادشاہ سے پوچھا۔ ”کیا مدعی درست کہتا ہے؟“

بادشاہ نے شرم سے سر جھکا دیا، بولا۔ ”ہاں، درست کہتا ہے۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”اور وہ چھڑی کہاں ہے جس سے امیر زادے کو پٹا لگایا تھا؟“

امیر زادے نے جواب دیا۔ ”وہ چھڑی نقیب النقباء

خیزران نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”میں یہ بات بالکل ناپسند کروں گی کہ آپ مجھے یا میرے کسی عضو کو اس لیے پسند کریں کہ ان میں آپ کی بیوی زبیدہ کی حیرت ناک مشابہت پائی جاتی ہے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ آپ مجھے میری وجہ سے، میرے حسن اور میری دلکشی کے پیش نظر پسند کریں۔“

خیزران! کمال ہے کہ زبیدہ باتیں بھی تیری ہی طرح کرتی تھی۔“

”پھر وہی، میں کہتی ہوں کہ اگر آپ نے اپنی باتیں اسی طرح جاری رکھیں تو میں کسی دن عاجز آ کر خودکشی کر لوں گی۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میری بیوی زبیدہ بھی اسی طرح خودکشی کی دھمکیاں دیا کرتی تھی۔“

خیزران نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ عبداللہ نے کہا۔ ”کمال ہے، کسی بات سے عاجز آ کر زبیدہ بھی اسی طرح اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتی تھی۔“

خیزران ہاتھ چھڑا کر ایک کمرے میں چل گئی اور اسے اندر سے بند کر لیا۔ باہر عبداللہ اپنی کہے جا رہا تھا۔

”زبیدہ بھی میری باتوں سے عاجز آ کر یوں ہی کمروں میں چھپ جاتا کرتی تھی۔“

☆☆☆

قاضی کمال الدین کی عدالت میں اتنا جھوم پہلے نہیں دیکھا گیا تھا۔ ایک طرف کسی امیر کا تیرہ چودہ سالہ لڑکا تیوری چڑھائے کھڑا تھا اور اس کے مقابل کٹہرے میں بادشاہ عام آدمی کی طرح عدالت اور اس امیر زادے کو دیکھنے میں ٹھوٹھا۔

عبداللہ اس منظر سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”جب تک یہ صورت حال اس ملک میں موجود رہے گی، سارے ملک میں انسانی فلاح و بہبود کے کام ہوتے رہیں گے، خدا مہربان رہے گا۔“

قاضی کمال الدین نے لڑکے سے پوچھا۔ ”اب بتا کہ تیرے استغاثے کی بنیاد کیا ہے؟“

امیر زادے نے بادشاہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ میں نے اگر صاف گوئی سے کام لیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟“

قاضی کمال الدین نے درشت لہجے میں کہا۔ ”امیر زادے! یہ عدالت ہے، یہاں ہیر پھیر کی باتیں نہیں کی جاتیں۔“

سے انکار نہیں کیا اور مدعی کو راستہ کو قرار دیا ہے۔ ان حالات میں عدالت کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ عدالت محمد تغلق کو مجرم اور ظلم و زیادتی کا سزاوار قرار دیتی ہے اور مدعی امیر زادے کو حکم دیتی ہے کہ وہ بادشاہ کو بھرے دربار میں اسی سید سے اکیس ضربات لگائے اور کوشش کرے کہ یہ ضربات بادشاہ کے انہی اعضا پر لگائی جائیں جہاں جہاں بادشاہ نے اس کے لگائی تھیں۔ اور ضربات لگانے کے دوران مدعی امیر زادہ اس کا خاص خیال رکھے کہ یہ ضربات قریب قریب اتنی ہی شدید یا ہلکی ہوں جتنی شدید یا ہلکی بادشاہ کی ضربات رہی ہوں گی۔“

عدالت میں سناٹا طاری ہو گیا۔ بادشاہ مغموم اور دل شکستہ واپسی کے لیے مڑا اور عدالت سے باہر نکل کر حاجیوں کے سردار ملک فیروز کو حکم دیا۔ ”ملک فیروز! میں نے اس امیر زادے کو کل ہزار ستون کے دیوان میں پٹا تھا۔ تو اسی وقت کل کے دروازے پر رکھے ہوئے دفتر میں اندراجات کے مطابق ان امراء کو دربار میں طلب کر لے جنہوں نے اس دن امیر زادے کی پٹائی کا منظر دیکھا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سزا پر فوراً ہی عمل درآمد ہو جائے۔“

ملک فیروز، بادشاہ کا چچا زاد بھائی بھی تھا۔ اس نے محسوس کیا، اس وقت بادشاہ بہت مغموم ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”حضور والا! اس تاجپز کی رائے میں اگر امیر زادے کو مال و دولت سے نوازا دیا جائے تو وہ آپ کی شان میں گستاخی نہیں کر سکے گا۔“

بادشاہ نے افسردہ سی آواز میں کہا۔ ”میں اس امیر زادے کے مزاج سے کسی حد تک واقف ہو گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس سزا کے عوض مال و دولت نہیں قبول کرے گا بلکہ وہ بادشاہ کے تازیانے لگانے کو اپنی زندگی کا نظم کرنا سمجھتا ہے۔ گوارا نہیں کرے گی کہ میں اس کی خوشامد درآمد کروں اور سزا کے عوض اسے مال و دولت قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں۔“

ملک فیروز نے کہا۔ ”کیا میں بات کروں؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”کر کے دیکھ لے۔“

ملک فیروز نے امیر زادے سے بات کی لیکن وہ مال و دولت لینے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس نے جواب دیا۔ ”حاجیوں کے سردار! تو میری اس خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتا جو مجھے بھرے دربار میں بادشاہ کو اکیس تازیانے لگا کر حاصل ہوئی۔ میں حکومت کے عوض بھی اس لذت کا سودا نہیں کر سکتا۔“

کی تھی۔ بادشاہ نے غصے میں چھڑی اس کے ہاتھ سے لے کر میری پٹائی کی تھی۔“

قاضی نے بادشاہ سے پوچھا۔ ”مدعا علیہ بتائے کہ مدعی کی بات کہاں تک درست ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”امیر زادہ سچ بول رہا ہے۔“

قاضی نے امیر زادے سے پوچھا۔ ”کیا تجھے یاد ہے کہ بادشاہ نے تجھے کتنے بے لگائے تھے؟“

امیر زادے نے جواب دیا۔ ”خوب یاد ہیں، میں نے گئے تھے۔ مجھے اکیس سید لگے تھے۔“

قاضی نے بادشاہ سے پوچھا۔ ”مدعا علیہ تصدیق یا تردید کرے کہ مدعی سچا ہے یا جھوٹا؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”مجھے بیوقوف کی تعداد نہیں معلوم کیونکہ میں اس وقت غصے میں تھا اور اسے اشتعال میں پیٹ رہا تھا۔“

قاضی نے کہا۔ ”چونکہ شروع سے آخر تک امیر زادے نے کسی جگہ بھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا ہے اس لیے اس کی بیان کردہ بیوقوفی کی تعداد کو عدالت سچ مانتی ہے۔“ اس کے بعد پھر امیر زادے سے سوال کیا۔

”اب امیر زادہ عدالت کے آخری سوال کا نہایت احتیاط اور غور و فکر کے بعد جواب دے۔ اس کے لیے امیر زادے کو اپنے حافظے اور ضربات کی اذیت پر غور کرنا پڑے گا۔“

بادشاہ، امیر زادہ اور حاضرین عدالت دم بخود قاضی کے آخری سوال کا انتظار کر رہے تھے۔ قاضی نے کہا۔ ”امیر زادے کو یہ یاد ہے کہ بادشاہ نے اس کے جسم کے کن کن حصوں پر سید مارے تھے؟“

امیر زادہ اس آخری سوال پر سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”میری پشت، دونوں شانے، سر، دونوں ٹانگیں اور سچاؤ کی غرض سے بے اختیار اٹھنے والے دونوں ہاتھ بادشاہ کی مار سے زخمی ہوئے تھے لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کتنے سید میری پشت پر لگے تھے، کتنے شانوں، کتنے ٹانگوں پر اور کتنے ہاتھوں پر۔“

قاضی خاموش ہو گیا اور مقدمے کی روداد کے پیش نظر فیصلے پر غور کرنے لگا پھر اس نے لکھنا شروع کیا اور جب لکھ چکا تو اپنا فیصلہ پڑھ کر سنا دیا۔

”اس مقدمے میں ایک معمولی امیر زادہ مدعی ہے اور محمد تغلق مدعا علیہ جو اس ملک کا مقتدر اعلیٰ بھی ہے۔ مقدمے کی روداد کی جان یہ نکتہ ہے کہ بادشاہ نے اپنے جرم

امیر زادے کے جواب کا جب بادشاہ کو علم ہوا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ملک فیروز! امیر زادے کے اس جواب کا مجھے پہلے سے علم تھا۔ اب تو دربار لگانے کا اہتمام کرو۔“

بادشاہ داسرا چلا گیا اور ملک فیروز محل کے دروازے پر متعین مقصد یوں کے پاس، جن کے دفتر میں دربار میں حاضر ہونے والے امراء اور وزراء کے اندراجات ہوتے تھے۔

☆☆☆

عبداللہ، بادشاہ سے اتنا متاثر تھا کہ بار بار اس کا دل بھرتا تھا۔ وہ اپنے محل میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ اس کے کئی ملاقاتی اور دوست اس کے منتظر ہیں۔ عبداللہ نے انہیں بادشاہ کے مقدمے کی روداد سنائی اور کہا۔ ”میں حیران ہوں، اتنی بہت ساری صفات اس ایک شخص میں کس طرح جمع ہو گئی ہیں۔“

ان میں ایک فقیہہ عقیفہ الدین بھی شامل تھا۔ اس نے کہا۔ ”عبداللہ! آپ اس شخص کی تعریف کر رہے ہیں جس کے عدل و انصاف سے زیادہ اس کا ظلم اور خون ریزی مشہور ہے۔“

عبداللہ نے ناگواری سے کہا۔ ”فقیہہ عقیفہ الدین! تو بادشاہ کو ظالم مت کہہ۔“

عقیفہ الدین کے دو دوست ایک ساتھ بولے۔ ”کچھ دنوں پہلے عقیفہ الدین نے بادشاہ کے اس عمل کی مخالفت کی تھی کہ شہر کے باہر کنوئیں کھود کر بادشاہ کی طرف سے زراعت کا حکم دیا گیا تھا۔ بیج اور آلات کاشت کاری بادشاہ کی طرف سے فراہم کیے گئے تھے۔ بادشاہ نے اس کا معاوضہ یوں وصول کر لیا کہ پوری فصل شاہی گودام میں داخل کروا دیتا تھا۔ عقیفہ الدین فقیہہ ہے اس لیے اس نے بادشاہ کے اس فعل کو ناجائز قرار دیا۔“

عبداللہ نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ ”ہاں پھر کیا ہوا؟“

دونوں دوستوں نے جواب دیا۔ ”بادشاہ نے انہیں قید کر دیا اور کہا کہ تو امور سلطنت میں کیوں دخل دیتا ہے۔ گو کہ چند دنوں بعد بادشاہ نے عقیفہ الدین کو رہا کر دیا لیکن یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ عقیفہ الدین موت کے منہ سے نکل آئے۔“

عقیفہ الدین نے مسکرا کر کہا۔ ”واقعی یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اس ظالم سے نجات حاصل کر لی۔“

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ عبداللہ انتظار کر رہا تھا کہ عقیفہ الدین اور دوسرے لوگ چلے جائیں تو وہ کھانا کھائے لیکن وہ لوگ جانے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ کافی دیر

بعد عبداللہ نے ازراہ تکلف اور رسا پوچھا۔ ”آپ لوگ اس وقت کا کھانا تو میرے ہی ساتھ نوش فرمائیں گے؟“

عبداللہ کا خیال تھا کہ اس طرح یہ لوگ جلدی ٹل جائیں گے لیکن عقیفہ الدین نے جواب دیا۔ ”حضرت! اس وقت تو ہم سب آپ ہی کے ساتھ کھائیں گے اور آپ کے ساتھ خور و نوش ہم سب کے لیے ایک اعزاز ہوگا۔“

عبداللہ نے بناوٹی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ”تب پھر مجھے اندر جانے کی اجازت دیجیے تاکہ میں آپ حضرات کے لیے کھانے کا انتظام کروں۔“

عقیفہ الدین نے کہا۔ ”بہتر ہے، جب تک ہم لوگ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔“

عبداللہ نے اندر جا کر خیزران سے کہا۔ ”خیزران! جب سے تو نے اس گھر میں قدم رکھا ہے، میں فضول خرچیوں کا شکار ہو گیا ہوں۔ تو خود بھی فضول خرچ ہے اور اب جو لوگ میرے پاس آ رہے ہیں، وہ سب فضول خرچ ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟“

خیزران نے شجی سے پوچھا۔ ”کیوں کیا ہوا؟“

عبداللہ نے عقیفہ الدین اور دوسرے لوگوں کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”اب وہ سب بعد ہیں کہ اس وقت کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔ خیزران! ذرا سوچو تو یہ کتنا غیر اخلاقی فعل ہے کہ میرے پوچھنے پر انہوں نے تکلف بھی یہ نہیں کہا کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔“

خیزران نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”ہر شخص کا رزق مقرر ہے۔ وہ جہاں ہوتا ہے، وہ اسے وصول کرنے وہیں پہنچ جاتا ہے چنانچہ فقیہہ عقیفہ الدین اور دوسرے لوگ اگر اپنے حصے کا رزق وصول کرنے یہاں آ گئے ہیں تو آپ کو اس پر طول ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے کہ خدا نے آپ کو اس قابل بنادیا کہ دس آدمی آپ کے ساتھ دسترخوان پر اپنا رزق کھائیں گے۔“

عبداللہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ”محنت کر کے کھانا چاہیے۔ پرندوں تک کو دانے کی تلاش میں ادھر ادھر سرگرداں رہنا پڑتا ہے پھر کہیں انہیں دانہ ملتا ہے۔ مجھے مہمان کی حرام خوری ذرا بھی پسند نہیں۔“

خیزران شرارت پر تلی ہوئی تھی، بولی۔ ”اگر پرندوں کو اپنے رزق کی تلاش میں ادھر ادھر رہنا پڑتا ہے تو آپ کے ان مہمانوں کو بھی آپ کے محل تک آنے کی زحمت اٹھانا پڑی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی دیکھتی ہوں کہ آپ نے کوئی محنت نہیں کی مگر بادشاہ کی داد و بخش اور بخیری

کھانے میں بڑے فائدے ہیں اور مجھے ان فائدوں کا ذاتی تجربہ ہے۔“

عبداللہ نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”خدا تیرا بھلا کرے تو بڑا سمجھ دار نظر آتا ہے۔ ذرا ان فائدوں کی بابت شریک طعام ساتھیوں کو بھی کچھ بتادے۔“

تاجر نے جواب دیا۔ ”آہستہ آہستہ چاچا کرکھانے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ معدہ کھانا جلدی ہضم کرتا ہے اور بھوک جلدی جلدی خوب کھل کر نکلتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ زیادہ کھانا کھایا جاتا ہے اور آدمی جتنا زیادہ کھائے گا، اتنی ہی اس کی صحت بھی اچھی رہے گی اور جب صحت اچھی رہے گی تو آدمی ہشاش بشاش رہے گا اور جب آدمی ہشاش بشاش رہے گا تو اس کی عمر بھی زیادہ ہوگی اور زیادہ دن جیے گا۔“

عبداللہ نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ ”تیری ساری نصیحتیں اور پندنامے اپنے دسترخوان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے دسترخوان پر اس طرح کھانا چاہیے لیکن جب آدمی کسی گھر مہمان جائے تو اسے آداب مہمانی کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں نے نہیں رسول اللہ کی یہ حدیث پڑھی ہے کہ انسان کو اس وقت کھانا چاہیے جب بھوک کھل کر لگ چلی ہو اور کھانے سے اس وقت کھانا چاہیے جب چند لقموں کی اشتہا باقی ہو اور پھر میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ درازی عمر کے لیے ضروری ہے کہ انسان کم کھائے، کم سوئے اور کم باتیں کرے۔“

ان دلچسپ اور نوک جھونک والی باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ بہت زیادہ کھا گئے۔

عبداللہ بنجدی کے معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے ان سب سے کہا۔ ”دوستو! اگر تم ہر آنہ محسوس کرو تو میں تمہیں اپنے باغ کی سیر کرا دوں۔“

فقیرہ عقیف الدین اور ان کے ساتھیوں کو باغ کی تفریح سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن تاجر نے سوچا کہ باغ میں ضرور پھل ہوں گے۔ مفت میں کھانے کو ملیں گے، بولا۔ ”باغ کی سیر ضرور کرنا چاہیے کیونکہ ادھر ادھر چلنے پھرنے سے ہاتھ پر بڑا خوشگوار اثر پڑے گا۔ میں باغ میں چلے کو تیار ہوں۔“

مجبوراً عقیف الدین بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ محل کے پیچھے والے باغ میں چلا گیا۔ باغ کے آخری سرے پر خشک درختوں نے سرسبز و شاداب باغ کی رونق کم کر دی تھی اور یہ باغ کے حسن پر داغ بن گئے تھے۔ فقیرہ عقیف الدین نے کہا۔

”آپ کو سب سے زیادہ خوش قسمت انسان بنا دیا ہے۔“ عبداللہ چیخ پڑا، بولا۔ ”خیزران! تو سر چڑھنے کی کوشش مت کر۔ میں بغداد کے عباسی خلیفہ کے خاندان کا ایک فرد ہوں۔ میرے آباؤ اجداد نے جو سخت محنت کی تھی، اس کے صلے میں اگر میں نے یہ دولت اور اعزاز حاصل کر لیا ہے تو مجھے تکلیف کیوں پہنچ رہی ہے۔ اور پھر اس دولت اور اعزاز کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ایران سے دہلی تک کا مصائب و آلام سے گزرنا پڑا ہے، مجھے جو کچھ بھی ملا ہے یوں ہی نہیں مل گیا۔“

خیزران نے عبداللہ کی خفگی کی کوئی پروا نہیں کی، برابر ہنسی مسکراتی رہی۔

عبداللہ نے مہمان دوستوں کے لیے کھانا تیار کروایا۔ کھانے سے ذرا پہلے ایک ایرانی تاجر نازل ہو گیا۔ وہ عبداللہ کی بیوی کا ایک پیغام لایا تھا۔ اس کی بیوی نے کہلوایا تھا۔

”معاشی بد حالی نے میرا حال کر دیا ہے۔ لڑکے کی پرورش اور تربیت نے الگ فکر مند کر رکھا ہے۔ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ دہلی کے بادشاہ نے مجھے بہت زیادہ نواز دیا ہے اور تو بادشاہوں جیسی زندگی گزار رہا ہے۔ اگر میں نے غلط نہیں سنا تو پھر تو مجھے اور اپنے بیٹے کو کیوں نہیں بلا لیتا؟ سچ کہتی ہوں کہ اگر میں مرگئی تو تیرا بیٹا در یوزہ مری کرے گا اور اگر بد قسمتی سے ایسا واقعی ہو گیا تو گویا تیرے حکمران آباؤ اجداد کی نسل کا یہ بھکاری شہزادہ کہلائے گا۔“

ایرانی تاجر نے کھانے کے دوران اپنے شریک طعام اجنبی ساتھیوں سے کہا۔ ”دوستو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ صبح تک آپ کے ساتھ کھانے کا میں گمان تک نہ کر سکتا تھا لیکن اس وقت میں آپ سب کے ساتھ لذیذ غذا میں کھا رہا ہوں۔ سچ ہے دانے دانے پر کھانے والے کا نام کھانا ہوتا ہے۔“

عبداللہ بذات خود بہت کم کھا رہا تھا۔ اس کا ایک لقمہ دوسروں کے تین لقموں کا اوسط تھا۔ جل کر ایرانی تاجر کو جواب دیا۔

”دانے دانے پر کھانے والے کا نام بھی کچھ اور بھی لکھا ہوتا ہے جس کا کھانے کے بعد پتا چلے گا۔“ پھر کھانے والوں کی تیز رفتاری پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔ ”انسان کو چند باتوں کا بڑا خیال رکھنا چاہیے۔ اول اس بات کا کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ ہر کام میں محل اور اعتدال سے کام لینا چاہیے۔ دانتوں کا کام آنتوں سے نہیں لینا چاہیے۔ ہر لقمہ چبا چبا کر کھانا چاہیے۔“

تاجر بڑا مڑخا تھا، بولا۔ ”آہستہ آہستہ چاچا کر

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں ایک درخواست لے کر حاضر ہوا تھا مگر اب نہیں کہوں گا۔“
عبداللہ نے کہا۔ ”نہیں نہیں، تیرا اور ہی معاملہ ہے۔ تو تو ایک محتاط شخص ہے۔“
قاضی نے جواب دیا۔ ”اسی احتیاط نے تو میری زبان پکڑ لی ہے۔“

عبداللہ نے اصرار کیا۔ ”بخدا تجھے اپنی بات کہنی پڑے گی۔ قاضی، میں تجھے بے حد عزیز رکھتا ہوں۔ تو شرمناک نہیں، جو کچھ کہنا چاہتا ہے صاف صاف بے تکلفی سے کہہ دے۔“
قاضی کمال الدین نے رک رک کر کہا۔ ”یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں نے بادشاہ کے خلاف ایک زبردست فیصلہ سنایا ہے اور اس بات سے بھی آپ واقف ہیں کہ بادشاہ کے مزاج کا کچھ پتا نہیں کہ کس وقت کیا کر بیٹھے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب جب میں بادشاہ کے سامنے جاؤں تو شاندار نذرانے کے ساتھ جاؤں اور اس کے علاوہ میرے ذمے کچھ لوگوں کا قرض چلا آ رہا ہے۔ آج جب میں بادشاہ کے خلاف اپنا فیصلہ سنارہا تھا تو یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرے قرض خواہوں نے میرے خلاف کوئی مقدمہ کر دیا تو بادشاہ مجھے معاف نہیں کرے گا اور اس کی کیا سزا دے گا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن تیرا مطلب کیا ہے، یہ تو تو نے بتایا ہی نہیں؟“
قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”اس وقت مجھے پانچ ہزار سرخ تنکوں (اشرفیوں) کی ضرورت ہے۔ چاہتا ہوں آپ مجھے مستعار دے دیں، بعد میں واپس کر دوں گا۔“

عبداللہ سوچ میں پڑ گیا۔ قاضی کمال الدین نے۔۔۔ بے چینی سے کہا۔ ”جناب! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ میں یہ رقم تو آپ سے لے کر ہی رہوں گا۔“

عبداللہ نے نہایت نرمی سے جواب دیا۔ ”کمال الدین! تو میری بات کا یقین کر، میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اور بہانہ کروں گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کبھی نہ کبھی مجھے میری یہ رقم واپس بھی مل جائے گی عمر.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

قاضی نے کہا۔ ”ہاں ہاں کہیے کہیے، جو کہنا ہے صاف صاف کہیے۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”قاضی کمال الدین! اندر سے میرا دل مجھے مجبور کر رہا ہے کہ تیری مجبوریوں کا خیال

”جناب! ان درختوں کو تو کنوا دینا چاہیے۔“
عبداللہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی، بولا۔ ”بالکل درست عقیدہ الدین..... مجھے سب کی رائے سے اتفاق ہے اور میرے خیال سے یہ کام اسی وقت ہونا چاہیے۔“
ایرانی تاجر نے سوال کیا۔ ”یہ کام اس وقت کیونکر ہو سکتا ہے؟“

عبداللہ ایک خشک درخت کی طرف بڑھا اور اس کی ایک شاخ توڑتے ہوئے بولا۔ ”اس طرح..... دوستو! کیا خیال ہے؟ یہ کام تو ابھی انجام دیا جاسکتا ہے۔ ہم سب مل جل کر ان خشک درختوں کو صاف کر کے رکھ دیں گے۔“
ایرانی تاجر نے جیز ہو کر سوال کیا۔ ”یعنی یہ کام ہم کریں گے؟ میں تاجر ہوں اور یہ لوگ کہاں ہیں میں نہیں جانتا لیکن چہرے بشرے سے اس شہر کے معزز ہی نظر آتے ہیں۔ یہ ان درختوں کو کس طرح صاف کریں گے؟“

عبداللہ نے کہا۔ ”تم سب میں سب سے معزز میں ہوں۔ عباسی خلفا کے خاندان کا ایک شہزادہ لیکن میں رسول اللہ کی سنت پر عمل کرنے کا قائل ہوں۔ آپ ہر کام کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ کپڑوں میں پیوند تک لگا لیتے تھے اور اپنی جوتیاں خود گانگھ لیتے تھے۔ ہمیں کسی کام سے شرمناک نہیں چاہیے۔“

اتنا کہہ کر اس نے تیزی سے کام شروع کر دیا۔ عبداللہ کی دیکھا دیکھی فقیرہ عقیف الدین بھی خشک شاخیں توڑنے لگا اور پھر بھی نہ کام شروع کر دیا۔

یہ کام زور و شور سے جاری تھا کہ خدمت گار نے اسے مطلع کیا۔ ”قاضی کمال الدین ملنا چاہتے ہیں۔“
اس نے جواب دیا۔ ”قاضی کو یہیں لے آتا کہ یہ دلچسپ تماشا وہ بھی دیکھ لے۔“

تھوڑی دیر بعد خدمت گار قاضی کمال الدین کو ساتھ لے کر وہیں پہنچ گیا۔ عبداللہ نے اپنا کام چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”دوستو! تم اپنا کام جاری رکھو، میں ذرا قاضی کمال الدین سے باتیں کر لوں۔“

قاضی کمال الدین نے حیرت سے سوال کیا۔ ”جناب! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

عبداللہ نے پوری تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔ ”میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ کوئی شخص میرا کھانا کھائے مگر میرا کام نہ کرے۔“

قاضی کمال الدین نے کچھ کہتے کہتے زبان روک لی۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”تو مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے؟“

انسو

دنیا کا مہنگا ترین مملوک انسو ہے، اس میں ایک فیصد بانی اور 99 فیصد احساسات ہوتے ہیں۔ لہذا کسی کو تکلیف پہنچانے سے پہلے سو مرتبہ سوچیں۔

سنہری باتیں

☆ وہ ایک اگلی جو مشکل وقت میں آپ کے انسو پوچھتی ہے، ان دس انگلیوں سے بہتر ہے جو آپ کی کامیابی پر تائیاں بجاتی ہیں۔

☆ کامیابی کی طرف جانے کے لیے کوئی شاہانہ راستہ نہیں ہے، لیکن کامیاب ہو جانے کے بعد تمام راستے شاہانہ ہو جاتے ہیں۔

☆ اگر آپ اپنی انگلیوں پر اپنی ہی غلطیوں کو گنتیں تو دوسروں پر انکی اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆ ماں بھی قدرت کا انمول تحفہ ہے، اولاد کو دکھ میں بھی دیکھے تو انسواور رکھ میں بھی دیکھے تو انسو۔

☆ کسی انسان کا زوال اس وقت شروع ہو جاتا ہے جو وہ خود کو اپنے مخلص دوستوں سے دور کر لیتا ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

خوب صورت باتیں

☆ کامیابی آپ کو دنیا سے متعارف کراتی ہے اور ناکامی دنیا کو آپ سے متعارف کراتی ہے۔

☆ وقت اور دولت دو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں۔ وقت انسان کو مجبور اور دولت انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔

☆ میرے پاس ان لوگوں کے لیے وقت نہیں ہے جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ مصروف ہوں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

☆ تکبر سے پاک گفتگو، وقار سے پاک محبت، لالچ سے پاک خدمت اور خود غرضی سے پاک دعا سچے رشتے کی بنیاد ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

کروں اور پانچ ہزار سرخ شے بطور قرض تجھے دے دے دوں لیکن ہمت جواب دے رہی ہے۔ افسوس کہ میں تیری ضرورت نہیں پوری کر سکوں گا۔“

قاضی کمال الدین نے مایوسی سے کہا۔ ”پتا نہیں میرا کیا حشر ہو، بہر حال میرے حق میں دعا تو کر ہی سکتے ہیں آپ۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، دعا ضرور کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں میری دعا کم ہی قبول ہوتی ہے اور تو کتنا ہی ترقی کر جائے مگر مرتبے اور عزت میں مجھ سے بڑھنے سے ہا کہ میں حسد کروں۔“

قاضی کمال الدین نے مشورہ دیا۔ ”اگر میرے کام نہیں آتے تو نہ آئیے لیکن اپنے مرتبے اور عزت کو بچانے کے لیے آپ فقر اور مساکین پر خرچ ضرور کرتے رہیے کیونکہ ان کی دعائیں آپ کے حق میں مفید ہیں گی۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”یہ کام میرے بس کا نہیں، افسوس کہ میں دینے والا نہ کی خود میں ہمت ہی نہیں پاتا۔“

قاضی کمال الدین مایوس اور افسردہ واپس چلا گیا اور عبداللہ نے ایرانی تاجر کو پچھڑنے کی خاطر کہا۔ ”جس طرح دانے دانے پر آدمی کا کھانا لکھا ہوتا ہے، اسی طرح یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ انسان کو دانے کے عوض کیا کیا کرنا پڑے گا۔“

☆☆☆

دیوان ہزارستون میں امراء اور دوسرے درباریوں کا ہجوم تھا۔ بادشاہ سر پر کلاہ رکھے شہنشین پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے قاضی کمال الدین امیر زادوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ عبداللہ، بادشاہ کے برابر بیٹھا تھا۔ فقیہ عقیف الدین اور اس کے ساتھی بھی امراء کی صف میں کھڑے تھے۔

کچھ دیر بعد بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا وہ تمام امراء اور درباری موجود ہیں جو اس دیوان میں اس دن موجود تھے جب میں نے اس امیر زادے کو اکیس یا اس کے... لگ بھگ تازیانے لگائے تھے؟“

حاجبوں کے سردار ملک فیروز نے جواب دیا۔ ”اخواند عالم! سبھی موجود ہیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”تو اس امیر زادے سے آخری بار دریافت کر کہ کیا وہ مال و دولت کے عوض تازیانوں کی سزا معاف نہیں کر سکتا؟“

ملک فیروز نے بادشاہ کا سوال امیر زادے سے ہر ادا کیا۔ امیر زادے نے جواب دیا۔ ”بادشاہ اگر زبردستی مال و دولت دے کر تازیانوں کی سزا سے چمٹا چاہتا ہے تو اور بات ہے ورنہ میں تازیانے لگانے پر بعد ہوں اور اس کے

بھگت لینے دے، میں تیری بات کا جواب دوں گا۔“
امیرزادہ تازیانے لگتا رہا یہاں تک کہ اکیس تازیانے لگ گئے۔ اس وقت تک بادشاہ کے دم ہو چکا تھا۔ سارے درباری امراء اش اش کر رہے تھے۔ امیرزادے نے تازیانہ ایک طرف پھینکا اور بادشاہ کے قدموں پر جھک گیا۔ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ”جہاں پناہ! مجھے معاف فرمایا جائے۔“
بادشاہ نے پرمردگی سے جواب دیا۔ ”تو نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے نہیں بلکہ یہ عدالت کا فیصلہ تھا اس لیے تیرے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

امیرزادے نے کہا۔ ”پھر بھی میں شرمندہ ہوں۔“
فقیہہ عقیف الدین نے امیرزادے کو ڈانٹا، کہا۔ ”تو ایک معمولی امیرزادہ ہے مگر اس وقت تو نے جس گستاخانہ جرات کا مظاہرہ کیا ہے، وہ بہتوں کے لیے لمحہ فکریہ ثابت ہوگی۔“

بادشاہ نے عقیف الدین کو ڈانٹا۔ ”تو یہ کیا بک رہا ہے؟ تو اس عدالت کا منصف یا قاضی نہیں جس نے اسے یہ اختیار دیا تھا کہ میرے اکیس تازیانے لگائے جائیں پھر تو یہ بکواس کیوں کر رہا ہے؟“

فقیہہ عقیف الدین چپ ہو گیا۔ بادشاہ نے حاجوں کے سردار ملک فیروز کو حکم دیا۔ ”اس امیرزادے کو مال و دولت بھی عطا کیا جائے۔“

ملک فیروز نے جواب دیا۔ ”جو حکم اخوند عالم۔“
بادشاہ نے کہا۔ ”قاضی کمال الدین! تو ابھی نہیں جانے گا کیونکہ یہاں ایک اور مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔“
قاضی کمال الدین کی جان نکل گئی۔ عبداللہ نے قاضی کمال الدین کی سفارش کی۔ ”قاضی کمال الدین ایک شریف انسان ہے اور اس کا مستحق ہے کہ اسے کچھ مہلت دی جائے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”میں قاضی کمال الدین کی شرافت کا دل سے قائل ہوں اسی لیے قاضی کمال الدین کو روک رہا ہوں۔“ پھر فقیہہ عقیف الدین کو آواز دی۔ ”عقیف الدین! تو ذرا آگے بڑھ۔ میں تجھ سے کچھ پوچھنے والا ہوں۔“

فقیہہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کے پاؤں لرزنے لگے۔ بادشاہ نے عقیف الدین سے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ تو نے مجھے ظالم کہا ہے؟“

فقیہہ عقیف الدین کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بادشاہ نے

بعد بادشاہ اگر مجھے انتہائی کارروائی میں ہلاک بھی کر دے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“

بادشاہ نے افسردہ آواز میں کہا۔ ”قاضی کمال الدین! تو امیرزادے کو حکم دے کہ وہ تازیانے لگائے۔“
نقیبوں کے سردار سے اس کا بیحد لیے لیا گیا اور بادشاہ شہ نشین سے اتر کر امیرزادے کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ امیرزادے نے قاضی کمال الدین سے نقیبوں کے سردار کا بیحد لیا اور بادشاہ سے کہا۔ ”بادشاہ کی شناخت کرے کہ یہ وہی بیت ہے جس سے اس نے مجھے مارا تھا یا کوئی اور؟“

بادشاہ نے سید کو اچھی طرح دیکھ بھال کر جواب دیا۔ ”میں پہچانتا ہوں، یہ وہی سید ہے۔“

امیرزادہ مرعوب ہوتا رہا تھا۔ قاضی کمال الدین نے اسے حکم دیا۔ ”امیرزادہ عدالت کے فیصلے پر عمل کرے۔“

امیرزادے نے لرزتے ہاتھ سے تازیانہ بلند کیا۔ بادشاہ سیدھا کھڑا تھا۔ امراء اور درباری دم بخود تھے۔ ان کی سمجھ سے یہ بات بالآخری کہ بادشاہ کو واقعی تازیانے لگ سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا یہی خیال رہا ہوگا کہ بالکل آخری محوں میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسا ہو جائے گا کہ امیرزادہ تازیانے نہیں لگ سکے گا۔

امیرزادے نے لرزتے ہاتھ سے بادشاہ کی پشت پر تازیانہ رسید کر دیا۔ بادشاہ اف کر کے ذرا جھکا پھر سیدھا ہو گیا۔ قاضی کمال الدین، امیرزادے کا ہاتھ پکڑ لیتا چاہتا تھا لیکن وہ بادشاہ کے غضب سے بھی واقف تھا کہ انتہائی جبر سے کام لے کر کھڑا رہا۔ امیرزادے کا دوسرا تازیانہ بادشاہ کے شانے پر لگا۔ پانچ، چھ تازیانوں کے بعد امیرزادے کا ہواؤ کھل گیا اور اس کا ہاتھ شپ شپ چلنے لگا۔ بادشاہ بری طرح پٹ رہا تھا۔

پندرہویں تازیانے سے بادشاہ کی کلاہ سرے سرک کر دور جا گری۔ بادشاہ نے درخواست کی۔ ”امیرزادے! مجھے کلاہ اٹھانے کا موقع دے، مہربانی ہوگی۔“

امیرزادے نے جواب دیا۔ ”ابھی چھ تازیانے باقی ہیں۔ ابھی کلاہ پہننے کا فائدہ؟ یہ دوبارہ بھی کر سکتا ہے۔“
بادشاہ نے کہا۔ ”تو درست کہتا ہے، کلاہ دوبارہ بھی کر سکتا ہے۔“

فقیہہ عقیف الدین نے کہا۔ ”اخذ عالم! کلاہ کا بادشاہ کے سرے سرک جانا بدشگونی میں شامل ہے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”عقیف الدین! مجھے سزا

چھوڑنے کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔ ہاں تو میرے دوسرے خط یا پیغام کا انتظار کروں گا کہ تجھ کو بھی یہیں بلالوں۔“

☆☆☆

قاضی کمال الدین کئی دن بعد مغرب کے بعد عبداللہ کے محل پہنچا۔ اس وقت پورا محل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور ڈیوڑھی میں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ قاضی کو شبہ گزرا کہ شاید عبداللہ نے محل خالی کر دیا ہے لیکن صدر دروازے پر پہرے دار کو دیکھ کر یہ شبہ کسی حد تک دور ہو گیا۔ قاضی کمال الدین نے پہرے دار سے پوچھا۔ ”عبداللہ کہاں چلا گیا؟“

پہرے دار نے جواب دیا۔ ”اندر محل موجود ہے۔“ قاضی نے کہا۔ ”خوب، پھر یہ اندھیرا کیوں ہے؟“ پہرے دار نے جواب دیا۔ ”کیا آپ پہلی بار یہاں تشریف لائے ہیں؟“

”نہیں تو، میں یہاں کئی بار آچکا ہوں لیکن زیادہ تر دن ہی میں آیا ہوں۔“

پہرے دار نے کہا۔ ”اس محل کا آقا بہت کفایت شعار ہے، وہ خرچ سے بچنے کے لیے ڈیوڑھی اور محل کے بیشتر حصوں کو تاریک ہی رکھتا ہے۔ اس لیے اس محل پر قبرستان کا گمان ہونے لگتا ہے۔“

اطلاع پاتے ہی عبداللہ نے قاضی کمال الدین کو اندر بلالیا۔ قاضی نے کہا۔ ”آپ ڈیوڑھی کو توروڑن رکھا کیجیے، میں تو محل میں اندھیرا دیکھ کر واپس چلا جانے والا تھا۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اول تو مغرب کے بعد میرے پاس کوئی آتا ہی نہیں اور اگر کوئی آتا بھی ہے تو کبھی بھی اتفاق سے، جیسے اس وقت تو خود آ گیا ہے۔ اس کبھی بھی اور اتفاق کے لیے فضل خرچی کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔“ قاضی کمال الدین کچھ سوچنے لگا۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”تو کیا سوچنے لگا؟“

قاضی کمال الدین نے پوچھا۔ ”یہاں کوئی ہماری گفتگو تو نہیں سن رہا؟“

”نہیں، تم سرگوشی میں ہر بات کہہ سکتے ہو۔“ قاضی کمال الدین نے پوچھا۔ ”کیا آپ یہاں سے چلے جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں؟“

عبداللہ نے گھبرا کر سوال کیا۔ ”لیکن تجھے یہ بات کس سے معلوم ہوئی؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”قیاس سے، انداز سے۔“ عبداللہ نے افسوس سے کہا۔ ”ہاں، جب سے میں

متنبہ کیا۔“ ”عفیف الدین! اگر تو نے جھوٹ کا سہارا لیا تو دروغ گوئی کا مجرم بھی ٹھہرے گا۔“

عفیف الدین نے جواب دیا۔ ”بے شک میں نے بادشاہ کو ظالم کہا تھا۔“

بادشاہ نے عفیف الدین کے دونوں ساتھیوں کو اپنے قریب بلالیا اور پوچھا۔ ”کیا تم دونوں نے بھی عفیف الدین کی بات سن کر یہ کہا تھا کہ خدا کا شکر ہے جو تیری خلاصی ہوئی؟“

انکار کی گنجائش ہی نہ تھی کیونکہ جھوٹ بولنے سے ایک جرم اور بڑھ جاتا۔ یکے بعد دیگرے دونوں نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہم نے یہ کہا تھا۔“

بادشاہ نے سچ زادہ نہادندی (جلاد) کو حکم دیا۔ ”ان تینوں کے دو دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔“

عفیف الدین کے دونوں ساتھیوں نے گڑگڑا کر عرض کیا۔ ”اخواند عالم! عفیف الدین کا تو یہ جرم ہے کہ اس نے بادشاہ کو ظالم کہا لیکن ہم دونوں کس جرم میں قتل کیے جائیں گے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”تم دونوں نے عفیف الدین کی بات سن کر تردید نہیں کی۔ اس طرح تم دونوں نے اس سے اتفاق کیا اور اسی جرم کے مرتکب ہوئے جس کا ارتکاب عفیف الدین نے کیا تھا۔“

سچ زادہ نہادندی نے ان تینوں کو اسی وقت دیوان ہزار ستون کے سامنے لے جا کر دو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ان کے پھڑکتے ہوئے لاشوں کو بہت سارے امراء نے بھی دیکھا۔

اس واقعے نے عبداللہ کو بہت طول اور خوف زدہ کر دیا۔ وہ بادشاہ کے پاس سے بہت افسردہ اٹھا۔ بادشاہ نے بھی اس افسردگی کو محسوس کر لیا، بولا۔ ”آقا زادے! میں نے سلاطین عالم کے حالات پڑھے ہیں اور انہی سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک بادشاہ کو اپنا رعب برقرار رکھنے کے لیے سیاست و تادیب کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

عبداللہ نے جبری مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”میرے جدِ اعلیٰ ابو العباس کا تو نام ہی ابو السفاح (خون ریز) پڑ گیا۔“

عبداللہ نے ایرانی تاجر کو بلوا کر بیوی کو خط لکھ دیا۔ ”مجھے تیری اور تیرے بیٹے کی پریشانی کا خوب علم ہے لیکن میں مجبور ہوں کیونکہ دہلی کے بادشاہ نے میری جتنی عزت افزائی کی ہے، اس کے پیش نظر میں ہندوستان

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں میں نے وہ وعدہ کیوں کر لیا تھا۔ بہر حال اب میں اس وعدے سے منحرف ہوتا ہوں۔ تو مجھ سے کوئی اور وعدہ لے سکتا ہے۔“

قاضی کمال الدین کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے آزر دگی سے کہا۔ ”جب آپ اپنے وعدے سے منحرف ہو رہے ہیں تو کسی اور وعدے سے بھی منحرف ہو سکتے ہیں۔“

عبداللہ خوشتر کر اکر قاضی کمال الدین حد و رقابت میں کہیں بادشاہ سے یہ شکایت نہ کر دے کہ عبداللہ دہلی سے فرار ہونے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اس نے ذرا زمانہ سازی سے کام لیا۔

”قاضی کمال الدین! میں تجھ سے مذاق کر رہا تھا، ورنہ میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ جس دن میں دہلی سے جاؤں گا خیزران کو تیرے حوالے کر جاؤں گا۔“

قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”نہیں، اس قسم کے وعدے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ کہیں میں آپ کے ارادے سے بادشاہ کو مطلع نہ کر دوں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا، کبھی بھی نہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔“ عبداللہ خاموش ہو گیا اور قاضی کمال الدین تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھ کر چلا گیا۔

عبداللہ نے اندر جا کر خیزران سے کہا۔ ”خیزران! میں تجھے کیا لگتا ہوں؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”یوں تو آپ بہت اچھے لگتے ہیں لیکن آپ کی بخالت بہت بری لگتی ہے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن میں نے تیرے ساتھ تو کبھی بخل نہیں برتا۔“

خیزران نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ آپ نے جبر سے کام لے رکھا ہے لیکن روز بھی آپ کی دلچسپی میں کمی آئی، آپ میرے سلسلے میں بھی بخل اختیار کر لیں گے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن میں نے تیرے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ شادی کر لوں، کیا تو میرے اس فیصلے سے اتفاق کرے گی؟“

خیزران نے جواب دیا۔ ”مجھے کبھی بھی اس سے اختلاف نہیں رہا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”تب پھر کل ہی یہ کام انجام۔۔۔ پاجائے گا کیونکہ قاضی کمال الدین کوشہ ہے کہ میں یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں لیکن میں تجھ سے شادی کر کے اس کے اس وہم کو دور کر دوں گا۔“

خیزران کیا کہہ سکتی تھی۔ دوسرے دن نہایت سادہ سی

نے فقیہہ عقیفہ الدین اور اس کے دونوں دوستوں کے قتل کا سنا حد دیکھا ہے، میرا یہاں سے دل اچاٹ ہو گیا ہے۔“

قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”اگر آپ واقعی یہاں سے چلے جانے کا ارادہ کر رہی ہیں تو اس کا کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچے گی اور بادشاہ آپ کا بھی دشمن ہو جائے گا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”مگر میرا تو یہ ارادہ تھا کہ میں بادشاہ سے اجازت لے کر جاؤں گا۔“

قاضی نے کہا۔ ”کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا کیونکہ آپ سے پہلے یہاں فرغانہ کے رئیس طغون اور اس کا بھائی، دونوں بادشاہ کے مہمان بن کر رہے تھے۔ بادشاہ نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا لیکن جب ان لوگوں نے یہاں سے بھاگ جانے کا منصوبہ بنایا تو بادشاہ نے ان دونوں کو قتل کر دیا اور عقیفہ الدین کی طرح ان دونوں کے بھی دو دو ٹکڑے کر دیے گئے۔“

عبداللہ نے ہنسنے پر چھا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”آپ کو معلوم ہو گا کہ بادشاہ دارالخلافہ کو دولت آباد منتقل کر رہا ہے۔ جب بادشاہ دولت آباد جائے تو آپ چوری سے ایران چلے جائیں اور پھر وہاں سے جہاں جی میں آئے جا کر تیرم ہو جائیں۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”قاضی کمال الدین! میں تیرا شکر گزار ہوں جو اتنا صائب مشورہ دیا۔“

قاضی نے کہا۔ ”شکریہ کس بات کا، میں تو آپ کا ہمدرد ہوں۔“

عبداللہ نے نہایت جذباتی لہجہ میں کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو میں تیری اس ہمدردی کا وہ صلہ دوں گا کہ تیری طبیعت بار بار ہوجائے گی۔“

قاضی نے انکار سے کہا۔ ”میں آپ سے کوئی صلہ نہیں چاہتا۔ بس یہ ضرور یاد دلاؤں گا کہ آپ نے خیزران کے سلسلے میں مجھ سے جو وعدہ کر رکھا ہے، اسے ضرور پورا کیجیے گا۔“

عبداللہ نے کسی قدر تذبذب سے جواب دیا۔ ”میں خیزران کا تو کوئی وعدہ کر نہیں سکتا، ہاں اور کوئی بھی بات ممکن ہو سکتی ہے۔“

قاضی کمال الدین نے بے چینی سے کہا۔ ”حالانکہ خیزران کے سلسلے میں آپ مجھ سے کوئی وعدہ کر چکے ہیں، ذرا اسے یاد تو کیجیے۔“

روانہ ہونے لگے۔

عبداللہ نے بادشاہ سے ملاقات کی اور کہا۔ ”بادشاہ! میں تیرا احسان مند ہوں کہ تو نے مجھے میری توقع سے کہیں زیادہ نواز دیا۔ اب مجھ پر ایک اور مہربانی کر۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”وہ کیا؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”یہ کہ میں دہلی میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”آقا زادے! جب دہلی کا ایک ایک گھرا بڑ چکا ہوگا تو آپ یہاں کس طرح رہیں گے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں ہفت عشرہ رہ کر یہ دیکھوں گا کہ یہاں کس طرح رہ سکتا ہوں اور بس۔“

بادشاہ نے سردمہری سے کہا۔ ”اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو آپ چند دن اور رہ سکتے ہیں یہاں لیکن یہ یاد رکھیے کہ آخر کار آپ کو کبھی دولت آباد ہجرت کرنی ہوگی۔“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میں بادشاہ کے حکم کا تابع ہوں۔ میں کبھی بھی اس کے خلاف نہیں جاسکتا۔“

تیسرے دن شہر اجڑ گیا۔ اس دن ہر طرف ویرانی ہی ویرانی مسلط تھی۔ قافلوں پر قافلے دولت آباد جارہے تھے۔ عبداللہ اپنے کل کاروازہ بند کیسے اس ہولناک تماشے کے انجام کا انتظار کرتا رہا۔

عبداللہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ اتنے زیادہ ساز و سامان کے ساتھ دہلی سے نکلے گا کس طرح؟ اور اس پرانے میں تو اس کی ایک ایک حرکت بادشاہ کے علم میں آتی رہے گی۔ اسے شہر گزرا کہ قاضی کمال الدین کا مشورہ برناتے خلوص ہرگز نہ تھا بلکہ یہ انتقام تھا جو اس نے خیزران کے سلسلے میں اس سے لیا تھا۔

بادشاہ، قاضی کمال الدین اور چند دوسرے امراء اب بھی دہلی میں ہی تھے اور یہ لوگ بادشاہ کے ساتھ سفر کرنے والے تھے۔ عبداللہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خود بھی بادشاہ کے ساتھ دولت آباد جائے گا۔ اپنے اس فیصلے کی اطلاع دینے وہ بادشاہ کے پاس روانہ ہو گیا۔ بادشاہ نے خوش اخلاقی سے عبداللہ کا استقبال کیا۔ اس وقت بادشاہ کے پاس قاضی کمال الدین کے علاوہ کچھ اور امراء بھی موجود تھے۔ اس وقت بادشاہ بہت خوش تھا۔ اس نے حاجیوں کے سردار ملک فیروز سے دریافت کیا۔

”کیا دہلی کے تمام آدمی دولت آباد روانہ ہو چکے؟“

ملک فیروز نے جواب دیا۔ ”اخواند عالم! بظاہر تو یہی نظر آتا ہے۔“

تقریب میں عبداللہ نے خیزران سے شادی کر لی، بولا۔ ”خیزران! تو یقین کر، تیری شکل بالکل زبیدہ جیسی ہے، میری بیوی کی طرح۔“

خیزران ہنس کر چپ ہو رہی۔ عبداللہ اس نئی ذمہ داری سے فکر مند ہو گیا لیکن اس کے سوا دوسری کوئی تدبیر بھی نہ تھی جس سے وہ قاضی کمال الدین کو یہ یقین دلا سکتا کہ وہ ہندوستان سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

☆☆☆

عبداللہ اور خیزران کی شادی کی خبر نے کسی اور کو تو نہیں چونکا یا لیکن قاضی کمال الدین ضرور چونک گیا۔ اس نے عبداللہ سے شکایت کیا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب آپ دہلی سے جائیں گے تو خیزران کو میرے حوالے کر جائیں گے لیکن اس وعدے کے دوسرے ہی دن آپ نے خیزران سے شادی کر لی..... آخر یہ پکڑ کیا ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”پہلے میرا یہی ارادہ تھا کہ جب میں ہندوستان سے جاؤں گا تو خیزران کو تیرے حوالے کر جاؤں گا لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ہندوستان ہی میں مستقر رہ بس جانے کا ارادہ کر لیا۔“

قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”خدا آپ کو اس ارادے پر قائم رہنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔“

اس کے بعد ان دونوں کے دلوں میں کچھ فرق آ گیا۔ میل ملاقات بھی کم ہو گئی۔ اگر کبھی آمناسامنا ہو بھی جاتا تو بات علیک سلیک سے آگے نہ بڑھتی۔

دن گزرتے رہے، بادشاہ دہلی میں مقیم رہا۔ دولت آباد کی تعمیر ہوتی رہی۔ اس دوران خیزران سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اب عبداللہ کی خیزران سے توڑ میں بھی ہونے لگی تھی۔ وہ کپڑوں اور زینوں پر بہت خرچ کرتی تھی اور عبداللہ اس پر اعتراض ضرور کرتا تھا۔ اس دوران عبداللہ کی بیوی زبیدہ کی طرف سے کوئی خط یا پیغام نہیں آیا۔ وہ ایران جانے کے لیے بے چین تھا لیکن اس کا کسی پر اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے بادشاہ کی دولت آباد روانگی کا منتظر تھا۔

آخر ایک دن بادشاہ نے عام حکم دیا۔ ”تین دن کے اندر دہلی کو خالی کر دیا جائے اور لوگ دولت آباد ہوجائیں۔“

اس حکم نے پورے شہر میں ایک کھلبلی مچادی اور حواس باختہ، خوف زدہ لوگ اپنا اپنا سامان سمیٹ کر دولت آباد

تاکہ زندگی بھر عزت و آسائش سے رہ سکیں۔“ پھر قاضی کمال الدین کو مخاطب کیا۔
 ”اور قاضی کمال الدین تو! تو نے ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ تجھے قتل کروا سکتا ہوں۔ تو نے یہ خیر مجھے نہیں پہنچایا یہی تیرا جرم ہے لیکن میں تجھے اس لیے معاف کر رہا ہوں کہ میں خود آقا زادے کی عزت کرتا ہوں۔ جب میں آقا زادے کو کچھ نہیں کر رہا ہوں تو تجھ کو کیا سزا دوں گا۔“

عبداللہ کے جی میں آئی کہ بادشاہ کے قدموں میں گر جائے لیکن اسے فوراً ہی اپنے خاندان کی بزرگی اور برتری کا خیال آ گیا جو ہمیشہ عالم اسلام کے بادشاہوں کو بادشاہت کی سند دیا کرتے تھے اور ان بادشاہوں میں خود محمد تعلق بھی شامل تھا۔ قاضی کمال الدین دو زانو ہو کر بادشاہ کے قدموں میں جھک گیا۔ فریضہ خوف اور شدت جذبہ شکر گزاری میں اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔ بادشاہ نے اسے اٹھالیا، بولا۔ ”اب تم ان باتوں کو بھول جاؤ اور میرے ساتھ کل کی چھت پر چلو، میں تمہیں ایک خوشگوار منظر دکھاؤں۔“

بادشاہ ان سب کو لے کر محل کی چھت پر چلا گیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ بادشاہ نے سب کے ساتھ وہیں مغرب کی نماز ادا کی اور بعد میں شہر کی ویرانیت کا نظارہ کرنے لگا۔ چاروں طرف ایک ہوکا مالا تھا۔ کسی بھی گھر سے نہ تو دھواں اٹھ رہا تھا اور نہ ہی کہیں چراغ جل رہا تھا۔ بادشاہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”کتنا خوشگوار نظارہ ہے۔“

لوگ خاموش رہے، بادشاہ نے متانت سے کہا۔ ”کیا تم لوگوں کو مزہ نہیں آ رہا؟ کیا تم لوگ خوش نہیں ہوئے؟“ ہر ایک نے گھبرا کر اور زبردستی مسکرا کر جواب دیا۔ ”اخواند عالم! شہر کا ہر مسکون اور خاموش ماحول ہم پر یہ لطیف انکشاف کر رہا ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندے ایسے مسکون اور خاموش ماحول کے کیوں متلاشی رہتے ہیں۔ اب اس شہر میں اللہ اللہ کر کے میں بڑا مزہ آ سکتا ہے۔“

☆☆☆

عبداللہ اپنے محل میں جیسے ہی داخل ہوا، لہذا یہ کھانوں کی خوشبو نے اس کے دل و دماغ کو فرحت بخشی۔ اسے حیرت تھی کہ اس محل میں آج تک ایسے کھانے نہیں کپکے تھے۔ وہ خیزران کو تلاش کرتا ہوا اس حصے میں چلا گیا جہاں خدمت گار اور غلام رہتے تھے۔ وہاں اس نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ سارے خدمت گار اور غلام لطیف و لذیذ کھانوں پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ خیزران ان کے

بادشاہ نے شیخ زادہ نہاوندی (جلاد) کو حکم دیا۔ ”نہاوندی! تو چند غلاموں کے ساتھ خالی مکانوں میں گھس گھس کر جائزہ لے کہ کہیں کوئی چھپ کر تو نہیں بیٹھ رہا۔“ شیخ زادہ نہاوندی بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی خاطر غلاموں کی ٹولی کے ساتھ خالی گھروں کی تلاشی لینے روانہ ہو گیا۔

اس دن بادشاہ کے مزاج میں بڑی خوشگوار کمی تھی۔ اسے اس احساس نے خوش کر رکھا تھا کہ اس کے ایک حکم پر دہلی کی آبادی ویرانے میں بدل گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے عبداللہ سے دریافت کیا۔

”آقا زادے! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اب یہاں رہنا ممکن نہیں رہا؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اسی لیے میں یہ فیصلہ آپ کے گوش گزار کرنے آیا ہوں کہ میں بھی بادشاہ کے ساتھ دولت آباد چلوں گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ہاں، دولت آباد چلنا آپ کے لیے یوں بھی مفید رہے گا کہ وہاں سے سورت کی بندرگاہ بہت قریب ہے۔ آپ سورت سے بہ آسانی ایران روانہ ہو سکیں گے۔“

عبداللہ پکرا گیا، ہوش و حواس جواب دے گئے۔ بادشاہ نے کن انکھیوں سے عبداللہ کی طرف دیکھا، کہا۔ ”کیا یہ غلط ہے کہ آپ اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں؟“

اس وقت عبداللہ کی وہی کیفیت تھی جو سورت سے تھوڑی دیر پہلے قتیہ عقیف الدین کی رہی ہوئی۔ عبداللہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بادشاہ نے قاضی کمال الدین سے کہا۔ ”کیوں قاضی کمال الدین! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا تو بھی اس مشورے میں ان کا شریک نہیں تھا؟“

قاضی کمالی الدین کو کبھی اپنی موت آنکھوں کے سامنے نہیں کرتی نظر آئی۔

بادشاہ نے عبداللہ سے کہا۔ ”آقا زادے! کیا میں نے آپ کی سب سے زیادہ عزت نہیں کی؟ کیا میں نے آپ کو کبھی بھی کوئی تکلیف دی؟ نہ صرف یہ کہ میں نے آپ کی عزت کی بلکہ دوسرے امراء کو بھی آپ کے آگے جھکا دیا۔ اس عزت و احترام اور الطاف و عنایات کے بعد بھی اگر آپ چوری سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ جاسکتے ہیں، میں آپ کو روکوں گا نہیں بلکہ میرے آدمی آپ کو سورت کی بندرگاہ تک پہنچا دیں گے۔ آپ مال و دولت کے انبار اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں

سامنے کھڑی کھلا رہی تھی اور لطف لے رہی تھی۔ خیر چوں سے اسے تباہ و برباد کر دیں گی۔ اس لیے ایک وقت میں ایک ہی بیوی رہنا چاہیے۔

بادشاہ اپنے امراء، قاضی کمال الدین اور عبداللہ کے ساتھ دولت آباد روانہ ہو رہا تھا۔ فتح زادہ نہادندی نے شہر کے ایک ایک گھر کی چھان بین کے بعد دو ایسے آدمی پکڑ لیے جو دولت آباد نہیں گئے تھے۔ ان میں ایک اندھا تھا، دوسرا لنگڑا تھا۔ بادشاہ نے نہادندی کو حکم دیا۔ ”اندھے کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں اور لنگڑے کو دولت آباد تک گھسیٹ کر لے جایا جائے۔“

دہلی کا یہ آخری قافلہ بھی دولت آباد روانہ ہو گیا۔ لنگڑے کو چالیس دن تک گھسیٹا گیا۔ وہ چند گھنٹوں بعد ہی مر گیا تھا لیکن بادشاہ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اس کے سارے اعضا کٹ کٹ کر راستے ہی میں گرے رہے یہاں تک کہ جب وہ لوگ دولت آباد میں داخل ہوئے تو فتح زادہ نہادندی کے ہاتھ میں لنگڑے کی ایک ٹانگ ہی باقی رہ گئی تھی۔ بادشاہ کے دوسرے حکم سے اسے دولت آباد کے دروازے پر پھینک دیا گیا۔

عبداللہ نے روائی کی تیاریاں کر لیں اور اپنے دوستوں سے الوداعی ملاقاتیں کرنے لگا۔ بادشاہ کا تعاون عبداللہ کا شامل حال رہا۔ قاضی کمال الدین اس سے ملنے آیا تو عبداللہ نے کہا۔ ”قاضی کمال الدین! میں نے خیران کے سلسلے میں تجھ سے جو وعدہ کیا تھا، آج اسے پورا کر دینا چاہتا ہوں۔“

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”وہ میرے لیے قابل قبول نہیں رہی۔“

عبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

قاضی کمال الدین نے جواب دیا۔ ”یہ میں اس وقت بتاؤں گا جب آپ سورت روانہ ہو رہے ہوں گے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن میں خیران کو طلاق دے چکا ہوں اور اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔“

قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”اے بادشاہ کے سپرد کر دیجیے۔ وہ جسے مستحق یا مناسب سمجھے گا، بخش دے گا۔“

عبداللہ نے یہی کیا اور خیران کو بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ”آپ اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”جناب والا! میری ایک بیوی وطن میں موجود ہے اس لیے اگر میں خیران کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تو دونوں آپس میں لڑمیں گی اور میری زندگی

غلاموں اور خدمت گاروں نے عبداللہ کو سامنے کھڑا دیکھا تو ان کے چہرے مر جھک گئے۔ وہاں چار اغاں جیسا منظر تھا اور اس تیز روشنی میں ان کی پریشانی اور بے چینی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

خیران نے پلٹ کر عبداللہ کی طرف دیکھا اور پھر مر جھائے چہرہ کو حکم دیا۔ ”تم لوگ پریشان کیوں ہو؟ گھبرا کیوں گئے؟ آزادی سے کھاؤ، ڈرومت۔ سمجھ لو یہ آخری کھانا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا، کسی کو نہیں معلوم۔“

عبداللہ نے نہایت کرب سے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہائے ہائے، ہر چیز کا زیاں، ہر شے کی فضول خرچی۔ میں تو لٹ گیا، تباہ ہو گیا۔ یہ اتنے بہت سارے چراغ کس نے جلائے ہیں اور یہ اتنا بہت سارا کھانا کس نے اور کس کے حکم سے تیار کیا ہے؟ اور یہ حرام خورد و نوش کی طرح کس کے حکم یا اجازت سے کھا رہے ہیں؟“

خیران نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ سب کچھ میرے حکم اور میری مرضی سے ہوا ہے کیونکہ دہلی چھوڑنے کی خوشی میں ہم پر یہ دعوت فرض تھی۔“

عبداللہ نے جلدی جلدی چراغ بجھانے شروع کر دیے، بولا۔ ”خیران! میں تجھے طلاق دے دوں گا۔ میں ایسی فضول خرچ عورت کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔“

خدمت گار اور غلام ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ خیران نے عبداللہ کو روکنے کی کوشش کی مگر اس کے ایک دھکے میں دور جا کر۔ عبداللہ نے کھانوں کی قاتیل الٹ دیں اور دسرخوان ہوا میں اچھال دیے۔

خیران، عبداللہ کو قہر کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ نہایت غصے اور حسرت سے پوچھا۔ ”یہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کا فائدہ؟“

عبداللہ نے جواب دیا۔ ”یہ سب کچھ میری مرضی اور اجازت سے نہیں ہوا تھا اس لیے میں بھی اس سے کسی کو لطف اندوز نہیں ہونے دوں گا۔“

خیران بہت کھیا گئی تھی۔ عبداللہ کے سامنے سے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”اب میں خود بھی تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی، مجھے طلاق دے دو۔“

عبداللہ کو اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ساری رات سو نہیں سکا اور خوب سوچنے اور غور کرنے کے بعد بھی وہ اپنے اسی فیصلے پر قائم رہا کہ خیران کو طلاق دے دی جائے۔ اس نے سوچا اگر خیران اور زبیدہ مل گئیں تو دونوں اپنی شاہ

اجرن ہو جائے گی۔“

تھی۔ مسجد سے ملحق مدرسہ مستنصریہ تھا۔ اسے بھی اس کے دادا ہی نے بنوایا تھا۔

بادشاہ نے قاضی کمال الدین کو حکم دیا۔ ”خیزران اور اس کے بچے کو تو رکھ لے، یہ میرا حکم ہے۔“
عبداللہ مسکرا دیا مگر قاضی کمال الدین کا چہرہ اتر گیا۔ اسی دن خیزران اور اس کے بچے کو قاضی کمال الدین کے حوالے کر دیا گیا۔

کچھ دنوں بعد یہ بیوی اور لڑکے کی تلاش میں کرمان چلا گیا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ بیوی تو مرچکی ہے اور لڑکا بری صحبتوں میں پڑ کے معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ اب وہ بالکل تنہا تھا۔ وہ بغداد واپس گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ خیزران اور اپنے بچے کو ساتھ لیتا آتا تو زندگی خوشوار ہو جاتی۔

بادشاہ کے آدمیوں نے عبداللہ کو اس کے مال و دولت کے ساتھ سورت تک پہنچا دیا۔ وہاں اسے خوش قسمتی سے جہاز تیار مل گیا جو بحیرہ عرب سے خلیج فارس جانے والا تھا۔

ایک دن اس نے مدرسہ مستنصریہ سے ایک نوجوان طالب علم کو ٹکٹے دیکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا کسٹن ملازم کتا میں لیے چلا جا رہا تھا۔ کسی راہ گیر نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے دوست! کیا تم اس کسٹن ملازم کو پہچانتے ہو؟“

قاضی کمال الدین اسے سورت تک چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں اس نے عبداللہ کے کان میں کہا۔ ”کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے خیزران کو قبول کرنے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں نہیں جانتا۔“
قاضی کمال الدین نے کہا۔ ”مجھے ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ خیزران بادشاہ کی مخبر تھی اور وہ اب تک جس کسی کے پاس بھی رہی ہے، بادشاہ کے لیے اس کی سراغ رسانی کرتی رہی ہے۔“

عبداللہ سنائے میں آگیا، پوچھا۔ ”اب کیا ہوگا؟“
اب تو وہ تیری سراغ رسی کرے گی۔“

عبداللہ کا دل بھر آیا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اس لاوارث کا وارث بن جائے لیکن اس کی بری عادتوں اور فضول خرچی کے پیش نظر وہ اتھ بھینچ رہا۔ ہاں اس نے یہ ضرور کیا کہ اپنے مکان کا وہ دروازہ جو مدرسہ مستنصریہ کی طرف کھلتا تھا، چنوا دیا اور اپنی آمدورفت دوسری طرف سے کر دی۔

عبداللہ نے کہا۔ ”میں کہیں بھی رہوں، تیرے لیے دعا گو رہوں گا۔ خدا تجھے خیزران کے شر سے محفوظ رکھے۔“

لیکن اس عمل کے بعد بھی اس کا اس عذاب سے بچھا نہیں چھوٹا۔ اب اس کے خیالات کی نظر میں بغداد اور دولت آباد کے درمیان حائل ایکاہی فاصلے کو طے کرتی ہوئی ایک ایسا ہی دوسرا منظر دیکھنے لگی تھیں جہاں خیزران کا بیٹا کسی دوسرے امیر کے بیٹے کی کتابیں اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا اور لاوارث کی زندگی نے اسے بھی غلط کاروں کے حوالے کر کے بری عادتوں کا عادی اور فضول خرچ بنا دیا تھا..... اور یہ ایک ایسا منظر تھا کہ ایسے کسی دروازے کو بند کر کے نظروں سے اوجھل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

عبداللہ کا جہاز ہندوستان کے ساحلی شہروں سے گزرتا ہوا خلیج فارس روانہ ہو گیا۔ کئی ہفتوں بعد وہ خلیج فارس میں داخل ہو گیا پھر وہ ابادان کے سامنے جنوبی ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ یہاں سے بصرہ بہت قریب تھا۔ عبداللہ یہاں سے بصرہ چلا گیا۔ بصرہ سے بغداد پہنچا اور بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مال و دولت پاس تھی، ایک شاندار مکان خرید کر رہنے لگا۔ یہاں سے اس کے دادا مستنصریہ باللہ کی بنوائی ہوئی مسجد بہت قریب

کہانی کے تاریخی مآخذ

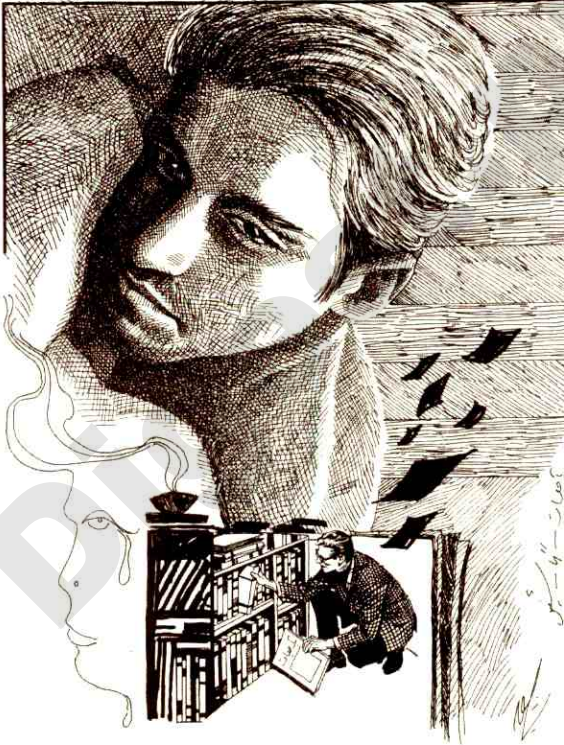
تاریخ بغداد	تمدن عرب	تاریخ ایران	المامون	مجمع البلدان	تاریخ اسلام	طبقات ہامری
خطیب بغدادی	ذاکندہ گستاوردی	قبول بیگ بدخشی	شلی نعمانی	یقوت حموی	معین الدین احمد لندی	منہاج سراج

سادہ منصوبہ

امجد رئیس

انسان منصوبہ چاہے جو بھی بنا لے اس کا پورا ہونا یا نہ ہونا اس کے مقدر پر منحصر ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسے منصوبے جن سے کسی کو نقصان بھی ہو۔ ہمیشہ مکافات کو دعوت دینے کے مرحلے سے گزر کر تکمیل پاتے ہیں۔ کچھ یہی حال اس کا بھی ہوا یہ اور بات کہ منصوبہ سادہ تھا مگر تھا جاندار۔

عمل اور عمل کے درمیان خونی رماشی کا عبرت اثر مقرر



”تمہیں تلاش کرنے میں مجھے کافی وقت لگا۔“ اس نے کہا۔ پھر کرسی کھسکا کر اس کی میز پر ہی ٹک گئی۔
 بیڑ کی چسکی لے کر اس نے عورت کو دیکھا۔ وہ ایک جوان عورت تھی لیکن اتنی بھی نہیں۔ آنکھوں کے نیچے عمر کی علامت کو اس نے میک اپ کے ذریعے نمایاں ہونے سے روکا ہوا تھا۔
 ”تمہیں یقین ہے کہ میں وہی ہوں، جس کی تمہیں تلاش ہے؟“

”اگر تمہارا نام ”جو“ ہے تو پھر یقیناً تم وہی ہو۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جو۔“

”مجھے ایک کام کرانا ہے۔“ عورت نے مدعا بیان کیا۔

”جواب؟“

”ہاں، ایک جواب ہے۔“

”میرے بارے میں تمہیں کس نے بتایا؟“

”ایک شناسانے۔ وہ ایک فرانسوی سٹریٹ کا مالک تھا۔“

”اں..... ہاں..... ابرام، اس نے اسٹریٹ کو آگ

لگادی تھی۔“

”اس نے نہیں، اس کی بیوی نے۔“ عورت نے

تردید کی۔

”خیر، کس نوعیت کا کام ہے؟“ جو نے سوال کیا۔

عورت نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”کیا ہم یہاں بات

کر سکتے ہیں؟“

”کیوں یہاں تمہیں پولیس نظر آ رہی ہے کیا؟“ جو

مسکرایا۔ وہ جواب دینے والی تھی کہ اسے اندازہ ہو گیا کہ جو

مذاق کر رہا ہے۔

”تروس ہونے کی ضرورت نہیں۔“ جو نے کہا۔

”تم..... کہیں..... اس نے گلاس کی طرف نظر کی پھر نگاہ

اٹھائی۔ ”تم کسی کو میرے ذریعے.....؟“

”اوہ نو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔“ عورت نے جواب دیا۔

”پھر کیسی جواب ہے؟“

”لقب زنی، چوری.....“ عورت کو مناسب الفاظ تلاش

کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ جو نے بیڑ کی طرف اشارہ کیا

لیکن عورت نے فنی میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ

تم میرے گھر میں کس کر میرے زیورات چروالو۔“

”تمہارے اپنے زیورات چروالوں؟ یعنی انشورنس کا

معاملہ ہے؟“

”ہاں، مجھے رقم کی ضرورت ہے۔“

”پھر تمہیں وہ جواہرات واپس کر دوں؟“

”ویل، یس۔“ عورت نے اقرار کیا۔

”اور اس خدمت کے عوض تم مجھے ادائیگی کرو گی؟“

”اکل۔“

”یقینی؟“

”ایک ہزار ڈالر۔“ عورت نے جواب دیا۔

”کم نہیں ہیں؟“

”میرے خیال میں زیادہ ہیں۔“ عورت نے کہا۔

”ہزار ڈالر کے لیے، کیا یہ رسی جواب نہیں ہے؟“

”تمہیں شاید پیسوں کی ضرورت نہیں ہے؟“

”ضرورت تو ہے۔“ جو نے دانت نکالے۔

”تو پھر رسک کو ذہن سے نکال دو۔“

”تم کہاں رہتی ہو؟“

”1636 میرین کورٹ۔“

اس نے ترہنوں پر زبان پھیری اور گویا ہوا۔ ”شہر سے

میرین کورٹ ایک آپرکلاس سوسائٹی ہے، مکانات بڑے اور ان

کے درمیان فاصلہ ہے۔“ جو نے معلومات کا مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

”وہاں، تمہارے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟“

”صرف، میرا شوہر۔“

”کیا وہ بھی ملوث ہے، اس معاملے میں؟“

”نہیں، وہ لاعلم ہے۔“

”ہوں..... س..... س.....“ جو نے مسکرا کر تھنبی انداز

میں سر ہلایا۔

”کسی وجہ سے میں نہیں چاہتی کہ وہ اس بارے میں

باخبر رہے۔“

”یعنی تمہارا کوئی ذاتی مسئلہ ہے؟“

”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔“

جو نے مزید بیڑ انڈلی اور گھونٹ بھرا۔ ایک بار میں

زیورات چرایتا ہوں تو تم کو کیسے یقین آنے لگا کہ میں واپس کر

دوں گا؟“

”مجھے اعتبار کرنا پڑے گا۔“ وہ بولی۔

جو نے فنی میں سر ہلایا۔ ”میں ایک چور ہوں۔“

عورت نے تیور ہاں چڑھائیں۔ ”اگر تم زیورات

واپس نہیں کرو گے تو میں پولیس کو بتا دوں گی۔“

جو نے پھر سر کو فنی میں جتیش دی۔ ”میں کہہ دوں گا کہ تم

نے خود مجھے باز کیا تھا۔“

”تم ثابت نہیں کر سکو گے۔“ وہ بولی۔

”اگر میں کہوں کہ میں ثابت کر دوں گا..... پھر؟“

”پھر بھی، کیا تم خود بھی نہیں پھنس جاؤ گے؟“ عورت

الجھن میں پڑ گئی۔

”انشورنس کا مطلب زیورات بیش قیمت ہیں۔ تو میں

زیورات کے ساتھ فرار کیوں نہ ہو جاؤں؟“

عورت کے چہرے پر ایک سایہ آکے گزر گیا۔ وہ

خاموش تھی، جیسے سوچ رہی ہو کہ ٹیسی رہے یا اٹھ جائے۔

جو نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ ”پریشان مت

ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں واپس کر دوں گا۔ میری اپنی ایک

بیوی۔ ”میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔“

شوہر۔ ”کتنی عزت؟“

بیوی۔ ”اتنی کہ اگر آپ بیڈ پہ بیٹھے ہوں تو میں صوفے پہ بیٹھوں گی۔“

شوہر۔ ”اگر میں صوفے پہ بیٹھ گیا تو؟“

بیوی۔ ”تو میں موڑھے پہ بیٹھوں گی۔“

شوہر۔ ”اگر میں موڑھے پہ بیٹھ گیا تو؟“

بیوی۔ ”تو میں پیڑھی پہ بیٹھوں گی۔“

شوہر۔ ”اگر میں پیڑھی پہ بیٹھ گیا تو؟“

بیوی۔ ”تو میں زمین پہ بیٹھوں گی۔“

شوہر۔ ”اگر میں زمین پہ بیٹھ گیا تو؟“

بیوی۔ ”میں گڑھا کھود کے اس میں بیٹھوں گی۔“

شوہر۔ ”اگر میں گڑھے میں بیٹھ گیا تو؟“

بیوی غصے سے۔ ”تو میں گڑھے کو مٹی سے

بھردوں گی، کمبخت تیرے کو عزت راس نہیں

آتی۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کریمزوی،

اورنگی ٹاؤن، کراچی

”آئی ایم سوری..... لیکن.....“

”پلیز، میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں گن کی ضرورت

نہیں پڑے گی۔ میں..... میں وہ گن خالی کر دوں

گی۔“ ٹیری نے جو یقین دلانے کی کوشش کی۔

”گن ساتھ لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اسے

ضروری استعمال کروں گا۔“ جو نے اسے سمجھایا۔ کچھ دیر کی

بھٹکتے بعد ٹیری رضامند ہو گئی۔

”گھر میں کوئی پالتو جانور ہے؟ کتا، بلی وغیرہ؟“

”نہیں۔ کچھ نہیں۔“

”ایک سوال۔“ ٹیری نے کہا۔ ”بعد میں رابطہ کیسے

ہوگا؟“

جو نے کاغذ کے ٹکڑے پر ایک نمبر گھسیٹا اور ٹیری کے

حوالے کر دیا۔ ”اسے ازبر کرو اور پھاڑ کر پھینک دو۔ میں اس

نمبر پر ملوں گا۔ اگر نہیں ملا تو نمبر پر جو بھی ہوگا وہ تمہیں میرے

بارے میں بتا دے گا۔“

ساتھ ہے۔ میں اپنے گاؤں کو ڈیل کر اس نہیں کرتا۔ صرف دو باتیں ہیں کہ اگر تم نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا تو میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا اور دوسری بات.....“

”میں اپنا ذہن کیوں تبدیل کروں گی، مجھے یہ کام کروانا ہے۔“ عورت نے اس کی بات کاٹ دی، وہ مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

”تم نے دوسری بات نہیں سنی۔“ جو نے اسے ٹوکا۔

”ہاں، دوسری بات کیا ہے؟“

”بندہ موڈ الرزلوں گا۔“ جو نے غور سے عورت کو دیکھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی، جیسے فیصلہ کر رہی ہو۔ ”ٹھیک ہے۔“ عورت نے ہامی بھری۔

”تمہارا نام؟“

”ٹیری..... ٹیری ولن۔“

”ٹھیک۔ کام کب کرنا ہے؟“ جو نے سوال کیا۔

”کل رات۔“

”اتنی جلدی؟“ جو نے معمولی حیرت کا اظہار کیا۔ وہ

خاموش رہی۔ ”اوکے، وقت بتاؤ؟“ جو نے استفسار کیا۔

”2 A.M.“ وہ بولی۔ ”تم پچھن ڈور سے آؤ گے جو

تمہیں ان لاک ملے گا۔ جبوری تمہیں پچھن سے ملحقہ کمرائے

استراحت میں میز پر ملے گی۔“ ٹیری ولن نے وضاحت کی۔

”تمہارے شوہر کو یہ عجیب نہیں لگے گا؟“

”نہیں۔ وہ ڈنر کے بعد اس طرف نہیں آتا..... جب

تم روانہ ہونے لگو تو جاتے جاتے کھڑکی کا شیش توڑ دیتا۔“

”کیوں؟“

ٹیری کا چہرہ چمک اٹھا۔ جیسے اس نے کوئی بہترین

آئیڈیا پیش کیا ہے۔ ”اس طرح پولیس کو پتا نہیں چلے گا کہ

تمہیں پچھن کا دروازہ ان لاک ملا تھا۔“

”نخوب، کیا شیش ٹوٹنے کی آواز تمہارے شوہر کے

کانوں تک نہیں پہنچے گی؟“

”وہ گہری نیند سوتا ہے..... ویسے بھی ہمارا کمر اسٹینڈر

کے اوپر مکان کے دوسری جانب ہے۔“

”اس کے پاس گن وغیرہ ہے؟“

”گن؟ ہاں..... لیکن کیوں؟“ ٹیری نے پوچھا۔

”اس کے بیدار ہونے کا امکان بہر حال موجود ہے

گا، جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لیے مجھے اپنی گن

ساتھ رکھنی پڑے گی۔“

”نہیں..... نہیں..... اس کی ضرورت پیش نہیں آئے

گی۔“ ٹیری نے تیزی سے انکار میں سر ہلایا۔

میری نمبر یاد کر نے لگی۔ ”تم بھولو گے تو نہیں، کل رات دو بجے؟“ اچانک اس نے سوال کیا۔
جو مسکرایا۔ ”میرا پیشہ ہے یہ!“

☆☆☆

اگلی رات جو کی گہرے نیلے رنگ کی کار میرین 1636 سے چار بلاک کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہاں سے وہ پیدل میری کے گھر تک پہنچا۔ یہ آسانی دیوار پھاند کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ہاتھوں پر دستاں چڑھا کر اس نے عقبی حصے میں کچن کی ڈور تاپ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچن کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ اس نے دھیرے سے دروازہ کھولا اور خاموشی سے کچن میں داخل ہو گیا۔ عقب میں دروازہ بند کر کے اس نے جب سے کچن لائٹ نکالی، کچن لائٹ کی لکیر غماز روشنی کچن میں گردش کر رہی تھی۔ مدھم روشنی میں جو نے لمحہ کمرائے استراحت کے دروازے کو دیکھ لیا۔ چند ساعت بعد وہ کمرے میں تھا۔ یہ دروازہ بھی اسے کھلا ملا تھا۔ میز پر چمڑے کا باکس رکھا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے باکس کھولا۔

جو اہرات کی رنگ برنگ کرنوں نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔ زیورات اس کے اندازے سے زیادہ بیش قیمت تھیں۔ اس کی نیت اٹوا ڈول ہو گئی۔ جو نے خود کو سنبالنے کی کوشش کی..... لیکن یہ ایک دشوار کام تھا۔ سخت دشوار، تاہم اس نے جڑے سے بھیج کر ڈبا بند کر دیا۔ اسے اپنی ساکھ اور وعدہ عزیز تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

معا چوبی فرش پر مدھم آہٹ ہوئی۔ وہ پھرتی سے گھوم گیا۔ گھومتے گھومتے نہ صرف اس نے مدھم روشنی کل کر دی تھی بلکہ بغل کے نیچے موجود اعشاریہ 138 بجیل بھی اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ اس کی تجربہ کار ساعت نے بتا دیا تھا کہ یہ چوبی فرش پر قدم کا دباؤ تھا جس نے معمولی آواز پیدا کی تھی۔

”میلو“، نسوانی آواز مدھم اور قریب تھی۔ ”جو، تم ہو؟“ آواز پہچان کر اس نے لائٹ آن کر دی۔ وہ خالی ہاتھ دروازے میں کھڑی تھی۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ جو نے اس کے چہرے پر روشنی ڈالی۔

”میں نروس تھی، مجھ سے رہا نہیں گیا، میں تمہیں دیکھنے آ گئی۔“
”تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔“
”بے فکر ہو، وہ بے خبر سویا ہوا ہے۔“ میری نے کہا۔
”کام ہو گیا؟“
”مجھو ہو گیا۔“ جو نے بند ڈبے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

”ایک منٹ رکو۔“ میری نے اشارہ کیا۔ ”میں ایک زور تو رکھتا بھول ہی گئی تھی۔ اسے بھی ساتھ رکھ لو۔“ اس نے اپنے گاؤں کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میری کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا پستول تھا، پستول سے دو گولیاں نکل کر جو کے سینے میں داخل ہو گئیں، وہ لوکھڑا کر پیچھے گیا اور دیوار سے ٹکرایا۔ میری کی موجودگی نے اسے بے پروا کر دیا تھا، بے دھیانی سے پکڑا ہوا اس کا اپنا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ پھسلتا ہوا ز میں بوس ہو گیا۔

میری قطعی ایک مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے جس پھرتی اور صفائی سے اچانک وار کیا تھا، اسی سرعت کے ساتھ وہ آگے بڑھ کر جھکی اور جو کا پستول اٹھالیا۔ جو نے پستول پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ شدید زخمی ہو چکا تھا، خون تیزی سے اس کے زخموں سے بہہ رہا تھا۔ تاہم ابھی اس میں جان باقی تھی۔ ”کیوں؟“ اس نے قہارت زدہ آواز میں سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں غیر یقینی کا عنصر نمایاں تھا۔

”تم دیکھ لو گے۔“ میری کے چہرے پر قاتلانہ رنگ گہرا تھا۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ ”ٹام!“ وہ زور سے چلائی۔ جواب میں خاموشی تھی۔ ”ٹام!“ وہ پھر چیخی اس کے ہاتھ میں جو کا پستول تھا، ہاتھ پر اس نے رومال ڈال دیا تھا۔

”کیا مصیبت ہے؟“ مکان میں کسی جانب سے جھلائی ہوئی آواز آئی۔
”یہاں آؤ، میں کچن کے ساتھ والے کمرے میں ہوں۔“
”لعنت ہے، اس وقت تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“
”آکر دیکھ لو، بڑی گڑبڑ ہے.....“ پھر اس نے مرتے ہوئے جو کی طرف دیکھا۔ ”کچھ سمجھ میں آیا؟“
وہ جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ٹام دروازے سے نظر اٹھا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے 38۔

پستول کی گولی نے اس کی پیشانی پر سرخ نیکال دیا۔ میری نے دوسرا پستول صاف کر کے مردہ شوہر کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”تمہارا ہتھیار تمہیں ابھی مل جائے گا۔“ اس نے نیم مردہ جو کو مخاطب کیا۔ ”پہلے میں چند اور کام نمٹا لوں۔“ وہ اس وقت ایک نیم پاگل اور خطرناک قاتل کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ جو کی ذوقی سماعت نے سنا کہ وہ کچن سے پولیس کو فون کر رہی تھی۔ جو نے آخری آواز جوئی وہ کچن کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی تھی..... ظاہر ہے کہ شیشہ کو باہر سے توڑا گیا تھا۔



وحشی

کاشف زبیر

انسان خود کو چاہے کتنا ہی مہذب ظاہر کرے مگر جب ثابت کرنے کا وقت آتا ہے تو مشکل میں پڑ جاتا ہے کیونکہ... اندر سے ہر انسان وحشی ہوتا ہے یہ اور بات کہ حالات و واقعات کبھی کبھی اس درندے کو اندر ہی اندر سلا دیتے ہیں اور کبھی وحشی بنا کر دلہوز داستانیں رقم کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ بھی زمین کے اس حصے میں جا پہنچے تھے جہاں انسان اور انسانیت کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔

قوموں کی منفرد شناخت کے نام پر خونیں دشتوں کی روداد

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا کارڈ دکھا سکتی ہوں۔“
عورت کی آواز میں ایک نوع کی سنسنی اور کشش تھی۔
اس کے سامنے سیاہ اسکرٹ اور سفید بلاؤز میں... کئی قدر
طویل قامت، متناسب الاعضاء اور حسین نقوش کی حامل ایک
عورت موجود تھی۔ اس کی سرمئی مائل شفاف نیلگوں آنکھوں
میں سحر تھا اور سنہری بال سلیقے سے جوڑے کی صورت میں
بندھے ہوئے تھے۔ کارل کے مکان کے آگے ایک شاندار
سیاہ گاڑی کے ساتھ دو سیاہ سوٹ پوش کھڑے تھے اور ایریا

کارل اولیور... کرسی پر دراز تھا اور اس کے منہ
پر تنکوں کا ہیٹ تھا مگر اسے سوراخوں سے اندازہ ہو گیا کہ
کوئی اس کے سامنے آیا تھا اور پھر ایک پرکشش نسوانی آواز
آئی۔ ”کارل اولیور...؟“
”ہی... اس نے منہ سے ہیٹ ہٹائے بغیر کہا۔
”میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔“
”دکس سلسلے میں؟“
”اگر تم اپنے منہ سے ہیٹ ہٹاؤ تو میں یو ایس

لگ رہا تھا کہ وہ اس عورت کے گاڑے تھے۔ عورت نے اپنا کارڈ سامنے کیا ہوا تھا اور اس پر اس کا نام ریٹولن اور عہدہ لکھا ہوا تھا۔ وہ آفیسر فار پرسنل تھی۔ کارل نے بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور سر ہلایا۔ ”ویلم مس ولن ان مٹاؤس، برازیل۔“

”شکریہ کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“ کارل اٹھ بیٹھا۔ ”پائی دی وے برازیل کی سرزمین پر میں نے تم سے زیادہ حسین امریکی عورت آج تک نہیں دیکھی۔“

”تعریف کا شکریہ ڈاکٹر پروفیسر کارل اولیور۔“ ریٹا کا لہجہ بد ہو گیا۔

”اوہ تو تم جانتی ہو مجھے۔“ کارل مسکرایا۔

”اسی لیے تو تمہارے پاس آئی ہوں۔“ ریٹا ولن۔۔۔

.... اس کے سامنے کرسی پر تنگ مٹی۔ اس کے بیٹھے کا انداز بھی بہت دل کش تھا۔ ”تم نے جنوبی امریکا کی قدیم ثقافتوں پر تحقیقی کام کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ تم جنوبی امریکا میں پائے جانے والے بہترین امریکی آرکیالوجسٹ ہو۔“

”میں امریکی تھا اب میں برازیلین ہوں۔“ کارل نے تصحیح کی۔ ”میرے پاس برازیل کا پاسپورٹ ہے۔“

”اوکے اب تم برازیلین ہو۔“ ریٹا نے تسلیم کر لیا۔ ”مگر تمہارا امریکا سے تعلق تو ہے؟“

”تھا۔“ کارل کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔ ”پانچ سال پہلے جب میں وہاں سے نکلا تو سارے تعلق توڑ کر آیا تھا اب میں ڈاکٹر نہیں ہوں آرکیالوجسٹ بھی نہیں ہوں صرف ایک گائڈ ہوں جو سیاحوں کو امیزون کی سیر کراتا ہے اور یہی میری روزی کا ذریعہ ہے۔“

”میں جانتی ہوں اور اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

کارل نے اٹھ کر آئیں کس سے ایک عدد میز کی بوتل نکالی اس کا ڈھکن کھولا اور ایک ہی سانس میں اسے آدھا کر کے بولا۔ ”سوری مس ولن میں ابھی کام کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”میں تمہیں معاوضہ دوں گی۔“ ریٹا نے آفر کی۔ ”اس سے زیادہ جو تم عام طور پر لیتے ہو۔“

”میں صرف چند کھٹے پہلے ایک طویل سفر سے آیا ہوں اور گزشتہ دو ہفتوں سے ایک رات بھی ڈھنگ سے نہیں سو سکا ہوں اس لیے میری طرف سے معذرت قبول کرو، ویسے تمہیں انکار کرتے ہوئے میرا دل دکھ رہا ہے۔“

ریٹا نے اس کے انکار کو جیسے سنا ہی نہیں اور اس نے

اپنے پرس سے درمیانے سائز کا شیب نکالا اور بولی۔ ”کیا بہتر نہیں ہوگا کہ تم انکار سے پہلے ایک بار میری بات سن لو اور میری آفر.....“

”میں انکار کر چکا ہوں۔“ کارل نے بوتل خالی کر کے کہا۔ ”اس لیے اصرار مت کرو میں نے کہا تھا مجھے دکھ ہو رہا ہے۔“

”اوکے مسز اولیور۔“ ریٹا نے گہری سانس لی اور شیب واپس رکھ لیا۔ ”تمہاری مرضی۔“

”ہائے۔“ کارل نے دوبارہ ہیٹ منہ پر رکھ لیا مگر اس طرح کہ اسے جھری سے ریٹا کا سر ایا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سبز جھیل کی طرف بڑھی اور پھر رک گئی۔

”مسز اولیور میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

”میں سن رہا ہوں۔“

”چار مہینے پہلے سان فرانسسکو سے نوجوانوں کی ایک تحقیقی ٹیم امیزون کی طرف گئی تھی۔ اس کا لیڈر جان چارلز تھا۔ تقریباً ستائیس برس کا جان چارلز بہترین ایکسپلورر اور ماہم جو ہے۔ اسے انٹارکٹیکا کی ماہم سے شہرت ملی۔ میرن اس کی ساتھی اور محبوبہ ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ماہمات پر جاتی رہی ہے۔“ ریٹا نے بات جاری رکھی۔ ”کرس کلیر، جان کا نائب اور بہترین فوٹو گرافر ہے جب کہ جرج فرسٹ اس کا نائب اور وہ بھی فوٹو گرافر ہے۔ اس کے ذمے ویڈیو بنانا تھا۔“

”میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔“ کارل نے کہا۔ ”وہ گائڈ کے لیے پہلے میرے پاس آئے تھے۔“

”اور تم نے انکار کر دیا؟“

”کیونکہ وہ کینی بال قبائل کے علاقے کی طرف جانا چاہتے تھے۔“

”انکار کی وجہ؟“

”کینی بال قبائل اپنے علاقے میں اجنبیوں کی آمد پسند نہیں کرتے ہیں اور وہاں جانے والے عام طور سے واپس نہیں آتے۔“

”وہ چاروں بھی واپس نہیں آئے اور میں انہیں ہی تلاش کرنے آئی ہوں۔“ ریٹا نے کہا اور نیچے اتر گئی۔ اس کے ایک ساتھی نے اس کے لیے گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا اور اس کے اندر بیٹھنے کے بعد وہ بھی گاڑی میں سوار ہوئے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کارل انہیں جاتا دیکھ رہا تھا کہ اندر سے اس کا ساتھی اور ماتحت شان نکلا۔ وہ مقامی سل کانوجوان تھا اور کئی سال سے کارل کے ساتھ تھا۔ اس نے پوچھا۔

”یہ کیون تھی؟“

”ایک بے وقوف امریکی۔“ کارل نے دوبارہ ہیٹ منہ پر رکھ لیا۔
 ”ایک خوب صورت امریکی۔“ شان نے شرارت سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے یہ جان چارلزی ٹیم کی تلاش میں آئی ہے۔“

”ہاں۔“ کارل نے بے پروائی سے کہا۔ ”یہ امیزون ہے یہاں لوگ غائب ہوتے رہتے ہیں۔“
 ”مجھے لگ رہا ہے یہ بھی واپس نہیں آئے گی۔“ شان سنجیدہ ہو گیا۔ ”کیٹنی بال خطرناک قبائل ہیں وہ اپنے علاقے میں باہر کے لوگوں کی آمد پسند نہیں کرتے ہیں۔“

کارل کا خیال تھا کہ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن رینا کے بارے میں خدشہ سن کر وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے اپنی کیفیت نظر انداز کرنا چاہی مگر ناکام رہا۔ شام کو جب سورج غروب ہوا تو وہ گھر سے نکلا۔ اس کی پرانی جیب کارخ منازس کے اس حصے کی طرف تھا جہاں بہترین ہوش تھے اور غیر ملکی سیاح وہیں ٹھہرتے تھے۔ اسے رینا کے بارے میں پوچھنا نہیں پڑا۔ اس کی سیاہ گاڑی اسے ایک ہوٹل کی پارکنگ میں نظر آئی اور اس نے اندر کاؤنٹر پر رینا کے بارے میں پوچھا۔ رینا نے کسی ملاقاتی کے لیے منع کیا تھا اس لیے کاؤنٹر گرل بہ مشکل ہی اسے کال کرنے پر آمادہ ہوئی۔ اس نے رینا کو کارل کے بارے میں بتایا اور پھر فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”میں مسٹر کارل؟“ رینا مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 ”کس سلسلے میں؟“
 ”اسی سلسلے میں جس کے لیے تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔“
 رینا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ”اوپر آ جاؤ، فون کاؤنٹر گرل کو دو۔“

ایک منٹ بعد کارل اس کے خوب صورت کمرے میں رینا کے سامنے تھا۔ وہ شاید ابھی نہا کر آئی تھی کیونکہ ہاتھ رو بہ تھی اور خاصی ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی۔ ہاتھ رو بہ کا گریبان کسی قدر کھلا ہوا تھا اور کارل کی نظریں محسوس کر کے رینا نے اسے ٹھیک کیا۔ ”بولوب کیا کہنا چاہتے ہو کیا تم جانے کے لیے تیار ہو؟“

”نہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی وہاں مت جاؤ۔“
 رینا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”تمہارے خیال میں میں اس ذمے داری کی اہل نہیں ہوں؟“
 کارل نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس ان لوگوں کے

بارے میں کیا معلومات ہیں؟“
 ”جان کی ٹیم برازیل اور پیرو کی سرحد کے پاس مچی تھی۔ رواجی کے ایک ہفتے بعد ان کو آخری بار ایک جرمن سیاح نے دیکھا اور اس کے بعد ان کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئے؟“

”اس سلسلے میں برازیل حکام کا کیا کہنا ہے؟“
 ”ان کا کہنا ہے کہ وہ ممنوعہ علاقے میں داخل ہو گئے ہوں گے اور وہاں جانے والے زندہ سلامت واپس نہیں آتے ہیں۔“

”ممنوعہ علاقہ؟“
 ”کیٹنی بال ریجن۔“ رینا آہستہ سے بولی۔ ”آدم خور قبائل جو اپنے علاقے میں کسی اجنبی کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔“
 ”کیٹنی بال آدم خور ہیں لیکن خطرناک نہیں ہیں۔“ کارل نے ٹی ٹی میں سر ہلایا۔ ”وہ اپنے مردے کھاتے ہیں اور ایسا وہ برکت کے لیے کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو جو جنگوں میں مارے گئے ہوں کھا جاتے ہیں تاکہ ان کی بہادری ان میں شامل ہو جائے۔“

رینا نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ ”وہ آدم خور ہیں اور اس سے زیادہ خطرناکی کیا ہوگی؟“
 کارل نے اس سے پوچھے بغیر سرگٹ نکال کر لگایا اور گہرا کس لے کر بولا۔ ”یہ ان کا کلچر ہے۔ وہ کسی کو صرف کھانے کے لیے نہیں مارتے۔“

رینا شاید بحث کرنا چاہتی تھی مگر اس نے موضوع بدل دیا۔ ”کارل تم جنوی امریکا کی قدیم تہذیبوں پر اتھارٹی ہو۔“
 ”یہ درست ہے۔“

”وہ چاروں بہت اچھے اور مہذب نوجوان ہیں۔ پتا نہیں اس وحشی علاقے میں ان پر کیا گزری ہوگی؟ میں چاہتی ہوں کہ تم یہ جاننے میں میری مدد کرو کہ ان پر کیا گزری ہے؟“

”یہ حکوتوں کا کام ہے۔“
 ”تم نے ٹھیک کہا لیکن بد قسمتی سے برازیل حکام ایک حد سے زیادہ مدد پر آمادہ نہیں ہیں کیونکہ یہ علاقہ پیرو کے ساتھ لگتا ہے اور یہاں سرحد بھی متنازعہ ہے۔“

کارل سوچ میں پڑ گیا۔ شاید رینا کی جگہ کسی اور نے اس سے کہا ہوتا تو وہ صاف انکار کر دیتا مگر اسے انکار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے سر ہلایا۔ ”اوکے لیکن میرے کچھ سوالات ہیں۔“

”میرے پاس ہر سوال کا جواب ہے۔“ رینا خوش

ہوگئی۔

”پہلا سوال، اس اضافی مہم کے اخراجات کون برداشت کرے گا؟“
”امر کی حکومت برداشت کرے گی اور تمہیں مزید ادائیگی بھی کی جاسکتی ہے۔“

”دوسرے اگر ان لوگوں کے ساتھ وہاں کچھ ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دوسرے بھی خطرے میں ہوں گے، اس کے سد باب کے لیے کیا کیا جائے گا؟“
”برازیلی فوج کا ایک دستہ ہمارے ساتھ جائے گا۔“ رینا نے کہا۔ ”تم بھی مستحق ہو سکتے ہو۔“

کارل نے سر ہلایا۔ ”امریکیوں کو رازداری کا بڑا خطرہ ہوتا ہے۔ میں اس قسم کی رازداری کا پابند نہیں ہوں گا۔“
رینا ہچکچاتی۔ ”دیکھو بعض اوقات کچھ باتیں سب کے سامنے نہیں لائی جاسکتی ہیں۔ اس لیے تم مت گنجائش رکھو۔“
کارل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم میرے بارے میں سب جانتی ہوگی میں گنجائش والا آدمی ہوتا ہوں تو اس وقت کسی امریکی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتا۔“

کارل برا منظم۔۔۔ امریکا کی قدیم نسلوں کے حقوق کا شدید حامی تھا اور اس نے ریڈ انڈین قبائل کے تحفظ اور انہیں برابر کا امریکی شہری قرار دلوانے کے لیے جدوجہد کی تھی اور تا کامی کے بعد دل برداشتہ ہو کر وہ ہمیشہ کے لیے امریکا چھوڑ کر یہاں آبا تھا۔

”میں جانتی ہوں۔“ رینا نے کہا۔ ”لیکن تم ایک نظر یہ دیکھ لو۔“ اس نے ٹیب کارل کے سامنے کیا اور ایک ویڈیو چلائی۔ ”یہ آخری ویڈیو ہے جو ان کی طرف سے ملی تھی۔“

چار نو جوان جن میں ایک لڑکی بھی تھی، میامی۔۔۔ ایئرپورٹ پر تھے اور اپنے سامان سمیت ڈیپارچر کی طرف جا رہے تھے۔ جان اور میرن سامان سنبھال رہے تھے جب کہ کرس اور ورو ویڈیو بنا رہے تھے اور تصویریں لے رہے تھے۔ پھر جہاز ساڈا پاولو کے ایئرپورٹ پر اترتا۔ اس کے بعد وہ مختلف طریقوں سے سفر کرتے ہوئے امیزون کے آخری اہم شہر ٹی فے تک جا پہنچے تھے جہاں سے ایک بڑی بوٹ میں وہ مزید مغرب کی طرف روانہ ہوئے اور ٹی فے سے کوئی سو میل دور ایک جرمن سیاح نے انہیں آخری بار دیکھا جب وہ کینی بال قبائل کے علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ رینا نے ویڈیو دکھاتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

”ان کے چہرے دیکھو اور ان کی عمریں دیکھو، یہ سب بہت اچھے انسان اور امریکی تھے کیا ان کے گھر والوں

کو جاننے کا حق نہیں ہے کہ ان پر کیا گزری؟“
کارل ایک بار پھر خود کو بے بس محسوس کرنے لگا اسے لگ رہا تھا کہ یہ عورت اس سے اپنی بات منکر کر رہے گی۔ اس نے سر آہ بھری۔ ”ٹھیک ہے لیکن ہمیں یہ سوچ کر جانا ہوگا کہ واپسی کا امکان پچاس فیصد بھی نہیں ہے۔“

”مگر تمہارا کہنا ہے کہ وہ خطرناک نہیں ہیں۔“
”میں نے آدم خوری کے سلسلے میں تردید کی تھی ورنہ کینی بال جنگجو قبائل ہیں اور یہ بہت مہارت سے زہر پلے تیر اپنے دشمن کے جسم میں اتار دیتے ہیں جن پر کسی زہر پلے ترین سانپ کا مہلک زہر ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے آمادہ جنگ ہیں تو ان سے زیادہ خطرناک دشمن کوئی نہیں ہوگا۔ اس لیے تمہیں پوری تیاری کے ساتھ جانا ہوگا۔“

☆☆☆

”میں کیپٹن مولیر ہوں۔“ فوج کی وردی میں ملبوس سیاہ فام کیپٹن نے رینا سے کہا۔ ”میں تمہاری، تمہارے ساتھیوں اور سامان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں۔“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ رینا بولی۔ گری بے پناہ تھی اور اس کی سفید شرٹ بھگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔ ٹی فے کی دریا کی بندرگاہ پر ان کا سامان ایک پانی میں اترنے والے طیارے سے نکال کر جیٹی پر جمع کیا جا رہا تھا اور یہ سامان کچھ دیر بعد ایک بڑی سی مشین میں منتقل کر دیا گیا جس میں انہیں آگے سفر کرنا تھا۔ ان کے ساتھ ایک مقامی افسر بینو الفانے بھی تھا۔ بینو کی رگوں میں اسپین اور پرتگال کا ملا جلا خون تھا۔ برازیل میں پرتگالی نسل کی اکثریت ہے اس لیے یہاں کی زبان اور رسم و رواج پرتگالی ہیں، البتہ ان میں اسپین کی جھلک بھی آتی ہے۔ کیپٹن مولیر کے ساتھ بارہ مسلح فوجیوں پر مشتمل ایک دستہ تھا۔ کارل، بینو اور شان امیزون میں بولی جانے والی مقامی زبانوں سے واقف تھے اور وہ راستے بھی جانتے تھے۔

رینا نے بینو سے پوچھا۔ ”حکومت نے اب تک یہاں کوئی سسٹم قائم کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”سسٹم قائم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ بینو نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ ذرا سی مداخلت پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر زیادہ خطرہ محسوس کریں تو اپنی عورتوں بچوں کو خود کر کے ان کے مرد گھنے جنگلوں میں چلے جاتے ہیں جہاں وہ مرتے دم تک دشمن سے لڑتے ہیں۔“

ایسے لوگ کسی سسٹم کے تحت کہاں رہ سکتے ہیں؟“
رینا دنگ رہ گئی۔ ”یہ اتنے وحشی ہوتے ہیں؟“

لیے دریا کے وسط میں بیٹنگ ڈال دیا کیونکہ کیپٹن مولیر کے خیال میں رات کے وقت کنا سے بڑا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ کارل نے اس کے فضلے کی تائید کی تھی۔ بوٹ کی روشنیاں بھی جل رہی تھیں کہ کوئی بے خبری میں بوٹ تک نہ آجائے۔ اگلی صبح روشنی ہوتی ہی انہوں نے نیچے اترنے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ ہوا سے بھرنے والی کشتی کی مدد سے کنارے پہنچے کیپٹن نے کنارے پہنچنے ہی اپنے آدمیوں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا، ان کے چار چار کے دو گروپ بنائے۔ ایک گروپ دائیں طرف سے اور دوسرا بائیں طرف روانہ کر دیا۔ باقی دو سپاہی کیپٹن نے اپنے ساتھ رکھے۔ کیپٹن کا اپنے سب آدمیوں سے ریڈیو پر رابطہ تھا۔

بنیون رہنمائی کر رہا تھا، کارل اور باقی اس کے پیچھے تھے۔ سورج نکلنے ہی گرمی بہت زیادہ ہو گئی تھی مگر کیڑے کموڑوں اور سپانیوں سے بچنے کے لیے وہ پورے لباس میں تھے اور ان کے پیروں میں گھٹوں تک مضبوط واٹر پروف جوتے تھے۔ وہ جھانپوں اور گھنے پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ دائیں طرف سے فائرنگ کا شور سنائی دیا۔ مولیر ویڈیو پیسج پیسج کر اپنے آدمیوں سے پوچھ رہا تھا کہ کیا بات ہے اور وہ کیوں فائرنگ کر رہے ہیں مگر دوسری طرف سے شور جاری تھا۔ کیپٹن کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بائیں طرف موجود گروپ کو اپنی طرف آنے کا حکم دیا اور جب وہ گروپ آیا تو کیپٹن اپنے دو آدمیوں کے ہمراہ دائیں طرف روانہ ہوا۔ کارل آگے آیا۔ ”میں بھی ساتھ چلوں گا، میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔“

”تم پستول چلانا جانتے ہو؟“ کیپٹن نے پوچھا۔ کارل نے سر ہلایا تو اس نے اپنا پستول اسے تھما دیا۔ ”میرے ساتھ رہنا۔“

وہ تیزی سے اس طرف بڑھے۔ فائرنگ رک گئی تھی اور اب کیپٹن ریڈیو پر بات کر سکتا تھا۔ دوسری طرف سے بتایا گیا کہ فوجیوں نے آدم خوروں کا ایک گروہ دیکھا جو انسانی اعضا کھا رہا تھا۔ انہوں نے ان پر فائر کھول دیا پھر میں سے چار وہیں مارے گئے اور دو بھاگ گئے۔ بعد میں انہوں نے چھپ کر زہر پلے تیر مارے اور ایک سپاہی نشانہ بنا تھا مگر انہوں نے باقی دو میں سے ایک کو مار دیا اور ایک کو زندہ پکڑ لیا۔ وہ چند منٹ میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ معرکہ ہوا تھا۔ مارے جانے والے قبائلیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور زندہ پکڑا جانے والا رسیوں میں جکڑا ہوا نیچے پڑا تھا۔ زہر پلے تیر کا شکار ہونے والے سپاہی کو اس کے ساتھی

”یہ تمہاری سوچ ہے۔“ کارل نے کہا۔ ”ورنہ اپنے طور پر یہ بالکل درست کرتے ہیں۔“ دوپہر کے وقت ان کی بوٹ روانہ ہو گئی۔ کارل کیپٹن مولیر کے ہمراہ اوپر عریشے پر چھپرے تلے تھا کیونکہ دھوپ شدید تھی۔ وہ اور کیپٹن برف کی بیڑ پل رہے تھے۔ یہ لوکل بیڑ بھی جس سے خاصی تیز بو آ رہی تھی۔ کارل اسے پسند کرتا تھا۔ اس نے کیپٹن مولیر سے پوچھا۔ ”تم اس علاقے سے واقف ہو؟“

”میرا بچپن ایمیزون میں گزرا ہے اور یہاں سب علاقے ایک جیسے ہیں صرف لوگوں کا فرق ہے۔“ بنیون بھی وہیں آ گیا۔ اسٹیر تقریباً ڈسٹ کی رفتار سے دریا کے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ دن بھر تیز دھوپ کے بعد شام کو پادل آئے اور بارش ہوئی اس کے بعد موسم کسی قدر خوشوار ہو گیا تھا۔ رینا کے دونوں ساتھی ایف بی آئی ایجنٹ تھے اور وہ اس کے محافظ اور معاون تھے۔ دریا کے ساتھ موجود گھنے درخت اتنے بڑے تھے کہ ان کی شاخیں شستی کے اوپر تک آ رہی تھیں اور ان درختوں پر مقامی نسل کے بندر اور دوسرے جانور انہیں دیکھ کر شور مچا رہے تھے۔ رینا اپنے آئی فون میں ان کی تصویروں اور ویڈیو بنا رہی تھی کہ کارل اوپر آ گیا۔ وہ رینگ سے تک گیا۔ رینا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تم اس زندگی اور اس پیشے سے خوش ہو؟“ ”تمہارا مطلب ہے کہ میں اس سے زیادہ خوش ہوں جتنا کہ امریکا میں پروفیسر بن کر اور وائٹ کالر جاب میں خوش تھا؟“ کارل کا لہجہ استہزا بن گیا۔ ”تو میرا جواب ہے ہاں میں بہت خوش ہوں۔“

”تم ہر بات میں امریکا کا حوالہ کیوں دیتے ہو؟“ رینا کو غصہ آ گیا۔ ”جب کہ تم اس ملک کو چھوڑ چکے ہو۔“ ”ہاں لیکن اس نے مجھے نہیں چھوڑا ہے۔“ کارل ہنسا تو رینا منہ پھیر کر چیخو چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی بنیون اوپر آ گیا۔

”میڈم غصے میں ہے۔“ ”تم جانتے ہو امریکی جذبہ باقی قوم ہے، جلد غصے میں آ جاتی ہے۔“ کارل نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہمیں کب تک سفر کرنا ہوگا؟“

”کل شام تک ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔“ مگر بعض مقامات پر دریا میں بکرا آ گیا تھا اس کی وجہ سے انہیں ذیلی شاخوں سے گزر کر جانا پڑا اور اسی وجہ سے وہ اگلے دن رات گئے مذکورہ مقام پر پہنچے تھے۔ صبح تک کے

دہشت طاری کر دی تھی۔ خاص طور سے رینا کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ کارل اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ ”مہینے ڈرگ رہا ہے؟“ رینا بولی۔ ”کیا نہیں لگتا چاہیے.....؟ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انسان اس قدر درندہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”انسان بنیادی طور پر درندہ ہی ہے۔“ کارل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”یون جو آگے تھا اس نے کارل سے کہا۔ ”ہم چاؤش قبیلے کی حد میں ہیں، وہ دریا کے سب سے نزدیک آباد ہے۔“

کارل نے کمپین کو خبردار کیا اور اس نے اپنے سپاہیوں کو آگے کر دیا مگر اس نے حکم دیا کہ براہ راست فائر سے گریز کریں اور صرف ڈرانے کے لیے فائرنگ کریں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں برگد جیسے بہت پرانے اور قدیم درخت تھے۔ مناؤز قبیلے کے جنگجوؤں نے چاؤش قبیلے کو ان درختوں پر محصور کر رکھا تھا اور انہیں نیچے آنے پر مجبور کرنے کے لیے آگ جلا کر دھواں پیدا کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے ہوائی فائرنگ کی تو وہ بھاگے اور ڈرا سی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ سپاہیوں نے آگ بجھائی اور ایک طرف موجود رسیوں سے جھڑی درجن بھر سے زیادہ عورتوں کو آزاد کیا۔ چاؤش قبیلہ بھی درختوں سے اترا آیا تھا اور شان کی مدد سے انہوں نے بتایا کہ مناؤز والے ان سے عورتوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چاؤش کمزور تھے، اس لیے وہ درختوں پر محصور ہو گئے۔ انہوں نے درختوں کے اوپری حصے کا کرا اور ان میں مزید لکڑیاں جوڑ کر رہائش کے قابل کمرے بنائے ہوئے تھے۔ اوپر آنے جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں جنہیں بد وقت ضرورت الگ بھی کیا جاسکتا تھا۔ مناؤز نے ایک درخت پر موجود افراد کو دھواں کر کے نیچے آنے پر مجبور کر دیا تھا، انہوں نے مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں کو قیدی بنا لیا۔ اب وہ باقی درختوں کے نیچے دھواں کر رہے تھے۔ مگر غیر متوقع مداخلت نے انہیں بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیا۔

انہوں نے سفر کا پہلا پڑاؤ وہیں ڈالا۔ اس دوران میں چاؤش قبیلہ اپنے مردوں کی آخری رسومات کی تیاری کر رہا تھا، وہ مردے دفناتے تھے۔ رات تک ماتم برپا رہا اور اس کے بعد جان بچ جانے پر جشن ہوا۔ رینا حیران تھی۔ ”کچھ دیر قبل تو یہ لوگ رو پیٹ رہے تھے اور اب ناچ گا رہے ہیں۔“

”ان کی زندگی اور رد عمل بہت سادہ ہے۔“ کارل نے کہا۔ وہ ایک طرف بیٹھے رقص دیکھ رہے تھے۔ ”یہ خوشی

طبی امداد دے رہے تھے۔ اسے زہر کے تریاق کا انجکشن لگا دیا تھا مگر اسے مزید علاج کی ضرورت تھی اس لیے کمپین مولیرو نے اسے کشتی پر بھجوادیا۔ پھر وہ قیدی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جوان اور مضبوط آدمی تھا۔ اس کے بال مخصوص ساخت میں بڑھے ہوئے تھے۔ کارل آگے آیا اور اس نے قیدی کی گردن پکڑ کر اسے جھکا یا اور بال اوپر کر کے اس کی گدی کا معائنہ کیا جس پر یونیٹو ہوا تھا۔ کرنل نے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“

”کئی بال قابل اس طرح کے ٹیوز بنواتے ہیں جو ان کے قبیلے کی نشانی ہوتا ہے۔ اس کا تعلق مناؤز قبیلے سے ہے، یہ وسطی حصے میں پایا جاتا ہے جہاں دریا کی ایک ذیلی شاخ نکلتی ہے۔“

”اوہ، تم ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔“ ”میں اسی لیے ساتھ ہوں۔“ کارل نے کہا اور فوراً اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ صرف رینا کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔

کمپین کے نائب نے بتایا۔ ”یہ اجنبی زبان بول رہا ہے۔“ ”شان ان کی زبان جانتا ہے۔“ کارل نے کہا۔ ”اس کی رگوں میں کبھی بال خون ہے۔“

کچھ دیر میں باقی سب بھی وہیں آ گئے تھے۔ شان نے قیدی سے اس کی زبان میں بات کی تو اس نے تسلیم کیا کہ وہ مناؤز قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور انہوں نے درختوں پر بسنے والے چاؤش قبیلے پر حملہ کیا تھا۔ چاؤش قبیلہ درختوں پر چڑھ کر اپنا دفاع کر رہا تھا اور انہوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ البتہ اس نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ انہوں نے اپنے علاقے سے نکل کر اتنی دور چاؤش پر حملہ کیوں کیا تھا؟ وہ اسے لے کر آگے روانہ ہوئے اور اس جگہ پہنچے جہاں وہ آگ پر انسانی اعضا بھون کر کھا رہے تھے۔ یہاں بارے جانے والے چار آدم خوردوں کی لائیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دور ایک درخت پر اٹکا ہوا بیگ دیکھ کر وہ چونکے۔ رینا نے تیزی سے آگے بڑھ کر بیگ اٹھالیا۔ اس نے کارل سے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ جان چالو لکا ہے یہ دیکھو اس پر بے سی لکھا ہوا ہے۔“

بیگ خالی تھا۔ ”ممکن ہے۔“

وہ آگے بڑھے۔ قیدی ان کے ساتھ تھا، اس کے پاؤں کھول دیے گئے تھے۔ کچھ جنگل میں سفر کرتے ہوئے وہ غلط اور خاموش تھے کیونکہ اگر وہ آواز نکالتے تو آگے موجود کئی بال ہوشیار ہو سکتے تھے۔ پہلی جھڑپ نے سب پر ان کی

دانتوں کے درد، مسوڑھوں سے

نحون آنا، ڈھنڈا گرم لگنا اور

دیگر تکالیف کے لیے

10 پر اہل علم 1 حل



Dr. Atta-ur- Rehman
Dental Surgeon

مریض کا بھروسہ ڈاکٹر پر

ڈاکٹر کا بھروسہ 25 سال سے میڈی کیم ڈینٹل کریم

لیے بہت لمبی چوڑی مہم چلائی ہوئی ہے۔ اسی لیے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ان کے لیے مجھے بھیجا ہے۔“
 ”تم اس مہم کی خطرناکی سے باخبر نہیں؟“
 ”میں نے یہاں آنے سے پہلے مکمل معلومات حاصل کی تھیں۔“

”تب تمہیں اپنے گھر والوں کا خیال نہیں آیا؟“
 ”میرا سوائے ایک بوڑھی ماں کے دنیا میں اور کوئی نہیں ہے اور وہ ایک اسپتال میں ہوش و حواس سے بیگانا پڑی ہے۔“ رینا نے سناٹ لیجھ میں کہا۔
 ”اوہ آئی ایم سوری، کوئی اور بھی نہیں ہے؟“
 ”مام اور پھر کیریئر سے فرصت نہیں ملی جو کسی طرف توجہ دیتی۔“

نہ جانے کیوں کارل کو یہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔ وہ، بنیون، رینا، شان اور قیدی آگے تھے جب کہ کیپٹن اور اس کے آدمی کی قدر چھپے پھیل کر چل رہے تھے۔ اس لیے جب اچانک ان پر تیروں کی بارش ہوئی تو وہ چاروں محفوظ رہے تھے۔ سرکنڈوں کے کئی چھنڈ تھے جہاں سے تیرا رہے تھے اور سپاہیوں کو لگ رہے تھے۔ ان کی چیخوں اور پھر فائرنگ کی تیز آواز سے یہ میدان گونجنے لگا۔ کارل نے رینا کا بازو پکڑا اور تیزی سے درختوں کی طرف دوڑا۔ وہ وہیں محفوظ رہ سکتے تھے۔ کم سے کم چار سپاہی اس کے سامنے گرے تھے۔ بنیون اور شان عقب میں فائرنگ کرتے ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ جب تک وہ درختوں میں نہیں گھس گئے انہیں اطمینان نہیں ہوا تھا۔ رینا نے ہانپتے ہوئے کہا۔
 ”میرے خدا کی کیا تھا؟“

”وہی جس کی توقع تھی۔“ کارل نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کیپٹن اور اس کے آدمی نظر نہیں آ رہے ہیں۔“
 ”وہ مارے گئے ہیں یا پھر کہیں پیچھے ہوئے ہیں۔“ بنیون نے کہا۔ ”میرے خدا تیروں کی بارش تھی، ہم نہ جانے کیسے بچ گئے؟“

”ہم اس لیے بچ گئے کہ انہوں نے ہمیں نشانہ نہیں بنایا۔“ کارل نے اپنی رائفل کا جائزہ لیا۔ ”وہ جانتے ہیں کہ پہلے کس پر حملہ کرنا ہے۔ انہوں نے سپاہیوں کو نشانہ بنایا اور ان سے نمٹ کر وہ ہمارے پیچھے آ گئے۔ اس سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا۔“

رینا اور بنیون کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں البتہ شان بے تاثر تھا۔ قیدی کی رسی اس کے ہاتھ میں تھی۔ رینا نے پوچھا۔ ”اب کیا کرنا چاہیے؟“

اور غم کو بہت دیر تک محسوس نہیں کرتے۔ کل تک یہ نارمل ہو جائیں گے۔“

جب رقص کرنے والے ٹھیک گئے، عورتیں اپنے بچے سمیٹ کر اوپر درختوں پر چلی گئیں اور مرد پہرا دینے لگے تو کارل نے شان کی مدد سے قبیلے کے روہانی پیشوا اور سردار سے جان اور اس کی پارٹی کے بارے میں پوچھا۔ سردار نے بتایا کہ یہ پارٹی ان کے قبیلے سے گزر کر آگے گئی تھی۔ وہ ایک دن یہاں رکے تھے۔ ان کا رخ لیٹی ہال ریجن کے وسط کی طرف تھا جہاں مناؤز اور دوسرے خطرناک جنگجو قبائل آباد تھے۔ انہوں نے جاؤش قبیلے والوں کو کچھ تحفے بھی دیے تھے جن میں وہ بیگ بھی شامل تھا جس پر بے سی لکھا ہوا تھا۔ کارل فکر مند ہو گیا اور اس نے رینا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”اب ہمیں آگے جانا ہوگا یہ کوئی اچھی اطلاع نہیں ہے۔“
 ”تم ڈر رہے ہو؟“

”تمہارے لیے۔“ کارل نے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے تم یہیں روکیں اور دوسرے لوگ آگے جاتے ہیں۔“
 رینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اصل ڈرے داری میری ہی ہے لہذا میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔“

کارل اس کا جواب جانتا تھا، اس لیے اس نے پھر نہیں کہا۔ اگلے دن وہ آگے روانہ ہوئے تو جاؤش قبیلے کے افراد انہیں اپنی سرحد تک چھوڑنے آئے تھے۔ ان کا قیدی ان کے ساتھ تھا۔ اگر وہ ان کا قیدی نہ ہوتا تو جاؤش قبیلے والے انہیں زندہ نہ چھوڑتے۔ اسلحے کے ساتھ وہ دو پہر تک دلدلی جھاڑیوں کے درمیان سفر کرتے رہے۔ یہ نشی علاقہ تھلہ سرکنڈوں، سانپ وغیرہ سے بچ کر گزر رہے تھے۔ کارل نے رینا سے کہا۔

”اس پہلے تجربے سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان چاروں کے زندہ بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔“
 ”ہاں لیکن مجھے ان کے بارے میں معلوم تو کرنا ہے۔ میرا اصل مشن یہی ہے۔ وہ زندہ ہیں یا نہیں؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”دنیا بھر میں ہر سال ہزاروں امریکی غائب ہو جاتے ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق امریکی حکومت ان کے لیے ایسے مشن نہیں بھیجتی پھر ان چاروں میں ایسی خاص بات کیا ہے؟“

رینا جواب دینے سے پہلے ذرا ہچکچاہتی تھی۔ ”یہ چاروں اصل میں میڈیا سے متعلق ہیں اور میڈیا نے ان کے

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ تینوں کہاں ہیں؟“
کارل نے آگے دیکھا تو تینوں غائب تھے۔ ”شاید
آگے درختوں میں ہیں۔“

وہ دونوں بھاگے کیونکہ پرندوں کی آوازیں نزدیک آرہی
تھیں مگر جب وہ آگے نکلے تو انہیں وہ تینوں نظر نہیں آئے، کارل
فکر مند ہو گیا۔ ”ایسا لگ رہا ہے ہم غلط سمت نکل گئے ہیں۔“
”تمہاری رائفل کہاں ہے؟“
”وہ میں نے شان کو دے دی تھی۔“

”اب ہمارے پاس بس یہی ایک پستول
ہے۔“ رینا نے پستول نکال کر دکھایا تو کارل نے لے
لیا۔ وہ رینا کا بازو تھام کر تیزی سے آگے بڑھا۔ ایک
چھوٹے سے میدان سے گزر کر وہ درختوں میں داخل ہو
رہے تھے کہ عقب سے ایک تیرا کر درخت گئے تھے پر لگا۔
کارل نے مڑ کر دیکھا۔ کئی بال ان کے عقب میں آچکے
تھے۔ اس نے رینا کو آڑ میں کیا اور پستول سے آگے آنے
والے کا نشانہ لیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ وہ اچھل کر پیچھے
گرا اور اس کے پیچھے آنے والے پلٹ کر بھاگے۔ کارل نے
موقع غنیمت جانا اور رینا کے ساتھ آگے بھاگا وہ درختوں
کے جھنڈ سے نکلے تو سامنے گھاس کے ایک بڑے میدان
کے بعد پانی بہہ رہا تھا۔ کارل نے کہا۔

”جلدی ہمیں اس کے پار جانا ہوگا۔“
وہ دوڑنے لگے مگر نصف میدان ہی عبور کیا تھا کہ
عقب سے پھر کئی بال آگئے۔ وہ ان پر تیر پھینک رہے تھے
مگر دوری کی وجہ سے تیر نشانے پر نہیں لگ رہے تھے۔ البتہ
ان کے آس پاس ضرور گر رہے تھے۔ کارل بھاگتے بھاگتے
اچانک رخ بدل لیتا تھا اور وہی رینا کو بھی کھینچ رہا تھا۔ وہ
ایک بار پھر لڑکھانے لگی تھی۔ دریا کے پاس پہنچ کر کارل
نے مڑ کر مزید دو فائر کیے تو نزدیک آجانے والے قبائلی
پلٹ کر بھاگے۔ وہ انہیں اسلئے کی تباہ کاری سے انجھی
طرح واقف تھے۔ کارل نے رینا کو پانی کی طرف دھکیلا
”چلو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

رینا پانی میں گھس گئی کارل اس کے پیچھے تھا جب وہ
تیرنے کے قابل پانی تک پہنچے تو اس نے پستول بلیٹ
میں اڑس لیا۔ ”ہمیں زیر آب تیر کر جانا ہوگا ورنہ سطح پر یہ
آسانی سے نشانہ بنائیں گے۔“

رینا نے سر ہلایا۔ انہوں نے گہرے سانس لیے اور
پانی میں چلے گئے۔ وہ اس وقت تک اندر تیرتے رہے جب
تک سانس اکھڑنے نہیں لگا۔ پھر وہ سطح پر آئے اور سانس

”ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔“ کارل نے سوچ کر
کہا۔ ”ان سے چھکارے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم ان
کی حد سے نکل جائیں۔“

”اس سے پوچھو کہ ہم کس کی حد میں ہیں۔“ بیٹوں نے
قیدی کی طرف اشارہ کیا تو کارل بولا۔
”میں جانتا ہوں یہ کئی بال کین قبیلہ ہے یہ بانس
سے تیر بناتے ہیں اور اس شعبے میں ان سے زیادہ ماہر کوئی
نہیں ہے۔“

ان لوگوں کی مہارت وہ دیکھ چکے تھے۔ اس لیے اس
بار سب نے تیزی سے قدم اٹھائے۔ وہ تقریباً دوڑنے کے
انداز میں چل رہے تھے۔ کارل نے انہیں خبردار کیا۔ ”ہر
ممکن تیزی سے قدم اٹھاؤ کیونکہ یہ لوگ بہت تیزی سے پیچھا
کرتے ہیں ہمیں جلد از جلد ان کی حدود سے نکل جانا ہے۔“
رینا کو یوں بھاگنے کی عادت نہیں تھی مگر اس نے ان کا
ساتھ دیکھ کر دس منٹ بعد اس کی حالت خراب ہونے لگی۔
کارل نے اس کے لڑکھڑاتے قدم دیکھے تو اسے سہارا دینے
لگا۔ اس کے باوجود رینا کی ہمت کچھ دیر بعد جواب دے گئی
اس نے وقتی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”اب میں..... اور
نہیں..... بھاگ..... سکتی۔“

رینا لڑکھڑائی اور مرنے لگی تو کارل نے اسے
سنبلایا اور پھر اٹھا کر اپنے شانے پر ڈال لیا۔ کارل نے اپنا
بیگ اور رائفل شان کو دے دی تاکہ وہ رینا کو آسانی سے
اٹھا سکے۔ کچھ دیر بعد فائرنگ رک گئی اور عقب سے ایسی
آوازیں آئیں جیسے پرندے بول رہے ہوں۔ بیٹوں جو
آگے تھا کر گیا اور دھشت زدہ ہو کر بولا۔

”وہ آ رہے ہیں یہ آوازیں وہی نکال رہے ہیں۔
جب کئی بال دشمن کا پیچھا کرتے ہیں تو ایسی ہی آوازیں
نکالتے ہیں۔“
”تیز چلو۔“ کارل نے کہا۔ ”اب کوئی نہ رکے۔ جو
بھاگ سکتا ہے تیزی سے بھاگے۔“

انہوں نے کارل کی بات پر عمل کیا۔ قیدی کے لیے
بندھے ہاتھ کے ساتھ بھاگنا مشکل تھا اس لیے شان نے
اس کے ہاتھ کھول دیے البتہ اس کے گلے میں بندھی ری
اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ تینوں کارل سے
آگے نکل گئے تھے۔ وہ رینا کو اٹھائے ہوئے تھا اس لیے
پیچھے رہ گیا۔ رینا نے اس بات کو محسوس کیا اس نے کہا۔ ”اب
میں ٹھیک ہوں مجھے اتار دو۔ میں بھاگ سکتی ہوں۔“
کارل نے اسے پیچھا اتار دیا۔ ”تم چل سکو؟“

”مجھے لگ رہا ہے کوئی تعلق ہے اور ہمیں وہی تعلق تلاش کرنا ہوگا۔“ کارل نے کہا اور آگے بڑھا۔ اس نے پستول بیلت میں لگا کر اپنی پینڈلی سے بندھا بڑا سا خنجر نکال لیا۔ اس نے ایک جگہ سے دو عدد بانس کاٹے اور خنجر سے چھیل کر ان کے سرے نیزے کی طرح نوک ڈاکر لے لے اس نے ایک بانس رینا کو تھما دیا۔ ”اس سے ہم اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔“

رینا سوچ رہی تھی کہ اگر ان جنگلیوں نے حملہ کیا تو وہ اس ایک بانس کی مدد سے کیا کر سکے گی۔ اس نے کارل سے مطالبہ کیا۔ ”پستول مجھے دو میں اس سے کام نہیں لے سکتی۔“ کارل نے پستول اس کے حوالے کر دیا۔ ”لیکن فائر سوچ سمجھ کر کرنا، اس میں کل سات گولیاں رہ گئی ہیں۔“

رینا نے پستول شرٹ تلے پستول کی بیلت میں لگا لیا۔ ”میں نے ان کے بارے میں سنا تھا لیکن انہیں اس سے کہیں زیادہ وحشی پایا ہے۔“

کارل نے نرمی سے کہا۔ ”یہ اپنی فطرت کے مطابق کر رہے ہیں جب کہ ہم نے اپنی فطرت کو تہذیب اور ثقافت کے خوشنما لہادوں تلے چھپا لیا ہے۔ ذرا غور کرو ہم مہذب کہلانے والے انسان ایک دوسرے کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟“

”مجھے لیکچر مت دو۔“ رینا چڑ کر بولی۔ ”ابھی ان سے سامنا ہوتا ان کو بتانا کہ وہ انسانیت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں اور ان کو دنیا پر حکمرانی کرنی چاہیے۔“

کارل ہنسا۔ ”تم برا مان لگیں، اوکے میں ان کی زیادہ تعریف نہیں کرتا کیونکہ یہ دشمن ہیں۔“

دو ریا کے دوسری طرف سرکنڈوں سے بھرے میدان تھے جہاں پانی نہیں تھا وہاں نرم گھاس اگ آئی تھی۔ کارل نے چاروں طرف دیکھا اور ایک طرف اشارہ کیا۔ ”شاید اس طرف آبادی ہو کیونکہ وہ جگہ بلند ہے یہاں بارش میں سیلاب آتا ہوگا۔“

وہ ذرا آگے بڑھے تھے کہ انہیں بستی نظر آ گئی۔ یہ زیادہ بڑی بستی نہیں تھی۔ شاید اس میں چار پانچ سو افراد رہتے ہوں گے۔ رینا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے یہ ہمیں دیکھتے ہی حملہ نہ کر دیں۔“

”نہیں اگر ہم نے کوئی مشکوک حرکت نہ کی تو یہ حملہ نہیں کریں گے۔“ رینا اس سے متفق نہیں تھی لیکن مجبور آگے بڑھی۔ قریب آنے پر انہیں گڑبگ کا احساس ہوا۔ سامنے والے جھونپڑے سلامت تھے لیکن ان کے عقب میں واقع دو

لے کر دو بارہ پانی میں چلے گئے۔ دریا یہاں سست روی سے بہہ رہا تھا اور اس کا پاٹ سوگڑ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ قبائلی کنارے تک آگئے تھے گھرانہ انہوں نے دریا میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی بس وہیں سے تیر چھٹکتے رہے۔ کارل کی حکمت عملی کام آئی۔ اگر وہ سطح پر تیرتے تو لازمی تیروں کا شکار ہو جاتے مگر زیر آب ہونے کی وجہ سے وہ تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ کارل نے خود کو دریا کے ساتھ جانے دیا تھا۔ اس طرح وہ زیادہ دور نکلتے۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ دوسری طرف نکلے اور ہانپتے ہوئے دریا کے کنارے ریت پر گر گئے۔ دشمن پیچھے رہ گئے تھے اور اب وہ اس طرف سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ رینا نے کہا۔

”وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔“

”لیکن ہم پتا نہیں کہاں آ نکلے ہیں؟“ کارل نے تشویش سے کہا اور اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ ”ایسا لگ رہا ہے ان کی حدود پر باتک بھی اس لیے انہوں نے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی۔“

”وہ دونوں بھی پتا نہیں کہاں ہیں؟“

کارل نے پستول کا معائنہ کیا، اس میں پانی چلا گیا تھا مگر اسے امید تھی کہ وہ کام کرے گا۔ اس نے رینا کی طرف دیکھا۔ اس ذرا سے ایڈ وچر نے اسے نچوڑ دیا تھا۔ واشنگٹن کے پرنسکون ماحول میں کام کرنا الگ بات تھی اور امیزون میں ہر لمحے موت کا سامنا کرنا بالکل الگ تجربہ تھا۔ ”انہو ہمیں آگے جانا ہوگا۔“

”آگے کہاں؟“

”شاید ہم مناؤز قبیلے کی حدود میں ہیں اور یہ کینی بال ریجن کے وسط میں ہے۔ ممکنہ طور پر جان اور اس کی پارٹی یہیں آئے تھے۔“

رینا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”یہ تو بہت خطرناک لوگ ہیں۔“

”دیکھو کینی بال شاذ ہی دوسرے کے علاقے پر حملہ کرتے ہیں۔ مناؤز نے چاؤش قبیلے سے عورتیں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اس کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔ درمیان میں کین قبیلہ ہے لیکن انہوں نے دور کے چاؤش قبیلے پر حملہ کیا۔ اس کا مطلب ہے وہ اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتے کہ کین قبیلے پر حملہ کر سکیں۔ انہوں نے درختوں پر بسنے والے چاؤش کا انتخاب کیا کیونکہ وہ کمزور ہیں۔“

رینا اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”ان سب باتوں کا جان اور اس کے ساتھیوں کی تلاش سے کیا تعلق ہے؟“

مرید

ایک مسجد میں دو آدمی بیٹھے تھے۔

پہلا: ”تم کس کے مرید ہو؟“

دوسرا: ”میں اپنے مرشد کا نام ایسے نہیں بتاؤں گا

پہلے وضو کر آؤں۔“ اس نے وضو کیا، دو رکعت نماز پڑھی۔

سب انتظار کر رہے تھے کہ لوگوں نے دیکھا کہ

اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے اور اس نے

انتہائی عقیدت اور احترام سے گردن جھکائی اور بولا۔

”میں ’زن مرید‘ ہوں کستوری لگا کے.....“

مرسلہ: رضوان توی کی ریڑی، اورنگی ٹائون، کراچی

اپنے آدمی کو قیدی دیکھ کر مناؤز چاروں طرف سے

جمع ہونے لگے تھے مگر ان کا رویہ جارحانہ نہیں تھا۔ کارل

نے آہستہ سے کہا۔ ”ان کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے۔ یہ جلی

ہوئی جھوٹریاں اور یہ ڈھانچے دیکھ رہے ہو۔“

”ان کی عورتیں ماری گئی ہیں۔“ شان بولا۔

بینون نے سر ہلایا۔ ”شاید اسی لیے انہوں نے

چاؤش پر حملہ کیا تھا یہ ان سے عورتیں حاصل کرنا چاہتے تھے

تاکہ اپنی نسل برقرار رکھ سکیں۔ مگر وہاں بھی انہیں ناکامی کا

مند دیکھنا پڑا۔“

”میرا خیال ہے اس قیدی کو آزاد کر دینا چاہیے۔“

کارل نے کہا۔ ”اس سے ان پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ رینا

بولی۔ ”اب ہم سچ ہیں۔“

”صرف سچ ہونا کافی نہیں ہے۔ اگر یہ ہمارے

خلاف ہو گئے تو ہم ایک گھنٹا بھی اپنا دفاع نہیں کر سکیں

گے۔ فی الحال یہ جارحانہ موڈ میں نہیں ہیں۔“ کارل نے

کہا۔ ”شان اس کی رسی کھول دو۔“

شان نے قیدی کی رسی کھول دی اور اس سے

کہا۔ ”اب تم آزاد ہو۔“

قیدی نے بے یقینی سے شان کی طرف دیکھا اور پھر

گھبراہٹا ہوا اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔ انہوں نے اسے

گھیر لیا تھا۔ اس بھاگ دوڑ نے انہیں جھکا دیا تھا اور وہ

بھوکے جی تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان تھا۔

رینا نے کہا۔ ”پلیز یہاں سے چلو مجھے یہ سب دیکھ کر دشت

بڑے جھوٹے جل چکے تھے اور ان کی جلی ہوئی بلیاں باقی

رہ گئی تھیں۔ یہی نہیں ان جلے ہوئے جھوٹے میں درجنوں

جل جانے والی لاشیں تھیں جو اب ہڈیوں میں بدل چکی

تھیں۔ انہیں وہاں اکاؤنٹ کا قبائلی نظر آرہے تھے۔ پھر رفتہ

رفتہ جھوٹے بڑوں سے لوگ نکلنے لگے۔ مگر ان کی تعداد بہت

زیادہ نہیں تھی۔ رینا سہم کر کارل کے نزدیک ہوئی اور کارل

نے نوٹ کیا کہ ان میں مردوں کی تعداد کہیں زیادہ بھی جب

کہ عورتیں اور بچے بہت کم تھے۔ جل جانے والے

ڈھانچوں کی ساخت عورتوں والی تھی۔ کارل نے آہستہ سے

کہا۔ ”میرے خدا یہاں کیا ہوا ہے؟“

یہ وہی مناؤز کہانی بال تھے جو ایک دن پہلے چاؤش

قبیلے پر حملہ آور تھے اور ان کے مردوں کو مار کر کھا رہے

تھے۔ ان کی عورتوں کو قیدی بنالیا تھا لیکن یہاں ان کا رویہ

بالکل مختلف تھا۔ وہ افسردہ اور شکست خوردہ لگ رہے تھے۔

ایک طرف میدان میں لکڑی کے ساتھ ایک درجن کے

قریب ڈھانچے بندھے تھے۔ ان کے ہتھیار اور لکڑی سے

بندھی ان کی ذاتی اشیاء تھیں کہ وہ جنگجو تھے۔ کارل ان

کی طرف بڑھا تو ایک معمر قبائلی آگے آیا اور ڈھانچوں کی

طرف اشارہ کر کے کچھ کہنے لگا۔ رینا نے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ

رہا ہے؟“

کارل خود سے سن رہا تھا۔ ”یہ کہہ رہا ہے کہ مناؤز کے

عظیم جنگجو تھے جو اب نہیں رہے تھے۔ ان کا قبیلہ مر رہا ہے۔“

”کیا ان پر کسی دوسرے قبیلے نے حملہ کیا تھا؟“

”شاید۔“ کارل نے کہا اور پھر چونکا کیونکہ ایک

طرف سے بینون، شان اور ان کا قیدی نمودار ہوئے

تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف آئے۔ شان

کارل سے لپٹ گیا اور بینون نے گرم جوشی سے رینا سے

ہاتھ ملایا۔

”شکر ہے تم زندہ ہو ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم بھی

ماری گئی ہو۔“

کارل نے پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟“

”ہم تیزی سے آگے بڑھے تھے۔“ شان نے

بتایا۔ ”مجھے بہت دیر بعد خیال آیا کہ تم جچھے نہیں ہو۔“

”ہم راستہ بھٹک گئے تھے۔ کین ہمارے پاس آگے

تھے مگر دریائے ہمیں بچالیا وہ اس کے پار نہیں آئے۔“

”دریا سے مناؤز کی حد شروع ہو جاتی ہے۔“ بینون

نے کہا۔ ”ہم بہت پہلے آگئے تھے مگر چھپے ہوئے تھے تمہیں

دیکھا تو سامنے آ گئے۔“

ہو رہی ہے۔“

”وہ جگہ مناسب رہے گی۔“ بیٹون نے ایک تالاب کے کنارے بے چھپر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس تک آئے اور اس کے پیچھے ڈیرا جمایا۔ رات قریب تھی۔ بیٹون فکر مند تھا اس نے کہا۔ ”میں یہ رات کو خاموشی سے ہم پر حملہ نہ کریں۔“

”نہیں، یہ دھوکے بازی سے نا آشنا ہیں۔ اگر انہوں نے دشمنی کرنا ہوئی تو دن میں کر لیتے۔“ کارل نے کہا۔ وہ سب چھپرتے بچے کی گھاس پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ سب سے برا حال رہنا کا تھا۔ اس نے تھوڑا بہت کھایا اور پھر بے سادھ ہو کر سو گئی۔ وہ سب باری باری جاگتے اور سوتے

رہے۔ رات سکون سے گزری اور بیٹون کے خدشے کے خلاف قبیلے والوں نے ان پر حملہ نہیں کیا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو کارل جاگ رہا تھا۔ اس نے بیٹون کو جگایا اور خود تالاب تک آگیا۔ لباس اتار کر صرف نیکر میں وہ پانی میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد نصف درجن مقامی لڑکیوں کا ایک

گروہ آیا اور پانی میں گھس گیا۔ وہ مکمل طور پر بے لباس تھیں اور بہت شوخ ہو رہی تھیں انہوں نے کارل کو گھبراہٹ اور اسے چھیڑنے لگیں۔ کارل ان کا رویہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ وہ شوخ ضرور ہو رہی تھیں مگر ان کے انداز میں جنسیت کے بجائے معصومیت تھی۔ پھر وہ کارل کو بچھڑ کر پانی

سے باہر لائیں اور ایک طرف لے جانے لگیں۔ بیٹون اور شان بھی ان کے پیچھے آئے۔۔۔ بڑے سرکنڈوں کے پیچھے ایک بڑے درخت کے باقی رہ جانے والے تنے پر چار عدد ڈھانچے لکڑی کی کیلوں سے تھکے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بے شمار سامان بھی لٹک رہا تھا۔ کارل کو اپنے روکتے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے کیونکہ سامان میں کیمرے، سفری بیگ، جوتے اور لباس نمایاں تھے۔

”یہ سب کیا ہے؟“ بیٹون بولا۔ لڑکیاں اب درخت کے سامنے زمین پر گر کر رین کرنے والے انداز میں رو رہی تھیں اور اپنے سروں پر خاک ڈال رہی تھیں۔ کارل نے ٹھنڈی سانس لی۔

”میرا خیال ہے ہم جان اور اس کے ساتھیوں کا انجام دیکھ رہے ہیں۔“

رینا بھی پیچھے سے آگئی تھی۔ وہ اسی وقت جاگ گئی تھی، جب لڑکیاں تالاب میں کارل کے ساتھ شوخیاں کر رہی تھیں۔ اسے یہ اچھا نہیں لگا تھا، اس لیے وہ سوئی بن گئی مگر جب وہ کارل کو اس طرف لانے لگیں تو وہ بے چین ہو کر ان کے پیچھے چلی آئی۔ چاروں ڈھانچے اپنی اصل حالت

میں تھے اور ان کی کھال سکڑ کر ہڈیوں سے چپک گئی تھی مگر کہیں سے غائب نہیں تھی۔ گویا انہیں کھایا نہیں کیا تھا جب کہ میدان میں لکڑی سے بندھے ڈھانچوں سے گوشت غائب تھا۔ رینا نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ان دشمنوں نے انہیں مار دیا۔“

لڑکیاں جو سروں پر خاک ڈال رہی تھیں اچانک اٹھ کر وہاں سے چلی گئیں۔ کارل آگے آیا اور اس نے مختلف جگہوں پر اس کے کمرے اور ان کی استعمال شدہ کیسٹ نکالیں۔ اس نے رینا سے کہا۔ ”شاید ان سے پتا چلے کہ ان کو کس نے اور کیوں مارا؟“

کیمرے اور کیسٹ ٹھیک حالت میں تھے اور قبائلیوں نے انہیں توڑنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ مرنے والے دشمن کی چیز لینا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے اور آدمی کی ہر چیز اس کی لاش کے ساتھ رکھ دیتے تھے یہی وجہ تھی کہ جان چادر اور اس کے تنیوں ساتھیوں کی تمام چیزیں صحیح سلامت حالت میں درخت پر لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ واپس چھپر تک آئے اور رینا نے اپنے ویڈیو کیمرے میں کیسٹ ڈال کر اسے چلایا۔۔۔ سب اسکرین کے آگے آجھک گئے۔ یہ اوپن کیسٹ تھی جس میں امریکا سے روانگی کی ویڈیو بھی موجود تھی اور اس کے آخری حصے میں وہ فی نے کینی ہال کے علاقے کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ اس کیسٹ کے کچھ حصے کارل رینا کے ٹیپ پر دیکھ چکا تھا کیونکہ یہ جان نے امریکا بھیجی تھی۔ یہ کیسٹ ختم ہوئی تو رینا نے کیمرے میں دوسری کیسٹ ڈالی۔

☆☆☆

”18 اکتوبر، کینی ہال کا علاقہ۔“ کرس کہہ رہا تھا۔ اسکرین پر جان اور میرن ساتھ ساتھ چل رہے تھے جب کہ ان سے آگے روجر نے کوارٹرما چاقو سے راستے میں آنے والی شاخیں اور جڑیں کاٹنا ہوا چل رہا تھا۔ مگر اس کے انداز میں تفرقہ اور شوخی تھی۔ کرس نے ڈراؤنی آواز بنا کر کہا۔ ”ہم خطرناک کینی ہال کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں جو انسانوں کو کھاتا جاتے ہیں۔ مگر وہ ہمیں نہیں کھا سکیں گے ہمارے پاس ان کے لیے کچھ خاص ہے۔“

ویڈیو وقفے وقفے سے جاری تھی۔ دوپہر کے قریب وہ ایک نہر کے پاس پہنچے اور پکڑے اتار کر اس میں نہانے کے لیے گھس گئے۔ اب روجر ویڈیو بنا رہا تھا اور وہ خاص طور سے میرن کو نمایاں کر کے دکھا رہا تھا جس نے نہ ہونے کے برابر لباس پہنا ہوا تھا اور وہ اس فوٹو گرافی پر روجر کو برا

بھلا کبہر رہی تھی۔ جان ہنس رہا تھا۔ اچانک وہ چلا آیا اور پانی میں گھس گیا۔ ذرا دیر بعد وہ ایک درمیانے سائز کے کچھوے کو پکڑے برآمد ہوا جو خود کو آزدگار کرنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ جان نے چلا کر کرس سے کہا۔ ”میری مدد کرو ورنہ یہ بھاگ جائے گا۔“

”اے چھوڑ دو۔“ میرن بولی۔

”نہیں آج ہم تازہ گوشت کھا سکیں گے۔“ جان نے جواب دیا۔ وہ کرس کی مدد سے کچھوے کو پانی سے باہر لانے میں کامیاب رہا۔ اسے الٹا لٹکا کر بے بس کر دیا اور پھر جان نے اپنا چاقو کچھوے کے سر میں اتار دیا۔ اس نے سر اندر کر لیا تھا مگر سر سوراخ سے نظر آ رہا تھا۔ کچھوہ کچھوہ دیر پاؤں چلاتا رہا پھر اس نے دم توڑ دیا۔ انہوں نے آری کی مدد سے اس کے خول کو کاٹا اور اندر کا نرم گوشت اور اعضا کاٹ کاٹ کر الگ کرنے لگے۔۔۔ روجر بہت واضح انداز میں ویڈیو بنا رہا تھا۔ میرن سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا تھا، اس لیے وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی مگر جب اگلی ویڈیو میں کچھوے کے جسم سے خون کرکھاتے ہوئے دکھایا تو وہ بھی کھانے میں شامل تھی۔ وہ چاروں بہت خوش تھے۔ کارل نے کہا۔

”میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ انہوں نے مختلف کینی بال قبائل کے علاقے کیسے پار کیے۔ یہ نہر کینی بال کے وسطی علاقے کے پاس ہے جہاں انہوں نے کچھوا پکڑا۔“

دوسرے پلٹس سے انہیں پتا چل گیا کہ انہوں نے مختلف قبائل کے علاقے کس طرح پار کیے۔ جب وہ کین قبیلے کی حد میں داخل ہوئے تو انہوں نے کھانے پینے کی چیزیں اٹھا رکھی تھیں اور یہ چیزیں انہوں نے ایک کھلی جگہ پر رکھ دیں اور خود پیچھے ہو گئے۔ شام کے قریب جھاڑیوں سے کین قبیلہ برآمد ہوئے انہوں نے کھانے پینے کی چیزیں اٹھائیں اور واپس چلے گئے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ انہوں نے راہداری کا نذرانہ وصول کر لیا تھا اور اس کے بعد ان چاروں نے سکون سے یہ علاقہ پار کر لیا۔ اس سے پہلے جاؤش قبیلے کی حد میں بھی انہیں کوئی پریشانی پیش نہیں آئی بلکہ وہاں ان کی مہمان نوازی بھی کی گئی تھی۔ دوسرے انسانوں سے قربت کی وجہ سے جاؤش اتنے وحشی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے آدم خوری ترک کر دی تھی۔ مگر کین، مناؤز اور دوسرے قبائل آدم خوری کرتے تھے۔ جان اور اس کی پارٹی نے کین قبائل کا سامنا کیا یہی نہیں تھا اس لیے وہ ان سے ناواقف تھے۔

تیسری کیسٹ میں وہ مناؤز قبیلے کی حد میں داخل

ہوئے اور تب انہوں نے خوفناک مناظر ریکارڈ کیے۔ پہلا منظر صبح سویرے کا تھا جب ایک جھیل میں ایک مقامی شخص اکیلا کشتی چلاتا ہوا اس کنارے تک آیا جہاں انہوں نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ اس نے کشتی سے کھینچ کر ایک بندوقی عورت کو نیچے اتارا اور اسے بے دردی سے بالوں سے کھینچتا ہوا کنارے پر لایا۔ اس نے عورت کے چلانے اور کراہنے کی پروا کیے بغیر اسے نیچے گرایا اور زبردستی پچھائے کر اس کے پاؤں کھولے اور ایک ٹکلیے پتھر سے اس کے پیٹ پر وار کر کے لگا۔ عورت دردناک آوازیں نکال رہی تھی۔ ویڈیو کرس بنا رہا تھا اور میرن کی آواز آ رہی تھی۔ ”اسے روکویہ اسے مار دے گا۔“

”میرن شٹ اپ۔“ جان کی آواز آئی۔ ”یہ نہایت نایاب منظر ہے جو ہم ریکارڈ کر رہے ہیں۔“

”اس کی تو دوہم بیچ جائے گی۔“ روجر جوش سے بولا۔

”تم لوگوں کو اس عورت کی پروا نہیں ہے جسے یہ وحشی قتل کر رہا ہے۔“

”ممکن ہے یہ اس کی بے وفا بیوی ہو۔“ جان نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس صورت میں اسے حق ہے۔“

عورت اب شدید خدیجی حالت میں نیم بے ہوش تھی۔ مرد کشتی کی طرف گیا اور وہاں سے ایک ٹھیلی لے کر آیا اور اس میں سے ریت جیسی کوئی چیز نکال کر عورت کے چاروں طرف ڈالنے اور اپنی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ پھر اس نے ایک دھار والا پتھر اٹھا یا اور عورت کے سر کے پاس بیٹھ کر اسے بار بار اس کے سر پر مارنے لگا۔ یہ بہت خوفناک اور حقیقی منظر تھا۔ ذرا سی دیر میں عورت ختم ہو گئی اور مرد کشتی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ کلپ ختم ہوا تو کارل نے کہا۔ ”مرد اور عورت دونوں مناؤز تھے اور جان نے ٹھیک کہا۔ اس کی بے وفائی بھی کیونکہ وہ دیوتاؤں سے اس کے گناہ کو معاف کرنے کا کہہ رہا تھا۔“

”پھر بھی اسے اتنی بے دردی سے قتل کر دیا۔“ رینا نے کہا۔

”ان چاروں کے بارے میں کیا خیال ہے جو اس منظر کی ویڈیو بنا رہے تھے اور انہوں نے عورت کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔“ کارل نے کہا۔ اس نے رکی ہوئی ویڈیو دوبارہ چلائی۔

اگلے کلب میں ایک جگہ چار افراد بانس میں پروئے انسان کو بھونکنے کی تباہی کر رہے تھے۔ اس کا سر، ہاتھ اور ٹانگیں الگ کر لی گئی تھیں۔ منظر اتنا خوفناک تھا کہ ان لوگوں

غائب تھا۔ جان اور کرس نے فائرنگ روک دی اور پھر وہ اس جھوپڑے کی طرف بڑھتے تو اس سے کئی مرد نکلی کر بھاگے۔ مگر ان کی تعداد نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ جان اور کرس نے انہیں جانے دیا۔ وہ جھوپڑوں میں دیکھ رہے تھے مگر تمام جھوپڑوں میں عورتیں اور بچے تھے۔ ان میں نوجوان لڑکیاں نہیں تھیں۔ جان پلٹ کر آیا اور اس نے ہمتااتے ہوئے چہرے کے ساتھ کمرے کی طرف رخ کر کے کہا۔

”اب ان لوگوں کے ساتھ وہ کریں گے کہ یہ آدم خوری بھول جائیں گے۔“

جان اور کرس دوسری جھوپڑیوں سے عورتوں اور بچوں کو بانک کر دو بڑی جھوپڑیوں میں جمع کرنے لگے۔ وہ انہیں رائفلوں سے دھمکا رہے تھے اور ان کی ڈری ڈری آوازوں سے محفوظ ہو رہے تھے۔ میرن ان سے بار بار پوچھ رہی تھی کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں؟ مگر جان اور کرس اپنے کام میں لگے رہے۔۔۔ انہوں نے کوئی دوسو عورتوں اور بچوں کو ان دو جھوپڑوں میں دھکیل دیا اور پھر نزدیک جیلنے والے الاؤ سے لکڑیاں لا کر ان کو آگ دکھانے لگے۔ جھوپڑے مکمل طور پر لکڑی اور گھاس سے بنے تھے اور انہیں آگ پکڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ چند منٹ میں دونوں جھوپڑے مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ کرس، جان اور درو جان کے گرد گھوم رہے تھے کہ کوئی ان سے نکلنے نہ پائے۔ ساتھ ہی درو جو ویڈیو بھی بنا رہا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ کوئی جھوپڑوں سے نہ نکل سکے اس کے باوجود کچھ عورتیں اور بچے نکل بھاگے تھے۔ جو عورتیں اور بچے دوسرے جھوپڑوں میں تھے وہ پہلے ہی بھاگ نکلے تھے۔ کیرا کرس نے سنہال لیا۔ جان نے کہا۔

”اب ہم شکار کریں گے۔“

”ان جانوروں کا پتھا کر کے۔“ کرس نے رائفل لہرائی۔ انہوں نے فتح کا جشن منانے کے لیے ہسکی کی بوتل کھول لی تھی۔ پھر وہ ایک طرف موجود گھاس کے میدان میں آئے اور یہاں انہوں نے ایک نوجوان لڑکی کو تلاش کر لیا۔ اس کے بعد جو منظور کیلئے میں آیا اس نے رینا اور ان سب کو اسکرین سے آنکھیں چرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ دیکھ نہیں رہے تھے مگر اس مظلوم لڑکی کی چٹین سن رہے تھے۔ میرن انہیں روک رہی تھی مگر وہ تینوں ہی جانور بن چکے تھے۔ انہوں نے میرن کو بھی مارا اور اسے دھمکی دی کہ وہ خاموش ہو کر نہیں بیٹھی تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔

نے یہ مشکل اسے برداشت کیا۔ اس بار جان، کرس اور درو جو ش کے بجائے غصے میں تھے اور ان لوگوں کو گالیاں دے رہے تھے مگر انہوں نے سین کو شوت کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ آدم خوری کرنے والے مناؤز قبائل تھے جو کین قبیلے کے جنگجو لاش کھا رہے تھے۔ سین شوت کرنے کے بعد وہ چاروں ان سے کٹر اکڑ گئے بڑھے۔۔۔ پھر وہ مناؤز کی بستی کے پاس پہنچ گئے۔ یہ صبح کا وقت تھا اور گیارہ اکتوبر کا دن تھا۔ گویا انہیں یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ ویڈیو روبرو بنا رہا تھا اور جان اپنا بیگ کھول رہا تھا اس نے کہا۔ ”وقت آ گیا ہے کہ ہم ان آدم خوروں کے لیے ہتھیار نکالیں۔“

اس نے بیگ سے تین عدد جدید ایم سولہ رائفلیں نکالیں اور مہارت سے ان کے حصے جوڑے۔ اس نے میرن کو ایک چھوٹا پستول دیا تھا۔ ان کے پاس ایمونیشن بھی وافر مقدار میں تھا۔ جان اور کرس اپنی رائفلیں تانے ہوئے بستی میں داخل ہوئے تو وہاں کھلبلی سی سچ گئی۔ عورتیں اور بچے بھاگ کر جھوپڑیوں میں گھس گئے۔ وہاں مرد نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرن نے بھی اپنا پستول نکالا ہوا تھا۔ درو کنٹری کر رہا تھا۔ ”یہ آدم خوروں کی بستی ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں کے مرد نہیں دیکھ کر کہیں چھپ گئے ہیں۔“

”سب اس سے ڈرتے ہیں۔“ جان نے رائفل لہرا کر کہا۔

اچانک تالاب کے پاس والے جھوپڑے سے چند مسلح مرد نمودار ہوئے۔ ایک معمر جنگجو ان کی قیادت کر رہا تھا اور ان کے تیور جارحانہ تھے۔ انہوں نے اپنے نیزے آگے کر رکھے تھے۔ جان اور کرس ان کی طرف بڑھے۔ وہ چیخ چیخ کر ان سے کہہ رہے تھے۔ ”اپنے ہتھیار پیچیک دو۔ ورنہ ہم سب کو قتل کر دیں گے۔“

کارل نے معمر شخص کو پچپان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو لکڑی سے بندھے ڈھانچوں کے آگے ماتم کر رہا تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے آدمیوں سے کچھ کہہ رہا تھا اور جوش میں بار بار زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ اچانک ایک لڑکا ان کی طرف لپکا اور جان نے فائر کھول دیا۔ لڑکے کا سینہ چھنی ہو گیا اور گولیاں اس کے وجود سے گزر کر پیچھے موجود دروازہ اور افراد کو لگی تھیں۔ میرن پتہ پتہ کر فائرنگ روکنے کو کہہ رہی تھی مگر جان اور کرس پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ جان کے بعد کرس نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجن کے قریب افراد خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ معمر شخص

وہ انہیں برا بھلا کہہ رہی تھی۔ لڑکی کے ساتھ زیادتی کے بعد وہ اسے بالوں سے پکڑ کر کھینٹتے ہوئے بستی میں لائے اور اسے ایک درخت سے باندھ دیا۔ بھوپتروں میں لگی آگ تقریباً بجھ گئی تھی اور روجر اندر چل جانے والی لاشوں کی ویڈیو بنا رہا تھا۔ جان نے رائفل لہرا کر کہا۔

”ہم نے وحشیوں کا ایک قبیلہ ختم کر دیا ہے۔“

”تم ان لوگوں کو اچھے اور مہذب انسان قرار دے رہی تھیں۔“ کارل نے غصے سے کہا۔

”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ایسے نکلیں گے۔“ رینا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ آگے ویڈیو دیکھنے لگے۔ اگلے کلپ میں وہ تاریکی میں کسی گھٹے جنگل میں تھے اور ان کے انداز میں خوف اور گھبراہٹ تھی۔ جان انہیں تسلی دے رہا تھا۔ ”فکرت کرو، اگر وہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں تو ہم ان سے منٹ سکتے ہیں۔“

”وہ کہیں سے بھی آسکتے ہیں۔“ روجر کہہ رہا تھا۔ ”میں نے خود کم سے کم تین افراد کو دیکھا ہے۔“

”میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ میرن رو دینے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ہم نے ان آدم خوروں کے ساتھ بالکل ٹھیک کیا ہے۔“ کرس نے اسے جھڑک دیا۔

جان اور روجر کی طرف چلے گئے تھے۔ کرس ویڈیو بنا رہا تھا۔ چانک انہیں جان اور روجر کے چلانے کی آواز آئی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کئی افراد سے لڑ رہے ہیں۔ میرن اور کرس اس طرف بھاگے اور جب وہ وہاں پہنچے جہاں جان اور کرس تھے تو زمین پر جگہ جگہ خون بڑا تھا اور وہ غائب تھے۔ میرن اور کرس خوف زدہ ہو گئے۔ میرن نے پھر بھاگ چلنے کو کہا مگر کرس نے صبح کی روشنی کا انتظار کرنے کو کہا۔

”رات میں ہم راستہ بھٹک سکتے ہیں۔“ صبح ہوئی تو کرس کیمرا سنبھالنے رکھے رکھے شاید سو گیا تھا۔ اچانک اسے کسی نے پکڑ کر کھینچا تو کیمرا وہیں رہ گیا اور اس سے سامنے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ روجر بھر منازہز جنگیوں نے کرس کو نیچے گرا رکھا تھا اور اسے نیزوں سے پکڑ کے لگا رہے تھے وہ اسے اذیت دے رہے تھے، ورنہ اسے ختم کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ وہ بہت دیر تک اسے اسی طرح اذیت دیتے رہے۔ عقب میں میرن ایک درخت سے بندھی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے کرس کو ختم کر لیا تو مرد پیچھے ہٹ گئے اور پھر عورتیں آئیں، انہوں نے میرن کو

درخت سے کھول کر چاروں طرف سے پکڑ لیا اور اس کا لباس نوچنے لگیں، وہ جان کو اسے ناخن مار رہی تھیں۔ میرن چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے اسے زمین پر لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھ وہی سلوک ہونے لگا جو جان، کرس اور روجر نے ان کے قبیلے کی لڑکی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ منظر ان سے دیکھا نہیں گیا اور کارل نے کیمرا آف کر دیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ اس نے رینا کی طرف دیکھا۔

”تو تمہیں پتا چل گیا کہ ان لوگوں نے کیا کیا اور پھر ان کے ساتھ کیا ہوا؟“

رینا نے سر ہلایا، وہ اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس نے تینوں کی سیٹھ اپنے بیگ میں رکھ لی۔

ان چاروں کا سامان اور لاشیں لے جانا آسان کام نہیں تھا مگر بیٹوں نے اسے آسان کر دیا۔ اس نے رینا کے سیٹلائٹ فون سے کال کی اور ایک ٹھنڈے بعد برازیلی فوج کا ایک ٹرانسپورٹر بمبلی کا پٹر وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والے پیرامیڈک نے جان، کرس، روجر اور میرن کی ڈھانچا ہو جانے والی لاشیں مخصوص پلاسٹک بیگز میں بند کیں اور ان کا سامان بھی ساتھ لے لیا پھر وہ سب اسی بمبلی کا پٹر میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ بمبلی کا پٹر نے انہیں براہ راست فی

فے پہنچا دیا تھا۔ راستے میں انہیں علم ہوا کہ کپٹن مولیر وکے پانچ آدمی حملے میں مارے گئے تھے اور وہ خود زخمی ہوا تھا مگر اس کی جان بچ گئی تھی۔ کشتی واپس ٹی نے فی کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ دو دن بعد وہ منازہز میں تھے جہاں ایک امریکی جیٹ رینا، اس کے آدمیوں اور لاشوں کو لے جانے کے لیے آیا تھا۔ رینا کے دونوں ساتھی رچرڈ اور مائل جو سپاہیوں کے ہمراہ تھے وہ بھی بچ گئے تھے۔ کارل اتر پورٹ تک آیا تھا، اس نے رینا سے کہا۔

”ان ویڈیو کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے گا؟“

”اس کا فیصلہ حکام کریں گے۔“ رینا نے آہستہ سے کہا تو کارل مسکرایا۔

”شرط لگا لو یہ بھی منظر عام پر نہیں آئیں گی۔“

”میں شرط نہیں لگاؤں گی اس لیے کہ بار جاؤں گی۔“

رینا نے کہا پھر آہستہ سے بولی۔ ”کیا تم واپس نہیں آسکتے؟“

”میں فیصلہ کر کے واپس نہیں لیتا۔“

رینا نے ٹھنڈی سانس لی اور سر ہلا کر طیارے کی طرف بڑھ گئی۔

ستاروں پر کمند

آخری قسط

طاہر جاوید مغل

اصول اور انقلاب... ہمیشہ دو مختلف طبقات کے درمیان عمل اور ردِ عمل کی ایسی کھلی جنگ کا نام جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ازل سے جاری ہے۔ چابوتوں کو دروہام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی پوجا جاتی ہیں... کیونکہ روزن کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے اسے دہانہ بنا دیتے ہیں... وہ بھی عجیب دہرے نظام اور مزاج کا شکار تھا جیسے کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کے جھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی پوتے ہیں ایسے ہی وہ بھی سرانٹھا کر جینے کی خواہش میں اپنی جڑیں زمین میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے بچپن کی دیوار سے ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا لیکن... اس کی امیدوں کے دیے تیز ہواؤں کے سرکش جھونکے بھی نہ بجھا سکے... دوسری جانب اس کی چاہت تھی جو سو دوزیاں کی حد کھینچے بیٹھی فاصلوں کو سمٹنے ہی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ جو ایک پل کی رفاقت میں قید تھا... ان گنت اندیشوں کے باوجود اسے انہونیوں کی امید تھی اگرچہ برسوں سے اس کے آنگن میں دشت کی ویرانی تھی لیکن دل کی گلیوں میں وہی جل تھل موسم کی کسک لیے وہ ایسی مسافت کے لیے رخت سفر باندھ بیٹھا تھا جس میں اس کے پاس حوصلوں اور عزم مصمم کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو خوش گمانیوں میں آکر ستاروں پر کمند ڈال چکا تھا... جس کے پیر تو زمین میں دھنسے تھے مگر... آنکھیں آسمانوں کی بلندیوں میں گم تھیں ایسے میں لگنے والی پرٹھو کر اسے ایک نئے رمز... اور پردہ اسے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستارے فلک سے زمین کی طرف نہیں آتے مگر... کمند تو زمین سے فلک کی جانب جاسکتی ہے۔ لہذا دور بیت دور اس کے مقدر کا ستارہ بھی اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

رقیبوں کی زہریلی چالوں..... پیار کی مدھرتالوں اور بدلتی رتوں کا

رومان آئینہ طویل سلسلہ





”آپ کو بھی مبارک تیا جی۔“ عادل نے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی آئی۔

بہت سے کسرے دھوا دھوا عادل کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ اس کے گرد مقامی اور غیر مقامی لوگوں کا جھوم تھا۔ برش لڑکیاں عادل کو قریب سے دیکھنے کے لیے امڈی پڑ رہی تھیں لیکن جسے وہ دیکھنا چاہ رہا تھا، وہ کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ یقیناً یہاں موجود تھی۔ شاید اپنے ٹینٹ کے روزن میں سے اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی شہزادی..... اس کی منزل..... اس کی زندگی۔

لاڑواؤں لوگوں میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھے۔ لوگ انہیں راستہ دینے کے لیے دائیں بائیں ہٹ گئے۔ انہوں نے عادل کی پیٹھ چھنی اور سرسرد سے انگلیں میں بولے۔ ”ویل ڈن مسٹر سد! آپ کے کھلاڑی نے کمال کر دیا۔ یقیناً اس میں عادل کی خدا داد صلاحیت کے ساتھ آپ کی محنت اور لگن کا بھی حصہ ہے۔ میں آپ دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔“

”آپ کی عزت افزائی کا بے حد شکریہ۔“ سرسرد نے کہا۔ وہ مسکرائے۔ ”اب اس خراج تحسین کو ایک عملی شکل دینے کا وقت بھی آ گیا ہے۔ آپ لوگ اپنے استقبال سے فارغ ہو کر میرے ٹینٹ میں تشریف لے آئیے۔ وہاں پر انٹر سیرمنی کا انتظام ہے۔“

وہ بڑی دلواؤشام تھی۔ خوشگوار..... حوصلہ بخش..... اور فتح مندی کے احساس میں ڈوبی ہوئی۔ سرسرد کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔ آج عادل کو وہ دفینیل گیا تھا جس کا وعدہ انہوں نے اس سے کیا تھا۔ وہ سب تکلیفیں اور مشقتیں آج بار آور ثابت ہوئی تھیں جن کا سامنا عادل نے پچھلے چند مہینوں میں کیا تھا۔ بے شک اس کے جسم میں اذیتوں کے بے شمار کانٹے ٹوٹے تھے لیکن آج وہ کانٹے نکال لیے گئے تھے اور اس کے جسم کو محبت کے گلابوں کا مہمہل رہا تھا اور محبت کے ان گلابوں میں اہم ترین گلاب شہزادی کی محبت کا تھا..... ہاں یہ ”کایا کلیپ“ شام تھی۔ بہت سرد ہونے کے باوجود روح کو گرما رہی تھی، سرشار کر رہی تھی۔

دو تین گھنٹوں کے اندر اندر عادل ایک کروڑ پتی شخص بن گیا تھا۔ ہاں..... آج ان برف پوش چوٹیوں نے اپنے اندر چھپا ہوا دفینیل اس کے حوالے کر دیا تھا۔ جب خوشیوں کی یلغار ہو تو جسمانی تکلیفیں اس کے اندر دب جاتی ہیں۔ عادل بھی تقریباً بھول چکا تھا کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے اور

عادل کی برتری اب تین فٹ سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ لیو پنڈ یہ برتری کسی بھی وقت ختم کر سکتا تھا۔ میں پچیس فٹ کی چڑھائی اب بھی باقی تھی۔ عادل نے اپنی رہی سہی طاقت جمع کی اور یہ آخری میں پچیس فٹ طے کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا..... اور پھر وہ سہری موقع آیا جب اس نے اپنے ہاتھوں سے نوبل راک کے بالائی کنارے کو چھوا۔ اوپر کھڑے ”ریفریڈ“ نے سرخ جھنڈی بلند کر کے اور سیٹی بجا کر عادل کی فتح کا اعلان کیا..... عادل بہ مشکل دو فٹ کے مارجن سے یہ مقابلہ جیت چکا تھا۔

وہ راک کے اوپر پہنچا اور قریباً چلرا کر اوندھے منہ گر گیا۔ چٹان پر موجود افراد اس کی طرف لپکے۔ ان کے پاس چھوٹے آکسیجن سلینڈر اور ماسک وغیرہ موجود تھے، انہوں نے ایک ماسک عادل کے منہ پر چڑھا دیا۔

☆☆☆

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس کامیابی نے جہاں برطانیہ کے گوروں کو ہلا کر رکھ دیا، وہاں عادل اور اس کے ساتھیوں کا جوش و خروش بھی دیکھنے کے قابل کر دیا۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد جب عادل نیچے پہنچا تو ہمایوں اور چند مقامی پور پرنرز نے اسے کندھوں پر اٹھالیا۔ تالیوں کی گونج اور نعروں کے شور سے قرب وجوار گونج اٹھے۔ سناترا برادری کے بہت سے افراد بھی چارونا چار عادل کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ سرمد صاحب کے چہرے پر فتح کی چمک دیکھ کر عادل کا خون سیروں بڑھ گیا۔ یہ بات بھی عادل کے لیے بہت حوصلہ افزا بھی کہ تیا فراسٹ کے ساتھ آئے ہوئے کئی افراد بھی اس موقع پر خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب عادل کے جانے پہچانے چہرے تھے..... اس کے ہم وطن..... اس کے گاؤں کے لوگ، جن کے ساتھ وہ کھیل کودا تھا اور جن کے درمیان وہ پروان چڑھا تھا۔

ہمایوں نے اسے کندھوں سے اتار کر کرشل دوڑ کر آئی اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ اس کا چہرہ گلزار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں عادل کو کرشل کے والد اور سوتیلی والدہ کی جھلک نظر آئی۔ ان کے منہ بھولے ہوئے تھے اور کدورت چھپائے نہیں جھپکتی تھی۔ کسی نے عادل کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کے سینے میں جیسے ان لنت شگوفے نکل اٹھے۔ تیا فراسٹ اس کے سامنے تھے۔

”مبارک عاوے پتر۔“ انہوں نے لرزتی آواز میں کہا اور عادل کو گلے سے لگالیا۔

”یہ انعام کی رقم ہے تایاجی! آپ میرے بڑے ہیں، اسے اپنے پاس رکھیں۔ آپ جس طرح چاہیں گے، میں اسے خرچ کروں گا۔“

”نہیں عادیے..... یہ..... تمہاری کمائی ہے۔ تم اسے اپنے پاس رکھو۔“

”تایاجی! آپ جانتے ہی ہیں، میں روپے پیسے کے معاملے میں بالکل نکما ہوں۔ یہ آپ کے پاس ہوں گے تو مجھے تسلی رہے گی۔“

”نہیں عادیے پتر.....“ وہ ہنسنے لگے۔ ”جو بندہ پیسے کما سکتا ہے، وہ انہیں سنبھال بھی سکتا ہے۔ یہ تمہارے پاس رہیں گے اور مجھے یقین ہے کہ تم انہیں خرچ بھی چکے طریقے سے کرو گے۔“

اسی دوران میں انور بھی خیمے میں آ گیا۔ وہاں عادل کو دیکھ کر اس نے جلدی سے واپس جانا چاہا لیکن پھر تایا فراسٹ کے اشارے پر رک گیا۔ تایا فراسٹ نے کہا۔ ”انور! تمہاری طرف سے عادل کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ تم کو عادل سے معافی مانگنی چاہیے۔“

انور نے اپنا زخمی بازو دھو لے لگا رکھا تھا۔ بازو پر کندھے سے کلائی تک پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ انور اندر آیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ”عادل بھائی! میں نے واقعی تمہارے ساتھ چنگا نہیں کیا۔ میں نے پنڈ میں جھوٹ بولا کہ تم مجھے زبردستی احاطے کے دروازے پر لے کر گئے تھے۔ یہ سب..... یہ سب.....“ وہ کہتے کہتے انک گیا۔ پھر ہمت کر کے بولا۔ ”یہ سب ناصر چودھری نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ بہت نگرا بندہ ہے۔ اگر میں اس کی گل نہ مانا تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھ کو معافی دے دو عادلے بھائی۔“ وہ ایک دم آگے بڑھ کر عادل کے قدموں میں گر پڑا۔

عادل نے فوراً اسے اٹھایا..... اور تسلی دی۔

سب کچھ تبدیل ہو رہا تھا۔ جو لوگ دو دن پہلے تک اسے نفرت اور کدورت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ اب اسے کندھوں پر اٹھانے کے لیے تیار تھے۔ وہ برطانوی شہریوں کو کٹھن سے بتا رہے تھے کہ وہ عادل کے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ برطانوی تماشائیوں میں کچھ حسانی بھی موجود تھے۔ وہ عادل کا انٹرویو لینے کے لیے بے تاب تھے۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ عادل کو لے کر اپنے ٹینٹ میں جانا چاہتی تھی اور وہاں اس کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کرنے کی خواہش مند تھی۔ سرد صاحب نے بھی اس کی

مقابلے کے دوران میں اس کی حالت کس قدر خراب ہوئی ہے۔ اب وہ خود کو بالکل بھلا چڑکھا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس سب کے باوجود اس نے کھانے پینے میں بہت احتیاط سے کام لیا۔ وہ جانتا تھا کہ فوڈ پوائزننگ کی حقیقت کیا تھی؟ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، لیوینڈ اور اس کے ساتھیوں کا کیا دھرا تھا پھر بھی وہ اب سارے نکلے شکوے بھلا کر لیوینڈ کو گلے سے لگانا چاہتا تھا لیکن لیوینڈ اسے اپنے آس پاس نہیں نظر نہیں آیا۔ شاید کہیں غم غلط کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد عادل نے سرد صاحب سے اجازت لی اور تایا فراسٹ کے ٹینٹ کی طرف چل دیا۔ وہ تایا فراسٹ سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ہمایوں سے کہا تھا کہ وہ قاسم کو کچھ دیر کے لیے دوسرے ٹینٹ میں بھیج دے۔ قاسم کے ہاتھ اب کھولے جا چکے تھے..... اور وہ کسی طرح کی مزاحمت یا ناراضگی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی ہمایوں نے احتیاطاً ایک گن مین اس کے ارد گرد رکھا ہوا تھا۔ ایک ایسا ہی گن مین دروازہ قدامتصر کے آس پاس بھی موجود رہتا تھا۔

عادل تایا فراسٹ والے ٹینٹ میں پہنچا تو وہ نماز پڑھ کر جائے نماز سے تھر رہے تھے۔ دو چادران میں ہی وہ بہت بدلے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ عادل کو دیکھ کر وہ آگے بڑھے اور عادل کو گلے لگا لیا۔

عادل نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”تایاجی..... آپ کی دعاؤں سے، میں نے آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“ وہ سسک پڑے۔ ”مجھے یقین تھا عادیے پتر! تو جو کچھ بھی ہے لیکن تیرے اندر ہمت ہے..... تو لڑنا جانتا ہے۔ تو کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ میں قاسم اور عاصم سے بھی یہی گل کہتا تھا.....“

”میں تو کچھ بھی نہیں ہوں تایاجی! بس قدرت نے میری مدد کی ہے۔“

تایا فراسٹ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے ایک بار پھر گلے سے لگا کر رونے لگے لیکن اس بار وہ سکینوں کے بجائے ہتھکپوں سے رو رہے تھے۔ عادل بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ وہ بتاتی ہی دیر اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر عادل نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ڈھالی ڈھالی لاکھ پاؤنڈ کے وہ دو ”بے آرڈر“ تایا فراسٹ کی طرف بڑھا دیے جو اسے پرائز مینی میں پیش کئے گئے تھے۔

”یہ کیا عادیے پتر؟“ تایا فراسٹ نے کہا۔

سفرارش کی اور عادل، سرمد صاحب کی بات رد نہ کر سکا لیکن جب وہ اس خاتون صحافی کے خیمے میں پہنچا تو ششدر رہ گیا۔ وہاں شہزادی پہلے سے موجود تھی۔ شہزادی تھوڑی گھبرائی ہوئی تھی۔ بہر حال اس نے عادل کو دیکھ کر سلام کیا اور ہولے سے مسکرائی۔

عادل نے پلٹ کر دیکھا۔ نوجوان خاتون صحافی بھی مسکرا رہی تھی۔ ”یہ کیا ہے؟“ عادل نے خاتون صحافی سے پوچھا۔

اس نے انکشاف میں جو جواب دیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے انٹرویو کے دوران میں شہزادی کی موجودگی اچھی لگے گی اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور عادل کی اس عظیم کامیابی کے بعد ان دونوں کی شادی کے قوی امکان بھی موجود ہیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ شہزادی نے عادل سے پوچھا۔ عادل بھی ہولے سے مسکرایا۔ ”بڑی اچھی اچھی باتیں کر رہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاید ہم دونوں بہت جلد ایک ہونے والے ہیں۔“

شہزادی کے چہرے پر شوق کے رنگ بکھر گئے۔ اسی دوران میں نوجوان صحافی خاتون بولی۔ ”اگاڈا! مائی آڈیو سسٹم۔“ وہ آڈیو سسٹم کا بہانہ کر کے جلدی سے باہر نکل گئی۔

یقیناً وہ عادل اور شہزادی کو موقع دینا چاہتی تھی کہ وہ دوچار منٹ اکیلے میں بات کر لیں۔

شہزادی کے دلکش چہرے پر گہرے ہنسنا نظر آنے لگی۔ پھر وہ تیزی سے اٹھی۔ ”عادل! مجھے اپنے خیمے میں جانا چاہیے۔“ وہ دروازے کی طرف بڑکی تو عادل نے ہمت کر کے اس کی کلائی تھام لی۔ کلائی کی چوڑیاں چمکیں، وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ”مجھے مبارک باد نہیں دو گی؟“ عادل نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

اس نے سر جھکایا اور سادگی سے بولی۔ ”نہیں۔“

”کیوں؟“ عادل نے پوچھا۔ شہزادی کی نازک کلائی ابھی تک اس کی گرفت میں تھی۔

”مبارک ہو لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ عادل نے پوچھا۔

”میرا دل بڑا بوہل ہے عادل! مجھے عاصم اسپتال میں زخمی پڑا ہے اور پھر۔۔۔۔۔ تمہارے ماموں طفیل۔ ان کا بہت دکھ ہے مجھے۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔“

”غم اور خوشی تو دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتے ہیں۔“ عادل کا لہجہ بھی کچھ بوہل ہو گیا۔

”لیکن۔۔۔۔۔ لیکن پتا نہیں کیوں عادل۔۔۔۔۔ مجھے لگتا

ہے کہ ابھی ہمارے دکھ ختم نہیں ہوئے۔ بس وہم سادل میں بیٹھا ہوا ہے۔ کہیں کچھ ہونے چاہئے۔“

”غم اتنا زیادہ سوچتی ہو کہ تمہارا دل ہر وقت غم کے گھیرے میں رہتا ہے۔ خوشی کے جو موقع آتے ہیں وہ بھی تمہارے غم کے بوجھ کے نیچے دب جاتے ہیں۔“

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ”ماموں طفیل کو کس نے مارا عادل؟ کیا اسی بد معاش نے جو مجھے بھی گاؤں سے یہاں لے کر آیا؟“

عادل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”حالات تو یہی بتا رہے ہیں۔“

”وہ اب کہاں ہے عادل؟“ شہزادی نے روہا سی آواز میں کہا۔

”مجھے کچھ پتہ چلتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ اپنے انجام کو بھی ضرور پہنچے گا۔“

دونوں کچھ دیر خاموش رہے پھر شہزادی موضوع بدل کر بولی۔ ”عادل! میں تمہاری جیت سے بہت خوش ہوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور مجھے لگتا ہے کہ اباجی بھی خوش ہیں۔“

اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ یقیناً ان آنسوؤں کا تعلق خوشی سے ہی تھا۔

اس نے عادل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں زور سے دبایا۔ یہ اس کی گرم جوشی کا اظہار تھا۔ عادل کو لگا جیسے شہزادی کا ہاتھ ہی نہیں اس کا پورا جسم اس کے جسم سے پیوست ہے۔ وہ عادل کو سمجھ رہی ہے۔ اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ اپنے تمام تر حسین احساسات کے ساتھ۔

عادل نے بھی اس کے ہاتھ کو دبایا۔ اپنی انگلیوں کو اس کی انگلیوں میں پیوست کر دیا۔ شہزادی نے پلکیں جھمکائیں جیسے وہ عادل کی آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہ رکھتی ہو۔ شاید ایسا ہی تھا۔ اس کے خوب صورت ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔ تمہاری طرح میں بھی کچھ بھی بھولی نہیں۔ ہاں عادل! لالی کے سارے روز و شب مجھے یاد ہیں۔ وہ ساری گرم سنسان دوپہریں جن میں ہماری سرگوشیاں گونجیں اور وہ ساری خوب صورت شامیں جن میں دلنشین وعدوں کی مٹھاس تھی۔

اچانک وہ دونوں بری طرح چونک گئے۔ خیمے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شاید صحافی خاتون واپس آ رہی تھی لیکن نہیں، یہ تو مردانہ قدموں کی آواز تھی۔ پھر یکا یک جیسے ایک طوفان آگیا۔ خیمے کا پردہ زور سے پھڑ پھڑایا۔ کسی نے عادل کا گریبان پکڑا اور ایک تند و تیز

کم ہونے لگی۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگا۔ آوازیں زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کی سماعت سے نکلنے لگیں۔ وہ کسی کی آواز کا مفہوم بھی سمجھنے لگا لیکن وہ اپنے وجود کو حرکت دینے کے قابل اب بھی نہیں تھا۔ اپنی پلکوں تک کو ہلا نہیں سکتا تھا۔

اس کا دھندلا یا ہوا ذہن اسے بتا رہا تھا کہ اس کے ارد گرد کچھ اٹکھا ہو چکا ہے۔ کچھ بہت خاص..... اور غیر متوقع..... شاید کوئی آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ کسی قدرتی اتلانے اسے اور اس کے قریب موجود سب افراد کو گھیر لیا ہے۔ شاید کوئی برف کا طوفان..... یا پھر کچھ نہایت بے رحم لوگ..... جن کی آنکھوں سے آگ نکل رہی ہے اور جن کے ہونٹوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ یہ سب کچھ کہاں پر ہو رہا ہے؟ کون لوگ ہیں یہ..... کیا چاہتے ہیں؟ کیا حقیقت میں ایسا ہے..... یا پھر یہ سب اس کا وہم ہے؟ اس کے پیار، مفلوج ذہن کا کوئی کن من گھڑت احساس ہے؟ اس کا ذہن واقعات کو آپس میں مربوط کرنے میں قطعی ناکام تھا۔

کبھی کبھی اسے اپنے بازو یا پھر کندھے پر ہلکی سی چھین محسوس ہوتی۔ اسے لگتا کہ اسے آنکھیں لگایا گیا ہے۔ گاہے گاہے کسی دوا کی نہایت تیز بو بھی وہ اپنے ہتھوں میں محسوس کرنے لگا۔

ایک دن جب وہ نیم بے ہوشی والی حالت میں تھا، کسی نے آنکھیں میں کہا۔ ”اس کی حالت میں کچھ بہتری تو نظر آ رہی ہے لیکن ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“

پھر دوا فرا دار دو میں باتیں کرنے لگے۔ کبھی عادل کو لگتا کہ یہ اس کا تصور ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ نہیں وہ لوگ حقیقت میں بول رہے ہیں۔ وہ سن رہا تھا لیکن خود کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا۔ ایک آواز نے کچھ اس قسم کی بات کہی ”قسمت کی بات ہے، جو کچھ ہوا اس طوفان کی وجہ سے ہوا۔ اگر ہم پندرہ بیس گھنٹے پہلے یہاں سے نکل جاتے تو کبھی یہ سب نہ ہوتا۔“

”قدرت کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔ یہ مصیبت ہمارے مقدر میں لکھی تھی۔“

پہلی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں۔ ان لوگوں سے بات کی جائے۔ کچھ لو، کچھ دوا کی بنیاد پر معاملہ طے کیا جائے۔ روپیہ میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور دینے کے لیے روپیہ ان غیر ملکیوں کے پاس کم نہیں ہے۔“

”لیکن بات تو نقد کی ہے نا۔ یہ بڑے خبیث لوگ ہیں۔ کسی وعدے پر اعتبار نہیں کریں گے۔ یہ یہی سوچیں

جھکا دے کر اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ اس کے کانوں میں شہزادی کے چلنے کی آواز آئی۔ اسے اپنے سامنے ایک ریسلر نما آکر بڑ نظر آیا۔ اس کے پہلو میں لیو پڈ تھا۔ لیو پڈ کو ایک نظر دیکھ کر ہی عادل جان گیا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے انگلیں میں پکڑ کہا۔ پھر ہاتھ میں پکڑے چاقو کو نہایت وحشت سے عادل پر چلا یا۔ وہ بار عادل کی گردن پر تھا۔ عادل نے تیزی سے ہٹک کر یہ ہلکے وار بچا یا لیکن وہ لگا وار نہیں بچا۔ یہ وار پیچھے سے کیا گیا تھا اور اسی پہلو انہما شخص نے کیا تھا جس نے اسے خیمے سے گھینا تھا۔ اس نے کسی نہایت وزنی شے سے عادل کے سر پر ضرب لگائی۔ عادل کی آنکھوں میں... آنکھت ستارے تاج گئے۔ وہ پہلو کے بل تخت برف پر گرا اور ہوش دھواں سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ عجیب کیفیت تھی۔ وہ ایک ناقابل بیان صورت حال تھی۔ عادل خود کو جیسے ہواؤں میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے نیچے جیسے پھیلی ہوئی برف کا دریا تھا جو بڑے شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ وہ شاید بے ہوش تھا لیکن وہ ایسی... بے ہوش تھی جس میں گاہے گاہے نیم بے ہوشی جیسے وقفے بھی آتے تھے۔ کبھی یہ نیم بے ہوشی واضح ہوتی تھی اور اس میں اسے ارد گرد کی آوازیں کا احساس ہوتا تھا اور کبھی یہ نیم... بے ہوشی..... بے ہوشی کا حصہ ہوجاتی تھی۔ اسے پھلکی ہوئی برف کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

جب وہ نیم بے ہوشی میں ہوتا تھا، وہ اپنے آپ کو حرکت دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی پلکوں تک کو اٹھانے میں ناکام رہتا تھا۔ پھلکی ہوئی برف کے دریا کا رنگ سنہری ہوجاتا تھا۔ اس کے اندر سے کوئی لپکار کہتا تھا..... تمہارا ذہن مفلوج ہو چکا ہے۔ تم خود بھی فانی زدہ ہو چکے ہو۔ یہ ادھوری موت ہے اب تمہیں واپس نہیں آتا۔ ادھوری موت سے پوری موت کی طرف جانا ہے۔ پوری موت، جس میں سفید نقش ہوتا ہے، کا فوری بوجھ ہوتی ہے اور اندھیری قبر۔ پھر سب کچھ لگا ہوں سے اوجھل ہو جاتا، ہر احساس ناپید ہو جاتا۔ یہ وقفہ معلوم نہیں کتنا لمبا ہوتا۔ شاید ایک دو گھنٹے، شاید ایک دو دن، یا پھر اس سے بھی زیادہ۔

آہستہ آہستہ نیم بے ہوشی والے وقفے بڑھنے لگے۔ وہ گہری بے ہوشی جو اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی تھی،

کسی آواز نے بین کیا۔

بھین بھین خوشبو ایک دم اوجھل ہو گئی۔ دوا کی تگوار پڑ
بھی پس منظر میں چلی گئی۔ کچھ وقت گزرا پھر اس نے دو
افراد کو اپنے قریب بائیں کرتے ہوئے پایا۔ ایک آواز کو
اس نے فوراً پہچان لیا۔ یہ اس کے تایا فراست کی آواز تھی۔
وہ غصے میں کسی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ یہ آواز کانوں سے
ٹکرائی تو عادل کو کیچہ اور بھی یاد آنے لگا لیکن جو یاد آ رہا تھا،
وہ بہت دھندلا تھا۔ ایک صورت کی نگاہوں کے سامنے بن
بن کر کھڑی رہی تھی۔ یہ کس کی صورت تھی؟

تایا فراست کی آواز بچانے کے بعد عادل نے اٹھنا
 چاہا، تایا کو یکارنا چاہا مگر اس کی آواز نے ساتھ دیا، نہ وہ
 اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دے سکا۔ بس پتھر کا پتھر لینا
 رہا۔ تایا کسی سے بول رہے تھے۔ دوسری آواز کس کی تھی؟
 کس کی تھی؟ یکا یک اس کے ذہن میں برق سی لہرائی۔ یہ
 آواز تایا کے بیٹے کی تھی۔ تایا کا بیٹا۔ تایا کا بیٹا۔ کیا نام
 تھا اس کا۔ قاسم۔ یہ قاسم کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا
 تھا۔ ”ابا! میں میرا کیا قصور ہے؟“

تایا کی آواز ابھری۔ ”تیرا قصور ہے..... قصور ہے، تو نے یار بنایا ہوا تھا۔ اس کی ہر چہچہائی بری گل کی حمایت کرتا تھا۔ میری آنکھوں پر بھی پردہ ڈالا ہوا تھا تو نے۔ اب دیکھ لیا انجام۔ وہ ہمارا لہو پیتا چھا رہا ہے۔ غیروں کے ساتھ مل کر ہمیں گولیوں سے چھانی کر رہا ہے وہ گنبد۔“

”ابا! وہ کہتا ہے کہ ہم شہزادی کے معاملے میں اس سے دھوکا کریں گے۔ اسے دغا دیں گے..... اس نے اپنے دل میں یہ نہیں کہا کیا سوچ لیا تھا۔“

اچانک عادل کے دل و دماغ میں برقی لہریں مچنے لگیں۔ اسے یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جو وجود اس کے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں چلا رہا تھا اور اسے دوپٹا رہا تھا..... وہ کوئی اور نہیں تھا، شہزادی کا وجود تھا۔ اس کی جان، اس کی روح..... وہ اس کے لیے آگ اور برف کے سات سمندروں کے اوپر سے گزرا تھا..... اور ابھی ایسے مزید کتنے سمندر پار کر سکتا تھا..... لیکن کیسے؟ وہ تو اب اپنے اندر ہلنے جلنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ایک بار بھر بحرِ پورِ نوش کی..... اپنے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کرنا چاہا۔ اپنے پاؤں کو اور ہاتھوں کی انگلیوں کو حرکت دینا چاہی۔ لیکن کچھ نہ کر سکا۔ ذہن پر چھائی دھند کچھ اور گہری ہو گئی۔ آوازیں فاصلے پر چلی گئیں مگر سنائی دیتی رہیں۔ چہرے باد آ رہے تھے لیکن واقعات کی بہت سی درمیانی کڑیاں

گئے کہ جہول رہا ہے وہ لے لیں اور جو کچھ ان کو مل رہا ہے، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ لاکھوں پاؤنڈ زکا بہترین سامان ہے۔ خوب صورت لڑکیاں ہیں، ہتھیار ہیں..... اور کیش کی شکل میں بھی لاکھوں پاؤنڈ تو ہوں گے۔“

دفعۂ عاقل کی سماعت سے کچھ آوازیں نکلیں۔ اسے لگا کہ وہ برف کے دریا سے نکل چکا ہے اور اب ایک بہت بڑے اور گہرے، برفیلے کنوئیں میں ہے۔ اس کنوئیں میں گولیاں چل رہی ہیں۔ کبھی سنگل فائر ہوتے ہیں، کبھی برسٹ چلتے تکتے ہیں۔ لوگ چلا رہے ہیں، زخمی ہو رہے ہیں۔ اس کے قریب گفتگو کرنے والے بھی باہر چلے گئے۔

عادل کے دل کی گہرائیوں سے ایک آواز ابھری۔ ”میں اسے
تو نہیں کہہ چکا ہوں کہ وہ جیسا کہ وہ ہے۔ پانڈوں کا
خیال ذہن میں آتے ہی عادل کے ذہن میں ایک کرخت
چہرے کی شبیہ ابھری۔ سوچی سوچی آنکھیں، ہتھمٹا ہوا
گندمی رنگ، منڈا ہوا سر۔ یہ کون تھا؟ اس نے دماغ پر زور
دیا لیکن کچھ یاد نہیں آیا۔ خیالات کبھرے کبھرے
تھے۔ پھر اس کے تصور میں شہر لاہور کا نقشہ ابھرا۔ ایک
معروف چوک، ٹریفک، بارنوں کا شور، جھوم۔ اس جھوم
میں اس نے کچھ دیکھا تھا۔ شاید یہی چہرہ۔ شرابی چہرہ۔

کیا نام تھا اس کا؟ کیا نام تھا، اس نہایت ناپسندیدہ شخص کا؟
 رہن میں جھکا سا ہوا..... مالکانے زادہ..... تو کیا مالکانے
 زادہ یہاں موجود تھا؟ وہ یہاں کیوں موجود تھا؟ اس سے اس
 کی کیا متنی تھی، کیا معاملہ تھا؟ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔
 لیکن یہ یاد آ رہا تھا کہ کچھ ہے۔ کچھ بہت برا ہے۔ ایک بار
 پھر نیمے ہوش کا دورانیہ ختم ہو گیا۔ وہ اپنے ارد گرد سے.....
 بے خبر ہو گیا۔ کتنی دیر کے لیے..... ایک دو گھنٹے کے لیے.....
 ایک دو دن کے لیے؟ وہ یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

☆☆☆

کوئی اس پر جھکا ہوا تھا۔ ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا۔ بڑی نازک انگلیاں تھیں۔ یہ جس کی انگلیاں تھیں؟ جسم سے اٹھنے والی یہ بھیجنی خوشبو کس کی تھی؟ کوئی بہت پسندیدہ ہستی تھی؟ مگر کون سی؟ وہ ٹھیک سے یاد نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ عجیب کیفیت تھی، آگاہی بھی محروم دھوری۔

پھر اس نازک انہیوں والی ہستی نے اسے دوا چلائی۔
دوا کی ناگوار بو، کوئل جسم کی جانی پہچانی خوشبو پر غالب
آگئی۔ تب ایک بار پھر وسیع برقیلے کنوئیں کے اندر گولیاں
چلنے لگیں۔ ریٹ ریٹ..... ریٹ ریٹ۔ کچھ لوگ چلائے،

غائب تھیں۔

پھر اس نے شہزادی کی دلدوز آوازیں سنیں۔ وہ قاسو کو پکار رہی تھی۔ بین کر رہی تھی..... ہاں وہ بین کر رہی تھی۔ وہ تو اس کا ایک آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کہاں یہ کہ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی، چلا رہی تھی۔

عادل کا سینہ جھٹنے لگا۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا، اپنی شہزادی کی گریہ و زاری نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے اپنی ساری جسمانی اور دماغی توانائیاں جمع کیں، اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ اسے لگا کہ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو حرکت دینے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس نے اس حرکت کو بڑھاتا چاہا۔ اپنے بالائی دھڑکاتھا چاہا۔ یہ بڑا جاں مسل عمل تھا۔ اسے محسوس ہوا، اس کے جسم کی ہڈیوں میں اذیت کا دیر پا بہہ لگا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں، اس نے ہونٹوں کو دلا کرنا چاہا۔ ایک دم کوئی نکشن سا کرت گیا۔ ذہن پھر تار یکویں میں ڈوبنے لگا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اس کا آخری احساس یہی تھا کہ یہاں اس جگہ..... اس کے ارد گرد کچھ بہت خوفناک ہو رہا ہے۔ کوئی ایسا مہلک حصار ہے جو لوگوں کو ایک ایک کر کے کھا رہا ہے، ان کا خون پی رہا ہے۔

☆☆☆

اس کے مفلوج ذہن نے ارد گرد کے ماحول کو دوبارہ محسوس کرنا شروع کیا تو اسے لگا کہ اس کے قریب کسی یلب کی مصنوعی روشنی ہے۔ اسے اپنے بازو میں سوئی جیسے کی ہلکی سی تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر ایک دم اسے شہزادی کی دلدوز آواز کا یاد آئی۔ تو کیا قاسم چکا تھا؟ یقیناً اس کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا۔ شہزادی تو بڑے حوصلے والی تھی، وہ یونہی بلک بلک کر نہیں روئی تھی۔

شہزادی..... عادل کے دل کی گہرائیوں سے ایک پکار اٹھی۔

اس نے پھر اٹھنا چاہا..... مگر وہ صرف اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو ہی حرکت دے پڑا۔ باقی جسم اسی طرح پتھر رہا۔ اسے ان باتوں کی گونج سنائی دینے لگی جو شہزادی کی آہ و یکا سے پہلے تیا فراموش اور قاسو میں ہوئی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ ان باتوں میں بار بار جس بندے کا ذکر کیا گیا..... وہ ناصر تھا۔ بے قدر اور سرد آنکھوں والا بد نیت ناصر۔ تو کیا ناصر پاؤندوں کے ساتھ مل چکا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہی پاؤندوں کو اور مالکانے زادہ کو یہاں لے کر آیا ہو؟

عادل کو محسوس ہوا کہ اب اس کا ذہن پہلے سے کچھ بہتر کام کر رہا ہے۔ اسے نہ صرف چہرے اور نام یاد آ رہے تھے

تیا کبہ رہے تھے۔ ”کواس بند کر قاسو۔۔۔ تو بے وقوف ہی نہیں، بے غیرت بھی ہے۔ ابھی ایک آدھ دن میں جب وہ کتے کا پتر ہم سب کو گھیر لے گا اور تیری بہن کو تیری آنکھوں کے سامنے خوار کرے گا..... اور باقی ساری زنانیاں بھی خوار ہوں گی تو پھر بھی یہی کہنا کہ اس میں ہمارا قصور ہی تھا۔“

قاسو چنگھاڑا۔ ”میری بہن کو کوئی ہتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ میں اس کے ٹوٹے کر دوں گا اب..... میں خون پی جاؤں گا اس کا۔“

کہرام سانچ گیا۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا۔ بس عادل اپنے دھندلائے ہوئے مفلوج ذہن کے ساتھ اندازے ہی لگا سکتا تھا۔ قاسو شاید رائل پڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تیا فراموش اسے سنہا لیا چاہ رہے تھے۔ ان کا کوئی کوئی فقرہ عادل کی ساعت تک بھی پہنچ رہا تھا۔ ”وہ وحشی ہو رہے ہیں، چھانی کر دیں گے تجھے..... اگر مرنا ہی ہے تو پھر اپنے ہاتھوں سے گولی مار لے خود کو.....“

”چھوڑ دے اب..... چھوڑ دے مجھے۔ تو نے مجھے..... بے غیرت کہا ہے، میں بتاؤں گا کہ غیرت کیا ہوتی ہے۔“

یہ ایک شور و غل کی یہ ساری آوازیں، عادل سے دور چلی گئیں..... اور جب یہ آوازیں دور جا رہی تھیں، عادل کے کانوں میں کسی عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ اس مرتبہ وہ پہچان گیا۔ یہ اس کی شہزادی کی آواز تھی۔ وہ کیوں چلائی تھی؟ وہ ابھی اس سوال کا جواب ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک بار پھر برف کے وسیع اور گہرے کنوئیں کے اندر گولیاں چلنے لگیں۔ ریٹ ٹیٹ..... ریٹ ٹیٹ۔ آواز شدید تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک دم درجنوں لوگ ایک دوسرے پر فائر کر رہے ہیں۔ واقعی فائرنگ ہو رہی تھی یا صرف اس کی ساعت اسے دماغوں میں ہٹا کر رہی تھی؟ نہیں یہ فائرنگ تھی، چھوٹے بڑے ہتھیار چل رہے تھے۔ کیوں ہو رہی تھی یہ فائرنگ؟ اس نے اپنے کمزور ذہن پر زور دیا۔

جواب نہیں ملا۔ دھند مزید گہری ہو گئی۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب وہ کچھ سوچنے کے لیے زیادہ کوشش کرتا تھا، ذہن تار یکویں میں ڈوبنے لگتا تھا۔

کچھ وقت گزرا پھر اسے اپنے آس پاس تیا کی روتی بلکتی آواز سنائی دی۔ ”قاسو..... قاسو! میں نے تجھے کہا تھا نا..... اوئے ناصر! میں نے تجھے کہا تھا نا۔ اوئے تو نے میری کمر توڑ کر رکھ دی۔“

بلکہ ان کا باہمی تعلق بھی کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے سر پر کوئی شدید ضرب لگی تھی لیکن یہ کس موقع پر لگی اور کس نے لگائی، اس کے بارے میں تصورات دھندلے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے سر کو چھو جانا یا لیکن وہ ہاتھ کو حرکت دے سکا، نہ سر کو۔ اس کی بے بسی برقرار تھی۔ اس کی ناتوانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

وہ شاید ایک خیمے میں تھا۔ خیمے سے باہر کوئی زخمی عورت جسمانی اذیت کے سبب رو رہی تھی اور انگلیں میں کچھ کہہ رہی تھی۔ الفاظ عادل کی سمجھ میں نہیں آئے۔ پھر کوئی عادل کے بالکل پاس سے بولا۔ غالباً یہ برٹش ڈاکٹر تھا۔ اس ڈاکٹر کا نام عادل کو یاد نہیں آیا لیکن اس کا چہرہ اس کے تصور میں گھوم گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ حالت ہفتوں اور مہینوں تک رہ سکتی ہے اور.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”اور کیا ڈاکٹر؟“ ایک دوسری آواز نے پوچھا۔
ڈاکٹر نے بالکل سرکوشی میں کچھ کہا۔ الفاظ عادل کی سمجھ میں نہیں آئے۔

دوسری آواز نے کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر..... آوازیں سن سکتا ہے؟“

”یہ ممکن ہے..... لیکن پہچاننا زیادہ سکون میں رہے گا اور اس کے برین کی حرکت جتنی کم ہوگی، اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ ہم ڈاکٹری زبان میں اس کیفیت کو Temporary paralysis کہتے ہیں لیکن اگر احتیاط نہ کی جائے تو پھر یہ حالت مستقل شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔“

”پلیز، ڈاکٹر! کچھ کریں، اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“ آواز نے پھر کہا۔

اور ایک ایسی عادل کے سینے میں جیسے سیکڑوں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے پچھلے چند دنوں میں گئی بات یہ آوازیں تھیں لیکن پہچان نہیں پایا تھا مگر آج اس نے پہچان لیا۔ یہ اس کے مہربان استاد..... اس کے روحانی باپ کی آواز تھی۔ اس کے رائیگاں اس کے مرتی، سرسرد۔ ہاں، وہ سرسرد تھے اور وہ اس کے پاس موجود تھے اور یہ وہ تھے جنہوں نے اسے جینا سکھایا تھا۔ زندگی کو زندگی کرنے کے گرتائے تھے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ چٹانوں سے کیسے ٹکرایا جاتا ہے۔ سنگلاخ دیواروں میں راستے کیسے بنائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ تقدیر اپنے ہاتھوں میں کیسے لی جاتی ہے۔ کیسے خود کو مصیبتوں، مشقتوں اور تکلیفوں سے نبرد

آزمایا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کی جاتی کہ صلہ کب ملے گا اور ملے گا بھی یا نہیں۔ بس اپنا کام اس غیر متزلزل یقین کے ساتھ جاری رکھا جاتا ہے کہ خوشیوں اور راحتوں کو آنا ہی آتا ہے۔ جیسے کالی رات کے بطن میں دن چھپا رہتا ہے، اسی طرح تکلیف کے اندر ہی کہیں ”ہم وزن“ راحت کا وعدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ ”ہم وزن“ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ یعنی جتنی تکلیف اتنی ہی خوشی اور راحت۔ نقد پر کو ہاتھ میں لینے کا گروہ یہ بتاتے تھے کہ انسانی زندگی میں تکلیفوں اور راحتوں کی مقدار برابر ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ہم تکلیفوں کے کھاتے میں بہت سی تکلیفیں سہہ لیتے ہیں اور جمع کر لیتے ہیں تو پھر ہم وزن راحتوں کو بھی زندگی میں آنا ہوتا ہے۔ اب اگر ایک بندہ خود پر دیگر راحتوں اور خوشیوں کے دروازے بند کر لیتا ہے اور اپنا من چاہا دروازہ کھلا رہنے دیتا ہے..... مثلاً اپنے محبوب سے وصال کا دروازہ..... تو پھر اس بات کا قوی امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس کے حصے کی خوشیاں اسے اپنے من چاہے دروازے کے راستے ہی سے ملیں..... یعنی محبوب سے وصال کی صورت میں..... عادل کو بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

ہاں، وہ ہی استاد محترم تھے۔ عادل نے چاہا کہ وہ اٹھے اور ان کے سینے سے لگ جائے۔ اس نے انہیں پکارنا چاہا، اٹھنا چاہا لیکن یہ دونوں کوششیں ناکام ہوئیں۔ اس کا ذہن یہ مشقت برداشت نہیں کر پایا۔ تاریکی گہری ہونے لگی۔ ہاں اسے لگا کہ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کے ساتھ ساتھ دیگر انگلیوں کو بھی حرکت دینے میں کامیاب رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد بے خبری دبے ہوئی کے اندھیرے اسے ڈھانپ چکے تھے۔

☆☆☆

تا بڑ تو ڈگولیاں چل رہی تھیں۔ اب یہ آوازیں نسبتاً قریب سے آ رہی تھیں۔ عادل کو لگ رہا تھا کہ برف کا وسیع کنواں تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی دیواریں قریب قریب آ رہی ہیں۔ اس کے دھندلے دودل و دماغ کی گہرائیوں میں کہیں یہ احساس موجود تھا کہ ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے، بہت برا ہو رہا ہے۔ زخمی چلا رہے ہیں، لاشیں گر رہی ہیں۔ دفعتاً ایک بار پھر اس کی روح لرز اٹھی۔ اس نے اپنے بالکل پاس سے شہزادی کی دل و دگر آوازیں۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے مخاطب یقیناً تا یا فرست ہی تھے۔ الفاظ جھلے سیسے کی طرح عادل کی ساعت میں اترے۔ ”اباجی..... میں..... ایسی موت..... مرنا نہیں چاہتی۔ آپ کو رب کا واسطہ اباجی!

نومبر 2014ء کا چمکتا دھمکتا پائیزہ حاضر ہے

کراچی

ترکِ وفا کا ذمّے دار

نایاب جیلانی

نے بالآخر کس کو ٹھہرایا

پاکیزہ

ماہنامہ

نگہت سیما کے خوب صورت ناول کا اگلا موڑ
رفاقت جاوید کے ناول رنگِ خلش کا ایک نیا رنگ

زاہدہ پروین کا روایتی انداز میں بڑھتا منی ناول جنگل کا پھول

ناہید سلطانیہ اختراک انوکھی کہانی کے ہمراہ

اس کی جگہ

ناہید فاطمہ حسنین اور سیما یاسمین مجتبیٰ کی پُرکشوہ تحریروں
کے ساتھ ساتھ پڑھیے حیا بخاری، فرحین اظفر، فرح طاہر، شاہدہ ملک،
روشانے عبدالقیوم و دیگر ماہر مصنفات کی حسین کہانیاں

شائستہ زریں ایک خصوصی مضمون کے ساتھ

شعبہ مدرس و تدریس سے وابستہ ہماری

ہر عزیز قلم کا اور شاعرہ پروفیسر سیما سراج

نے بخشی ہماری بزم کو ایک نئی رونق

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا گوش اور خوب صورت استخراج آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے

عادل پکار کر بولا۔ ”ایسی باتیں نہ کر شہزادی! میں نے ماں کے لیے اور تیرے لیے اپنا خون پینا ایک کیا ہے۔ میں کمائی لے کر آیا ہوں اور تو جانے کی باتیں کر رہی ہے۔“

کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔ پھر عادل نے دیکھا۔ شہزادی نے کہانیوں کی شہزادی کی طرح اپنے لیے بال تنگ کنوئیں میں پھینکے۔ سیاہ ریشمی بال۔ عادل نے ان بالوں کو تھما۔ وہ ہوا کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔ معمولی سی کوشش کے ساتھ وہ اوپر چڑھنے لگا۔ بلند یوں کی طرف جانے کا ہنر اسے خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ اگرچہ کنواں ہزاروں فٹ گہرا ہوتا تو بھی یہ وہ فاصلہ طے کر لیتا لیکن..... لیکن یہ کیا؟ ابھی وہ اُدھے راستے میں تھا کہ اس کے بازوؤں میں سے جان ختم ہو گئی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور پھر ریشمی بال اس کے ہاتھوں میں سے نکل گئے۔ وہ پشت کے بل کنوئیں کی گہرائی میں گرا اور اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کا سر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس غنودہ کیفیت میں سے نکل آیا۔ ارد گرد کی آوازیں پھر اس کی ساعت سے ٹکرانے لگیں۔ کہیں بالکل پاس ہی ادھیڑ عمر انگریز عورت اپنے زخموں کی وجہ سے تڑپ رہی تھی اور ڈاکٹر کو پکار رہی تھی۔ ہاں، عادل کو یاد آگیا۔ ڈاکٹر کا نام رابرٹ تھا۔ رابرٹ فورڈ۔ ارد گرد سے گولیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ریٹ ٹیٹ..... ریٹ ٹیٹ۔

کہاں سے آرہی تھیں یہ آوازیں؟ اس نے اپنے سر کو تھوڑا سا اونچا کیا۔ دائیں طرف ٹیٹ کے روزن کی چالی تھی۔ اس نے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ چاندنی رات تھی، سفید برف چمک رہی تھی۔ برف پوش چٹانیں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے ایک چٹان کی اوٹ سے شعلہ نکلتے دیکھا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی شعلے نکلے۔ ریٹ ٹیٹ..... ریٹ ٹیٹ۔

اچانک عادل سر تا پا ہل گیا۔ اسے اپنی حالت پر یقین نہیں آیا۔ اس نے کہنوں پر زور دے کر اپنا سر اٹھا رکھا تھا اور روزن سے باہر جھانک رہا تھا۔ کیا یہ، کوئی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا؟ کوئی ناقابل یقین بھری واہمہ تھا؟ وہ ایک بچھونے پر سیمہ دراز تھا۔ اس نے اضطراری طور پر اپنے پاؤں کے انگلیں جھک کر حرکت دی۔ پاؤں کا اگلا حصہ ہی نہیں پورا پاؤں ہلایا جاسکتا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھا یا اور اپنے چہرے کو چھوا۔

دائیں طرف ایک تپائی پر کئی دو ایمیں اور انجکشن

مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں، مجھے گولی مار دیں۔“

”نہ کر میری دھی رانی..... نہ کر..... رب سے آس رکھ.....“ تا یا فراست کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

”اب کیا آس ہے اباجی..... آپ نے دیکھ ہی لیا ہے، وہ کیا کر رہے ہیں عورتوں کے ساتھ۔ مجھے اس طرح نہیں مرنانا اباجی۔“ وہ بچگیوں سے رونے لگی۔

عادل کے سینے میں شعلے پھنکارنے لگے۔ اس کا جی چاہا، اس کی جان، اس کے جسم کے پتھرے سے آزاد ہو جائے۔ وہ اپنے جسم کے پتھرے سے باہر نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اندر ہی اندر ترپنے لگا۔ اسے لگا کہ ایسی صورت حال اس نے نہیں پہلے بھی دیکھی تھی یا شاید تھی، کسی کہانی میں..... کسی روداد میں۔ جب عورت کو مرنا آسان لگتا ہے، اپنی پیاری زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا بالکل سہل ہو جاتا ہے۔ کہاں سنی کی یہ کہانی؟ کیا سنی یہ روداد؟

وہ کیوں سوچ نہیں پاتا؟ کیوں اٹھ نہیں پاتا؟ اب اور کیا ہونا باقی ہے؟ اس کی شہزادی جارہی ہے، وہ مر رہی ہے، وہ منوں مٹی کے نیچے چلی جائے گی..... پھر وہ زندہ رہ کر کیا کرے گا۔ اس نے پوری قوت صرف کر کے اپنے پاؤں کو حرکت دی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں کا اگلا حصہ حرکت کر رہا ہے۔ جو لوگ اس کے پاس موجود تھے، وہ اس کے پاؤں کی حرکت کیوں نہیں دیکھ پارہے تھے؟ کیا اس کے پاؤں کے اوپر کوئی لحاف وغیرہ پڑا تھا؟ وہ اپنے اندر ہی اندر چلا گیا۔ اس نے اپنی منوں وزنی پلکیوں کو اٹھاتا چاہا۔ مفلوج ذہن برداشت نہیں کر پایا۔ ہر آواز غیر حقیقی محسوس ہونے لگی۔ خیالات گنڈم ہوتے چلے گئے۔ ایک بار پھر بے خبری کی تاریک لہر نے اسے ڈھانپ لیا۔

اس مرتبہ بے ہوشی کا یہ وقفہ کافی طویل تھا۔ کم از کم عادل کو یہی محسوس ہوا کہ کافی طویل ہے۔ وہ اس وقفے سے نکلا تو غنودگی کی کیفیت محسوس ہوئی۔ اس غنودگی میں اس نے دیکھا، وہ ایک تنگ اور گہرے کنوئیں میں ہے۔ اس کنوئیں کے اوپر کنارے پر دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ ایک اس کی ماں ہے..... ایک اس کی شہزادی ہے۔ دونوں اٹک بار ہیں۔ اسے پکار رہی ہیں۔ ماں کہہ رہی ہے۔ ”آ جا عادی پتر! اب بھی نہ آیا تو کب آئے گا۔ دیکھ تیری دوہنی نے خون کی مہندی لگائی ہے۔ وہ ڈولی میں بیٹھے کے لیے تیار ہے۔“

پھر شہزادی ہلک کر بولی۔ ”ہاں..... آ جا عادی! آ کہ میں ایک بار تجھے جی بھر کر دیکھ لوں..... اور تو بھی مجھے دیکھ لے۔ پتا نہیں پھر بھی دیکھنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔“

محسوس کیا تھا۔ اس کا جسم پختہ زمین سے ٹکرایا تھا اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ شاید یہی وہ شدید ذہنی شاک تھا جس نے اس کے paralysis کو ختم کیا تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ ایک موقع پر ڈاکٹر نے اس کے سر ہانے کھڑے ہو کر کہا تھا..... یہ سب کچھ کئی ہفتے، مہینے یا غیر معینہ مدت کے لیے چل سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آٹافانا ختم ہو جائے۔

کھڑے ہونے سے عادل کا سر بری طرح گھومنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ پھر پکرا کر گر جائے گا اور وہی محسوس..... بے بسی و ناتوانی اسے ڈھانپ لے گی جس نے اسے نامعلوم عرصے کے لیے پتھر بنائے رکھا ہے۔ سر اور جڑے سے شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے جڑے پر ہاتھ پھیرا اور چونک گیا۔ شیو کا کافی پرچی ہوئی تھی۔ اس نے اندازہ لگا لیا..... یہ کم از کم دس دن کی شیو تھی۔

”وہ گاہڈ! اس کا مطلب ہے، میں آٹھ دس دن یہاں پڑا رہا ہوں۔“ اس نے سوچا اور اپنے چہرے پر اتنے ذہن کو سنبھال کر بستر پر لیٹ گیا۔

اور تب ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اسے پیشاب کی نالی لگی ہوئی ہے۔ ایک طرف موجود تھیلی میں کوئی چوٹھائی لیٹر یورین موجود تھا اور پھر اسے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت بھی دکھائی دی۔ یہاں ڈریس وغیرہ کے لیے ”برانولا“ لگا ہوا تھا۔ اس نے پیشاب والی نالی اور برانولا، دونوں اپنے جسم سے علیحدہ کیں۔

سرسلسل چکرا رہا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ وہ کہیں پھر بے ہوش نہ ہو جائے۔ کچھ بھی مزید ہونے سے پہلے وہ ایک بار شہزادی کو دیکھنا چاہتا تھا اور سرد صاحب کو بھی۔ وہ کہاں تھے؟ کہیں..... کہیں ان کے ساتھ.....

اس سے آگے وہ سوچ ہی نہیں سکا۔

اچانک ایک بار پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ عادل والا خیمہ ایک ٹکنی چٹان کے پیچھے تھا، اس لیے براہ راست فائرنگ کی زد میں نہیں تھا۔ پھر بھی وہ بستر پر چت لیٹ گیا۔ اگلے قریباً تین منٹ تک دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ اس فائرنگ کے دوران میں چٹانوں کے پیچھے سے لکارے سنائی دیتے رہے اور نشتے میں ڈوبی ہوئی گالیوں کی بو چھا رہی تھی۔ دیتا رہی۔

ان تین چار منٹ میں عادل اس صورت حال کو کافی حد تک سمجھ گیا۔ چٹانوں کے پیچھے یقیناً پاؤندے تھے۔ وہ

وغیرہ رکھے تھے۔ وہ زور لگا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن ابھی رکوع کی حالت میں ہی تھا کہ اس کا سر خیمے کی چھت سے جھولنے لیمپ سے ٹکرایا۔ سر کے پچھلے حصے سے شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے سر کو چھوا۔ وہ بیٹوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ایک ایسی سارے مناظر پوری وضاحت کے ساتھ اس کی نگاہوں میں کھوئے گئے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کب ہوا تھا؟ وہ ٹوبلی راک کا چیمپین بن چکا تھا۔ اس نے لیو پڈ کو شہ مات دی تھی۔ فتح کی خوشی میں سرشار وہ شہزادی سے ملنے گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی بے پناہ قربت محسوس کی تھی اور پھر لیو پڈ..... وہ خنزیر لیو پڈ.....

عادل کے تن بدن میں شعلے لپک گئے۔ اس کا جی جاہا، وہ خیمے سے ٹکرا لیو پڈ کو پکارے۔ اس کی کہنکی و کمظنی کو لگا کرے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ مزید سوچتا یا کرتا۔ اس کی سماعت کو چند آوازوں نے جھڑپا۔ یہ آوازیں صرف ڈیڑھ دو سو فٹ کے فاصلے سے چٹانوں کے عقب سے بلند ہو رہی تھیں۔ یہ نسوانی آوازیں، بڑکیوں کے چلانے کی تھیں۔ غالباً یہ انگریز لڑکیاں تھیں..... وہ مدد کے لیے پکار رہی تھیں..... دہائی دے رہی تھیں۔ کسی شرابی مرد نے خوشی سے بھرپور بلند قہقہہ لگایا۔ کسی دوسرے بدست شخص کی آواز ہوا پر تیر کر عادل کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے پشت سے ملتی جلتی زبان میں کچھ کہا تھا۔

یقیناً یہ پاؤندے ہی تھے جو نشتے میں دھت ہو کر لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی کر رہے تھے۔ عادل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تب عادل کی نظر ایک اور لڑکے خنزیر منظر پر پڑی۔ چٹانوں کے پاس چار پانچ لائیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک لاش کو عادل نے اس کے بازو کی وجہ سے پہچانا۔ یہ بلا ستر شدہ بازو یقیناً تاجا فراست کے ملازم انور کا تھا..... وہ لڑکی ہوئی حالت میں برف پر اوندھا پڑا تھا۔ غالباً کسی میں ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر انور یا دیگر افراد کی لاشوں کو اٹھا سکتا۔

عادل کو اپنے سارے بدن میں عجیب سی ناتوانی محسوس ہو رہی تھی جیسے جسم اور دماغ کا رشتہ کمزور پڑا ہوا ہو لیکن خوش آئند..... بلکہ بہت خوش آئند بات یہی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکتا تھا۔ اس کا پورا جسم اب قابل حرکت تھا۔ یہ کرشمہ یقیناً آٹافانا ہی ہوا تھا اور جب یہ ہوا، اس کے ارد گرد کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ کوئی ٹرینٹ نہیں ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے حالت غنودگی میں خود کو بلندی سے گرتے

بلند آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ کسی مخمور پاؤندے نے اطلاع دینے والے انداز میں کچھ کہا۔
پھر ایک اور آواز آئی۔ ہوا کے دوش پر تیر کر آنے والی یہ منخوس آواز وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ اسی بد خصلت چھوٹے چودھری ناصر کی آواز تھی۔ اس نے غالباً پاؤندے کی ”اطلاع“ کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لے ہاویوں پتر! یہ تانچہ قبول کر ہماری طرف سے۔ لیکن ساتھ یہ بھی یاد رکھ۔ اسے ہم نے نہیں تم نے مارا ہے۔ ہم تو بس ”ٹھیل“ رہے تھے اس کے ساتھ۔ یہ تمہاری چلائی ہوئی گولیوں سے مری ہے۔“

خیمے کے بالکل قریب سے ہمایوں کی لکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”حرامزادے..... کتے!“

اس کے ساتھ ہی ایک طویل برست چلا۔ یقیناً یہ ہمایوں یا اس کے بچے کچھے ساتھیوں میں سے کسی نے چلایا تھا۔

اس ایک برست کے جواب میں دوسری طرف سے کم و بیش دس برست چلے اور برف پوش چٹانوں پر ہر طرف چنگاریاں بکھری نظر آئیں۔ خچر ڈر کر بھاگا اور لاش سمیت گولیوں کی زد میں آگیا۔ عادل نے اسے گر کر تڑپتے اور پھر ساکت ہوتے دیکھا۔ برہنہ لاش ابھی تک اس کی پشت پر بندھی تھی۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ کیا قیامت برپا تھی؟ سردی کے باوجود عادل کے ہر سام سے پسینا چھوٹ نکلا۔ شہزادی کہاں تھی؟ سرد صاحب کہاں تھے؟ اور تاتیا فراسٹ اور کرشل؟..... خدا نخواستہ..... خدا نخواستہ..... اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکا۔ نقاہت کے سبب اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے کانوں میں وہی الفاظ گونجنے جو اس نے نیم بے ہوشی کی حالت میں سنے تھے۔ شہزادی نے روتی سسکتی آواز میں کچھ اس طرح کی بات کہی تھی۔ ”اباجی..... مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دیں۔ میں بے عزتی کی موت مرنا نہیں چاہتی۔“ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے سوچا وہ ہمایوں کو پکارے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے پکارتا یا پچھونے سے انھنے کی کوشش کرتا، کوئی تیزی سے خیمے کی طرف آیا..... عادل نے ساکت ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جس ہاتھ سے اس نے برائو لا اتارا تھا، وہ کمبل کے پینچے تھا۔ آوازوں اور آہٹوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ کسی زخمی کو اٹھا کر اندر لائے ہیں اور خیمے کے فرش پر لٹا دیا ہے پھر ایک اور شخص کو لایا گیا اور اسے بھی لٹا دیا گیا۔ جو لوگ بول رہے تھے، ان میں ہمایوں کے علاوہ ڈاکٹر

اس کیپ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ یہ گھیرا یقیناً آٹھ دس روز سے برقرار تھا اور دھیرے دھیرے تنگ ہوتا چلا گیا تھا۔ اب تو کیپ کے خیموں اور پاؤندوں کے درمیان یہ مشکل سو ڈیڑھ سو فٹ کی دوری رہ گئی تھی بلکہ دھیان سے دیکھا جاتا تو پتا چلتا تھا کہ کیپ کا وہ حصہ جہاں ملازموں کے خیمے تھے اور خچروں، ٹٹوؤں وغیرہ کے لیے سائبان تھے، عمل طور پر پاؤندوں کے قبضے میں چا چکا تھا۔ اس حصے کے ساتھ ہی برش شہریوں کے وجود پر غصے تھے، ان میں سے پندرہ بیس بھی پاؤندوں کے قبضے میں تھے۔ یقیناً ان خیموں میں موجود ہر چیز کو لوٹا چا چکا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ لوٹ کے اس مال میں کچھ خواتین بھی شامل ہیں۔

فائرنگ کے ختم ہونے کے بعد پاؤندے کچھ اور نزدیک آگئے۔ نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے اپنی پوزیشن کچھ اور بہتر بنائی ہے۔ نہ جانے کیوں ہمایوں کے کہے ہوئے الفاظ ایک باز نش کی طرح عادل کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا، یہ پاؤندے انہی لوگوں کی نسل میں سے ہیں جنہوں نے گئے دنوں میں سالار و شواتھ کی زیرکمان، راجپوتوں پر حملہ کیا اور اپنی تعداد کے بل بوتے پر انہیں روند کر رکھ دیا۔ یہ اسی قبیل کے لوگ تھے، جنگ و جدل جن کا پیشہ ہوتا ہے اور خون ریزی و آبروریزی جن کے پسندیدہ ترین مشاغل ہوتے ہیں۔ آج یہ بات ثابت ہو رہی تھی۔

پھر بستر پر لیٹے لیٹے عادل نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ پاؤندوں کی جانب سے ایک خچر کیپ کی طرف ہانکا گیا۔ وہ پہلے بھاگا پھر دھیرے دھیرے کیپ کی طرف بڑھا۔ اس پر کچھ لدا ہوا تھا۔ وہ کیپ کے نزدیک پہنچا تو برٹش گارڈز میں سے کسی نے اس پر سرچ لائٹ ڈالی۔ چند سیکنڈ کے لیے خچر تیز روشنی میں نہا گیا۔ عادل کی دھڑکن ختم گئی۔ خچر اس کے خیمے سے صرف دس پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس پر ایک برہنہ لاش اوندھی پڑی تھی۔ لاش کو کوہ پہاڑی والے رے سے خچر کی پشت پر باندھا گیا تھا۔ یہ ایک لڑکی کی لاش تھی اور یہ لڑکی عادل کے لیے اجنبی نہیں تھی..... ہاں، وہ اجنبی نہیں تھی۔ یہ مسکراتے چہرے والی وہی نوجوان صحابی تھی جو عادل اور شہزادی کا انٹرویو کرنے کے لیے انہیں خیمے میں لائی تھی۔ وہ ان دونوں کو تنہائی میں بات کرنے کا موقع دے کر باہر نکلی تھی اور اسی دوران میں بدعت لیو پڈ نے وہاں پہنچ کر عادل کے سر پر قیامت توڑ دی تھی۔

عادل لاش کا منظر دیکھ کر آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی دوران میں چٹانوں کی دوسری جانب سے ایک

کرشل نے بھی مدغم..... نقابست بھری آواز میں کچھ کہا جو عادل کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ باہر سے وقتاً فوقتاً فائرنگ کی آواز بھی آرہی تھی۔

کچھ دیر بعد یہ افراد خیمے سے باہر نکل گئے۔ اب تک عادل نے اپنے ارد گرد جو گفتگو سنی تھی اور مختلف لوگوں کی باتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، اس سے اس کے ذہن میں صورت حال کا ایک نقشہ سامنے آ گیا تھا۔ یہ نقشہ کچھ یوں تھا۔ نوبل راک پر کلیمنگ کا مقابلہ ختم ہونے کے فوراً بعد ہی کیپ کو ختم ہو جانا تھا اور تمام ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کو یہاں سے نکل جانا تھا۔ اس جلدی کے پیچھے یہ اندیشہ موجود تھا کہ کہیں پاؤندے یہاں پہنچ کر مشکلات پیدا نہ کریں لیکن اس دوران میں قراقرم کے رنگ بدلنے شدید موسم نے غدا دی۔ ایک تند طوفان نے انہیں آلیا اور رواگی میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ دوسری دعا بازی کیپ کے اندر سے ہی سامنے آئی۔ چھوٹے چودھری ناصر نے جب یہ دیکھا کہ شہزادی کے حوالے سے پانسالٹ گیا ہے اور تاپا فراسٹ نے عادل کو گلے سے لگالیا ہے تو وہ سمجھ گیا کہ اب کھیل اس کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ بین ممکن تھا کہ تاپا فراسٹ اور ناصر میں کوئی جھڑپ وغیرہ بھی ہوئی ہو۔ جب پاؤندوں نے یہاں پہنچ کر کیپ کو گھیرا تو ناصر فوراً اپنے ساتھیوں سمیت پاؤندوں سے جاملے۔ اب وہ لوگ پوری طرح حاوی تھے اور دم بدم کیپ کے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب کیپ والوں کی جدوجہد زیادہ دیر چلنے والی نہیں۔ ہر طرف مقامی اور غیر مقامی گارڈز کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور ایمونیشن بھی ختم ہونے والا تھا۔ لگتا تھا کہ جلد ہی پاؤندے ان پر چڑھ دوڑیں گے اور سب کچھ تہس نہس کر دیں گے۔

اجانک عادل کو نیم تاریکی میں ایک باہر خرخر ہاٹ سنائی دی۔ کسی کی سانس اس کے گلے میں الجھ رہی تھی۔ شاید وہ قریب المرگ تھا۔ عادل نے اپنی نیم جان ناگوں کو سمیٹا اور ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اس نے سر موڑ کر آوازی سمت دیکھا۔ کوئی کبل کے نیچے چت لینا تھا۔ اس کے قریب کوہ پیانی میں استعمال ہونے والا چھوٹا آکسیجن سلینڈر رکھا تھا اور آکسیجن ماسک اس کے چہرے پر تھا۔ عادل نے اس کے قریب جھک کر غور سے دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔ یہ اس کا وہی بدخلصت حریف تھا جس نے قدم قدم پر اسے نقصان پہنچایا تھا۔ یہ لیوڈ تھا، اس کی آنکھیں بندھیں اور اس کے رخسار کا پرانا زخم نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ آکسیجن ماسک اس کے منہ سے کھسک کر اس کی ٹھوڑی پر چلا گیا تھا۔

رابرٹ کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ سب بے حد گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔

چار پانچ منٹ بعد یہ وسیع خیمہ بھر خالی ہو گیا۔ عادل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ رات کا آخری پہر ہے۔ چاند مغرب کی طرف بچھا ہوا تھا اور اس کی ترجمی کر نیں برف کی چادر کو چکا رہی تھیں۔ ایک زاویے سے بلند و بالا نوبل راک کا ایک پہلو بھی نظر آیا۔ وہ جیسے ستاروں کی چھوڑی تھی۔ چاندنی نے اسے بھی جھلکا ہٹ عطا کر دی تھی۔ یقیناً یہ سارا منظر خوب صورت ہوتا اگر سامنے برف پر کی لاشیں پڑی نہ ہوتیں..... اور چٹانوں کے پیچھے سے گاہے بگاہے غیر ملکی لڑکیوں کی آہ و بکا سنائی نہ دے رہی ہوتی۔

عادل کا ذہن اب مختلف کڑیوں کو جوڑنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ پاؤندے اور ان کے ساتھی درندہ صفت ڈاکوؤں کا روپ اختیار کر گئے ہیں۔ کیپ کے ایک حصے پر قبضے کے دوران میں انہوں نے کچھ مقامی اور غیر ملکی عورتوں کو اٹھالیا ہے اور اب ان سے برا سلوک کر رہے ہیں۔ خچر کی پشت سے بندھی ہوئی لاش اس کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ایک دم اس کا ذہن شہزادی کے حوالے سے دوبارہ نظر اس سے بھر گیا۔

وہ ہوش میں تو آ گیا تھا لیکن ابھی جسمانی طور پر پوری طرح درست نہیں تھا۔ خاص طور سے اپنی ناگنیں اسے.... بے جان محسوس ہوتی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے چلنے کی کوشش کی تو وہ گر پڑے گا۔ وہ کئی منٹ تک اسی طرح چت لیٹا رہا اور اپنی ناگوں کو ہلا جلا کر ان کی قوت کار جانچنے کی کوشش کرتا رہا۔ خیمے میں اب گھپ اندھیرا تھا۔ لیپ بچھا دیا گیا تھا۔ اچانک عادل کو خرخر ہاٹ سنائی دی جیسے کسی کے گلے میں سانس پھنس رہی ہو۔ یہ کون تھا؟ ابھی وہ اس سوال کا جواب جاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک یا دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان کی آوازوں سے پتا چلا کہ ان میں سے ایک ڈاکٹر رابرٹ ہے اور دوسری کرشل۔ وہ کسی زخمی شخص کے سر ہانے کھڑے تھے۔ دونوں نے انگلیں میں بات کی۔ ڈاکٹر رابرٹ نے کہا۔ ”یہ بڑی تیزی سے کمزور ہو رہا ہے۔ اسے گلوکوز کی ضرورت ہے لیکن گلوکوز کے بیگ اب ختم ہو چکے ہیں۔“

کسی مقامی شخص نے انگلیں میں ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”اسے منہ کے ذریعے کوئی چیز نہیں دی جاسکتی؟ مثلاً دودھ وغیرہ۔“

”دودھ بھی اب کہاں ہے؟ شاید ہی ایک دو بیگٹ ہوں۔ راشن اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی سانس سینے میں اٹک رہی تھی۔
خراہٹ کی آواز بھی اسی کا نتیجہ تھی۔

عادل نے اس کے سینے پر سے کھل بٹایا۔ بدبو کا ایک جھونکا آیا۔ وہی بدبو جو گہرے خراب زخموں سے اٹھتی ہے۔ لیوڈ کے سینے پر بہت سی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ چند دن پہلے اس کے سینے پر ایک یا ایک سے زائد گولیاں لگی ہیں..... اور اس زخم نے بتدریج خراب ہو کر اسے قریب المرگ کر دیا ہے۔ اس نے اس کا آسکین ماسک درست کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر رک گیا۔ نفرت کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی..... اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ اس کی فتح کی خوشی کو لیوڈ نے کس طرح برباد کیا تھا۔ سر پر لگنے والی جس شدید ضرب کے سبب وہ کئی دن کو بے کسی کیفیت میں رہا تھا، وہ اسی بدبخت کے پہلوان مٹاساچی نے لگائی تھی۔ اب وہ مر رہا تھا، اسے مرنا چاہیے تھا۔ عادل نے اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ ایک یاؤندوں کی طرف سے آٹومیک رائفل کا ایک برسٹ آیا..... اس چٹان پر چنگاریاں سی بکھر گئیں جس کے پیچھے یہ کشادہ خیمہ لگایا گیا تھا۔ چٹان کے کئی ٹکڑے فضا میں اچھلے اور ان میں سے کچھ خیمے کی دیواروں سے ٹکرائے۔ یوں لگتا تھا کہ اب گھبراؤ والوں کی فائرنگ کے زاویے خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔

عادل نے ایک بار پھر لیوڈ کی طرف توجہ کی۔ وہ بُرا دشمن تھا..... لیکن عادل خود کو اس کی مدد کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ اپنے اندرونی جذبات کو دباتے ہوئے اس نے آسکین ماسک پھر اس کے منہ پر چڑھا دیا۔ وہ دنیا و مافیہ سے بے خبر تھا۔ لگتا تھا کہ وہ زیادہ دیر سانس کی ڈور سے بندھائیں رہے گا۔ اس کے پہلو میں ایک اور جسم کھل تلے بے حرکت پڑا تھا۔ عادل نے اس جسم پر سے کھل ہٹایا لیکن پھر جلدی سے واپس ڈال دیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ بھی ایک لڑکی کی لاش تھی اور وہ اے جھی طرح جانتا تھا۔ یہ لارڈ اؤس کی شوخ و چٹیل بیٹی ڈور تھی۔ اس کا بالائی لباس بری طرح پھٹا ہوا تھا اور کوئل جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی یاؤندوں کی وحشت کا شکار ہوئی ہے۔ عادل کو اپنی آنکھوں میں نمی محسوس ہوئی۔ آخر ”آرو کا لیرا“ کیا حاصل کرتا ہے آرو لوٹنے سے۔ بس خوشی حاصل کرنے کی ایک سعی لا حاصل..... اور اس سعی لا حاصل کے آخر میں..... چھپتاوا، ندامت، کراہت..... اور اپنے ہی اوپر لعنت ملامت کرتا ہوا اپنا جسم۔

لیوڈ کی طرح یہ ڈور تھی بھی عادل اور سرسرد کے بدخواہوں میں سے تھی لیکن یہاں اسے اس حالت میں دیکھ کر عادل کو تکلیف ہوئی۔ اس کی نیم جان ناگوں میں لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے بچھونے پر گر پڑا۔ خیمے کے بالکل پاس سے ایک پانی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میرے خیال میں کوئی زہریلی چیز ہے۔ شاید کوئی ایسڈ وغیرہ۔“ یہ ہمایوں کی آواز تھی۔

”اب کیا ہو عیس گا۔ تو کچھ کر دے ہمایوں۔“ یہ ڈری ڈری آواز کرنل کی تھی۔

”شاید ان کا معرہ صاف کرنا پڑے گا۔ سامان تو موجود ہے، میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔“ ہمایوں نے کہا۔

”ہام کہتے ہیں کہ کرنل کرنل کی نئی آواز میں بولی۔“

عادل کے دماغ میں اب آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے ارد گرد بہت کچھ ہو رہا تھا اور خوف ناک تیزی سے ہو رہا تھا۔ اسے شہزادی، تیا فراست اور سرسرد کی خیر خبر ابھی تک نہیں ملی تھی اور یہی بات اسے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ وہ باہر نکلتا چاہتا تھا۔ شہزادی اور ہمایوں کو پکارنا چاہتا تھا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس کا نچلا دھڑا ابھی بھی پوری طرح کام نہیں کر رہا۔ شاید ابھی فاتح کے اثرات باقی تھے۔ گاہے گاہے دماغ میں دھند سی بھی بھر جاتی تھی۔ سر اور گردن کے پھیلے حصے کا درد تو پھیلے سفر سے ہی موجود تھا۔ کچھ دن پہلے لیوڈ کے ساتھی نے کند آ لے سے جو ضرب لگائی تھی، اس نے عادل کی اس تکلیف کو زبردست بڑھاوا دیا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا۔ سر میں ٹیس اٹھی اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اسے چھوٹی نال والی ایک چینی رائفل کوٹنے میں پڑی نظر آئی۔ رائفل کے دس پر خون جما تھا اور حالات کی بدترین کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ عادل اپنے جسم کو سنبھالتا ہوا رائفل تک پہنچا۔ یہ چھوٹی سی رائفل اسے غیر معمولی طور پر روزنی محسوس ہوئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہ رائفل کا بوجھ نہیں، یہ اس کے ہاتھوں کی ناتوانی ہے۔ وہ اپنے قوی کو ابھی ملوں پر استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ اسلئے کی جوتھوڑی بہت سمجھ اٹھی، اس کے مطابق اسے پتا چلا کہ رائفل کا میگزین بالکل خالی ہے۔ اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی۔ اتنی سی مشقت نے ناگوں پر لرزہ طاری کر دیا اور دماغ میں دھند بھر دی تھی۔ وہ لیٹ گیا..... اچانک ہمایوں کسی شخص کو گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ شخص رور رہا تھا۔ ”وہ نہیں بچے گی، وہ ختم ہو جائے گی۔“

بے چارگی

ثرین کے ایک پورے ڈبے میں برات بیٹھی تھی ایک آدمی کو جب کہیں جگہ نہ ملی تو وہ بھی ثرین کے اس ڈبے میں آ کے بیٹھ گیا ثرین چل پڑی کچھ دیر بعد براتیوں نے ایک ڈبا کھولا اور اس میں سے ٹھٹھے چاول نکالے اور ساری برات کو دبے لیکن اس آدمی کو نہ دیے۔ وہ چپ کر کے بیٹھا رہا کہ کوئی بات نہیں شاید انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد براتیوں نے ایک اور ڈبا کھولا اور اس میں سے برنی نکالی اور ساری برات میں تقسیم کی لیکن اس آدمی کو نہ دی۔ اسے بہت غصہ آیا کہ ایک میں ہی باہر کا آدمی ہوں مجھے بھی دے دیتے تو کیا تھا۔ لیکن وہ ضبط کر کے بیٹھا رہا۔ تیسری دفعہ براتیوں نے لڈو نکالے اور سب کو ایک ایک لڈو دیا لیکن اس آدمی کو نظر انداز کر دیا۔ اب تو اس آدمی کو بہت غصہ آیا وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ اللہ کرے اس ڈبے پر بجلی گریں گے اور تم سب مرجاؤ۔ براتیوں میں سے ایک سیانا آدمی کھڑا ہوا اور بولا۔ ”اگر اس ڈبے پر بجلی گری تو تم کیسے بچو گے؟“ اس آدمی نے جواب دیا۔

”جیسے چاول، برنی اور لڈوؤں کی دفعہ بچ گیا تھا۔“

تلاش

میاں بیوی کی بول چال بند تھی۔ میاں کو سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بیوی غصے میں کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔ سب ترکیبیں منانے کی بیکار ہو گئیں۔ ایک روز دن کی روشنی میں چراغ جلایا اور کچھ ڈھونڈنے لگا۔ بیوی کو اس جستجو پر صبر نہ ہو سکا اور میاں سے پوچھا ”کیا ڈھونڈ رہے ہو۔“ میاں چراغ پھینک کر بولا ”تمہاری زبان ڈھونڈ رہا تھا شکر ہے بڑی تلاش کے بعد مل گئی۔“

مرسلہ: بابراعباس، گلپانہ روڈ کھاریاں

عادل نے آواز پہچان لی۔ یہ اسی جوان سال گانڈ مڈر کی آواز تھی جو قاسم وغیرہ کے ساتھ کیمپ تک پہنچا تھا۔ بعد ازاں اس نے حالات کو کنٹرول کرنے میں سرمد اور عادل وغیرہ کی بہت مدد کی تھی۔ اس سفر میں اس کی نو جوان بیوی بھی شریک تھی۔ وہ قافلے کے لیے کھانے پکانے کا کام کرتی رہی تھی۔ شہزادی نے عادل کو اس کا نام فیروزہ بتایا تھا۔ مڈر ایک بار پھر دلہن و دلہن آواز میں پکارا۔ ”وہ پہلے ہی کہتی تھی، میں نہیں بچوں گی..... نہیں بچوں گی۔“

ہمایوں گلوگیر آواز میں بولا۔ ”بدفالن منہ سے نہ نکالو۔ اللہ سے دعا کرو۔ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔“

”مم..... میرا دل بھٹ جائے گا بابو جی..... میں اس سے بڑی محبت کرتا ہوں، میں نہیں جی سکتا اس کے بغیر۔“

”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ دعا کرو۔ جن لوگوں سے پیار کیا جاتا ہے ان کے لیے دعائیں قبول ہوتی ہیں۔“

ہمایوں اسے دلا سا دینے لگا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی کے زہریلی چیز کھانے کی جو بات ہوئی تھی، وہ فیروزہ کے بارے میں ہی تھی۔ حالات کی سنگینی سے دل برداشتہ ہو کر اس نے کچھ کھالیا تھا اور اب اس کی حالت خطرے میں تھی۔

باہر فائرنگ ایک بار پھر تیز ہو گئی تھی۔ عادل اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ ہمایوں..... مڈر کو دلا سا دیتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

مڈر غالباً گھٹنوں میں سر دیے سسکیوں سے رو رہا تھا اور دعائیں انداز میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ وہ چوڑے سینے والا ایک باہمت اور سخت جان پہاڑی تھا لیکن..... فی الوقت ایک بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ یہ سنگین ترین حالات کی ستم ظریفی ہی تھی کہ ایک کزمل جوان یوں بے چارگی سے آنسو بہا رہا تھا۔

عادل کی سوچیں ایک بار پھر شہزادی اور سرمد کے گرد گھومنے لگیں۔ ان سنگین حالات میں اس طرح لا تعلق پڑے رہنا اسے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ اسے اپنے جسم کی ناتوانی پر جھنجھلاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اپنی ہاپنی ہوئی سانسوں پر اسے طش آنے لگا۔

چند منٹ اسی طرح گزرے۔ عادل آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور مڈر کی دعائیں بڑبڑاہٹ سنتا رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کوئی خیمے میں داخل ہوا ہے۔ یہ ہمایوں ہی تھا۔ مڈر نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ ”کیا ہوا بابو جی۔“

جواب میں ہمایوں کی آواز سنائی دی۔ مڈر غالباً اٹھ

کھڑا ہوا تھا، وہ دلدوز انداز میں چلا یا۔ ”آپ چپ کیوں ہو باجی؟ کیا ہوا؟“
 ”الند کو یہی منظور تھا۔“ ہمایوں کی کراہتی ہوئی آواز ابھری۔

مدر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ پکار رہا تھا۔
 ”فیروزہ..... فیروزہ!“ اس کے ساتھ ساتھ شاید وہ خیمے سے نکلنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ ہمایوں نے اسے سنبھال لیا تھا۔
 اسے بازوؤں کے خٹکے میں کس لیا تھا۔ وہ خود بھی آبدیدہ تھا۔
 اس نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ تینوں مر گئیں مدر..... تینوں مر گئیں۔“

عادل پر انکشاف ہوا کہ زہریلی چیز کھانے والی ایک لڑکی نہیں تھی..... تین لڑکیاں تھیں۔ باقی دو کون تھیں؟
 اگلے لمحے انکشاف انگیز تھا اور یہ ایسا انکشاف تھا جس نے عادل کو سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک ہتھر کر دیا۔ اسے لگا کہ کائنات کی گردش ختم کی ہے اور وہ خود سیلوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضا کے بسط میں بکھر گیا ہے۔
 ہمایوں نے روتے ہوئے دل دھار لہجے میں مدر کو بتایا۔
 ”ہاں، شہزادی، فیروزہ، نسرین..... تینوں ختم ہو گئیں۔“

یہ چھ سات الفاظ نہیں تھے، چھ سات قیامتیں تھیں جو چند ساعٹوں میں عادل پر ٹوٹیں۔ کئی لمحے تک جیسے اس کے ذہن نے کام ہی نہیں کیا..... پھر اس کے حواس نے اسے بتایا کہ اس کے جینے کا جواز ختم ہو چکا ہے۔ وہ ہستی اب نہیں رہی جس کے لیے وہ زندگی کا زہریلا سنا تھا۔ وہ مر گئی ہے، چلی گئی ہے۔ کچھ وحشی دردندوں کے خوف سے اس نے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر لیا ہے۔ آنے والے دنوں کے سارے حسین پننے وہ اپنے ساتھ لے کر موت کے اندھیروں میں اتر گئی ہے۔ اب وہ بھی نہیں بنے گی، اب وہ کبھی اس کی چوڑیوں کی چھن چھن نہیں بنے گا۔ اب وہ بھی اس کا رسمی لمس محسوس نہیں کرے گا۔ زندگی سو برس بھی ہوئی تو یہ آگ کے سوسندروں میں سے گزرنے جیسی ہوگی۔ تو پھر وہ بھی کیوں جیے گا؟ لیکن کیا وہ واقعی مر گئی؟ کہیں اس کے ٹیٹل نے اسے کوئی بھیما تک منظور نہیں دکھایا؟ کہیں وہ ابھی تک بے ہوشی کے اندھیروں میں تو نہیں ہے؟

وہ چلا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ہمایوں پر چبھنا۔ اس نے ہمایوں کا گریبان پکڑ لیا۔ اپنے سینے کی پوری طاقت سے گرجا۔
 ”ہمایوں! کیا بکواس کر رہے ہو، شہزادی کا نام کیوں لے رہے ہو؟ کیا ہوا ہے؟“
 ”بھئی بھئی بتاؤ کیا ہوا ہے اسے؟“
 اس نے ہمایوں کو بھونڈا ڈالا۔ اس کی قمیص پھاڑ دی۔

ہمایوں کا چہرہ غم والم کی بے مثل تصویر تھا۔ اس نے کچھ کہا نہیں لیکن اس کی اشک بار آنکھوں میں عادل کو اپنی زندگی کی سب سے بھیما تک خبر نظر آ گئی۔ عادل مچھلی کی طرح تڑپا اور باہر کی طرف پلکا۔ ہمایوں نے اس کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈالے اور پوری طاقت سے اسے روکا۔ ”نہیں عادل! گولی چل رہی ہے، برک جاؤ۔“

وہ رکنے والا کہاں تھا۔ اس کے سینے میں تو ہزاروں ٹرن بارود کے دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ ہمایوں کو گھسیٹتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔ ”شہزادی..... شہزادی۔“ وہ پیچھے پھڑوں کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا۔

اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ برف پر لاشیں بکھری تھیں اور خون جما ہوا تھا۔ ہر طرف فائرنگ کی ساعت تھکن تڑتڑاہٹ تھی اور گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔
 چٹانوں کی دوسری طرف پاؤندوں نے اور نشیب کی طرف کیپ کے بچے کچھ گرا ڈرنے پر پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔
 عادل کو صاف محسوس ہوا، سنسنائی گولیاں اس کے سر اور کندھوں کے قریب سے گزر رہی ہیں۔ وہ موت کی سرگوشیاں سن رہی ہیں لیکن..... موت کی پروا اب کے تھی؟ وہ شہزادی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ہمایوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتا جا رہا تھا..... اور پھر ایک بڑی چٹان کے پیچھے ایک سائبان کے نیچے اسے کچھ جسم نظر آئے۔ وہ برف پر پڑے Mats پر ساکت پڑے تھے۔ پہلا جسم کس کا تھا؟ پہلا جسم سرسرد کا تھا۔ ان کے سینے پر..... تین دنوں کے مقام پر دوسرا پھول کھلے ہوئے تھے۔ گولیاں انہیں چیر کر گزرتی تھیں۔ ان کا جڑ ایک سفید پتی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس سے اگلی لاش مدر کی جواں سال بیوی فیروزہ کی تھی..... اور اس سے اگلی شہزادی کی۔ اس کا رنگ ہلدی اور زعفران سے زیادہ زرد تھا۔ وہ جیسے ادھ کھلی آنکھوں سے سائبان کو دیکھ رہی تھی۔ گلو کوڑکی ڈرپ کی سوئی اس کے بازو سے نکال کر اس کے سینے پر رکھ دی گئی تھی۔

”شہزادی!“ عادل درد و کرب میں ڈوب کر چلا یا۔
 ایک گولی اس کے بازو کو چھیدتی ہوئی گزرتی۔ اب ہمایوں کے علاوہ مشتاق اور ایک تیسرے شخص نے بھی عادل کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اسے گولیوں کی براہ راست زد سے نکالنا چاہ رہے تھے۔ وہ اسے طاقت سے کھینچتے ہوئے کچھ پیچھے لے آئے۔
 عادل گر گیا۔ ہمایوں اور مشتاق بھی گر گئے۔
 ”مجھے چھوڑ دو..... مجھے مرنے دو۔“ عادل کی آواز فرط الم سے پھٹ کر ناقابل شناخت ہو گئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ہمایوں اٹھ کر بھاگا۔ اس کا یہ اقدام نہایت پرخطر تھا لیکن خطرے کی پروا شاید اب ان تینوں کو نہیں تھی..... اور عادل کو تو بالکل بھی نہیں۔ ایک لحظہ ضائع کیے بغیر وہ بھی ہمایوں کے پیچھے لپکا۔ عقب سے مدثر نے انہیں Cover فائر دیا۔ عادل اور ہمایوں دوڑتے..... گرتے اور اٹھتے، بر فیٹلے کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہ زخمی شیروں کی طرح باؤندوں کے اس مورچے پر جھپٹے یہاں ایک ایم جی 42 متشین گن تھی اور چھ کے قریب افراد تھے۔ یہ سب نہایت سخت دل، لیسرے اور قاتل تھے لیکن عادل اور ہمایوں کی دیوانی جھپٹ نے انہیں چند سیکنڈ کے لیے مسمرائز کر دیا تھا۔ غالباً اس کیفیت میں وہ اپنی خطرناک جرم متشین گن کا بھرپور استعمال بھی نہیں کر پاتے تھے۔ عادل اور ہمایوں نے تین چار سیکنڈ کے اندر چالیس کے قریب گولیاں برسائیں اور انہیں بھون کر رکھ دیا۔ ان میں سے فقط ایک شخص جان بچا کر بھاگا، وہ پاؤندہ نہیں لگتا تھا۔ عادل نے اسے پہچان لیا۔ وہ دلاز قدامتصر تھا۔ وہ حواس باختہ ہو کر مخالف سمت میں دوڑا۔ عادل نے ایک لحظہ ضائع کیے بغیر اس کی پشت پر گولی چلائی۔ رائفل میں سے ”ٹھک“ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ میگزین خالی ہو چکا تھا۔ دوسرا میگزین لگانے کی مہلت نہیں تھی۔ عادل رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کر ناصر کے پیچھے بھاگا۔ صرف پندرہ میں قدم بھاگ کر اس نے اسے جالیا۔ وہ عادل کے نیچے آوندھا مگرا اور ڈھلوان برف پر دونوں دور تک پھسل کر ایک برفاب گڑھے میں گرے۔ یہاں گولیوں کی بو چھاڑیں بے اثر تھیں۔ ناصر نے پلٹ کر دیکھا تو اسے عادل کی آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، عادل نے جنونی انداز میں رائفل کو لاش کی طرح ناصر کے سر پر رسید کیا۔ آہنی دستے نے اس کی پیشانی پھاڑ دی..... وہ ٹھکیا۔ ”عادے! میں نے کچھ نہیں کیا۔ مم..... میں تو لڑائی رکوانے کی.....“

”بکواس بند کر۔“ عادل جھگڑا۔ ”میں نے سب کچھ سنا ہے۔ تو قاتل ہے، غدار ہے۔ کتنے کی موت ماروں گا تجھے۔“ (یہ وہی نورتی تھا جو اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا) اس نے بے درپے رائفل کے دستے کی تین ضربیں اس کے سر پر لگائیں۔ وہ لہو میں نہا گیا اور گھٹنوں پر گر گیا۔

”تو نے مارا ہے میری شہزادی کو... تو نے۔“ عادل دیوانی آواز میں بولا۔ ناصر کی آنکھوں میں ہراس اور دہشت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اب وہ اس قابل نہیں رہا تھا۔ عادل کی دو

ہمایوں بھی اب طیش میں تھا۔ اس نے ایک جھنک دے کر اپنا گریبان عادل کے ہاتھ سے چھڑایا اور بولا۔

”اگر مرنا ہی ہے تو پھر ان کو مار کر مرو جنہوں نے شہزادی کو مارا..... سر کو مارا۔“

گولیوں کی ایک بو چھاڑ ان کے سروں پر سے گزر گئی۔ وہ گرے پڑے تھے۔ اگر کھڑے ہوتے تو شاید چھلنی ہو جاتے۔ پھر عادل نے دیکھا، بلندی سے کریہہ شکلوں والے کچھ پاؤندے، رائفلیں اور چھوٹی کلہاڑیاں سوتے خیموں کی طرف لپک رہے ہیں۔ عادل نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا..... ہاں یہی تھے جنہوں نے سر سرمد کو مارا..... شہزادی کو مارا..... یہی درندے تھے۔ اور ان کا سر غرہ کو مینہ مالکانے زادہ تھا..... عادل نے انور کی لاش کے پاس سے ایک رائفل اٹھائی اور اندھا دھند پاؤندوں کی ٹوٹی کی طرف بھاگا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، وہ کیا کر رہا ہے..... اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک اس کی ٹانگیں نیم جان تھیں اور وہ اپنے بازوؤں کو ٹھیک سے حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ اسے وہ گولی بھی یاد نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے اس کے بازو میں اتری تھی اور شاید یہ بھی یاد نہیں تھا کہ زندگی نام کی بھی کوئی چیز ہوئی ہے۔ پاؤندے اس کی طرف لپک رہے تھے اور وہ ان کی طرف لپک رہا تھا۔ پھر اس نے ٹرگر دیا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند گولیاں چلیں۔ وہ چٹکھڑا سٹا گیا اور بھاگتا گیا۔ اس نے پاؤندوں کو زخمی ہو ہو کر گرتے دیکھا۔ اس کے اپنے بازو میں بھی ایک اور انگرا اتر گیا۔ وہ رکا نہیں۔ کم و بیش پانچ پاؤندوں کو ڈھیر کرتے ہوئے وہ ایک قد آدم چٹان کی اوٹ میں گرا۔

اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اس نے دیکھا، ہمایوں بھی سرتاپا قبر اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے آٹومیک رائفل کے دو بھرے ہوئے میگزین عادل کی طرف بھینکے اور خود عادل سے بھی چند قدم آگے جا کر ایک پتھر کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ کسی نے عادل کے شانے کے ساتھ شانہ ملا یا۔ عادل نے دیکھا یہ فیروزہ کا شوہر مدثر تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی شعلے رقصاں تھے۔ چارج کرنے کے دوران میں کارٹوس کے دو تین چھرے مدثر کی کلائی میں لگے تھے۔ خون بہہ رہا تھا لیکن اسے کوئی احساس نہیں تھا۔

ہمایوں نے عادل کو مخاطب کرتے ہوئے پکارا۔

”عادل! اس سامنے والی چوٹی پر ان کی گن ہے۔ وہی سب سے زیادہ مار رہی ہے۔ اس کو تین چھوڑنا۔“

کسی دردِ دردِ از گنج کی طرح عادل کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ برحمتِ عملی اور مصلحت کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔ اس کے کانوں میں بس شہزادی کی آخری ہنسی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بس اس کی آخری جھلک تھی۔ وہ اپنی رائفل سے نیامگزین امیج کر چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھے بغیر، ایک لفظ بھی کہے بغیر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پاؤندوں کی پوزیشنوں کی طرف دوڑا۔ ایک لمحہ ساکت رہنے کے بعد ہمایوں اور مدثر بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ اب باقیوں کے لیے بھی کوئی آپشن نہیں رہ گیا تھا۔ ان سب نے بھی ان تینوں کو فالو کیا..... لاکارے مارتے اور گولیاں برساتے وہ پاؤندوں کی پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ سچ ہی کہتے ہیں کہ لڑائی کے میدانوں میں قسمت ہمیشہ دلیروں کا ساتھ دیتی ہے اور یہ تو دلیری سے بھی آگے کی بات تھی۔ ایک جنوں..... ایک وحشت..... سامنے سے گولیوں کی باڑیں آئیں۔ قرب و جوار اندھا دھند دھماکوں سے گونجنے لگا۔ عادل، ہمایوں کے ساتھیوں میں سے دو تین افراد زخمی ہو کر گرے، باقی لاکارتے ہوئے پاؤندوں کی پوزیشنوں پر جا پڑے۔ پہلے گولیاں جھلیں پھر دست بدست لڑائی ہوئی۔ رائفلوں کی کلیننگ چلیں، کلباڑیاں لہرائیں۔ تیز دھار چاقو متحرک ہوئے۔ گوشت سے لوبا ٹکرایا، جمسوں سے خون اچھلا..... جنون غالب آ گیا..... ہر لہس پسپا ہوتا چلا گیا، ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے، ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ جن کی زندگیاں لٹ جاتی ہیں، جن کی کشتیاں جل جاتی ہیں، جنہیں اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے مار کر ازیت ناک موت سے بچانا پڑتا ہے..... وہ پھر خود بھی زندگی سے دور چلے جاتے ہیں، ان کو مرنے کا ڈر نہیں رہتا..... اور تاریخ گواہ ہے جن کو موت کا ڈر نہیں رہتا، وہ اپنے دشمنوں کی زندگیاں کے مالک بن جاتے ہیں۔

پاؤندے تعداد میں کثیر تھے۔ ان کے پاس وقتاً فوقتاً سیاحوں سے لوٹا ہوا بارڈر سے خرید ہوا جدید اسلحہ تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا شاید کہ ان پر ایسا ہملک ہلا بولا جائے گا۔ ان میں سے بہت سے زخمی ہوئے۔ بہت سے موقع پر ہی مارے گئے اور باقی محاصرہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ موت کا سند یہ لے کر سرسراتی ہوئی گولیوں نے ان کا تعاقب کیا اور وہ زخم کھا کھا کر برف پر گرے۔ ان میں سے کم ہی تھے جو بچ کر نکلے۔ عادل دیوانوں کی طرح کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ ان کے سرغنہ مالکانے زادہ... کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہی بدخصلت شرابی جس نے لاہور کے کلی کوچوں تک

اور ضربوں نے اس کی کھوپڑی توڑ ڈالی۔ سرخ خون میں سفید مغز کی جھلک نظر آئی۔ لالی گاؤں کا بددماغ چھوٹا چودھری زندگی کی رفق سے خالی ہو چکا تھا۔

چند سینکڑے بعد ہمایوں اور مدثر بھی بھاگتے ہوئے عادل کے پاس پہنچ گئے۔ ان تینوں کی ٹانگیں پنڈلیوں تک برقیلے پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ درحقیقت ایم جی 42 مشین گن والے مورچے پر قبضہ کر کے انہوں نے ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ یہ جگہ کافی بلندی پر تھی۔ پاؤندوں کی باقی پوزیشنیں یہاں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اب اگر ایک بھر یوں حملہ اور کیا جاتا تو نہ صرف پاؤندوں کا گھیراؤ ٹ جاتا بلکہ وہ جس نہیں بھی ہوتے۔

عادل، ہمایوں اور مدثر کی غیر معمولی دلیری و جانبازی نے کیپ کے نیچے کھینچے افراد کے حوصلے بھی بڑھا دیے تھے۔ قریباً دس مقامی و غیر مقامی افراد اب عادل اور ہمایوں کے ساتھ تھے اور مرنے یا مارنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کا لیڈر ورژنی جسم اور تھمتاتے چہرے والا ایک نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ تھی اور پیشانی پر سرخ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہمایوں کی خاموش آنکھوں میں ایک نیلی آگ تھی۔ شاید وہی آگ جو پچھلے ساڑھے تین سو برس سے اس کے خون میں سفر کر رہی تھی۔ راجپوتوں کی عورتیں مر گئی تھیں اور وہ خود بھی مر گئے تھے۔ عورتیں تو آج بھی مر گئی تھیں لیکن انتقام لینے والے ابھی زندہ تھے۔ کیا آج وہ ادھورا کام مکمل ہو سکے گا؟ کیا آج وہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکے گا؟ یقیناً ہمایوں کی آنکھوں جیسی آگ عادل کی آنکھوں میں بھی روشن تھی لیکن اسے اپنی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ہاں اپنے رخساروں پر رنگنے والے آتشیں آنسوؤں کی حدت وہ ضرور محسوس کر رہا تھا۔ سرسرد اور شہزادی کی لاشوں کو دیکھنے کے بعد زندگی اور موت میں اس کے لیے ایک ڈرے کا فرق بھی نہیں رہا تھا۔

”وہ بول کھلائے ہوئے ہیں، ہمیں ان کو سنہیلنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔“ ہمایوں مہیب آواز میں بولا۔ ایک پشیمان پورٹرنے کہا۔ ”اگر ام دووٹیوں میں بٹ جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ ایک ٹوٹی پکڑ کاٹ کر دائیں طرف چلی جائے۔ وہ وہاں سے فائرنگ شروع کرے تو ام سامنے سے ہلا بول دے۔“

ایک دوسرے شخص نے کہا۔ ”یا تھوڑا انتظار کیا جائے۔ ان کو آگے آنے کا موقع دیا جائے۔“ تیسرے شخص نے کوئی اور بات کہی۔ یہ باتیں جیسے

ایک نلک مالک نے زادہ کی لاش کو دیکھ کر ہاتھ دھوئے۔ اس کے دل نے ہمیشہ یہ گواہی دی تھی کہ اس بد معاش عامل کی رگوں میں انہی بے رحم قاتلوں کا خون ہے جنہوں نے زن اور زمین کے لالچ میں اس کے قبیلہ کو تاراج کیا تھا۔ مالکا قاتلوں کا وارث تھا اور ہمایوں مقتولوں کا..... اور آج کئی صدیوں بعد وہ ایک روپ میں ایک دوسرے کے سامنے موجود تھے۔

☆☆☆

عادل ایک بار پھر بے ہوشی کے حصار میں تھا۔ اس حصار میں پھر نیم بے ہوشی کے چھوٹے چھوٹے وقفے بھی آرہے تھے۔ ایسے ہی ایک وقفے کے دوران میں اس نے ہیلی کا پٹر کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ محسوس کی..... اور اسے یوں لگا کہ اس کے زخمی بازو پر کوئی تیز دھار آگ کھٹ..... لگا رہا ہے۔ اس نے خود کو کسی ہندو لے میں جھولتے ہوئے محسوس کیا۔

پھر نیم بے ہوشی کا ایک وقفہ ایسا آیا جب اسے لگا کہ رات ہے اور وہ کسی تیز رفتار گاڑی میں سفر کر رہا ہے۔ ملی جلی آوازیں محسوس ہو گئے۔ اس کی سماعت سے ٹکرائی محسوس..... سرسبز اور شہزادی کی لاشوں کا منظر اس کے ذہن میں نہیں تھا لیکن یہ احساس ضرور موجود تھا کہ اس کے ساتھ کچھ بہت خوفناک ہو چکا ہے۔ کوئی بہت گھمبیر حادثہ..... وہ عالم بے ہوشی میں بھی اس حادثے کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا۔

ایک بار جب اس کی بے ہوشی کی شدت کم ہوئی، اس کے نکتوں سے اسپرٹ کی تیز بو ٹکرائی، وہ کسی نرم بستر پر تھا..... اسے سرسبز اور شہزادی کی لاشیں یاد آئیں..... اسے سر سے پاؤں تک ایک آتشیں غم نے ڈھانپ لیا۔ کہیں وہ اس کا تصور تو نہیں تھا؟ جاگتی آنکھوں کا خواب تو نہیں تھا؟ وہ بری طرح تڑپا۔ اس نے نیم بے ہوشی کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی..... اور نکل آیا۔

اس کی دھندلائی ہوئی نگاہوں کے سامنے ایک سفید چھت تھی۔ دو تین افراد اس پر جھکے ہوئے تھے اور ان کے چہرے عادل کو اپنے سامنے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک چہرہ کسی نرس کا تھا۔ سفید کوٹ والے ایک اہیوز عمر شخص نے اپنا ہاتھ نرمی سے اس کے سینے پر رکھا اور بولا۔ ”نہیں..... لیٹے رہو..... ابھی اٹھنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔“

وہ زور لگا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے زخمی بازو اور سر میں شدید ٹیمپیں آئیں۔ اسے پہلا احساس یہی ہوا کہ اس کا جسم اب پہلے کی طرح مفلوج نہیں ہے۔ اس کا گلا آنسوؤں سے

اس کا تعاقب کیا تھا۔ وہ عادل کے ماموں کا قاتل تھا اور عاصم کو شدید زخمی کرنے والا بھی وہی تھا۔ اس کے علاوہ شہزادی کو اس پر فستان تک پہنچانے اور پھر زندگی سے دور کر دینے کی ذمہ داری بھی اسی شیطان صفت شخص پر آئی تھی..... اور پھر وہ عادل کو مل گیا۔ وہ گولیوں سے پھٹتی ہو جانے والی چند لاشوں کے نیچے پڑا تھا اور خود بھی لاش میں تبدیل ہونے والا تھا۔ اس کی ناف اور پیٹ میں پورا ایک برسٹ لگا ہوا تھا۔

عادل نے مزید دیکھا، مالک نے زادہ کے شرابی چہرے اور اس کی گردن پر کھروچوں کے دو تین دن پرانے نشان تھے۔ اس کے قریب ہی برف پر ایک جھکا اور ایک زنانہ سینڈل بھی نظر آیا۔ یقیناً یہ سرکردہ یاؤندہ مقامی اور غیر مقامی عورتوں کی عصمت دری میں بھی ملوث رہا تھا۔ جھکا تو کسی مقامی لڑکی کا تھا (ایسی کئی لڑکیاں سناترا برادری کے مقامی ”دوست خاندانوں“ میں شامل تھیں) سینڈل دیکھ کر عادل کو شک ہوا کہ یہ صحابی خاتون یا پھر اوش کی بیٹی ڈو بھی کا ہے۔ مالک نے زادہ آخری سانس لے رہا تھا۔ ایک حریص دنیا دار کی طرح وہ اب بھی جینا چاہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی بچ جانے اور جینے کی خواہش تھی۔ عادل کی آنکھوں میں شعلے تھے، اس نے راضل اٹھائی اور مالک نے زادہ کی اس خواہش کے درجنوں ٹکڑے کر دیے۔ اس نے اس بے رحم یاؤندے کے چہرے پر سیون ایم ایم کے دو برسٹ مارے اور اس کے نقوش اڑا کر رکھ دیے۔ اس کے بعد بھی وہ رکائیں، اس نے قریب پڑا ہوا ایک شکاری چاقو اٹھایا اور مالک نے زادہ پر چل پڑا۔ وہ اس کی چھاتی پر پے درپے وار کرتا رہا اور پکارتا رہا۔ ”تو نے میری شہزادی کی جان لی۔ تو نے سرسبز کی جان لی.....“

پھر ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے بازو پر دو گولیاں لگ چکی ہیں اور زخموں سے لگا تار خون بہتا رہا ہے۔ وہ تو پہلے ہی شدید نفاہت اور ناتوانی کے گھبرے میں تھا۔ خون کا مسلسل اخراج اسے بالکل نیم جان کر چکا تھا۔ وہ تورا کر مالک نے زادہ کی لاش کے اوپر ہی گرا۔ بے ہوشی نے پھر اسے ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس حالت میں بھی بڑبڑا رہا تھا۔ ”شہزادی..... شہزادی!“ کچھ دیر بعد اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہو گئی۔

اس کے قریب ہی ہمایوں کی جھمے کی طرح ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس کی سرخ انگار آنکھوں میں اب بھی تھی۔ وہ

تھی۔ یہ پٹی یقیناً آسی خون ریز لڑائی کا نتیجہ تھی جو توبل راک کی قریبی ڈھلوانوں پر ان کے اور پاؤندوں کے درمیان ہوئی تھی۔ دروازے کی دوسری جانب سرسرد کا ایک ملازم نظر آیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا تھا اور غم و اندوہ کی تصویر نظر آتا تھا۔

ہمایوں بستر پر بیٹھ گیا اور عادل کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں سسک اٹھے۔ پندرہ بیس سینڈ اسی طرح بیٹھے رہے پھر عادل نے دلہوز آواز میں پوچھا۔ ”ہمایوں بھائی! کہاں چھپا دیا ہے میرے سر کو؟“

وہ آنسو پونچھ کر بولا۔ ”وہ جہاں بھی ہیں، بہت خوش ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری نسبت، بہت اچھی جگہ پر ہیں۔ اللہ اپنے ایسے بندوں کو شاید ساری تکلیفیں دنیا میں ہی دے دیتا ہے۔“

عادل زار و قطار روتے ہوئے بولا۔ ”اور شہزادی.....؟“
ہمایوں نے دلاسا دینے والے انداز میں اس کی پشت تھپکی اور اسے اپنے ساتھ بچھ لیا۔ اسی دوران میں ادیہر عمر ڈاکٹر اور جواں سال نرس کی شکل دوبارہ نظر آئی۔ ڈاکٹر نے ذرا حتمی سے کہا۔ ”ہمایوں! آپ باہر جاؤ۔ میں نے کہا بھی ہے کہ ابھی اس کے لیے کوئی جذباتی پائلنٹ شیک نہیں۔“

ہمایوں آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ نرس اسے پھر انجکشن لگانا چاہ رہی ہے۔ اس نے انجکشن لگوانے سے انکار کر دیا۔ تاہم ڈاکٹر نے اسے سمجھایا بچھایا اور اصرار کر کے انجکشن لگا دیا۔ عادل خود بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کا سر درد سے بھٹنے لگا ہے۔ شاید ابھی یہ انجکشن اس کے لیے ضروری تھے۔

☆☆☆

وہ ستمبر کی آخری تاریخوں کی ایک نیم خنک رات تھی۔ آج شاید عادل کو انجکشن نہیں لگایا گیا تھا۔ اس کے حواس پر چھائی ہوئی دبیز دھند آج کچھ بھٹی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ ہمایوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ہمایوں نے اسے بتا دیا تھا کہ سرسرد نے کن حالات میں اور کیسے جان دی۔ اس نے بتایا تھا کہ آخری لڑائی سے دو دن پہلے، صبح کے وقت اس نے دیکھا تو سرسرد اپنے خیمے میں موجود نہیں تھے۔ ان کی میسا کھیاں بھی نہیں نظر نہیں آئیں۔ وہ سر کو ادھر ادھر تلاش کرتا رہا پھر اسے سر کے بیگ کے پیچھے ایک کاغذ پا ہوا نظر آیا۔ یہ سر کا لکھا ہوا تھا۔ یہ خط کچھ اسی طرح تھا۔ ”ہمایوں اور کرشن! تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو کہ حالات کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ اس میں

بھروسہ کیا۔ وہ زور لگا کر بولا۔ ”میں کہاں ہوں..... ہمایوں کہاں ہے؟ تائیابی کہاں ہیں؟“
ادیہر عمر ڈاکٹر بولا۔ ”وہ بھی نہیں ہیں۔ وہ ابھی تم سے ملنے آتے ہیں لیکن ابھی تم لیٹے رہو۔“
”مجھے بتاؤ میں کہاں ہوں؟ باقی سب کہاں ہیں؟“
وہ چنگھاڑا۔

”تم اس وقت راولپنڈی کے اسپتال میں ہو۔ ہمایوں اور تمہارے تائیابی نہیں ہیں.....“

عادل کے ذہن میں سرسرد اور شہزادی کی لاشوں کا منظر آسمانی بجلی کی طرح چمکا اور اس کی ہمت اور برداشت کو خاکستر کر گیا۔ وہ دلہوز لہجے میں پکارا۔ ”کہاں ہیں میرے سر؟ کہاں ہے شہزادی؟ میں ان کو کھینچتا چاہتا ہوں۔ ہمایوں کو بلاؤ..... ہمایوں بھائی..... ہمایوں بھائی!“ وہ چلانے لگا۔ دس پندرہ سینڈ پہلے اسے اپنی کلائی میں جبین محسوس ہوئی تھی۔ شاید کلائی میں لگے ہوئے ”براولا“ میں کوئی دوا انجیکٹ کی گئی تھی۔ اس دوا کا اثر تیزی سے اس کے خون میں شامل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پلکوں پر پوچھ محسوس کیا۔ ذہن میں دھندلی بھرنے لگی۔ اس نے بے قرار ہو کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر بس ناگوں کو حرکت دے کر رہ گیا۔ کسی نے اس کی پشت پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور اس کے گرتے ہوئے جسم کو ہمارادے کر بستر پر لٹا دیا۔

وہ عجیب سے شب دروز تھے۔ عالم بے خبری میں بھی اس کے ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ اسے لگا ہے انجکشن لگائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس کا ذہن ایک سکون بخش تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ ایک دوبار اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ وہ سفر میں ہے پھر ایک بار اسے اپنے بالکل قریب ہی ہمایوں کی آواز بھی سنائی دی۔ اس نے اپنے حواس پر چھائی ہوئی دبیز دھند میں سے نکلنے کی کوشش کی اور جزی طور پر کامیاب ہوا۔ اسے لگا کہ شاید وہ سرسرد کے گھر میں ہے۔ اگر وہ سرسرد کے گھر میں تھا تو پھر یقیناً لاہور پہنچ چکا تھا۔ کھڑکی سے باہر اسے ایک چھوٹا ٹریکٹر نظر آیا اور وہ سرسبز کھیت بھی نظر آیا جس میں سرسرد اپنے ہاتھوں سے کام کیا کرتے تھے۔ اس کے گلے میں ایک بار پھر آنسوؤں کا آئینہ گر نے لگا۔ ”ہمایوں بھائی..... کہاں ہو تم..... ہمایوں بھائی۔“

چند لمحوں بعد اسے دروازے میں ہمایوں کی غمزدہ صورت نظر آئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے دس پندرہ روز سے شیو نہیں کی۔ اس کے ایک ہاتھ پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی

راحتوں سے بھر دے۔ خدا حافظ۔“

یہ خط پانے کے بعد ہمایوں دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سرد صاحب نے اپنی تحریر میں صاف لکھا تھا کہ وہ حجت پوری کر رہے ہیں، ورنہ انہیں اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ مالکا کی طرف سے بد عہدی سامنے آسکتی ہے اور پھر یہی ہوا۔ دن کا اجالا پھیلنے کے کچھ ہی دیر بعد اوپر چٹانوں کے پیچھے گرانڈیل مالکانے زادہ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور مسلح شخص بھی تھا۔ مالکانے زادہ نے سرد صاحب کو ایک ڈھال کی صورت میں اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ مالکانے زادہ کی آٹو میک ایم 16 رائفل سرسرد کی کچنی سے چھو رہی تھی۔ سرسرد کا دوسرا بازو مالکانے زادہ کے سامنے کی گرفت میں تھا۔

مالکانے زادہ نے مقامی زبان میں پکار کر کہا۔ ”یہ چاچا اکیلا خناب گل کا قاتل نہیں ہے۔ ہمایوں اور عادل بھی اس گٹل میں برابر کے حصے دار ہیں۔ وہ بھی خود کو ہمارے حوالے کریں۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی رعایت دے سکتے ہیں۔“ ہمایوں نے پکار کر کہا تھا۔ ”تم اپنی بات سے پھر رہے ہو۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے کسی طرح کا مجھوٹا کیا جائے۔“

مالکا بولا۔ ”اور تم بھی اسی قابل نہیں ہو۔ تمہارے پاس ہے کیا، ہمیں دینے کے لیے؟ جو کچھ بھی ہے، وہ ہم اپنے زور پر حاصل کر سکتے ہیں۔ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر تعویذی بہت بچت چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار چھین کر اور اپنے کمینے دوست کو لے کر اوپر آ جاؤ۔“ یہ مکالمہ دو چار منٹ جاری رہا۔ مالکا اور اس کا تو منہد سامنے مسلسل اپنا دباؤ بڑھا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمایوں اور عادل خود کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ وہ سرد صاحب کو شوٹ کر دیں گے۔ سرد صاحب کی زندگی ہمایوں کے لیے ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس وقت عادل بے ہوشی کی حالت میں تھا لیکن ہمایوں تو ہوش میں تھا اور اپنی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے سرسرد صاحب کو شدید خطرے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ کیا کرے۔ دوسری طرف شاید سرد صاحب بھی جان گئے تھے کہ ان کی وجہ سے ہمایوں اور عادل کی زندگیاں داؤ پر لگ سکتی ہیں۔ انہوں نے اس ”بدلی ہوئی صورت حال“ میں وہی کیا جو ان جیسے بے خوف اور باہمت شخص کو کرنا چاہیے تھا۔ ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اچانک سرد صاحب کی ایک میسا کھی ہوا میں لہرائی اور تو منہد شخص کے پھتول والے ہاتھ پر لگی۔

کسی کا کوئی قصور نہیں، بس قدرت کی طرف سے ایک سخت آزمائش ہے جو ہم پر آئی ہے۔ تم لوگوں نے دیکھ ہی لیا ہے، مالکا اور اس کے ساتھی کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ وہ بے دریغ مار رہے ہیں اور گھبراہٹ کر رہے ہیں۔ ان کا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ خناب گل کے قاتل کو ان کے حوالے کیا جائے۔ وہ عادل کو مانگ رہے ہیں۔ شاید یہ بات تمہارے اور کرٹل کے لیے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہو کہ پچھلے تین روز سے میں مالکا کے ساتھ رابطہ میں ہوں۔ یہ رابطہ ایک واک ٹاک کی ذریعے ہو رہا ہے۔ میں نے مالکا سے کہا تھا کہ دونوں طرف سے جائیں ضائع ہو رہی ہیں۔ میں نے اسے آفر کی تھی کہ اگر وہ خون کا بدلہ خون چاہتا ہے تو میں خود کو اس کے حوالے کرنے کو تیار ہوں لیکن شرط یہی ہے کہ وہ اس کے بعد محاصرہ اٹھالے گا اور پکڑے جانے والوں کو بھی رہا کر دے گا۔ ہاں قیمتی سامان اور کیش وغیرہ کی صورت میں اس نے جو کچھ لوٹا ہے، وہ اس کے پاس ہی رہے گا۔

”آج رات مالکانے زادہ نے ایک دو مزید شرطوں کے ساتھ یہ آفر قبول کر لی ہے۔ تم لوگ مجھے معاف کرنا۔ میں مزید جانی نقصان سے بچنے کے لیے اور آبروریزی کے اس گھٹاؤنے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے خود کو مالکا کے حوالے کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ مقتول خناب گل کا باپ رواج کے مطابق مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مارنا چاہتا ہے۔ میں اس کے لیے بالکل تیار ہوں۔ میری عمر اس وقت ساٹھ سال ہے اور شکر الحمد للہ میں نے ایک بھر پور زندگی گزاری ہے۔ اگر اپنے بچے بچپن کے لیے مجھے اپنی جان دینا پڑتی ہے تو میرے لیے اس سے اچھا سودا اور کوئی نہیں ہے۔ اندیشہ صرف ایک بات کا ہے اور وہ یہ کہ مالکا اپنے وعدے سے پھرنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ بات ممکن ہے کہ مجھے مارنے کے باوجود وہ کیپ کا محاصرہ ختم نہ کرے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تم لوگ اپنا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہو لیکن میرے بچو! یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ اگر پانچوں نے اور مالکانے یہ بد عہدی کی تو ان پر ضرور اللہ کی مار آئے گی۔ وہ بدترین شکست کا شکار ہوں گے اور تم دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا۔ میں نے ایک خط علیحدہ سے اپنی شریک حیات فائزہ کے لیے بھی لکھ دیا ہے اور اس میں اسے ضروری ہدایات بھی دے دی ہیں۔ تم جانتے ہو، میں اس کی طرف سے بھی بالکل مطمئن ہوں۔“

”اب میں چار ہوں، اس خواہش اور دعا کے ساتھ کہ میری اس چھوٹی سی حقیر قربانی کے بدلے اللہ تعالیٰ تم بچوں کی زندگیوں کو محفوظ بنائے اور انہیں خوشیوں اور

کا بھی کردار دیکھ رہا ہوں۔“

ہمایوں نے کہا تھا۔ ”مگر سزاوہ تو بے ہوش پڑا ہے۔“ انہوں نے دور کہیں دیکھتے ہوئے عجیب انداز میں کہا تھا۔ ”شاید وہ زیادہ دیر بے ہوش نہ رہے۔ اس کا بہت خیال رکھو..... وہ..... ضرور تمہارا ساتھ دے گا بلکہ تم سب سے دو قدم آگے چلے گا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔“

کچھ دیر بعد انہوں نے گہرے سانس لینے شروع کر دیے تھے۔ ان کے پاس موجود لوگوں نے انہیں زمین سے اٹھا کر نرم بچھونے پر لٹانے کی کوشش کی تھی اور انکاشن وغیرہ دینا چاہا تھا مگر انہوں نے ہمیشہ کی طرح بے سہولت لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے زخم کاری تھے اور جسم کا زیادہ تر خون ضائع ہو چکا تھا۔ انہوں نے دو گھنٹہ سادہ پانی پیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ چند منٹ کے اندر ان کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی تھی۔

عادل نے یہ ساری روداد ہمایوں کی زبانی سنی۔ ہمایوں کی آنکھیں نم رہیں اور اس دوران میں گاہے بگاہے عادل کے رخساروں پر بھی آنسو رینگتے رہے۔

روداد ختم ہوئی تو عادل اور ہمایوں کٹنی ہی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے..... کھڑکیوں سے باہر رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے۔ یہ سرد صاحب کے اپنے ہاتھوں سے پالے ہوئے باغیچے تھے..... آخر ہمایوں کی کھیر آواز ابھری۔ ”سرد صاحب کے جانے کے بعد شام تک حالات اور خراب ہو گئے تھے۔ پاؤندے، شدید زخمی مالکانے زادہ کو اٹھا کر لے گئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے مسلسل فائرنگ کرتے ہوئے گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہماری کئی عورتیں جن میں چار پانچ انگریز لڑکیاں بھی شامل تھیں، پاؤندوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ انہوں نے ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا۔ کیپ میں دہشت کی فضا پہلے ہی تھی..... اور بڑھتی چلی گئی..... اور پھر وہ سب کچھ ہوا عادل جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ ہمایوں کی آواز ہترا گئی۔ وہ دل فگار انداز میں بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”شہزادی، فیروزہ اور ایک نرسین نامی لڑکی نے ایک زہریلا ٹیکسیل لیا۔ یہ ٹیکسیل ڈاکٹر رابرٹ کے سامان میں تھا، معلوم نہیں وہ ان کو کیسے ملا۔ نرسین کیپ میں زہرنگ کا کام بھی کرتی رہی ہے۔ خیال ہے کہ یہ ٹیکسیل وہی ڈاکٹر کے سامان میں سے نکال کر لائی تھی.....“

عادل کے دل و دماغ میں جیسے انگاروں کی بارش ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بہت جلد ان انگاروں کے

اس جچی تلی ضرب نے پستول اس پاؤندے کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ سرد صاحب اپنی بیساکھوں سمیت پستول کے اوپر گرے۔ انہوں نے پلٹ کر دو فائر کیے اور خود پر جھپٹے ہوئے پاؤندے کو ڈھیر کر دیا۔ مالکانے زادہ نے چٹکھا ڈاکٹر سرد صاحب پر گولی چلائی۔ ایک فائر ان کے سینے پر لگا لیکن وہ کمال ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مالکانے زادہ پر جا پڑے۔ دونوں اوپر نیچے گرے اور سچم گتھا ہو گئے۔

ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے آگے بڑھنا چاہا مگر پاؤندوں کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہوئی۔

ہمایوں اور اس کے دیگر ساتھیوں میں سے دو افراد شدید زخمی ہو کر گرے۔ اس کے بعد انہوں نے بھی پوزیشن لینے لے کر

فائرنگ شروع کر دی۔ درمیان میں مالکا اور سرد صاحب کے بیچ زندگی موت کی لڑائی جاری تھی۔ سرد صاحب ادھیڑ عمر تھے، مالکا درمیانی عمر کا تھا اور نسبتاً جاندار بھی تھا۔ پھر بھی

سرد صاحب نے اس کی حیران کن مزاحمت کی۔ وہ پستول دوبارہ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ شاید اس میں گولی بھنسن گئی تھی یا پھر وہ ویسے ہی ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ اپنی

پوری طاقت سے مالکا کی رائفل کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر رائفل سے ایک اور گولی چلی۔ یہ گولی بھی

سرد صاحب کو چھاتی پر ہی لگی۔ ان لحوں میں یوں محسوس ہوا جیسے سرد صاحب مکمل طور پر زیر ہو گئے ہیں لیکن نہیں.....

ابھی ان کی غیر معمولی سخت جانی وخت کوئی انہیں سہارا دے رہی تھی۔ وہ شاید مرتے مرتے مالکانے زادہ کو اپنے ساتھ

لے جانا چاہتے تھے اور پھر سب نے دیکھا کہ وہ کامیاب ہوئے۔ رائفل کا ایک پورا برسٹ چلا۔ اس میں سے چند

گولیاں ہوا میں نکلیں، زیادہ تر مالکا کے پیٹ میں بیوست ہو گئیں۔ وہ پشت کے بل برف پر گرا۔ سرد صاحب بھی اپنی

اکھٹی صحت مند ٹانگ پر کھڑے نہ رہ سکے اور ڈھلوان پر لڑھکے اور پھسلے ہوئے نیچے آ گئے۔ فائرنگ کے دوران میں

ہی انہیں اٹھا کر مورچے میں لایا گیا۔ وہ سانس لے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ اس وقت

انہوں نے چند باتیں بھی کی تھیں۔ ان کی نگاہیں دور کہیں جیسے مستقبل کے پردوں کے پیچھے چھانک رہی تھیں۔ پیشانی

پر الوہی چمک تھی۔ انہوں نے ہمایوں کا ہاتھ دبا تے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا تھا۔ ”فکر نہ کرنا، یہ آزمائش اب

زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں، تم کا کامیاب رہو گے..... لیکن۔“ وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ پھر سانس

درست کر کے انہوں نے بات مکمل کی۔ ”میں اس میں عادل

پاؤں سے اٹھانے کی کوشش کی..... لیکن وہ اسی طرح جھکا رہا..... جھکے جھکے ہی بولا۔ ”عادل..... میں نے بڑی بے رحمی کے ساتھ جھوٹ بولا۔ میں نے شہزادی کے بارے میں تم سے جھوٹ بولا۔“

عادل کے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ اس کے کانوں کے پردے جیسے لرز اٹھے۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ کوئی بہت بڑی خبر سننے والا ہے۔ ہمایوں کے کہے ہوئے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ ”شہزادی زندہ ہے عادل..... وہ بچ گئی ہے عادل۔“

عادل ایک بار پھر پتھر اٹھایا۔ اس کا جسم جو یکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضائے بسط میں بکھریا تھا، روشنی کی رفتار سے ایک بار پھر ”جسم“ ہو گیا۔ وہ کئی سیکنڈ تک کچھ بول نہ سکا۔ پھر جیسے اس کے پتھر اٹھے ہوئے جسم میں جان واپس آئی۔ ایک مڑ جوش ریلے کی طرح، ایک نورانی لہری کی طرح۔ اس کے سینے میں جیسے ہزاروں تھمتے کبابا رنگی روشن ہو گئے۔

اس نے ہمایوں کو دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”ہمایوں بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میرے ساتھ مذاق نہ کرنا..... میری دھڑکن رک جائے گی۔“

اس نے آنسوؤں سے جھگا ہوا چہرہ اٹھایا۔ ”نہیں عادل! میں بہت سنگ دل ہوں لیکن اتنا بھی نہیں ہوں۔ تمہاری شہزادی زندہ ہے۔ فیروزہ بھی زندہ ہے، وہ تینوں زندہ ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ بیٹھے بیٹھے عادل سے لپٹ گیا۔ عادل نے بس شادی مرگ کے الفاظ ہی سنے تھے۔ اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ شادی مرگ کیا ہوتی ہے۔ خوشی کی یلغار سے دل کیسے رک جاتا ہے، روح کیسے پرواز کر جاتی ہے لیکن آج وہ محسوس کر رہا تھا، بے پناہ شدت اور وضاحت کے ساتھ۔ اسے لگا اس کی حرکت قلب تھم جائے گی۔

”ہمایوں بھائی! کہاں ہے شہزادی؟“ وہ خود کو سنبھال کر بہ مشکل یہ پانچ الفاظ کہہ پایا۔

پھر اس نے آنسوؤں کی جھلملاہٹ کی دوسری جانب دیکھا۔ دروازے میں شہزادی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے گلابی پھولوں والی سفید شلوار قمیض میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی تک وہی چوڑیاں تھیں جو عادل نے بے ہوش ہونے سے پہلے صفائی لڑکی کے خیمے میں دیکھی تھیں۔ شہزادی کے چہرے کو ایک دلکش زردی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ عادل کو کچھ پتا نہیں چلا، وہ کب بستر سے نیچے اتر آ، کب اس نے

انبار کے نیچے دب کر ختم ہونے والا ہے۔ کہیں پڑھے یا سنے ہوئے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”مشرقی اور مشرقی عورت میں فرق ہے۔ مشرقی عورت کو اپنی آن آبرو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور اس کا ثبوت لاشوں سے اٹے ہوئے وہ کنوئیں ہیں جو 1947ء میں سکھ مسلم فسادات کے وقت جگہ جگہ دیکھنے میں آئے تھے۔“

انگاریوں کی بارش بڑھتی جا رہی تھی، اسے لگا کہ وہ بے پناہ حدت کے نیچے دب رہا ہے۔ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ کہاں تھی شہزادی جس کی پھٹی پر اس نے اپنی کمانی لاکر رکھنی تھی؟ کہاں تھے وہ دلنشین ہونٹ جنہوں نے بے ساختہ مسکراتا تھا؟ وہ دل ہی دل میں پکارنے لگا۔ اب جیتا کیسے ہو سکے گا؟ اب کیسے ہو سکے گا؟

ایک ایک اس نے محسوس کیا کہ ہمایوں نے اپنے ہاتھ اور سر اس کے پاؤں پر رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ ہمایوں نے واقعی اس کے پاؤں پر اپنا سر رکھا ہوا تھا۔ وہ سکیوں سے رو رہا تھا۔ عادل بستر پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ اس نے اپنے پاؤں ہمایوں کی گرفت سے چھڑا چاہے مگر ناکام ہوا۔ ”ہمایوں۔“ وہ قدرے حیرت سے بولا۔

ہمایوں نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں۔ وہ مسک کر بولا۔ ”عادل! میں تمہارا گناہ گار ہوں..... مجھے معاف کرو..... میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں نے بہت سنگ دلی دکھائی ہے..... بہت زیادہ سنگ دلی دکھائی ہے۔“

”ہمایوں بھائی! کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ عادل کہا۔

”پہلے مجھے معاف کرو عادل! میری سنگ دلی پر..... میری بے رحمی پر مجھے معاف کرو۔ مجھے بخش دو عادل۔“ اس کے آنسوؤں سے عادل کے پاؤں نم ہونے لگے۔

”تم نے ایسا کچھ نہیں کیا ہمایوں بھائی۔ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟“

”میں نے کیا ہے عادل..... تم اپنے منہ سے کہہ دو۔ تم نے میری زیادتی پر مجھے خدا کے واسطے معاف کر دیا۔“ عادل نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور کراہتے ہوئے کہا۔ ”ہمایوں بھائی! مجھے نہیں معلوم، تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو لیکن..... میں نے تمہیں معاف کیا۔ مجھے تم سے..... کسی طرح کا کوئی گلہ نہیں.....“

اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے ہمایوں کا سر اپنے

سخت بے حسی ہی کہوں گا..... مجھے وہ ساری کہانی یاد آئی جو تاریخ کی کئی کتابوں میں درج ہے۔ ہندو سالار کا حملہ، راجپوتوں کا اپنی عورتوں کو ختم کرنا اور خودکٹ مرتا۔ وہ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ جب ظالم کا ظلم انتہا سے بڑھ جاتا ہے..... اور جنگ و جدل کا بازار گرم ہوتا ہے، کمزور گھیرے جاتے ہیں اور طاقتور گھیر لیے ہیں تو پھر سب سے بڑی آفت بچوں اور عورتوں پر ہی آتی ہے۔ اس کہانی میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ میری مائیں بہنیں نہیں تھیں..... لیکن میری ماؤں بہنوں جیسی تھیں۔ جب ان کے مردوں نے مجبور ہو کر انہیں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا تو پھر کیا ہوا؟ وہ خود بھی جیتے جی مر گئے اور انہوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ لیے۔ اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد وہ ایسی دیوانگی سے لڑے کہ انہوں نے کشتوں کے پستے لگا دیے۔ یہ اور بات ہے کہ آخری نتیجہ ان کے حق میں نہ نکلا اور وہ سب کے سب مارے گئے۔ لیکن ان کی جانفشانی نے دشمن کو لرزہ بر اندام کر دیا۔ وہ مدت تک ان کی دہشت کے اثر سے نہ نکل سکا۔ وہاں مجھے بھی یہی لگا عادل کہ موت کے اس ٹھہرے کو توڑنے کے لیے مجھے کم از کم دو تین ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ساتھی جو واقعی اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ چکے ہوں اور موت جن کے لیے بے معنی ہو چکی ہو..... اور پھر میں نے وہ کیا جواب تمہاری سمجھ میں آچکا ہوگا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر مدثر کو تینوں لڑکیوں کی موت کی اطلاع پہنچائی اور میں اس وقت جانتا تھا کہ تم بھی میری بات سن رہے ہو۔ مجھے پتا تھا کہ تم دونوں پر اور خاص طور سے تم پر شدید ترین رد عمل ہوگا لیکن یہ رد عمل پیدا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں، دیوانگی درکار تھی عادل! اور یہ دیوانگی ہمیں ملی۔ شاید یہی ایک وجہ ہے جس کے سبب میں خود کو قابل معافی سمجھ سکتا ہوں۔ تم سمجھ رہے ہو۔ ہم مروتو ویسے بھی رہے تھے..... اگر ہر سمر دھڑ کی بازی لگا دیتے تو شاید کامیاب ہو جاتے اور پھر یہی ہوا عادل..... ہم نتائج سے بے پروا ہو کر بس ٹوٹ پڑے..... اور وہ کر دکھایا جو بد ظاہر ناممکن تھا۔ جب ہم نے بلندی پر رکھی ہوئی ”ایم جی 42“ پر قبضہ کر دکھایا تو ٹیکہ کے بچے مجھے جو ان بھی ہمارے پیچھے آئے اور بازی مکمل طور پر ہار گئی۔“

عادل حیرت سے گنگ سن رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر بھر و سنا نہیں ہو رہا تھا۔ اسے وہ قیامت خیز لمحے یاد آئے جب موت اسے ایک بے معنی چیز محسوس ہوئی تھی اور اس کے اندر بہنے والے آگ کے دریائے اس کے سامنے آنے والی

دروازے تک کا فاصلہ طے کیا..... کب شہزادی کی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانکا اور کب اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی۔ اس کے اندر جذب ہو گئی۔ وہ دیدنی ملاپ تھا..... وہ دونوں رو رہے تھے۔ گرد و پیش سے بے خبر ہو گئے تھے۔ شہزادی کے بال عادل کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔ وہ اپنے ہونٹوں پر شہزادی کے پھیلے چہرے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ ہمایوں اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

عادل کو اس سوال کا جواب قریباً دو گھنٹے بعد ملا جس نے اس کے دل و دماغ کی چولیس ہلا ڈالی تھیں۔

ہمایوں اور عادل کو دوبارہ تنہائی ملی تو ہمایوں نے سرخ متورم آنکھوں کے ساتھ عادل کو بتایا۔ ”تمہیں یاد ہے عادل! تم نے خیمے میں اپنے بچھونے سے اٹھ کر لیو پڈ کے منہ پر اس کا گیس ماسک درست کیا تھا؟“

”ہاں ہمایوں بھائی! تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔ اس وقت مجھے ٹھیک سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔“

”عادل! میں نے اس وقت تمہیں دیکھ لیا تھا اور جان لیا تھا کہ تم ہوش میں آ گئے ہو۔ نہ صرف ہوش میں آ گئے ہو بلکہ تمہارا ”سکنتی یافان“ بھی بہت حد تک ختم ہو گیا ہے۔“

”تو تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم جان گئے ہو۔“

”تم نے بھی تو نہیں بتایا تھا۔ ہوش میں آنے کے باوجود آنکھیں بند کیے لیٹ رہے تھے۔“

”میں اس وقت خود کو بس تیس چالیس فیصد ہی ٹھیک محسوس کر رہا تھا۔ ہوش میں آ کر بھی میرا سر چکر رہا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بے جان تھے ہمایوں بھائی۔“

ہمایوں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”میرے دماغ میں وہی سب کچھ چل رہا تھا عادل جو سر نے بتایا تھا۔ ہم جانتے ہیں عادل کہ ان کی لمبی ہوئی اکثر باتیں درست ثابت ہوتی ہیں..... اور انہوں نے کہا تھا کہ تم اس آزمائش سے نکلنے میں بڑا کردار ادا کرو گے..... لیکن کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے، کچھ لوگ تو پاؤں دندوں کے ”ٹھہرے“ سے پہلے ہی ٹیکہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ باقی جو بچے ان میں سے چھپیں کے قریب مر چکے تھے اور کوئی چالیس کے لگ بھگ زخمی پڑے تھے۔ پاؤں دندوں کا گھبراہٹ ہو رہا تھا۔ سبھی لمحے سب کچھ ملیامیت ہو سکتا تھا اور پھر میرے ذہن میں وہ بات آئی جس کے لیے میں نے تم سے معافی مانگی ہے اور جسے میں اپنی

بہت دکھ پہنچا یا ہے..... وہ ہر دوسرے روز ان کی قبر پر جاتی ہے اور دیر تک بیٹھی رہتی ہے۔“

”مڈر کہاں ہے؟“ عادل نے دریافت کیا۔

”وہ ابھی ایبٹ آباد کے اسپتال میں ہے۔ اس کے پیٹ میں ایک گولی لگی تھی اور بازو بھی شات گن کی فائرنگ سے زخمی ہوا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ فیروزہ بھی اب صحت یاب ہے بلکہ اس کی تیمارداری بھی کر رہی ہے..... تمہاری طرح میں نے مڈر سے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی ہے۔ میں نے اسے فیروزہ کی موت کی جھوٹی اطلاع دی..... کسی وقت سوچتا ہوں کہ اگر تم دونوں میں سے کسی کو کچھ ہو جاتا تو میں خود کو بھی معاف نہ کرتا۔ زندگی بھر کچھ بتاؤ گے کی آگ میں جلتا رہتا۔“

عادل نے کچھ دیر توقف کیا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”نہیں ہمایوں بھائی! میں سمجھتا ہوں کہ تم نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔ وقت نے بھی ثابت کیا ہے کہ وہ ٹھیک ہی تھا۔ اس وقت ہمیں ہوش کی نہیں جوش کی..... بلکہ اندھے جوش کی ضرورت تھی۔ ہم ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر ان سے لڑے..... اور پھر ہمایوں بھائی اس ”بے نیازی“ میں تم بھی تو ہمارے ساتھ شریک تھے۔ تمہیں بھی تو کچھ ہو سکتا تھا؟ ہاں..... جو وہ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یقیناً ہم میں سے کوئی یہاں نہ ہوتا۔“

عادل اور ہمایوں کی گفتگو جاری رہی۔ ہمایوں کی باتوں سے پتا چلا کہ لیوینڈ، ڈورسٹی اور صافی لڑکی سمیت قریباً سولہ غیر ملکی اس مسلح تصادم میں جان سے گئے ہیں۔ پاؤندوں کے قبضے میں چلے جانے والی لڑکیوں کو باز یاب کر لیا گیا ہے۔ لارڈ آؤس اور ان کے ساتھی جو یہاں ایک سالانہ ایونٹ میں شرکت کے لیے آئے تھے، اپنے ساتھ سولہ تابوت لے کر واپس جا چکے تھے۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ پاؤندوں کے گھیرے سے پہلے کچھ لوگ کمپ سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ تاہم یہ لوگ شدید طوفان میں راستہ بھٹک کر راکا پوٹی کی چوٹی کی طرف نکل گئے۔ وہ صرف پانچ روز پہلے ڈھونڈے جاسکے تھے۔

اس مسلح تصادم میں اٹھارہ کے قریب مقامی لوگ بھی جان سے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ ستارا برادری کی دوست فیملیز میں سے تھے۔ کچھ مقامی پورٹرز اور گارڈز تھے۔ دراز قد چودھری ناصر اور اس کے دو ساتھی بھی مرنے والوں میں شامل تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی تیس سے کم نہیں تھی۔ آخری لڑائی کے بعد پاؤندوں کی ہلاکتیں

ہر چیز کو رکھ کر ڈالا تھا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر خاموش رہے۔ شاید ہمایوں کے ذہن میں بھی وہی مناظر چل رہے تھے تب ہمایوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یاد ہے، میں نے ایک مرتبہ سرد صاحب کے ایک جنگی نامی شاگرد کا ذکر کیا تھا؟“ عادل نے چند لمحے سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ ہمایوں بولا۔ ”جو پہلے مجھے لڑکے کے ہمارے ساتھ شریک ہوئے، ان میں سب سے آگے وہی جنگی تھا..... وہی جس نے ماتھے پر سرخ پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ بڑی بہادری سے لڑا عادل! وہ مارشل آرٹ کا ایک بہترین کھلاڑی بھی ہے۔ وہ اس مقابلے کے تمام شیئوں میں بھی شامل تھا جو نیل راک پر ہوا اور جسے تم نے جیتا۔“

”وہ اب کہاں ہے؟“ عادل نے پوچھا۔

”دونوں پہلے تک وہ یہیں تھا اور وہی نہیں سرد صاحب کے شاگردوں اور بے شمار چاہنے والوں کا بھی یہاں تانتا بندھا رہا ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ سرد صاحب کو چاہنے والے اور ان سے زندگی کے لیے راہنمائی حاصل کرنے والے باہر کی دنیا میں بھی موجود ہیں۔“ گھڑی کا الارم بجنے لگا۔

عادل کی دوا کا وقت ہو گیا تھا۔ ہمایوں نے اصرار کر کے اسے دوا کھلائی۔ اس کے بعد ان کی گفتگو جاری رہی۔ عادل نے غم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہمایوں بھائی! مجھے اور مڈر کو تو تمہاری ”اطلاع“ نے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا لیکن تمہیں کس چیز نے دیوانہ کیا؟“

وہ کئی سینکڑن خاموش رہنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا عادل! میری دیوانگی بہت پہلے کی ہے..... شاید بدلے کی یہ آگ کئی نسلوں سے میرے اندر بھڑک رہی تھی۔ مجھے پتا تھا میرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ کسی روز میں ان پاؤندوں سے لکڑاؤں کا اور اس آگ کو ٹھنڈا کروں گا یا پھر اس آگ میں خود جل مروں گا۔ مالکا کو سرد نے مارا..... اور تم نے اسے ٹھنڈا کیا لیکن مجھے اس سے اتنا ہی اطمینان ملا ہے، جتنا اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کر کے ملتا۔ یقین کرو، مجھے یہی لگتا ہے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرنے کی میری خواہش پوری ہو گئی ہے۔“

دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر عادل نے ہمایوں سے پوچھا۔ ”کرشل کہاں ہے؟“

”وہ ائر پورٹ گئی ہے۔ اپنے والدین کو سی آف کرنے کے لیے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی۔ سر کی موت نے اسے

ڈھونڈ کر خبریں لا رہے تھے۔ اس شاندار فائل مقابلے کا ذکر بھی ہو رہا تھا جولائی گاؤں کے ایک بے نام نوجوان نے جیتا تھا۔ قریباً 1600 فٹ کی وہ خطرناک ترین چڑھائی جس میں اس نے بڑے بڑے نامور ”راک کلبز“ کو چاروں شانے چت کیا تھا۔ وہ غریب اور بے آسرا تھا..... غیر تربیت یافتہ تھا۔ اپنے حریفوں کی طرح اسے دنیا کے بہترین کو چڑکی خدمات بھی حاصل نہیں تھیں۔ اسے بس چھوڑ کے سوکھے تنوں پر چڑھنا آتا تھا، لیکن اس کے اندر خدا کی عطا کردہ بے مثال صلاحیت موجود تھی۔ پھر اسے ایک فن شناس ملا۔ اس نے چند ماہ میں اسے مٹی سے سونا بنایا اور یہ سونا نوبل راک کی بلند یوں پر یوں چپکا کہ سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ غربت اور فاقہ کشی کے بارے ہوئے اس بے نام نوجوان کا نام عادل تھا۔ اس مقابلے کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بھی زندگی کا حصہ ہی تھا۔ انسان مشکلات کا ایک دریا یا تھو پائوں مار کر پار کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک دوسرا دریا موجود ہوتا ہے۔ پائندوں کا آتا بھی تو ایک دوسرے دریا کی طرح ہی تھا مگر سرسرد کے مشکل پسند شاگرد اس دوسری آفت سے بھی سرخرو ہو کر نکلے تھے۔ انہوں نے نہ صرف خود کو بچایا بلکہ غیر ملکی خواتین کی عزت آبرو کے سامنے بھی ڈھال بن گئے۔



موسم بدل گیا..... گرمی اور صبح کے مینے گزر گئے۔ دھوپ سنہری اور نرم ہو گئی۔ یہ نومبر کی آخری تاریخیں تھیں..... رنخوں پر کھرہنڈا رہے تھے لیکن تین اموات ایسی تھیں جنہیں عادل اب بھی نہیں بھولا تھا۔ پہلی موت سرسرد کی تھی، دوسری ماموں طفیل اور تیسری شہزادی کے بھائی قاسم کی۔ وہ غیرت کے طوفانی ریلے میں سیدتان کو ٹکلا اور پائندوں کی گولیوں کا شکار ہوا۔ شہزادی بھی ابھی اس غم سے پوری طرح نہیں نکل پائی تھی۔ کہتے ہیں کہ جو مر جاتے ہیں، ان کے لیے آہستہ آہستہ صبر آنا شروع ہو جاتا ہے لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ مستقل درد بن کر دل میں رہتے ہیں۔ عادل کے کشدہ دوست صادق کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اسے لاکا نے زادہ نے پک اپ سمیت لاہور کے مقام شاہدرہ سے اغوا کیا تھا اور پھر وہ لا پتا ہو گیا تھا۔ عادل اب تک اس کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا۔ آج کل عادل لاہور میں تھا۔

گاؤں میں بھی حالات دھیرے دھیرے معمول پر آ رہے تھے۔ ناصر کی موت کے بعد اس کے باپ چودھری مختار پر فوج کا حملہ ہوا تھا اور اب وہ بستر پر تھا۔ مختلف کیسوں

کا کافی بڑھ گئی تھیں۔ ہمایوں نے بتایا کہ محتاط اندازے کے مطابق پچاس کے قریب پائندے موقع پر ہی جان سے گئے تھے کچھ زخمی حالت میں بچے گئے تھے۔ ان میں رمزی بھی شامل تھا جو بعد ازاں دو تین مقدمات میں وعدہ معاف گواہ بنا۔ پولیس نے اس صرخ تصادم کے لیے دونوں طرف کے افراد پر مقدمات قائم کیے تھے۔ اس سنگین صورت حال کی زیادہ تر ذمے داری یقیناً پائندوں پر ہی آئی تھی۔ ان کے خلاف لوٹ مار کی شکایات پہلے سے موجود تھیں۔ ان لوگوں کی گرفتاری کے لیے کئی جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ یہ اطلاعات بھی تھیں کہ ان میں سے کچھ لوگ پاک چائنا بارڈر کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔

عادل اور ہمایوں، سرمد صاحب کی قبر پر پہنچے..... تادیر وہاں بیٹھے رہے اور انہیں اشکوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ سرمد صاحب کی آخری آواز عادل نے وہیں کیمپ میں سیم بے ہوشی کے عالم میں سنی تھی۔ وہ الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ سرسرد نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ ”پلیز ڈاکٹر! عادل کے لیے کچھ کریں..... اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“ اسے کچھ نہیں ہوا تھا لیکن وہ خود ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ گئے تھے۔

قبرستان سے واپسی کے بعد عادل اور ہمایوں جب سرمد صاحب کے گھر پہنچے تو وہاں پولیس کی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ یہ لوگ ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں آئے تھے۔ سرمد صاحب کے چاہنے والوں میں شہر کے ایک نامور ایڈووکیٹ اقبال ملک بھی شامل تھے۔ وہ بھی ہمایوں وغیرہ کی معاونت کے لیے موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے عادل کو بتایا کہ پولیس اس کا بیان قلم بند کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمایوں، کرشل اور تایا فراست سے بھی کچھ سوال جواب کیے جانے تھے۔

یہ ساری کارروائی مکمل ہونے میں کئی گھنٹے لگے۔ پولیس شام کے بعد واپس گئی۔ ہمایوں نے سب کو بتایا کہ اقبال ملک اور ان کی ٹیم کے ہوتے ہوئے انہیں قانونی معاملات میں کسی طرح بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ قراقرم کے اس بر فیلے ویرانے میں ہونے والے رخ تصادم کو اب کئی روز ہو چکے تھے، اس کے باوجود کئی اخبارات میں اس واقعے کے بارے میں چھوٹی موٹی خبریں آ رہی تھیں۔ نوبل راک اور اس پر ہونے والے کلام بینک کے مقابلے کو بھی موضوع بنایا جا رہا تھا۔ جرنلسٹ ڈھونڈ

کونپنا رویت بدلتا پڑا۔ وہ گا ہے لگا ہے ان سے ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کے لیے آنے لگی۔ اپنی زندگی کے آخری تین چار سال میں سرد صاحب کو اس سے کوئی شکوہ نہیں رہا تھا۔

ابھی عادل اور ہمایوں وغیرہ کی گفتگو جاری ہی تھی کہ ایڈووکیٹ اقبال ملک ایک ڈی ایس پی کے ساتھ عادل کے زیرِ تعمیر گھر میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے دروازے پر پہنچے تو عادل بھونچکا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے ساتھ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ اسے پہچان کر عادل سشدر رہ گیا۔ وہ صادق تھا۔ صادق اور عادل کا ملاپ دیدنی تھا۔ دونوں دیر تک ایک دوسرے کے گلے گلے رہے۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

ایڈووکیٹ اقبال ملک کی زبانی معلوم ہوا کہ ایبٹ آباد میں جو چند پائونڈے زیرِ حراست تھے، ان میں سے ایک نے پچھلے ہفتے اپنی زبان کھولی اور اس سے پتا چلا کہ لاہور سے آغوشہ صادق، اسکرود کے ایک قریبی دیہہ میں موجود ہے۔ مقامی پولیس نے اس اطلاع پر فوری چھاپا مارا اور صادق کو برآمد کر لیا۔

اداسیوں کے موسم میں یہ عادل کے لیے خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا تھا۔ صادق نے جو روداد سنا، وہ ان اندازوں کے عین مطابق تھی جو عادل اور ہمایوں وغیرہ نے اب تک لگائے تھے۔ ماکانے زادہ اور اس کے ایک ساتھی نے صادق پر بے رحمی سے تشدد کیا تھا۔ اس کے پاؤں، پنڈلیوں اور کمر پر چھڑیوں سے بیٹھے جانے کے پرانے نشان موجود تھے۔ عادل اور صادق رات گئے تک بیٹھے رہے۔ کمرشل اور ہمایوں بھی ان کے ساتھ تھے۔ بہت سی باتیں ہوئیں اور دل کے بوجھ ہلکے گئے۔

آدھی رات کے بعد ہمایوں نے صادق کو لایا اور چند قدم ملے کر کے سرد سرد والے گھر میں چلا گیا۔ نجف و نزار صادق کو آرام کی ضرورت تھی۔ زیرِ تعمیر گھر کے کمرے میں عادل اور کمرشل اکیلے رہ گئے۔

کمرشل نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”عاذل! آج کئی مہینوں کے بعد ہام اپنے دل میں ٹھوڑا سا Happiness محسوس کر رہا ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ تو اب بھی Happiness محسوس کرتا۔ آج تمہارا لکھو یا ہوا فرینڈ صادق تو تم سے دوبارہ ملا۔ اٹ از ریٹلی ونڈ رفل۔ ہام بہت خوش۔“

عادل غور سے کمرشل کو دیکھتا رہا۔ آج کافی عرصے

میں قانونی کارروائی بھی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ بہر حال تباہی فراست نے اب گاؤں چھوڑ کر لاہور میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جو ملی جو عادل نے گاؤں میں بنوانا تھی، اب وہ لاہور میں بنوارا تھا۔ اس نے سرسرد کی رہائش گاہ کے بالکل ساتھ ایک بڑا قطعہ زمین حاصل کر لیا تھا اور اس پر تین سرسرد کے گھر کی طرز پر ایک گھر بنوارا تھا۔ اس میں بہت سی جگہ کھلی چھوڑی تھی جس میں پھلداریاں تھیں، پھل دار پودے تھے اور اناج بونے کے لیے رقبہ تھا۔

ایک شام جب وہ، ہمایوں اور کمرشل زیرِ تعمیر گھر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، عادل نے کہا۔ ”ہمایوں بھائی! دو سوال اب بھی میرے ذہن میں کھلتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ شروع میں تمہارے بارے میں پتا چلا تھا کہ تم بچپن میں ہی اپنے والدین کے ساتھ انگلینڈ چلے گئے تھے اور وہاں کئی سال رہنے کے بعد پاکستان آئے لیکن بعد میں پتا چلا کہ والدین کی وفات کے بعد تم بلتستان میں ہی رہے۔ محنت مشقت کی اور پہاڑوں پر اپنی روزی ڈھونڈتے رہے۔“

”اس سوال کا جواب کافی لمبا ہے عادل! مختصر یوں سمجھ لو کہ آج سے کوئی دس سال پہلے جب میں سولہ سترہ سال کا لڑکا تھا، مانسہرہ کے قریب ایک پائونڈے کے ساتھ میری لڑائی ہوئی اور وہ بھاگنے کی کوشش میں ایک کھائی میں گر کر مارا گیا۔ اس کے بعد سے مجھے اپنی شناخت چھپانا پڑی۔ میرا لڑکپن کا نام بھی ہمایوں نہیں آفتاب تھا۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے، تمہیں بھی آرام سے بتاؤں گا۔ اور دوسرا سوال کیا ہے تمہارا؟“

عادل نے ایک گہری سانس لی۔ ”دوسرا سوال سرد صاحب کے بارے میں ہے ہمایوں بھائی! میں نے ان کا آخری خط دیکھا ہے۔ اس میں ایک جگہ انہوں نے تمہیں مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے۔ میں نے ایک خط علیحدہ سے اپنی شریک حیات کے لیے بھی لکھ دیا ہے، تم جانتے ہو کہ میں اس کی طرف سے بھی پوری طرح مطمئن ہوں۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کا کیا مطلب ہے؟“

ہمایوں نے اس سوال کا طویل جواب دیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سرد صاحب کے خاص طرزِ زندگی اور مشکل پسندی کی وجہ سے ان کی بیوی علیحدہ گھر میں رہنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دن سرد صاحب اپنا درویشی ڈیرا چھوڑ کر اس کے چر آسائش گھر میں آجائیں گے لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی ایسا نہ ہوا۔ آخر ان کی شریک حیات

بعد اس نے اس کے سر جھائے ہوئے چہرے پر زندگی کے آثار رد کیے تھے۔ وہ کافی بدل چکی تھی۔ اب زیادہ تر مشرقی لباس پہنتی تھی۔ عادل نے اسے انگلیش تریجے والا قرآن مجید پڑھتے بھی دیکھا تھا۔ اب بھی اس کے سر پر ایک شال نظر آ رہی تھی۔

عادل گہری سانس لے کر ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔
”کرشل! کہتے ہیں کہ جب کوئی بہت خوش ہو تو اس سے کچھ مانگا جاسکتا ہے..... اور وہ اکثر دے دیتا ہے۔“
”ہام نے بھی یہ سنا لیکن..... تو م کیا لینا مانگتا؟“ وہ سادگی سے بولی۔

عادل نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں یاد ہے کرشل، تم نے ہانگزی چوٹی کی طرف جانے سے پہلے ایک رات مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا..... تم نے کہا تھا..... مجھے بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ اور میں نے کہا تھا، وقت آنے پر بتاؤ گا۔ تمہیں یاد ہے؟“

اس کی آنکھوں میں سوچ کی لکیریں ابھریں۔ پھر ہولے سے مسکرائی اور سر ہلا کر بولی۔ ”میں عادل! ہام، تو م کا بات سمجھ رہا۔ ہام کو یاد ہے لیکن..... تو م..... کیا مانگنا چاہتا؟“

عادل نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کرشل! میں تم کو مانگنا چاہتا..... اپنے دوست ہمایوں کے لیے..... ہاں کرشل! میں تمہیں اس کی زندگی میں دیکھنے کی شدید خواہش رکھتا ہوں۔ وہ بہت خاموش ہے۔ سمندر کی طرح گہرا اور بھیدوں بھرا۔ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے..... لیکن زندگی بھر تمہیں اس پیار کا پتا نہیں چلنے دے گا۔ کبھی کوئی درخواست، کوئی التجا اپنی زبان پر نہیں لائے گا لیکن میں اس کے دل کا حال اچھی طرح جانتا ہوں۔ سمجھو کہ وہ انسانوں کے ایک خاموش قبیلہ کا فرد ہے۔ اس قبیلے کے لوگ اپنی محبتوں کو اپنے سینوں میں دفن رکھتے ہیں..... ساری زندگی خاموشی کی آگ میں جلنے رہتے ہیں اور اکثر راگھ ہو جاتے ہیں۔“

کچھ باتیں کرشل کی سمجھ میں آئیں، کچھ نہیں آئیں لیکن عادل کا مدعا وہ سمجھ گئی تھی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں گہری سوچ نظر آنے لگی تھی۔ عادل التجا آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے بھاری لمحے تھے۔ عادل کو کچھ، شاید اسے کرشل کو قائل کرنے کے لیے ابھی طویل کوشش کرنا پڑے گی۔ دلیلوں اور وضاحتوں کا سہارا لینا

پڑے گا لیکن جو کچھ ہوا، وہ بالکل اچانک تھا۔ جیسے ایک پہلے سے لگا ہوا بھل، نیم سحری کے ہلکے سے جھونکے سے جھوٹی میں آگرتا ہے۔

کرشل نے عادل کا ہاتھ تھاما۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں نمی چمکی..... اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شاید وہ پہلے سے سب کچھ جانتی تھی۔

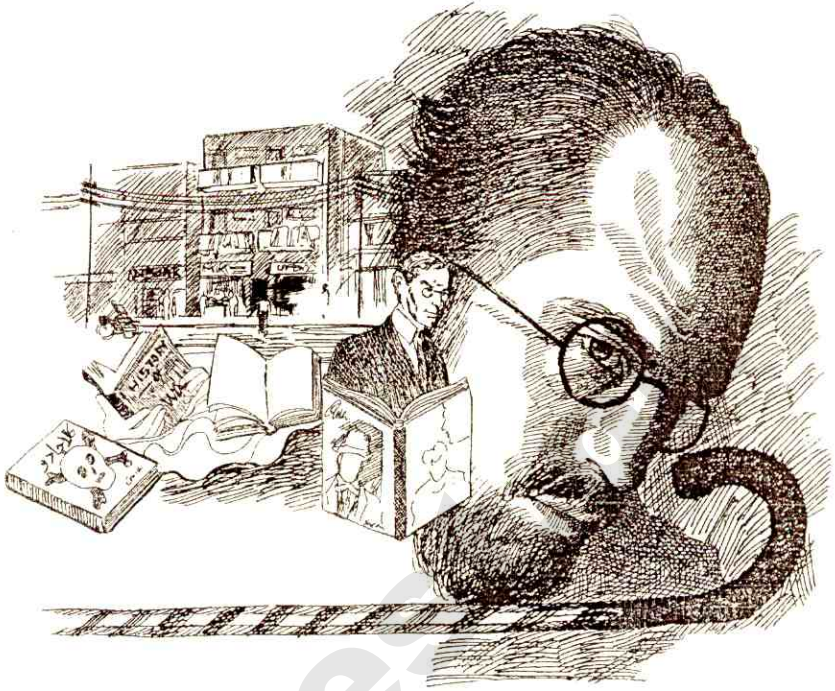
”ٹھیک ہے عاڈل!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لیکن اس کے لیے ہام کی بھی ایک کنڈیشن ہے۔“
”بتاؤ کرشل!“ اس نے بے تابی سے کہا۔

”تو م اور شہزادی کا شادی پہلے ہوگی گا۔ اسی دسمبر میں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

عادل نے اثبات میں سر ہلانے میں دیر نہیں کی تھی۔ ہوا کے ایک سرد جھونکے سے کمرے کی کھڑکی کھل گئی۔ رات کی رانی کی مدھر خوشبو سرسرد کے گھر کے باغیچوں سے اٹھ کر آئی اور کمرے میں بھر گئی۔ یہ پورے چاند کی، سردرات کا آخری پہر تھا۔ عادل اور کرشل نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ تیس چالیس قدم کے فاصلے پر سرسرد کے گھر کا وسیع و عریض احاطہ نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں نے خاموش طبع ہمایوں کو دیکھا۔ اس نے اتنی ٹھنڈ میں بھی معمولی سی پتلون قمیض پہن رکھی تھی۔ اس نے کسی دیہاتی محنت کش کی طرح قمیض کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور ایک ٹیکن کے ذریعے اس چھوٹے سے ٹریکٹر میں ڈیزل ڈال رہا تھا جو پچھلے مئی ماہ سے بند پڑا تھا۔ ڈیزل ڈالنے کے بعد اس نے ٹریکٹر کی جھاڑ پونچھ کی اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ تھوڑی سی کوشش سے انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ ہیڈ لائٹس میں ایک کھیت روشن ہو گیا۔ اس کھیت میں گھاس اگ آئی تھی اور یہ کچھ ویران دکھائی دینے لگا تھا۔ ہمایوں یقیناً اس کھیت کو پھر سے آباد کرنا چاہ رہا تھا، ایک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ۔

ابھی بہت اندھیرا تھا..... ابھی بہت سردی تھی۔ ابھی تو بستر میں گھسے رہنے کو ہی دل چاہتا تھا لیکن ”دل کی چاہت“ ہی کو تو سرسرد نے ختم کرنا سکھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ دنیا کی عظیم کامیابیاں نفس کی چاہت کے پیچھے چھپی ہوتی ہیں۔ نفس کی چاہت کو ریزہ ریزہ کر دو..... کامیابیاں سامنے نظر آئیں گی۔

ہمایوں نے ٹریکٹر آگے بڑھایا اور کھیت میں داخل ہو گیا۔
(ختم شد)



کرائے دار

تئویر ریاض

یہ دنیا بھی کس قدر ازداد کا مجموعہ ہے... کبھی کبھی اچھائی کے ساتھ برائی یوں ہم قدم ہوتی ہے جیسے دونوں میں کوئی بیر نہ ہو... کمال ہے انسان جس قدر ایمانداری سے بدی کی طرف راغب ہوتا ہے اگر نیکی بھی اتنی ہی ایمانداری سے کرے تو کم از کم انسان ہونے کا حق ہی ادا ہو جائے... وہ بھی ایک ایسا ہی کرائے دار تھا جسے اس کمے کو استعمال کرنے کا کرایہ ادا کرنا تھا۔

جرائم کی دنیا میں ایک مجرم کے منصفانہ رویے کا اظہار

خاطر تواضع کیسے کی جاسکتی ہے اور مہمان بھی وہ جو بن بلایا اور اجنبی ہو۔ میں اس روز لان میں بیٹھی اپنے انگوٹھے سے خون بہتا ہوا دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر خون نہ رکا تو مجھے اندر جا کر اس پر پٹی لپیٹنا ہوگی۔ دراصل غلطی میری ہی

پرانے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ مہمان باعثِ رحمت ہوتے ہیں لیکن اب قدریں بدل گئی ہیں اور اس کے ساتھ ہی پرانے محاورے اور کہاوتیں بھی بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ آج کے دور میں اپنا ہی گزارہ مشکل ہے پھر مہمان کی

تھی۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ لان کے گرد لگی ہوئی گاڑھ پرانی ہو چکی ہے اور اس پر رنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ گاڑھ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کا ایک پول گر گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اسے اپنی جگہ دوبارہ کھڑا کرنے میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگیں گے لیکن یہ کام ایک گھنٹے میں ختم ہوا۔ اس کوشش میں میرا انگوٹھا زخمی ہو گیا اور کندھے بھی دکھنے لگے تھے۔ میں اسی لیے لان میں کرسی پر بیٹھی سستا رہی تھی اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ گھر کے اندر جا کر خون کو روکنے کے لیے پٹی باندھ سکوں۔

”تم ٹھیک تو ہو سوسی؟“ عقب سے ماما کی آواز سنائی دی جو مجھے اس طرح پیشاد کچہ کر کچہ فکر مند ہی ہو گئی تھیں۔ ”ہاں ٹھیک ہوں۔“ میں نے چڑ کر کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوا، دراصل مجھے اس نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ جب کوئی مجھے سوسی کہہ کر بلاتا تو یوں لگتا جیسے میں ابھی تک سات سال کی بچی ہوں حالانکہ میں بالغ ہو گئی تھی اور کالج میں پڑھ رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہمیشہ کی پہلی پولیس چیف بن جاؤں گی۔

میں ایک بار پھر اپنے انگوٹھے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے ابھی بھی خون رس رہا تھا۔ ماما گھر کے باہر چھوٹے سے پورچ میں بائیں ٹانگ ایک موندھے پر کھڑے ہوئے بیٹھی تھیں جس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ دو ہفتے قبل میڈیاں اترتے ہوئے ان کا پاؤں ایک گڑھے میں چلا گیا تھا اور ان کی بائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے ان کی دیکھ بھال کے لیے کالج چھوڑ کر گھر آ پڑا اور میرا ایک سمسٹر ضائع ہو گیا۔ گھر آ کر معلوم ہوا کہ ہمارے مالی حالات انتہائی خستہ ہو چکے ہیں اور ٹیلی فون ٹرائی کے نچلے خانے میں غیر ادا شدہ بلوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

دراصل ڈیڈی اور ماما نے جوانی میں ہی شادی کر لی تھی اور ساری زندگی سیاسی سرگرمیوں میں گزار دی، چنانچہ انہیں کبھی اچھا کھانا اور اچھا پہننا نصیب نہ ہوا۔ میری پیدائش کے بعد ڈیڈی بہتر مستقبل کی تلاش میں مغرب کی جانب چلے گئے اور اس کے بعد ہم نے ان کی شکل نہیں دیکھی۔ ماما نے ہی میری پرورش کی اور شروع سے ہی مجھے احکامات اور نظم و ضبط کا پابند بنادیا، لہذا میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ تعلیم مکمل کرنے کے پولیس کی ملازمت اختیار کر لوں گی۔

زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی کہ ماما کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے حالات کا رخ یکسر بدل دیا۔ گھر آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ماما نے بلوں کی ادائیگی کرنے کے

بجائے اپنی ساری آمدنی قلمی ادارے کو عطیہ کر دی تھی جہاں سے انہیں تعریف و توصیف کے چند جملوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہ سب کچھ جان کر میں بہت بیچنی چلائی جس پر بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا۔ میں نے جیسے تیسے کر کے بلوں کی ادائیگی کا انتظام کیا جس کے نتیجے میں میری ساری بچت ختم ہو گئی اور مجھے لگا کہ دوبارہ تعلیم شروع کرنے کے لیے ایک سمسٹر کے بجائے سال یا دو سال انتظار کرنا پڑے گا۔ بلوں کی ادائیگی کے علاوہ مجھے مبینہ کاراٹھن اور گھر کی قسطیں بھی ادا کرنا ہوتی تھیں چنانچہ عارضی طور پر میں نے ایک ملازمت اختیار کر لی۔

اُس روز لان میں بیٹھے بیٹھے قرب و جوار پر نگاہ دوڑائی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں ایک جیسے مکانات بنے ہوئے تھے اور ہمارے گھر کے سامنے اینٹوں سے بنی ایک پرانی عمارت تھی جس میں ایک فارمیسی اور اس کے ایک جانب چھوٹا سا پارکنگ لاٹ بنا ہوا تھا۔ جب میں چھوٹی تھی تو اپنے جیب خرچ سے ٹافیاں اور آئس کریم خرید کرتی تھی۔ فارمیسی اب بھی موجود تھی لیکن اس کا نام مختلف اوقات میں بدلتا رہا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے انگوٹھے کی طرف دیکھا۔ خون رک چکا تھا لہذا میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ عین اسی وقت وہ بوڑھا شخص سائڈ لین پر چلتا ہوا میری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی عمر ستر برس کے قریب ہوئی۔ اس نے پینٹ شرٹ اور جینکٹ پہن رکھی تھی جبکہ جوتے گرد آلود تھے۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ایک بوسیدہ سا سوٹ کس پکڑا ہوا تھا۔

وہ میرے سامنے آ کر رک گیا۔ اس نے پہلے مجھے دیکھا پھر ماما اور گھر پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”گو یا یہ اب بھی اپنی جگہ موجود ہے۔“

مجھے انجی لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں۔ خواہ ان کی کتنی بھی عمر کیوں نہ ہو چنانچہ میں کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”معاف کرنا، میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

وہ میری طرف مڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سوری، میرا نام رونی بیک ہے۔ میرا بچپن اسی گھر میں گزرا ہے۔ یہ اب بھی ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ البتہ اس وقت یہاں دوسری گاڑھ لگی ہوئی تھی۔“

”واقعی؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، پہلے یہاں ایک اونچی لکڑی کی گاڑھ ہوا کرتی تھی لیکن وہ میری ماں کو پسند نہیں تھی اور وہ ڈیڈی سے اکثر کہا

”ڈیڈی اور آپ نے جس سے یہ مکان خریدا تھا، کیا یہ وہی شخص ہے؟“

”نہیں۔ وہ ایک عورت تھی، مسز جینی ونٹرز۔ میرا خیال ہے کہ تم اسے جانتی ہو۔“ ممانے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ مسز ونٹرز نے اس شخص سے یہ مکان خریدا ہوگا؟“

”سوی!“ ممانے کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے انگوٹھے پر ڈالی اور کہا۔ ”مما!

میں اور آپ اس شخص کو نہیں جانتے۔ اس وقت گھر میں ہم دو عورتیں ہیں جبکہ آپ کی ٹانگ بھی ٹوٹی ہوئی ہے پھر میں ایک اجنبی شخص کو گھر میں کس طرح آنے دیتی؟ اگر وہ اپنے سوٹ کیس سے ریو اور یا چاقو نکال لیتا تو.....“

ممانے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”مجھ میں اور تم میں یہی ایک فرق ہے۔ تم ہمیشہ لوگوں میں برائی تلاش کرتی ہو۔“

”اور آپ ہر شخص کو اچھا سمجھتی ہیں چاہے وہ حقیقت میں ایسا نہ ہو۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مما کو کھانا کھلانے اور بستر میں لٹانے کے بعد میں اپنی ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ کسی زمانے میں کالج کے طالب علموں کو اپنی پڑھائی اور امتحان میں اچھے نمبر لانے کے علاوہ کوئی فکر نہیں ہوتی تھی لیکن اب یہ بھولی بھری کہانیاں لگتی ہیں۔ اب انہیں ایک سیکسٹر مکمل کرنے کے بعد دوسرے سیکسٹر میں داخلہ لینے کی پریشانی لگی رہتی ہے اور اس کے لیے وہ وظیفہ یا بینک سے قرض لینے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ لہذا مجھے بھی ماما کی دیکھ بھال کرنے اور گھر کے اخراجات کے لیے ملازمت کی ضرورت پیش آئی اور میں گرافٹن کاؤنٹی گارڈسرومز میں سیکورٹی آفیسر بھرتی ہو گئی۔ میری ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی۔ اس طرح مجھے دن میں ماما کو بھلانے دھلانے، کھانا کھلانے اور گھر کے دیگر کام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

میں نے ڈیوٹی پر جانے کے لیے وردی پہنی جو نیلی قمیص اور سیاہ پتلون پر مشتمل تھی۔ کمر میں نائن ایم ایم ایم کا سی آؤٹوٹیک پستول لگایا جو میں نے خود اپنی خواہش اور دلچسپی کے پیش نظر اپنی آئیسوس سالگرہ پر خریدا تھا اور کمپنی نے ڈیوٹی کے دوران یہ ریو اور ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب میں اپنے ہاتھ میں رات کا کھانا اور پانی کی بوتل لیے کار کی طرف بڑھی لیکن سڑک کے

کرتی تھی کہ اس باڑھ کی وجہ سے ہمارا پورج بالکل چھپ گیا ہے لیکن ڈیڈی کا کہنا تھا کہ اس اونچی باڑھ کی وجہ سے ہم سڑک کے شور سے محفوظ رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں سے گئے ہوئے چالیس برس تو ہو گئے ہوں گے۔“

میں اس سے معذرت کر کے گھر کے اندر جانے ہی والی تھی کہ میری ماں اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بول پڑی۔ ”واقعی تم یہاں رہا کرتے تھے؟ مجھے تو یہ سن کر بہت اچھا لگا۔“

میں نے ماما کو گھورا لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بوڑھا آدمی تھوڑا سا جھکا اور بولا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں لیکن اس بات کو بہت عرصہ ہو گیا۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی مداخلت کرتی، ماما بول پڑیں۔ ”کیا تم اندر سے یہ مکان دیکھنا چاہو گے؟“

”اوہ! یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔“ اس نے سوٹ کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

میرے لیے اس سے زیادہ برداشت کرنا ممکن نہ تھا چنانچہ میں بول پڑی۔ ”سوری! یہ ممکن نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد کوئی ملنے کے لیے آنے والا ہے۔ اس لیے ہم تمہارے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

میری ماں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں تمہاری دلچسپی کی قدر کرتی ہوں لیکن فی الحال وقت کی کمی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔“

رونی نے کہا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں، تکلیف دینے کے لیے معذرت چاہوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ مڑا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی پر ہولیا۔ میں نے اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ محسوس کی۔

اس کے جانے کے بعد ماما ناراض ہوتے ہوئے بولیں۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ تم اس کے ساتھ اتنی سختی سے کیوں پیش آئیں۔ دیکھنے میں وہ ایک اچھا آدمی لگ رہا تھا۔ تم نے اسے اتنا حقیر کیوں سمجھا؟“

”میں نے اسے حقیر نہیں سمجھا بلکہ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔“

”نہیں، میرا خیال ہے کہ تم نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ اس نے صرف یہی کہا تھا کہ وہ اپنا پرانا گھر دیکھنا چاہتا ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ ایک شریف بوڑھا آدمی تھا؟ کیا آپ اس سے پہلے مل چکی ہیں؟“

”نہیں لیکن.....“

پار نظر پڑی تو میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہی بوڑھا شخص روٹی بیک ایک لیپ پوسٹ کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں وہی سوٹ کیس تھا اور وہ مسلسل مجھے اور ہمارے مکان کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں آئی۔ میں نے پانی کی بوتل اور کھانے کا ڈبا کار میں رکھا اور سڑک پار کرنے کے لیے ٹرک کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی جو اچانک ہی وہاں آگیا تھا لیکن جب میں سڑک پار کر کے وہاں پہنچی تو وہ بوڑھا غائب ہو چکا تھا۔ میں نے ایک دو منٹ رک کر پارکنگ لاٹ کا جائزہ لیا اور دوبارہ اپنے گھر کی طرف چل دی تاکہ ایک بار پھر ملری کر لوں کہ سارے دروازے بند ہیں یا نہیں۔

☆☆☆

میری ڈیوٹی ایک بڑے سے پارکنگ لاٹ میں تھی جہاں کسی مقامی کمپنی کے درجنوں ٹرک اور ٹریلر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے احاطے کا ایک چکر لگا لیا اور کچھ جگہوں پر رک کر وہاں لگے ہوئے تالوں کو چیک کیا۔ میرے بارے میں کبھی جانتے تھے کہ میں ڈیوٹی کے دوران کبھی میں نہیں سوئی بلکہ مستقل گشت کرتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی دفتر چلی جاتی، جہاں ٹیلی ویژن اسکرین پر کیمروں کی مدد سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ وہیں بیٹھ کر میں نصف شب کھانا کھاتی جو عموماً ایک سینڈویچ پر مشتمل ہوتا تھا۔ بقیہ وقت میں کتاب پڑھنے یا کوئی معاملہ کرنے میں گزار دیتی تاکہ نیند کے جھوٹے مجھے پریشان نہ کریں۔

اس ملازمت میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ مجھے وہاں تنہا رہنا ہوتا تھا۔ اس طرح سارا وقت سوچنے میں گزار دیتی۔ اس رات بھی میں روٹی بیک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ رات کے وقت پارکنگ لاٹ میں کھڑا کیا کر رہا تھا؟ پہلی بار اس کا آنا مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا لیکن دوسری بار اسے دیکھ کر مجھے کچھ شک ہوا۔ میں ڈر رہی تھی کہ تیسری بار وہ گھر میں ہی نہ چلا جائے۔ مجھے اس وقت ڈیوٹی پر آنا اچھا نہیں لگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری یاں ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ گھر میں آتی تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ چھپنی کرنے کی صورت میں ایک دن کی تنخواہ کٹ جاتی اور میں اس کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اگلے ہفتے مجھے مکان کی قسط ادا کرنا تھی۔ گوکہ میں گھر کے تمام دروازے چیک کر کے آتی تھی، اس کے باوجود دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

دوبچے کے قریب مارک ہوگن مجھ سے ملنے کے لیے

☆☆☆

”اور اگر اس کا نام مالکوں کی فہرست میں نہ ہوا تو.....“

بہ نفس نفیس

ایک اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون سے پوچھا۔

”محترمہ اس سے پہلے بھی آپ نے کچھ لکھا۔“
 ”کیوں نہیں جناب۔ میں اپنی آپ بیتی لکھ چکی ہوں۔ یہ آپ بیتی میں نے ایک مشہور رسالے والوں کو بھیجی تھی۔“ خاتون نے جواب دیا۔
 ”میرے خیال میں انہوں نے واپس کر دی ہوگی۔“

”جی نہیں۔ ایڈیٹر صاحب بہ نفس نفیس ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے مجھ سے ملنے آگئے تھے۔“
 مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

میں انہیں کہنے ہی والی تھی کہ وہ اوپر جا کر وہ کمرہ کچھ سکتے ہیں جسے یہ اپنے بیڈروم کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔“
 میں روٹی بیک اور پورچ کے درمیان راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”اس سے پہلے کہ ہم انہیں اندر جانے دیں، کیا مسٹر بیک یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس سن میں یہاں رہا کرتے تھے؟“

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر بولا۔ ”یہ انیس سو انہتر اور ستر کی بات ہے جب میں یہاں رہائش پذیر تھا۔“
 ”تھیں تھیں ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟“ یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولی۔ ”رجسٹرار کے ریکارڈ کے مطابق اس وقت اس مکان کا مالک جاسن خاندان تھا۔ اس سے پہلے مسٹر کلیان اس مکان کے مالک تھے۔ یہ مکان بھی میری بیک فیملی کی ملکیت نہیں رہا، بھی نہیں۔“

اس پر مجھے میری ماں کچھ نہیں بولی لیکن بیک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، اس وقت جاسن اس مکان کا مالک تھا اور میں نے اس سے اوپر کا ایک کمرہ کرائے پر لیا تھا۔ میں اس زمانے میں ٹرنز میں کام کیا کرتا تھا پھر وہ مل بند ہو گئی، یہی سچ ہے۔“

میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور بولی۔ ”مجھے افسوس ہے مسٹر بیک! میں تمہاری بات پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

اس نے اپنا سوٹ گیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور بولا۔ ”تم نوجوان نسل کے لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تم سب کچھ جانتے ہو کیونکہ تمہیں جدید ترین کمپیوٹر، انٹرنیٹ

”پھر تم مجھے فون کر دینا۔ میں فوری طور پر اس کے ماضی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ یہ جان سکوں کہ کبھی روٹی بیک نامی شخص اس قصبے میں رہتا تھا یا نہیں۔“

میں نے اس پر ایک مسکراہٹ نکھاوری اور بولی۔
 ”شکریہ، مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“
 اس نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ مت سمجھنا کہ میں یہ سب کچھ تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور صرف مسکرا کر رہ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن سہ پہر کے وقت میں رجسٹرار آفس چلی گئی۔ ماما کے پاس ان کی دو پرانی سہیلیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے لیے کھانے اور چائے کا انتظام کر دیا اور یہ بھی گزارش کی کہ میرے واپس آنے تک وہ ماما سے نہیں لڑائیں۔ ان عورتوں کے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے وہ بخوشی تیار ہو گئیں۔ رجسٹرار آفس کنکریٹ اور اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت میں واقع تھا جس میں کئی کھڑکیاں اور بڑے بڑے پال تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا مطلوبہ دفتر تنخانے میں واقع ہے۔ وہ جگہ الماریوں سے بھری ہوئی تھی اور وہاں میری ماما کی عمر ایک قبول صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ جب میں نے اس سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ مجھے ایک الماری تک لگئی اور اس میں سے ایک فائل نکال کر مجھے تھماتے ہوئے بولی۔

”تم اس میز پر بیٹھ کر اس کا مطالعہ کر سکتی ہو۔“
 میں نے فائل کے صفحات پلٹنا شروع کیے۔ سب سے اوپر میری ماما اور بیٹی کے نام کی رجسٹری لگی تھی۔ اس سے پہلے جینی ونز کا نام تھا۔ میں صفحات پلٹتی گئی اور میں نے گزشتہ چالیس سال کا ریکارڈ دیکھ ڈالا لیکن وہاں بیک کے نام کا کوئی کاغذ نہیں تھا لہذا میں نے مارک کو فون کیا اور گھر چلی آئی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو میں نے روٹی بیک کو اپنی ماں اور اس کی دو سہیلیوں سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے کار سے باہر آتا دیکھ کر وہ دونوں عورتیں اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔ میں مسٹر بیک کی طرف بڑھی تاکہ اس سے معلوم کر سکوں کہ وہ حقیقت میں کون ہے اور یہاں کس مقصد سے آ رہا ہے۔ میری ماں پورچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”سو! دیکھو مسٹر بیک ہمارے مہمان ہیں۔“

اور سیل فون کی سہولت حاصل ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تم اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

رات کو جب میری ماں بستر پر لیٹی تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”سوس! میں نہیں جانتی کہ وہ شخص یہاں کیوں آتا ہے لیکن مجھے اس کی ایک بات سے اتفاق ہے۔“

”وہ کیا تھا؟“

”یہی کہ تم نو جوان لوگ بہت سی باتوں پر توجہ نہیں دیتے۔“ ماما نے کہا۔ ”موجودہ دور کی سہولتوں کے سبب دنیا بھر کی معلومات تمہاری انگلیوں پر ہیں۔ تم منٹوں میں لندن کے موسم کا حال بتا سکتے ہو اور یہ بھی معلوم کر سکتے ہو کہ 1951ء میں ورلڈ سیریز کس نے جیتی تھی۔ تم چین، جاپان اور آسٹریلیا میں کسی کو بھی ای میل کے ذریعے پیغام بھیج سکتے ہو اور منٹوں میں اس کا جواب وصول کر سکتے ہو لیکن حقیقی زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر تمہاری نظر نہیں جاتی۔“

میں ڈیوٹی پر جانے سے پہلے تمام انتظامات کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ میں نے ماما کے سر ہانے رکھی ہوئی میز نو ان کے بستر سے قریب کر دیا تاکہ ان کا ہاتھ بآسانی پانی کے جگ اور گلاس تک پہنچ سکے۔ ماما نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”لیکن تمہیں اپنے پڑوسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ تم اس کا نام بھی نہیں جانتے اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں کام کرتا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ تمہیں اس شہر اور اس مکان کی تاریخ کبھی نہیں معلوم۔“

میں نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ”ماما! میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ مکان کی قسط ادا کرنے میں ایک ہفتے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے اور اگر میں آج رات باطل یا پرسوں کام پر نہیں گئی تو مکان کی قسط ادا نہیں ہو سکے گی اور آپ کا نام نادہندگان کی فہرست میں آجائے گا۔“

انہوں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کاش تم مجھے اس کے لیے مورد الزام نہ ٹھہراتیں۔“

”میں آپ کو الزام نہیں دے رہی، صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب چلتی ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی۔“

☆☆☆

اس رات میرے لیے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ میں نے احاطے کے کئی چکر لگائے۔ انتظار کی کیفیت میں مجھ سے کچھ کھا یا بھی نہیں گیا۔ خدا خدا کر کے دو بجے تو میں مرکزی گیٹ کی طرف بھاگی لیکن وہاں پولیس کی کوئی گاڑی نہیں تھی اور نہ ہی مارک ہوگن کہیں نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ صبح ہونے سے پہلے مجھے اپنی فون کال کا جواب نہیں مل سکتا۔

میں نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر انتظار کیا اور پوچھل قدموں سے دفتر میں آگئی۔ کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد میں نے پولیس ہیڈ آفس فون کر کے مارک ہوگن کے بارے میں پوچھا۔

ڈیپچر نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”روٹ پچیس پر کار کا ایک بڑا حادثہ ہوا ہے۔ وہ رات بھر وہیں مصروف رہے گا۔“

☆☆☆

شفٹ ختم ہونے کے بعد میں سیدھی ٹرنز پولیس اسٹیشن چلی گئی اور یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ مارک کی پک اپ پارکنگ لائٹ میں موجود تھی۔ میں پولیس اسٹیشن کے اندر چلی گئی اور دومنٹ بعد ہی مجھے مارک اپنے دفتر میں مل گیا۔ وہ اس وقت بھی کمپیوٹر پر بیٹھا کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

”مجھے آفس ہے کہ تمہارے پاس نہ آسکا۔ پوری رات خوار ہوتا رہا ہوں۔“

”اور میں بھی رات بھر یہ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ تمہارے پاس مجھ سے بات کرنے کے لیے ایک دومنٹ بھی نہیں تھے۔“

”تم نہیں جانتیں کہ وہ کتنا خوفناک حادثہ تھا جس میں ٹرنز ہائی اسکول کی ذہین ترین طالبہ اپنی جان سے چلی گئی۔ جائے حادثہ کے نقشے بنانا، وہاں کی تصویریں لینا اور سب سے بڑھ کر لڑکی کے والدین کو اس حادثے کی اطلاع دینا میرے لیے بہت ہی تکلیف دہ تھا۔“

میں اپنے ہونٹ چباتے اور دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے، جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھے فون کر لینا۔“

”ایک منٹ۔“ وہ اپنی میز سے کچھ کاغذات اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”رونی بیک، عمر انہتر سال..... وہ چارلس ٹاؤن میا چونس کا رہنے والا ہے اور سانجھ کی دہائی کے آخر میں ٹرنز آ گیا تھا۔ اس نے تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ وہ تمہارے مکان میں ایک سال تک رہتا رہا تھا۔“

گھر گھر کی ضرورت

گیس نیل

گیس نیل جیسے ہیتمند درخت محسوس کیجیے

بدقسمتی کے باعث معدے کا بھاری پین طبیعت میں آگاہت پیدا کر دیتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ پر منوں
بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ گیس نل کے چپٹے پئے ڈالکتے سے محسوس ہوں اور اس بھاری پین سے نجات حاصل کریں۔



Marhaba Laboratories

UAN: 111-152-152

www.marhaba.com.pk

”کہتے رہو۔“ میں غصے سے بولی۔ ”اس کا کہنا ہے کہ وہ مرزلو میں کام کرتا تھا۔“

مارک نے کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ”نہیں۔ وہ ایک تعمیراتی کمپنی میں مزدور اور مستری کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔“

میں نے اپنی نیند سے جھل آنکھیں ملنے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ مارک۔“

میں جانے کے لیے مڑی تھی مگر وہ بولا۔ ”رکو، ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔“

”اب مزید کہنے کے لیے کیا باقی رہ گیا ہے؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا تم جانتی ہو کہ یہاں سے جانے کے بعد مسٹر بیک کہاں رہتے رہے؟“

”اس بارے میں اس نے کچھ نہیں بتایا۔“

”وہ وارنر سے آیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ ریاست کا مہمان تھا اور اسے اصلاح خانے میں رکھا گیا تھا۔“

”کیا وہ کوئی مجرم ہے؟“

”ہاں۔“

”اور وہ کس جرم کے تحت اندر ہوا تھا؟“ اور جب مارک نے مجھے اس کے جرم کی نوعیت بتائی تو میرے رو گنگنے کھڑے ہو گئے اور میں فوراً ہی وہاں سے چل دی۔

☆☆☆

میں نے گھر پہنچ کر دیکھا کہ ماما پورچ میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ جب میں قریب پہنچی تو دیکھا کہ اس دن کی ڈاک ان کے زانو پر رکھی ہوئی تھی۔

”سو! اس سے پہلے کہ تم ڈاک دیکھنا شروع کرو، میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ مسٹر بیک آئے تھے اور.....“

میں نے وہ ساری ڈاک اٹھائی اور بلوں کو دیکھنے لگی۔

ان میں دو بلوں پر سرخ حاشیہ بنا ہوا تھا۔

”ماما! یہ فون اور بجلی چینی کے خط ہیں اور ان میں لکھا ہے کہ ہم نے گزشتہ ماہ کے بل ادا نہیں کیے تھے۔ اس لیے وہ ایک ہفتے بعد بجلی اور فون کا کنکشن منقطع کر دیں گے۔“

”وہ صرف دھمکی دے رہے ہیں۔ اگر تم انہیں فون کرو تو مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے۔“

”لیکن آپ نے تو ان بلوں کی ادائیگی کا وعدہ کیا تھا پھر کیا ہوا؟“

”اس سے بھی زیادہ ضروری کام نکل آیا تھا۔“ وہ آہستہ سے بولیں۔ ”اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتی۔“

میں نے وہ بل ان کے سامنے لہرائے اور بولی۔ ”میں اگلے ہفتے مکان کی قسط اور یہ بل ایک ساتھ نہیں دے سکتی۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں؟“

جیسے ہی میری نظر فرش پر پڑے قدموں کے نشان پر گئی، میں نے چلنا بند کر دیا۔ وہ ماما کے نہیں بلکہ کسی مرد کے جوتوں کے نشان تھے۔ میں نے کہا۔ ”ماما! آپ کہہ رہی تھیں کہ مسٹر بیک آئے تھے۔ وہ کہاں ہیں؟“

”ماما نے موضوع تبدیل ہونے پر سکون کا سانس لیا اور بولیں۔ ”وہ ایک گھنٹا پہلے جا چکا ہے۔ ہم نے خوب باتیں کیں بلکہ اس نے تو اپنے اور میرے لیے چائے بھی بنائی۔“

”کیا وہ ادا پر بھی گئے تھے، اپنے پرانے کمرے میں؟“

”ہاں، کیوں نہیں؟“ ماما نے کہا۔ ”اور وہ جاتے وقت بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ بھلا میں اسے کیسے منع کر سکتی تھی۔“

میں نے وہ دونوں بل ان کی گود میں پھینکے اور بولی۔ ”اپنی زبان بند کر لیں۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“ یہ کہہ کر میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

☆☆☆

میرے پرانے کمرے کی حالت خاصی ابتر نظر آ رہی تھی۔ بستر اور میز کو گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا گیا تھا اور دیوار میں ایک سوراخ نظر آ رہا تھا۔ میں نے جبکہ کر اندر کی طرف جھانکا۔ وہ خاصا بڑا سوراخ تھا جسے کسی چیز کو چھپانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ بیک اسی کمرے میں رہا کرتا تھا اور میرے ذہن میں وہ الزامات گھومنے لگے جن کی وجہ سے وہ سرکاری مہمان خانے میں رہ کر آیا تھا۔ میں گھمنوں کے بل اٹھی اور ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ میرے بستر پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ وہ سو ڈالر کے نوٹوں کے پانچ پیکٹ تھے۔

ان کے ساتھ ہی ایک کاغذ بھی رکھا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔ ”گزشتہ چالیس سالوں تک تمہارا کمرہ میرے استعمال میں رہا۔ اس کے لیے شکریہ۔ امید ہے کہ اس رقم سے میرا حساب صاف ہو جائے گا۔ روٹی بیک۔“

میں نے وہ ہنڈل اٹھالیے۔ ان پر 1960ء کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ ان پر لگا ہوا اینڈ وھنڈا لگا تھا لیکن پڑھا جا سکتا تھا۔ ”ٹرنز سیونگس اینڈ لون۔“

میں سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئی اور ماں کے

سرگزشت

ماہنامہ

مقتول آزادی

اسلامی ممالک کے صدور میں سے ایک
مقتول صدر کی دلچسپ روداد زندگی

کم سن جنگجو

مغربی ممالک نے ہی بچوں کو میدان جنگ
میں استعمال کرنے کی شروعات کیس

تباہ کن

نفسے سے ذرے کا تذکرہ جو ایک پل میں
لاکھوں لوگوں کی جان لے سکتا ہے

تلاش

ایک انوکھے مگر انتہائی دلچسپ سفر کی روداد

احسان

طوائف کو لوگ برداشت کرنے پر تیار
نہیں بھلے ہی وہ شریفانہ زندگی گزارے

الکاحی عوالم

معرکتہ الآرا، لہو گرم کر دینے والی طویل سرگزشت
سرب، فلم اور ادب کی دنیا سے کئی انہی داستانیں
”فلمی لف لیڈ“ دلچسپ سفر کہانی ”الوداع“ اور
بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانیات، سچے قصے، سبق
آموز واقعات جسے آپ ضرور پڑھنا چاہیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر پرچہ شخص کرالیں

پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ میری نظریں سڑک کے پار والی گرین
فارمیسی پر جمی ہوئی تھیں۔

”مما!“ میں نے کہا۔ ”کیا کبھی یہاں بینک بھی ہوا
کرتا تھا؟“

”ہاں لیکن وہ سڑکی دہائی کے شروع میں ہی بند ہو گیا تھا۔“

”اوہ۔“ میں سمجھی۔ ”میں نے اپنے بازو سینے پر
باندھتے ہوئے کہا اور ماضی کے دنوں کا تصور کرنے لگی۔
روٹی بیک اس زمانے میں نوجوان اور صحت مند ہوا کرتا تھا۔

بظاہر وہ سڑکی کا کام کرتا اور میرے پرانے بیڈروم میں رہا

کرتا تھا لیکن اس کا اصل پیشہ بینک اور کاریں لوٹنا تھا۔ ایک

دن وہ سڑک کے پار واقع بینک میں گیا جہاں اب فارمیسی

ہے اور بینک لوٹ گرم اپنے کمرے میں چھپا دی۔ اسے

انتظار تھا کہ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو وہ یہ رقم یہاں سے نکال

لے گا۔ بد قسمتی سے وہ کسی دوسرے جرم میں پکڑا گیا اور

اسے ریاست مینی کی جیل میں ایک طویل عرصہ قید کا ٹکڑا پڑی

اور جب وہ رہا ہو کر واپس آیا تو میں اور ماما اس کے راستے کی

رکاوٹ بن گئے۔

”سوسی!“ ماما کی آواز سن کر میں اپنے خیالوں سے

باہر آگئی اور بولی۔

”جی ماما!“

”بلوں کا کیا ہوگا؟“

میں نے اچانک ہی ان کا ہاتھ تھام لیا۔ میں جانتی تھی

کہ ایک قانون پسند شہری ہونے کی حیثیت سے مجھے کیا کرتا

چاہیے۔ میں ایف بی آئی سے رابطہ کرتی یا بارک ہوگن کو

اطلاع دیتی لیکن کس لیے، جس بینک سے وہ رقم لوٹی تھی،

اب اس کا کوئی وجود نہیں تھا اور اب اس رقم کا کوئی دعوے

دار نہیں تھا۔

”مما!“ میں نے کہا۔ ”آپ بلوں کی ادائیگی کی فکر

نہ کریں۔ میں ایک بات اور بھی کہنا چاہ رہی تھی۔“

”وہ کیا؟“

میں ان کا ہاتھ جھینپتے ہوئے بولی۔ ”مجھے لوگوں کے

اندر چھپی ہوئی اچھائی پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔“ یہ کہہ کر میں

نے ان کا ہاتھ آہستہ سے چھوڑ دیا۔ اب میرے ذہن پر کوئی

بوجھ نہیں تھا۔

روٹی بیک اپنی چھپائی ہوئی دولت بریف کیس میں

سیٹ کر چلا گیا لیکن جانے سے پہلے چالیس سال کا کرایہ

ادا کر گیا تھا۔

سرزا امجد بیگ

آخری کیل

اللہ نے شریکِ حیات کو لباس فرمایا ہے مگر آج کچھ انسان... اسی لباس کو جلدی جلدی بدلنے کی طرف مائل ہیں بنا یہ سوچے کہ لباسوں کا یوں بدلنا زندگی کا کتنا مہنگا سودا ہوتا ہے۔ بہر حال اسے بھی یہ مہنگے سودے کرنے کی اتنی عادت تھی کہ ایک دن زندگی ہی سستی پڑ گئی... اور وہ سارے مہنگے سودے بھی بے قیمت ہو گئے جن کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اس نے تمام احساسات کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا... مگر انہی احساسات کا تعاقب کرتے کرتے مرزا امجد بیگ نے کم شدہ زندگی کا سرا تلاش کر لیا کہ یہی تو ان کا ہنر تھا جس کے بل پر وہ حقدار کو حق دلاتے آرہے تھے۔

ٹوٹے پھوٹے حصوں کو جوڑ کر آخری کیل ٹھونکنے

والے ایک وکیل کی جرح

مطابق وہ پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ بعد میں میرے اندازے کی تصدیق ہوئی۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے کہا۔

”وکیل صاحب! تفصیلات بس اتنی سی ہیں کہ میں اب مزید اس شخص کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا رویہ اور کردار میری برداشت سے باہر ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ رشتہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ عدالت سے مجھے خلع دلوائیں۔“

”خلع.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”فوزیہ صاحبہ! آپ کی زبان سے ”خلع“ کا لفظ سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کا شوہر کسی بھی قیمت پر آپ کو طلاق دینے کے لیے تیار نہیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں وکیل صاحب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ میرے اندازے کی تائید میں بولی۔ ”سفیان نہایت ہی کمینہ اور شیطانی ذہن کا مالک ہے۔“

”سفیان غالباً آپ کے شوہر کا نام ہے؟“ میں نے رف پیز پر قلم ہتھتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، میں نے پوچھا۔

وہ عورت اپنی وضع قطع اور پہناوے سے خاصی مہذب نظر آتی تھی۔ بعد ازاں گفتگو پر پتا چلا کہ وہ تعلیم یافتہ اور شائستہ بھی ہے۔ وہ میرے جیمبر میں داخل ہو کر بیٹھ چکی تو میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ استفسار کیا۔ ”جی فرمائیں..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

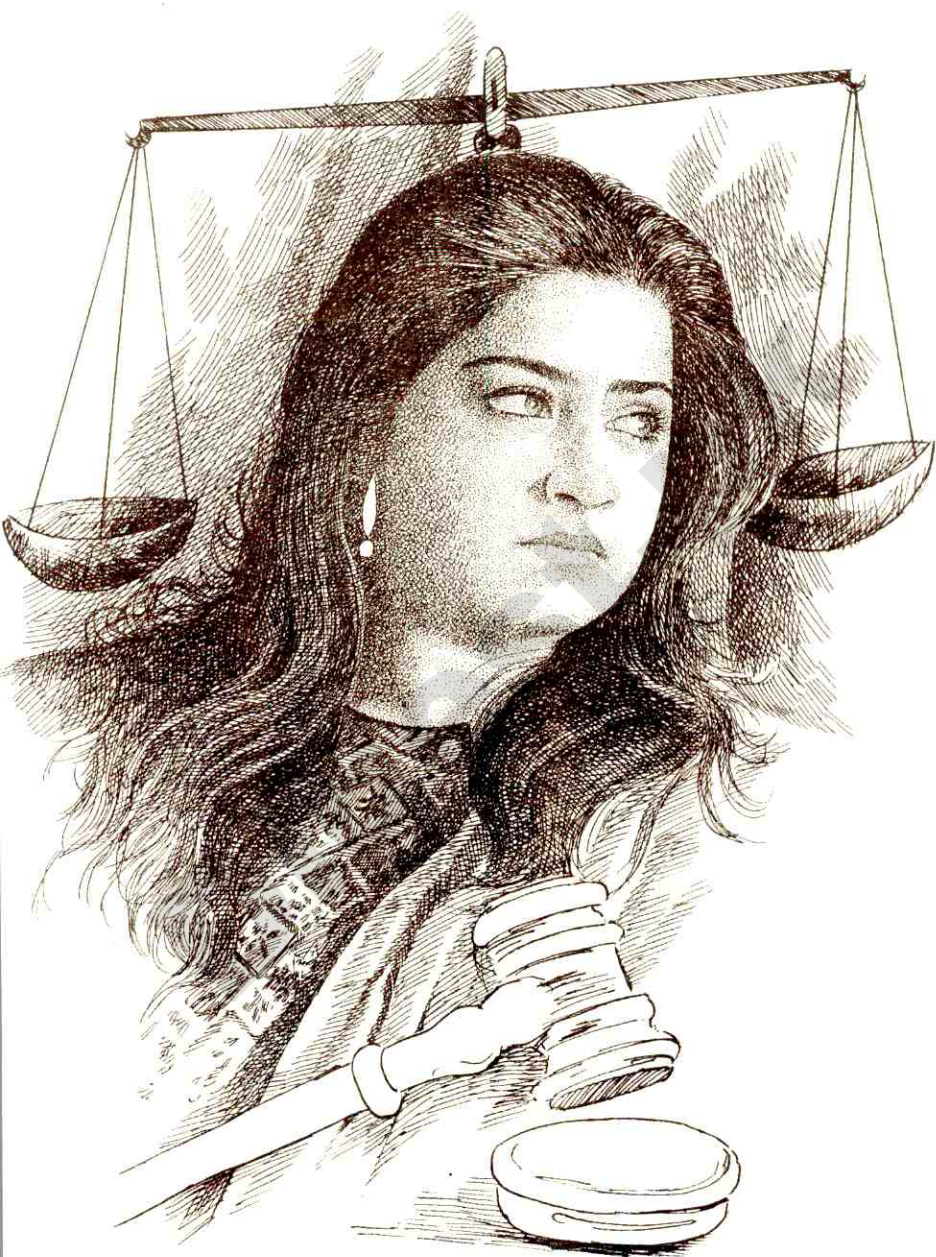
”میرا نام فوزیہ ہے۔“ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ ”اور میں اپنے ایک جذباتی مسئلے کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔“

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جی..... مجھے اپنے مسئلے کے بارے میں بتائیں؟“

”میں اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں.....“ وہ بے حد مضبوط لہجے میں بولی۔

”ہوں.....!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تفصیلات کیا ہیں؟“

میرے سامنے بیٹھی ہوئی فوزیہ نامی وہ عورت خوش شکل اور جاذبِ نظر تھی تاہم اس وقت پریشانی اور فکر نے پوری طرح اسے اپنے نرنے میں لے رکھا تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور باشعور عورت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے



بتا چکی ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔
 ”میں نے کئی مرتبہ اس سے طلاق کا مطالبہ بھی کیا ہے مگر وہ
 اس معاملے کو لٹکا لے چلا آ رہا ہے۔ دراصل.....“
 وہ بولتے بولتے رکی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔
 ”دراصل کیا؟“

”سفیان نے اس معاملے کو اپنی ضد اور انا کا مسئلہ بنا
 لیا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ اس میں اپنی
 ٹھکست محسوس کر رہا ہے۔ سفیان ایک ضدی، خود غرض اور انا
 پرست شخص ہے۔ وہ واضح الفاظ میں مجھے باور کچا ہے کہ
 موت ہی مجھے اس کے چنگل سے نکال سکتی ہے۔ جیسے جی
 میں اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتی اسی لیے.....“ لہجائی
 توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل
 کرتے ہوئے بولی۔

”اسی لیے میں سفیان جیسے عیاش اور بد قماش شخص کی
 قید سے نکلنے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور
 ہوئی ہوں۔“

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ”فوزیہ
 صاحبہ! آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”لگ بھگ دس سال۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”دس سال کا عرصہ ایک ساتھ گزارنے کے بعد آپ
 کو الگ ہونے کا خیال آیا ہے۔“ میں نے ابھن زدہ نظر
 سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے، ایک دوسرے کو
 سمجھنے کے لیے شادی کے بعد کا پہلا سال کافی ہوتا ہے۔“
 ”وکیل صاحبہ!“ اس نے براہ راست میری
 آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ کی شادی کو کتنا
 عرصہ ہو گیا ہے؟“

میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر سنبھل کر زیر لب
 مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ابھی تک میں اس نعمت سے
 محروم ہوں.....“
 یہ واقعہ جس زمانے کا ہے اس وقت میں غیر شادی
 شدہ تھا۔

”تو پھر آپ اس رشتے کے نشیب و فراز کا اندازہ لگا
 سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے بیچ غم کو سمجھ سکتے ہیں۔“ وہ گہری
 سنجیدگی سے بولی۔ ”ازدواجی زندگی بہت ہی عجیب اور پیچیدہ
 ہوتی ہے وکیل صاحبہ.....“ اس نے لہجائی توقف کر کے
 ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
 ”سفیان کی شخصیت پیاز کے مانند پرت در پرت کھلی
 ہے مجھ پر۔ وہ اتنا مکروہ اور بد ذات شخص ہے کہ میں آپ کو

”آپ کا شوہر کرتا کیا ہے؟“
 ”سفیان کی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے۔“ اس نے
 بتایا۔ ”مارنگ اسٹار ایڈورٹائزرز اس کمپنی کا نام ہے جو کہ
 خوب چلتی ہے۔“

میں نے ”مارنگ اسٹار ایڈورٹائزرز“ کا نام سن رکھا
 تھا۔ یہ ایک معروف اور کامیاب ایڈورٹائزنگ کمپنی تھی۔
 میں نے فوزیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”آپ کے شوہر کی کمپنی تو بہت اچھا بزنس کر رہی
 ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آپ لوگوں کے ساتھ کوئی معاشی مسئلہ
 نہیں ہو گا میں.....“

”وکیل صاحبہ!“ وہ میری بات پوری ہونے سے
 پہلے ہی بول پڑی۔ ”پیسائی تو سب کچھ نہیں ہوتا..... زندگی
 میں انسان کو اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن
 میں سرفہرست محبت، اتفاق، اعتماد، عزت نفس ہیں۔“
 ”آپ نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی۔“
 میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ میں کچھ اور
 کہنے والا تھا۔“

وہ ندامت آمیز انداز میں مجھے تنکھنے لگی۔
 ”آپ نے انسانی زندگی کی جن بنیادی ضروریات کا
 ذکر کیا ہے میں ان سے عمل اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے
 ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جب
 آپ اس شخص کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہئیں بلکہ اس سے
 شدید نفرت کرتی ہیں تو وہ طلاق دے کر آپ کو فارغ کیوں
 نہیں کر دیتا۔ آپ کو اس شخص سے نجات پانے کے لیے
 عدالت سے کیوں رجوع کرتا پڑ رہا ہے۔ کیا وہ مہر کی رقم
 بچانا چاہتا ہے یا پھر آپ کے برعکس، وہ اس رشتے کو چلانے
 کے حق میں ہے؟“

”اگر اس کو یہ رشتہ چلانے کا خیال ہوتا تو انسان بن
 جاتا۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”سفیان کی اس وقت جو
 مالی حیثیت ہے اس کی روشنی میں مہر کی رقم کوئی خاص اہمیت
 نہیں رکھتی۔ وہ ایک لاکھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ کر۔۔۔
 یہ آسانی مجھے اپنی زندگی سے نکال باہر کر سکتا ہے۔“

”پھر..... پھر مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے
 فوزیہ کی طرف دیکھا۔ ”جب آپ دونوں کو ایک دوسرے
 کی شکل سے نفرت ہے تو پھر سفیان کو طلاق دینے میں کون سی
 دقت محسوس ہو رہی ہے۔ کیا وہ جانتا ہے، آپ اس کے ساتھ
 نہیں رہنا چاہتیں؟“
 ”جی ہاں، یہ بات میں بڑے واضح انداز میں اسے

ہوئی اس تفصیل میں جانے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ نے بھی اپنے قرب و جوار میں ایسی شادیاں ہوتے دیکھی ہوں گی۔ وہ لڑکیاں جو اپنے گھر سے معاشی اور معاشرتی طور پر مضبوط نہیں ہوتیں اور خود کو بہت زیادہ غیر محفوظ محسوس کرتی ہیں وہ سفیان جیسے لوگوں کی چلتی چڑی باتوں میں آکر بغیر کی تحقیق اور مشق کے ان سے شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہیں اور بعد میں فوزیہ کی طرح اپنے نصیب کو روٹی رہتی ہیں۔

خیر، فوزیہ اور سفیان کی شادی ہو گئی۔ فوزیہ رخصت ہو کر سفیان کے گھر پہنچی مگر وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے گاہے بگاہے اس کے قلیت میں آ جا رہا تھا۔ نوید کی پیدائش کے بعد سفیان کی وہاں آمد و شد کم ہو گئی اور پھر رفتہ رفتہ یہ آمد مہینے میں دو تین بار تک محدود ہو کر رہ گئی۔ فوزیہ کے مطابق سفیان کو نہ تو اس سے محبت تھی اور نہ ہی اپنے بیٹے نوید سے۔ وہ صرف اپنی ہوس کی خاطر ان سے ملنے کے بہانے آ جاتا تھا۔ وہ خربے کے نام پر انہیں تھوڑی بہت رقم بھی دے دیا کرتا تھا تاہم گھر کے اخراجات سے کما حقہ نمٹنے کے لیے فوزیہ کو چھوٹی موٹی جاب بھی کرنا پڑتی تھی۔ علاوہ ازیں فوزیہ نے سفیان کی ذات کے حوالے سے چند ایسے واقعات بھی سنائے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک عیاش، بدکردار اور ہوس پرست انسان تھا۔ ان تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں فوزیہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس شخص سے جتنی جلدی جان چھوٹ جائے، اتنا ہی اچھا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”ٹھیک ہے فوزیہ صاحبہ! میں آپ کی طرف سے خلع کا کیس دائر کر دیتا ہوں لیکن آپ کو چند بائیں اپنے ذہن میں رکھنا ہوں گی۔“

”کون سی باتیں؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے تنگے لگتی۔ ”ہمارے ملک کے عائلی قوانین کے مطابق، اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو اور عدالت میں کھڑی ہو کر اپنے اس فیصلے کا برملا اعلان کر دے تو کسی جرح و بحث میں پڑے بغیر عدالت اس عورت کے حق میں فیصلہ کر دیتی ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن اس صورت میں عورت کو اپنے تمام حقوق اور مہر کی رقم وغیرہ سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ آپ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہیں گے۔“

”مجھے اس کہنے انسان سے ایک پسان نہیں چاہیے۔“ وہ کیلے لہجے میں بولی۔ ”میں اپنے ذہنی سکون اور نوید کے

بتائیں سکتی۔ میں ہر قیمت پر اس کے نکاح سے کھٹنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔“

”آپ کے بچے.....“ میں نے ایک نہایت ہی نازک سوال کیا۔ ”آپ کے بچے کتنے ہیں.....؟“

”صرف ایک.....“ اس نے بتایا۔ ”میرا آٹھ سال کا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام نوید ہے.....“

”ایک بات ذہن میں رکھیے گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خلع کا مقدمہ دائر کرنے کے بعد آپ اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر میں نہیں رہ سکیں گی۔ اگرچہ یہ کوئی قانونی شرط نہیں ہے لیکن میرے خیال میں یہ قطعی نامناسب ہوگا۔“

”میں آپ کی بات کو سمجھ سکتی ہوں۔“ وہ تعجبی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میری رہائش کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں جہاں ابھی رہ رہی ہوں، وہیں رہتی رہوں گی۔“

”کیا مطلب.....!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ اس وقت سفیان کے ساتھ نہیں رہ رہیں؟“

”سفیان کے ساتھ تو میں کبھی بھی نہیں رہی۔“ وہ کرب ناک لہجے میں بولی۔ ”بلکہ وہ مہینے میں دو تین بار میرے ساتھ رہنے آ جاتا ہے۔“

فوزیہ کے جواب نے مجھے بہت دور تک، بہت گہرائی تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میرے پیہم اصرار نما استفسار پر اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں مجھے ایک حیرت انگیز کہانی سنائی۔

مارنگ اسٹار ایڈ ورنائزنگ کمپنی کے مالک سفیان کی فوزیہ کے ساتھ سینڈ میرج تھی۔ سفیان اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک عالیشان ہنگلے میں رہتا تھا جبکہ فوزیہ طاری روڈ کے کمرشل ایریا میں واقع دو کمروں کے ایک چھوٹے سے قلیت میں رہتی تھی۔ اس کے والد کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا تھا اور پورھی بہار والدہ سملی بیگم بھی اس کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھیں۔ سملی کو دمہ اور فی لی کا مرض تھا۔ دمہ تو دمہ کے ساتھ ہی جاتا ہے اور اس زمانے میں فی لی بی (تپ دق) بھی ایک لاعلاج مرض ہی تھا۔ سملی بیگم کا زیادہ وقت بیڈ پر کھانے اور سانسوں سے جنگ کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ ایک لی لحاظ سے اسے عضو معطل کہا جاسکتا تھا۔ شکر کی بات یہ تھی کہ وہ چھوٹا سالیٹ ان کی ذاتی ملکیت تھا لہذا گھر سے بے گھر ہوجانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔

فوزیہ اور سفیان کی شادی کیسے اور کن حالات میں

بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے ابھی تک اپنی فیس کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں.....؟“
میں نے اسے اپنی فیس بتائی اور کہا۔ ”میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔“

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں لہرائی۔ میں یہی سمجھ پایا کہ اسے میری فیس زیادہ محسوس ہوئی تھی تاہم اس نے مجھ سے کسی قسم کی رعایت کی بات نہیں کی اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے وکیل صاحب! میں کل اسی وقت آپ کے آفس آکر فیس ادا کروں گی۔ آپ میرا کس تیار کر لیں۔“

مجھے یہ جاننے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ اس وقت فوئیر کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ میری فیس ادا کر سکتی میں نے اس سے تمام کوائف لینے کے بعد بھٹھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں آج ہی تمام ضروری کاغذات تیار کروالوں گا۔ آپ کل ان کاغذات پر دستخط کر دیجیے گا۔ پرسوں میں خلع کا مقدمہ دائر کروں گا۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

میں نے مکمل کاغذی تیاری کے بعد اپنی وکالت میں فوئیر کی جانب سے خلع کا کس عدالت میں دائر کر دیا۔ اسی روز میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے سفیان کے نام عدالت میں طلی کا حکم نامہ بھی جاری کر دیا۔ میری نظر میں یہ ایک حلوا کیس تھا۔ فوئیر یہ بھی کبھی صورت میں سفیان کی زوجیت میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ آٹھ سالہ نوید اپنی ماں کا حمایتی تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ فوئیر کے پاس سفیان کی بدکاری، عیاشی اور ہوس پرستی کے بھی واقعات شواہد موجود تھے۔ ان تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں یہ کیس از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین پیشیوں کی مار تھا۔

یہ کیس بارہ فروری کو عدالت میں دائر کیا گیا تھا اور بارہ فروری ہی کو میں نے عدالتی حکم نامہ بہ نام سفیان علی جاری کر دیا تھا جس میں سفیان کو بائیس فروری کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔

اس روز عدالتی کھینچڑوں سے نشنہ کے بعد میں اپنے آفس پہنچا اور عدالت میں دائر کیس کی ایک نقل متعلقہ یونین کونسل کو بذریعہ رجسٹر ڈاک ارسال کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ عدالتی حکم نامے کے آگے پیچھے ہی یونین کونسل کی جانب

مستقبل کے لیے مہر کی رقم اور دیگر تمام حقوق چھوڑنے کو تیار ہوں۔ اگر سفیان جیسے شیطان صفت انسان سے ہماری جان چھوٹ جائے تو میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گی۔“

”آپ نے نوید کا ذکر کیا ہے۔“ میں نے کہا۔
”آپ کے بیٹے کی عمر اس وقت آٹھ سال ہے۔ وہ اس عمر سے نکل آیا ہے جب چائلڈ سکھڑی کے حوالے سے عدالت کا جھکاؤ بچے کی ماں کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ اگر خلع کے کیس کے دوران میں یا فوراً بعد سفیان نے چائلڈ سکھڑی (بچے کی تحویل) کا مقدمہ دائر کر دیا تو آپ کے لیے پریشانی کھڑی ہو سکتی ہے۔“

ایک دیانت دار اور مخلص وکیل ہونے کے ناتے اپنے کلائنٹ کو کس کے تمام تر نشیب و فراز سے آگاہ کرنا میرا فرض بنتا تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بولی۔

”وکیل صاحب! کیسا باپ اور کیسی چائلڈ سکھڑی!“
اس کے انداز میں گہرا طنز پایا جاتا تھا۔ ”اگر سفیان نوید کو اپنی اولاد کا درجہ دیتا تو آج وہ بھی اس کی دوسری اولادوں کی طرح کسی عالیشان بنگلے میں آرام و آسائش کی زندگی گزار رہا ہوتا.....“ وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوئی پھر ایک بوھل سانس خارج کرنے کے بعد کہا۔

”مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں کہ سفیان، نوید کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے کسی قسم کی مقدمے بازی میں پڑے گا اور..... اگر اسے ایسا کوئی شوق اٹھا بھی تو میں ذہنی طور پر ہر مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ ہے کہ نوید، سفیان سے شدید نفرت کرتا ہے اور وہ کسی بھی صورت سفیان کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔“

”یہ واقعی اطمینان کی بات ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جب کوئی بچہ سات سال کا ہو جاتا ہے تو ”چائلڈ سکھڑی“ کے سلسلے میں عدالت اس کی ذاتی رائے اور فیصلے کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ وہ ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی رہنا چاہے، عدالت اسے اجازت دے دیتی ہے۔ جو صورت حال آپ بتا رہی ہیں اس کی روشنی میں سفیان، نوید کو حاصل نہیں کر سکتا۔“

”تو آپ نے میرا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ بات میں اس لیے پوچھ رہی ہوں تاکہ میں اس سلسلے میں ذہنی طور پر مطمئن ہو جاؤں اور ہاں.....“ وہ چونک کر رک کر پھر لمحاتی توقف کے

آخری کیل

میں ابھی گھر میں داخل ہوا ہوں۔ آفس سے میں ایک گھنٹا پہلے نکل آیا تھا.....“، بھاتی توقف کر کے میں نے پوچھا۔
 ”خیریت تو ہے نا..... کیا کہہ رہا تھا وہ؟“
 ”وہ کہہ رہا تھا کہ میں مقدمے بازی کے چکر میں نہ پڑوں۔“
 ”یعنی اگر آپ خلع کا مقدمہ واپس لے لیں تو وہ آپ کو آزاد کر دے گا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں.....“ وہ جلدی سے بولی۔

”پھر وہ آپ کو مقدمے بازی سے کیوں روک رہا ہے؟“

سے بھی اس سے رابطہ کر لیا جاتا تھا۔

پندرہ فروری کی رات میں جیسے ہی اپنے گھر میں داخل ہوا، میرے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ اس وقت رات کے گیارہ کا گھل تھا۔ میں نیلی فون سیٹ کی جانب بڑے ہوئے سوچنے لگا..... اس وقت کون ہو سکتا ہے؟

تیسری کھنٹی پر میں نے ریسور اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”ہیلو.....!“

”ہیلو بیگ صاحب! یہ میں ہوں۔“ ایریٹس میں ایک نسوانی آواز ابھری۔ ”فوزیہ!“

”جی فوزیہ صاحبہ..... خیریت؟“ میں نے پوچھا۔
فوزیہ کو میں نے اپنے وزیٹنگ کارڈ کے پیچھے گھر کا
نمبر بھی لکھ کر دیا ہوا تھا تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ
کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ کر سکے۔ آج تک اس نے
میرے آفس کے نمبر پر ہی فون کیا تھا۔ گھر پر..... اور وہ بھی
آدھی رات کو فون کرنے کا مطلب کسی نوعیت کی گڑبڑ ہی کو
ظاہر کرتا تھا۔

اس نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ”بیگ صاحب! سفیان کو خلع کرنے والے کیس کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔“

”تو اس میں ایسی حیرت یا پریشانی والی کون سی بات ہے۔“ میں نے نارمل انداز میں کہا۔ ”عدالتی حکم نامے کو جاری ہوئے تین دن گزر چکے ہیں۔ اسے اب تک وہ نوٹس مل گیا ہوگا اور عین ممکن ہے، متعلقہ یونین کو اس نے بھی اسے کوئی بلاؤ بھینچ دیا ہو۔“

”جی ہاں..... جی ہاں۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولی۔ ”اے دونوں جانب سے پکارا گیا ہے اور وہ سخت پریشان ہے۔ اس نے مجھے فون کیا تھا۔“

”فون کیا تھا۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”کس.....؟“

”ابھی آدھا گھنٹا پہلے۔“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے پہلے آپ کے آفس کے نمبر زنگ کی گئی تھی۔ جب وہاں کال انڈین نہیں کی گئی تو آپ کے گھر پر فون کیا ہے.....“ لچاتی توقف کے بعد اس نے معذرت خواہانہ انداز میں بوجھا۔

”آپ نے ماسٹر نہیں کیا بیگ صاحب؟“
 ”بالکل نہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جب آپ کو اپنے گھر کا نمبر دے رکھا ہے تو رابطہ کرنے پر ماسٹر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر پرچہ چاند ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اشغال کا نام جہاں پر چاندستیاں نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو جب اس سال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپهر ۱۳۵۵/۱۳۵۶ کنگره سرگزشت

63-C فیروزکینشن ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوریج روڈ، کراچی

مصر و قتل ٹیگٹاؤں نے ہر دو بچی رابطہ کر گئے ہیں

35802552-35386783-35804200

jdpgroup@hotmail.com: میل

”وہ مجھے خود سے الگ کرنے کے حق میں نہیں ہے۔“
 فوزیہ نے بتایا۔ ”نہ خلع کے ذریعے اور نہ ہی طلاق دے کر.....“
 ”کیا مطلب.....؟“ میں نے ابھن زہ انداز میں پوچھا۔
 ”آخر وہ شخص چاہتا کیا ہے؟“
 ”وہ کہہ رہا تھا، میں مقدمے بازی کا خیال دل سے نکال دوں اور خاموشی سے اپنے گھر میں بیٹھی رہوں..... اس کی مشکوہ کی حیثیت سے۔“ فوزیہ نے جواب دیا۔ ”وہ میری تمام تر شکایات دور کرنے کی کوشش کرے گا۔“
 ”پھر آپ نے اس سے کیا کہا؟“ میں پوچھے باندھ رہا۔
 ”کچھ نہیں۔“ وہ قطع لہجے میں بولی۔ ”میں بس سے نہ ہوئی۔“

”آپ کی ثابت قدمی کو دیکھتے ہوئے اس نے کیا متوقف اختیار کیا؟“ میں نے فوزیہ کے معاملے میں گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”جب اس نے دیکھا کہ میں کسی بھی طور اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تو وہ ہوشیاری دکھانے لگا۔“ فوزیہ نے بتایا۔
 ”کبھی ہوشیاری؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس نے کہا کہ وہ ہر قسم کی آوارہ گردی اور عیاشی سے باز آجائے گا۔“ وہ اپنے شوہر کی چال بازی سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ ایک معزز و باکردار انسان بننے کی کوشش کرے گا اور میرا بہت خیال رکھے گا۔“
 ”تو کیا آپ سفیان کو یہ موقع دینے کا ارادہ رکھتی ہیں؟“ میں نے فوزیہ کے دل کا حال جاننے کی خاطر استفسار کیا۔

”وکیل صاحب! اس بات کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔ ”میں نے ایک جتنی فیصلے پر پہنچنے کے بعد جو قدم اٹھایا ہے وہ اب واپس نہیں آ سکتا۔“

”ویری گنڈ!“ میں نے سراہتے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا سفیان نے ایک بار بھی آپ سے کوئی ایسی بات کی کہ وہ آپ کو اور آپ کے بیٹے کو بھی عزت و آبرو دے گا جو اپنی پہلی بیوی اور بچوں کو دیتا ہے اور یہ کہ اگر آپ اس کی بات مانتے ہوئے خلع کا مقدمہ واپس لے لیتی ہیں تو وہ آپ کو لوگوں کو بھی کسی صاف ستھرے بیگلے میں رکھے گا؟“
 ”جناب! میں سفیان کی عیاری کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔“ وہ طنز بے لہجے میں بولی۔ ”وہ اتنا سیدھا نہیں جیسا کہ خود کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میں کسی بھی قیمت پر اس کی چال میں نہیں آؤں گی۔ اگر اب میں اس کے چال میں پھنس جاتی، اس کی ہمدردی بھری بیٹھی باتوں میں آگئی تو

☆ ☆ ☆
 عدالت نے سفیان کو بائیس فروری کو حاضر ہونے کا حکم دیا تھا مگر میں فروری یعنی اس کی طلحہ کی تاریخ سے دو دن

بڑے لوگوں کی باتیں

☆ لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں۔

قابلیت پر نہیں (نپوٹین)

☆ عالم بے عمل اس پارس کے مانند ہے جو اوروں کو تو سونا بناتا ہے، مگر خود ہمیشہ پتھر رہتا ہے (نپولین)

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

”تفصیلات کیا ہیں؟“

”مجھے اس واقعے کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”فوزیہ کی ماں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے..... یہی بتانے کے لیے۔ آپ تھانے میں جا کر خود فوزیہ سے ملاقات کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور استفسار کیا، ”وہ کس تھانے میں ہے؟“

نور علی نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

فوزیہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس نے اپنی والدہ سلمیٰ بیگم کو خلع والے کيس کے حوالے سے تفصیلاً آگاہ کر رکھا ہے جیسی سلمیٰ بیگم نے اس افتاد کے موقع پر نور علی کو میرے پاس بھیجا تھا۔ میں نے نور علی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”آپ فوزیہ کی والدہ کو اطمینان دلا دیں کہ فکر مند ہونے والی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی فوزیہ سے، تھانے جا کر ملاقات کروں گا۔ اگر اس نے جرم نہیں کیا تو کوئی اس کا سچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

رات کو آفس سے فارغ ہونے کے بعد میں فوزیہ سے ملنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ مذکورہ تھانہ میری واپسی کے روٹ پر تو نہیں تھا مگر اپنے کلائنٹ کی داد رسی روٹ سے زیادہ اہم تھی لہذا میں نے یہ کیشٹ اٹھانے میں کوئی دقت محسوس نہ کی۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں تھانے کے اندر موجود تھا۔

میں اس تفصیل میں پڑ کر آپ کا قیمتی وقت اور سہنس کے نادر صفحات ضائع ضائع نہیں کروں گا کہ میں نے اپنی کلائنٹ سے ملاقات کرنے کے لیے کیا حربہ آزمایا تھا۔ اس طریقہ واردات کا پہلے بھی کئی بار ذکر کیا جا چکا ہے۔

میں حوالات میں پہنچنا تو فوزیہ کو ایک ٹھنڈے ٹھار فرش پر اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے

پہلے ایک ایسا سنسنی خیز واقعہ رونما ہوا کہ میرا سارا اطمینان اور سکون خاک میں مل کر رہ گیا۔

میں حسب معمول اپنے آفس میں بیٹھا کلائنٹس سے منٹ رہا تھا کہ میری سکریری نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی۔

”سر..... کوئی نور علی صاحب آئے ہیں۔ یہ آپ سے فوری ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“

”نور علی!.....! میں نے زیر لب دہرایا پھر پوچھا۔

”وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟“

”وہ آپ کی ایک کلائنٹ فوزیہ صاحبہ کے حوالے سے کوئی اہم اطلاع دیتا چاہتے ہیں۔“

میرا ماتھا ٹھنکا اور فوزیہ کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے محوم گیا۔ میں نے اپنی سکریری سے کہا۔ ”ٹھیک ہے..... میں صغیر صاحب سے فارغ ہو جاؤں تو آپ نور علی کو اندر بھیج دیتا۔“

”اوکے سر.....!“ سکریری نے کہا۔

میں نے انٹرکام کا ریسیور کرڈل کر دیا۔

پندرہ منٹ کے بعد نور علی نامی وہ شخص میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ نور علی کی عمر چالیس سے ستر و نصف آتی تھی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک سلاٹو شخص تھا۔ نور علی نے مناسب سائز کی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے نوٹے فیصد بال بے وفائی کر گئے تھے۔

میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”جی نور علی صاحب..... آپ فوزیہ کے بارے میں کیا بتانا چاہتے ہیں؟“

وہ گہری تنہید کی سے بولا۔ ”جناب! فوزیہ بیٹھے بٹھائے ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔“

میں اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”کیسی مصیبت..... اور آپ کون ہیں؟“

”میں فوزیہ کی پڑوسی ہوں وکیل صاحب!“ اس نے بتایا۔ ”فوزیہ کو آج شام میں پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“

”کیا!.....! بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”پولیس نے فوزیہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟“

”اس پر قتل کا الزام ہے۔“

”کس کے قتل کا الزام؟“ میری حیرت گہری تشویش میں بدل گئی۔

”سفیان علی.....“ نور علی نے جواب دیا۔ ”اس کے شوہر کے قتل کا الزام وکیل صاحب۔“

”اوہ مائی گاڈ!“ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

”لگ بھگ چار بجے سہ پہر۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”اور سفیان کو کہاں قتل کیا گیا ہے؟“
 ”بہادر آباد کے ایک فلیٹ میں.....“
 ”اوہ..... بہادر آباد کے اس فلیٹ سے آپ کا کیا تعلق؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”وہ کس کا فلیٹ ہے؟“
 ”آج دوپہر سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ فلیٹ کس کا ہے بلکہ کچا بات تو یہ ہے کہ میں اب بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ فلیٹ نرسنگ کا ہے یا کسی اور کا.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”نرسنگ؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”میں یہ بھی نہیں جانتی کہ نرسنگ کون ہے۔“ وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ میں نے اسے دیکھا ہے اور نہ ہی کبھی اس سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ مجھے تو وہ کوئی چال باز فراڈ لگتی ہے..... مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ میں نرسنگ کے بلانے پر بہادر آباد والے فلیٹ پہنچ گئی تھی۔“
 ”کیا مطلب؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ جائے وقوعہ پر گئی تھیں.....؟“
 ”جی ہاں.....!“ اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔
 ”میں نے پوچھا۔“ مجھے تفصیلاً بتائیں..... یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔“

”آج صبح کم و بیش دس بجے میں نے ایک فون اٹینڈ کیا.....“ وہ بتانے لگی۔ ”دوسری طرف بولنے والی نے اپنا نام نرسنگ بتایا اور مجھ سے پوچھا۔
 ”آپ فو زیہ بات کر رہی ہیں، سفیان علی کی بیوی؟“
 ”جی ہاں..... آپ کون ہیں؟“
 ”میرا نام نرسنگ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں بھی بدقسمتی سے سفیان کی بیوی ہوں.....“
 ”سفیان کی بیوی کا نام رضوانہ ہے۔ نرسنگ نامی اس عورت کا دعویٰ اس کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے ابھن زدہ انداز میں کہا۔

”لیکن سفیان کی بیوی کا نام تو رضوانہ ہے۔“
 ”رضوانہ اس کی اصلی بیوی ہے۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔
 ”اصلی بیوی..... کیا مطلب؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... رضوانہ اور اس کے بچوں کے ساتھ وہ معزز انسانوں کی طرح گھریلو زندگی گزارتا ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”آپ، میں..... اور ہم جیسی پختائیں کتنی عورتوں کو

دس بج رہے تھے۔ فردری کے مینیج میں اگرچہ زیادہ سردی نہیں ہوتی تاہم رات کے اس حصے میں حوالات کا ماحول اچھا خاصہ سرد ہو رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی فو زیہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”وکیل صاحب! میں نے سفیان کو قتل نہیں کیا..... میں اس واردات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی.....؟“
 ”مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”لہذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے مجھے بتائیں کہ آخر ہوا کیا تھا؟“

میری تسلی بخش باتوں سے اس کے چہرے پر امید کی کرن نمودار ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اس کی زخموں پر سکون بخش مرہم رکھ دیا ہو۔ اس کی گھبراہٹ اور سر اسکی میں یکجہتی کی آگئی تھی۔

”وکیل صاحب.....!“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس وبال سے آپ ہی مجھے نکال سکتے ہیں۔“
 ”اسی لیے تو میں آپ کی مصیبت کا سنتے ہی فوراً یہاں پہنچ گیا ہوں۔“ میں نے یہ دستور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔“
 وہ تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔ ”فو زیہ صاحبہ! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ کسی وقت بھی تھانہ انچارج ہماری اس اہم ملاقات میں رخنہ ڈال سکتا ہے لہذا آپ فوری طور پر چند ضروری کاغذات پر دستخط کر دیں۔“
 ”یہ کیسے کاغذات ہیں.....؟“ اس نے پوچھا۔

”ان میں ایک تو درخواست ضمانت ہے۔“ میں نے کاغذات اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور دیگر ضروری کاغذات ہیں جن کی عدالت میں کسی بھی موقع پر ضرورت پیش آسکتی ہے۔“

میں اپنے بریف کیس میں وکالت نامہ، درخواست ضمانت اور اسی نوعیت کے دوسرے ضروری کاغذات ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا کہ جانے کب اور کس جگہ ان کی ضرورت پیش آجائے فو زیہ نے میرے بتائے ہوئے مقامات پر دستخط کر دیے تو میں نے انہیں بریف کیس میں رکھنے کے بعد اس سے پوچھا۔

”فو زیہ صاحبہ! آپ کو کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟“
 ”میرے گھر سے!“
 ”کتنے بجے؟“

آخری کیل

آجائیں۔“

”میرے استقمار پر اس نے مجھے اپنے فلیٹ کا ایڈریس بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھا دیا اور ہمارے درمیان ٹیلی فونک سلسلہ ختم ہو گیا۔

”اور آپ.....“ فوزیہ سانس لینے کے لیے تھمبی تو
میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
”اس عورت کے کہنے میں آکر بہادر آباد والے فلیٹ پر
چڑھ گئیں.....؟“

”جی بیگ صاحب!“ وہ گہری ندامت سے بولی۔
”مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے اس فلیٹ پر نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”اب بچتائے کیا ہووٹ جب چڑیاں جگ گئیں
 ہیت۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کو کم از کم مجھے اس معاملے سے
 آگاہ تو کرنا چاہیے تھا۔ اگر آپ مجھے نرس کے فون کے بارے
 میں فوراً بتاتیں جیسا کہ پانچ دن پہلے سفیان کے فون کے
 بارے میں مجھے گھر پر فون کر کے۔۔۔ آگاہ کیا تھا تو۔۔۔ میں
 گزر گزر آپ کو نرس کے فلیٹ پر نہ جانے دیتا۔“

”ایک صاحب.....!“ وہ شرمندہ سی صورت بناتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں، اس وقت میرے داغ کو کیا ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی سوچ پر بالکل اختیار نہیں رہا تھا۔ واقعی، مجھے پہلی فرصت میں آپ کو مطلع کرنا چاہیے تھا۔“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”وہاں نرگس کے فلیٹ پر جو کچھ ہوا، وہ بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ واپس گھر آکر میں کافی دیر تک اسی واقعے کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر چار بجے پولیس نے مجھے اپنے گھر سے گرفتار کر لیا۔“

”آپ کی واپسی کتنے بجے ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”تین بجے سہ پہر.....“ اس نے جواب دیا۔
 ”اور آپ بہادر آباد والے فلیٹ یعنی جائے وقوعہ پر
 تین بجے پہنچی تھیں؟“

”یہی کوئی دو..... سوا دو کے!“

”طارق روڈ سے بہادر آبادز مادہ دور نہیں ہے۔“

شکل دس پندرہ منٹ کا راستہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے اپنی آمد و شد کے جو اوقات بتائے ہیں، اس سے یہی ہر ہوتا ہے کہ بہادر آباد والے فلیٹ پر آپ زیادہ دیر نہیں

اس نے بیوی کے نام پر شہر کے مختلف حصوں میں رکھا ہوا ہے۔ وہ کمینہ ایک نمبر کا عیاش اور بد معاش ہے۔“

”زرگس کا دکھ میرے درد سے گہری مماثلت رکھتا تھا لہذا اس کی باتیں سن کر مجھے ذہنی سکون محسوس ہوا۔ میں نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”نرگس صاحبہ! آپ نے کس سلسلے میں مجھے فون کیا ہے؟“
 ”سلسلہ وہی ہے، سفیان سے چھکارا“ وہ بیزاری
 سے بولی۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے خلع کا کیس دائر کر رکھا
 ہے۔ میں بھی سفیان سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہی
 راہ اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ اگر ہم، نرگس دووں مل جائیں تو یہ کیس
 دوسری بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”قدر مشترک“ ایک ایسی شے ہے کہ یہ دودھنوں کو بھی ایک صف میں کھڑا ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میرے ورزیکس کے مسائل اور مصائب میں گہری قدر مشترک پائی جاتی تھی چنانچہ میں اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی جگے۔ یہ ذات محسوس کرنے لگی اور میں نے بوجھا۔

”نرگس صاحبہ! بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“ اس نے

”میں بھی اپنا کیس اسی وکیل کو دینا چاہتی ہوں جو آپ کا کیس لڑ رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آپ کو ان وکیل صاحب کا نمبر دیتی ہوں۔ وہ سٹی کورٹ کے قریب ہی ایک ملٹی سٹوری بلڈنگ میں بیٹھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ان کے آفس کا ایڈریس بھی نوٹ کر رہا ہوں۔“

”میں آپ کے ساتھ ان وکیل صاحب سے ملنے جانا ہا ہتی ہوں۔“ وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔ ”اور اس سے پہلے میں آپ سے ایک بھر پور ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ جب کہیں گی، ہم مل لیں گے۔“
 س نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”جب نہیں..... آج ہی!“ وہ اصراری لہجے میں
 لی۔ ”میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ میں بہادر آباد

کے علاوے میں رہتی ہوں۔ اگر آپ دن میں مجھے خود اوقات کے دس تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔“

”نرس نے اپنی منت اور لجاجت سے یہ بات کہی تھی میں مجبور ہو گئی اور میں نے کچھ سوچے سببے بغیر اس سے ہمدیا۔

”بتائیں..... آپ کتنے بجے مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟“
 ”دن میں ایک اور تین کے درمیان کسی بھی وقت“

”زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔“

ہونے والے ایک سنسنی خیز خیال نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا..... کہیں یہ سفیان کی کوئی چال تو نہیں.....؟
میں نے دل ہی دل میں خود کو لعنت ملاست کی اور فوری طور پر اس فلیٹ سے نکل آئی اور گھر پہنچنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اسی عجیب و غریب واقعے کے بارے میں سوچتی رہی تھی.....“

فوز نے اپنا بیانیہ مکمل کیا تو میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ٹھیک چار بجے سپر پولیس نے آپ کو آپ کے گھر سے گرفتار کر لیا؟“
”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
”بہادر آباد والے فلیٹ کے بارے میں آپ نے اپنی والدہ کو بتایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ اس صورت حال سے کس حد تک آگاہ ہیں؟“

”جانتے وقت انہیں میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”لیکن واپس آنے کے بعد میں نے وہاں بہادر آباد والے فلیٹ پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں امی کو تفصیلاً بتا دیا تھا۔“

میں نے جانتا جاہا۔ ”پھر انہوں نے کیا کہا؟“
”امی میری بات سن کر پریشان ہوئی تھیں۔“ فوز یہ نے جواب دیا۔ ”انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ مجھے اس فلیٹ پر نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”ہوں.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا۔
”آپ نے اس فلیٹ میں مختلف چیزوں کو چھوا بھی تھا.....؟“
”جی ہاں۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش... دیتے ہوئے بولی۔ ”جب میں نے اس فلیٹ کے تینوں کمروں اور باتھ رومز اور کچن کو اچھی طرح جھانک کر دیکھا تھا تو ظاہر ہے، میں نے بے شمار چیزوں کو چھوا تو ہے۔“

میں نے سمجھ انداز میں پوچھا۔ ”آپ کو بہادر آباد والے فلیٹ میں کسی نے داخل ہوتے یا باہر نکلنے ہوئے تو نہیں دیکھا؟“

”وہ بہادر آباد کا ایک کمرشل ایریا ہے بیگ صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”بلڈنگ میں داخل ہوتے وقت کئی افراد کی مجھ پر نگاہ پڑی ہوگی اور بعض نے مجھے بلڈنگ سے نکلنے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن میں سمجھتی ہوں ان میں سے کوئی بھی میرا شنا نہیں تھا۔“

”اور فلیٹ میں داخل یا خارج ہوتے وقت کسی نے آپ کو دیکھا؟“
”جی نہیں، البتہ.....!“

”ہاں بہادر آباد والے فلیٹ پر ایسا کیا واقعہ پیش آیا تھا کہ جس کے بارے میں آپ گھر آ کر بھی کافی دیر تک سوچتی رہی تھیں۔“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ”کیا آپ کی نرس سے ملاقات ہوئی تھی؟“
”نہیں.....!“ اس نے قطعیت سے گردن ہلائی۔

”میں آج تقریباً سو واو بجے اس فلیٹ پر پہنچی تھی۔ وہ اپارٹمنٹس بلڈنگ بہادر آباد کے کمرشل ایریا میں واقع ہے۔ میں نے فوراً تھلور کے اپارٹمنٹ نمبر ”فوز روفر“ کی کھنٹی بجائی اور ایک طرف رک گردوازہ کھٹکنے کا انتظار کرنے لگی۔ نرس نے فون پر مجھے اسی فلیٹ کا ایڈریس سمجھایا تھا۔ جب کھنٹی کے جواب میں اندر سے کوئی نہیں نکلا تو میں نے دوبارہ کھنٹی بجا دی۔

”اس بار بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ نرس واش روم میں ہو۔ احتیاطاً میں نے دروازے پر دستک بھی دے ڈالی اور اسی وقت مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ میری دستک کے دباؤ سے دروازہ کھل گیا۔ میرے اندر تجسس نے سر ابھارا اور ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے اندر داخل ہو جانا چاہیے اور پھر..... میں فلیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

”وہ تین کمروں کا ایک صاف ستھرا فلیٹ تھا مگر اس کے اندر خاموشی اور سناٹے نے میرا استقبال کیا۔ وہاں کسی ذی روح کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں چکر لاتی رہی۔ میں نے واش رومز اور کچن میں بھی جھانک کر دیکھ لیا لیکن وہ فلیٹ انسانی وجود سے خالی تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ جب نرس نے مجھے ایک بجے سے تین بجے تک وہاں آنے کو کہا تھا تو پھر وہ کہاں غائب ہو گئی اور اگر کسی ایمر جسی میں اسے باہر جانا ہی تھا تو مجھے فون کر کے اطلاع دے سکتی تھی اور..... یہ بھی کہ وہ فلیٹ کا دروازہ کھلا کیوں چھوڑی.....؟

”جلدی ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے نرس نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے وہ ڈراما چلایا تھا۔ مجھے ایک اجنبی عورت کی کال پر یوں گھر سے اٹھ کر نہیں چلے آنا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ سوچ بھی جاگزیں تھی کہ آخر نرس کو میرے ساتھ ایسا بھیانک مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ذہن میں فوری طور پر پیدا

کر کے ایک ہفتے کے تفتیشی ریمانڈ کی درخواست کی۔ میں نے پچھلی رات، حوالات میں طرہ سے ملاقات کے وقت ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لے لیے تھے لہذا عدالت میں پیش ہونے پر میں نے درخواست ضمانت کے ساتھ اپنا وکالت نامہ بھی دائر کر دیا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں کہا۔

”جناب عالی! یہ اپنی نوعیت کا ایک عجیب و غریب کیس ہے.....“

وکیل استغاثہ نے آغاز ہی میں مجھ پر حملہ کر دیا اور میری بات پوری ہونے سے پہلے تیز آواز میں بولا۔

”جناب عالی..... یہ عجیب و غریب نہیں، قتل کا ایک کیس ہے۔“

جج نے حیرت بھری نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا جیسے یہ جانے کی جستجو میں ہو کہ..... اس میں بتانے والی کون سی بات ہے۔ جج کے متوجہ ہونے پر اس نے مزید کہا۔

”جائے وقوعہ پر طرہ کی انگلیوں کے نشانات کئی مقامات پر پائے گئے ہیں۔ پولیس کو اپنی تفتیش مکمل کرنے کے لیے کم از کم سات روزہ ریمانڈ کی ضرورت ہے لہذا ان ابتدائی مراحل میں، طرہ کی ضمانت کی درخواست منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔“

”یور آزا!“ میں نے درخواست ضمانت کے حق میں آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”میری موکل اور اس مقدمے کی طرہ ایک معزز شہری ہے۔ وہ بے گناہ ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔ اپنے اس موقف کو ثابت کرنے کے لیے میرے پاس ٹھوس دلائل بھی ہیں جنہیں میں مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں منظر عام پر لاؤں گا۔ فی الحال معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ میری موکل کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے رہائی کا حکم جاری کیا جائے۔“

”جناب عالی! عدالت صرف حقائق، ثبوت اور سچائی کی بنیاد پر فیصلے کرتی ہے۔“ وکیل استغاثہ نے گہری تنبیہی سے کہا۔ ”اس طرہ کو بے گناہ یا معصوم کہہ دینے سے بات نہیں بنتی۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں میرے فاضل دوست!“ میں نے نہایت ہی اطمینان سے کہا۔ ”عدالت ٹھوس حقائق اور مضبوط دلائل کی روشنی ہی میں فیصلے کرتی ہے اسی لیے تو میں نے عرض کیا ہے کہ میں تمام حقائق اور ثبوت کو عدالتی کارروائی کے دوران میں منکشف کروں گا۔“

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوئی تو میں نے سوال کیا۔ ”البتہ کیا؟“

”پولیس والے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس ایک عینی گواہ موجود ہے۔“ وہ ابھن زدہ لہجے میں بولی۔ ”جس نے مجھے لیٹر نمبر چار سو چار کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔“

پولیس نے سہ پہر چار بجے فوریہ کو اس کے قلیٹ سے گرفتار کیا تھا جبکہ وہ لگ بھگ دو بجے اس قلیٹ پر مبنی تھی اور یہ اتنی قلیل مدت تھی کہ کوئی عینی گواہ پیدا نہیں کیا جاسکتا تھا پھر یہ سوال بھی غور طلب تھا کہ پولیس کو کیسے پتا چلا کہ فوریہ نے سفیان علی کو بہادر آباد والے قلیٹ میں قتل کر دیا ہے۔ وہ اتنی جلدی گرفتاری کے لیے اس کے قلیٹ پر کیسے پہنچ گئی۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ پولیس اسے ہر اسماں کرنے کے لیے کوئی چال چل رہی ہے۔

”آپ کو بالکل فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔ ”مصیبت چھوٹی ہو یا بڑی، اس سے بہر حال نمٹنا ہی پڑتا ہے۔ بس، آپ اپنی ہمت کو مضبوطی سے تمام کر بیٹھی رہیں اور میری ہدایات کو ذہن میں نقش کر لیں۔ باقی تمام عدالتی معاملات سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔“

اس نے اطمینان کی سانس لی اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولی۔ ”جی، حکم کریں..... میں پوری توجہ سے سن رہی ہوں۔“

آئندہ پانچ منٹ میں، میں نے فوریہ کو چند اہم ٹپس دے دیں۔ اس نے میری ہدایات کو ذہن نشین کرنے کا وعدہ کیا اور ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولی۔

”بیگ صاحب! اوپر خدا اور نیچے آپ ہیں۔ میری ساری امیدیں آپ دونوں سے ہی وابستہ ہیں۔“

”ہم دونوں سے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں کانسٹیبل بہادر حوالات کی طرف تین چار چکر لگا چکا تھا۔ وہ مڑکڑ کرنے والے انداز میں آتا تھا اور ہمیں جھانک کر واپس چلا جاتا تھا۔ میرا کام پورا ہو چکا تھا لہذا مزید وہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے فوریہ کو مناسب الفاظ میں تسلی بخشی دی اور تھانے سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز پولیس نے طرہ فوریہ کو عدالت میں پیش

”جناب عالی! وکیل صفائی خوب صورت باتیں کر کے معزز عدالت کی توجہ اس کیس پر سے ہٹانا چاہتے ہیں۔“ وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ ”اس سے عدالت کا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے حوالہ پولیس کیا جائے تاکہ اس کیس کا معاملہ کچھ آگے بڑھ سکے۔“

میں نے جج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”جناب عالی! یہ بات میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری مٹوک کی بھی قیمت پر اپنے شوہر سفیان علی کا خون نہیں کر سکتی۔“

جج، وکیل استغاثہ اور عدالت میں موجود ہر شخص نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ جج نے سناتے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”بیگ صاحب! آپ اپنے اس دعوے کے حق میں کچھ کہنا چاہیں گے؟“

”ضرور کہنا چاہوں گا جناب عالی!“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آج اکیس فروری ہے۔ گزشتہ روز یعنی بیس فروری، وقوعہ کی سہ پہر میری مٹوک کو اس کے گھر سے، اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے جبکہ صرف آٹھ روز پہلے یعنی بارہ فروری کو میری مٹوک نے اپنے شوہر کے خلاف فیملی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا تھا۔ مذکورہ عدالت کی جانب سے مقتول سفیان علی کو بائیس فروری کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم نامہ جاری کیا گیا تھا اور بیس فروری کو سفیان علی قتل ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی حیرت اور اچھٹے کی بات نہیں؟“

”بیگ صاحب!.....“ میری بات کے مکمل ہونے پر جج نے کہا۔ ”آپ کی مٹوک نے کس سلسلے میں فیملی کورٹ میں مقتول کے خلاف مقدمہ دائر کر رکھا تھا؟“

”جناب عالی..... خلع کا کیس!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”خلع کا کیس؟“ جج کے لہجے میں الجھن در آئی۔ ”ییس سر!“ میں نے اٹل انداز میں کہا۔ ”میری مٹوک اپنے شوہر کے ساتھ ہرگز ہرگز نہیں رہنا چاہتی تھی..... کیوں؟ اس سوال کا جواب بہت طویل ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو عدالتی کارروائی کے دوران میں، میں اس معاملے کی وضاحت بھی کر دوں گا.....“ لمبائی تو قف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ملزم فوزیہ نے اپنے شوہر یعنی مقتول سفیان علی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بارہ فروری کو میری وکالت کے ساتھ ایک فیملی کورٹ میں خلع کا مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ عدالت یہ خوبی جانتی ہے کہ خلع کے کیسز کا فیصلہ بیوی کے حق میں ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ فروری کے اختتام یا زیادہ سے زیادہ مارچ کے وسط تک میری مٹوک کو تو ویسے بھی مقتول سے نجات حاصل ہو ہی جاتا تھی پھر وہ اسے قتل کرنے کی حماقت کیسے کر سکتی ہے اور..... اگر اسے مقتول کی زندگی کا چراغ گل کر کے ہی مٹی پاتا تھی تو پھر اس غریب کو میرے جیسے مہنگے وکیل کی بھاری فیس ادا کر کے خلع کا مقدمہ دائر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

پھر میں نے خلع والے کیس کی نقول والی فائل جج کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس فائل کے اندر موجود تمام کاغذات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ سفیان علی کو میری مٹوک نے قتل نہیں کیا۔“

جج نے سرسری انداز میں اس فائل کی ورق گردانی کی اور پھر وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

”یہ ملزم فوزیہ کی کوئی گہری چال بھی ہو سکتی ہے جناب عالی!“ وہ خاصے پُر جوش انداز میں بولا۔ ”اس نے پہلے خلع کا مقدمہ دائر کیا پھر ایک سازش کے تحت مقتول سفیان علی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خلع کا مقدمہ اس پیش بندی کا شائبہ نہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں ملزم پر خلع کی گنجائش باقی نہ رہے اور..... میرے فاضل دوست اسی پیٹرن پر چل کر ملزم کی درخواست ضمانت منظور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فوزیہ مجرم ہے..... جائے وقوعہ کے چپے چپے پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ اسی نے مقتول سفیان علی کو موت کی نیند سلا یا ہے۔“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ”وکیل سرکار میری مٹوک کو مجرم گردان کر عدالتی قواعد و ضوابط کی توہین کر رہے ہیں۔ جب تک کسی ملزم کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا اسے مجرم نہیں کہا جاسکتا۔ علاوہ ازیں، میرے فاضل دوست نے بہت زور دے کر کہا ہے کہ میری مٹوک ہی نے مقتول سفیان علی کو موت کی نیند سلا یا ہے۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے وکیل استغاثہ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا انہوں نے اپنی آنکھوں سے میری مٹوک کو قتل کی یہ ذرا دات کرتے ہوئے دیکھا ہے؟.....“

”ملزم کا جرم ثابت نہیں ہوا تو بہت جلد ثابت ہو جائے

مذمہ کو پولیس کی تحویل میں دینے کے احکام جاری کر دیے۔ پہلے بھی میں کئی بار اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت نہایت ہی مشکل اور نامکن ہوتی ہے۔ اس کیس میں یہ قول استغاثہ، اس کے پاس اس واردات کا ایک یعنی شاہد بھی موجود تھا۔ علاوہ ازیں جائے وقوعہ کے متعدد مقامات پر ملزمہ کے فنگر پرنٹس بھی ملے تھے لہذا اس کی درخواست ضمانت منظور ہونے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

میں نے اس ایک ہفتے میں بھاگ دوڑ کر کے اپنی مرضی اور کام کی بہت سی باتیں جمع کر لیں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں مجھے کسی مرحلے پر دقت کا سامنا نہ ہو۔ سردست میں اس کی تفصیل آپ کی خدمت میں پیش نہیں کروں گا۔ مناسب موقع پر سب کچھ خود بخود آپ کے سامنے آ جائے گا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ ابتدائی چند پیشیاں تلبیخی کارروائی کی نذر ہوئیں۔ لگ بھگ دو ماہ کے بعد اس کیس کی باقاعدہ ساعت کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزمہ نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد ملزمہ فوزیہ کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان دیا تھا۔ اپنی اور مقتول کی زندگی کا گویا ایک سرے کر کے رکھ دیا تھا۔ اس بیان میں میری مٹکل نے نہایت ہی حققی آمیز انداز میں مقتول کے لیے بے غیرت، بے شرم، آوارہ، کمینہ، بدمعاش، عیاش، بدقماش، شیطان، مکروہ، بدذات، بدکار، ہوس پرست، سفاک اور ظالم جیسے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اپنے بیان کے اختتام پر اس نے ایک جذباتی جملہ بھی ٹانک دیا تھا حالانکہ میں نے حوالات میں ملاقات کے وقت بڑی سختی کے ساتھ اسے اس نوعیت کی جذباتی غلطی سے باز رکھنے کی تلقین کی تھی۔ بہر حال، اس معاملے کو اب مجھے ہی ٹیکل کرنا تھا۔ فوزیہ نے بڑی نفرت سے عدالت کے روبرو یہ کہا تھا۔

”اگر اس نامراد کو قتل ہی کرنا ہوتا تو مجھے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے خلع کا مقدمہ دائر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں اگر..... وہ اس کیس کو خراب کرنے کی کوشش کرتا یا اس کیس کا فیصلہ میرے حق میں ہو جانے کے بعد وہ کسی دوسری نوعیت کی کمیٹیکسی لگ لگ جاتا تو میں نتائج کی پروا کے بغیر موقع ملنے ہی اس کی جان لینے سے ایک

گا۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”اور جہاں تک ملزمہ کا قتل کی واردات میں ملوث ہونے کا سوال ہے تو مناسب وقت آنے پر اس امر کا شوش ثبوت بھی مہیا کر دوں گا۔ ہمارے پاس ایک چشم دید گواہ بھی موجود ہے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے سانس درست کرنے کو تھما پھر اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جناب عالی! جائے وقوعہ پر متعدد مقامات پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں اور استغاثہ کے پاس جو عینی شاہد ہے اس نے ملزمہ کو جائے وقوعہ پر جاتے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر ملزمہ کی ضمانت قبول کر لی گئی تو تفتیش کے راستے میں ان گنت رکاوٹیں کھڑی ہو سکتی ہیں لہذا میری عدالت سے استدعا ہے کہ ملزمہ کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے عرصہ سات یوم کا ریمانڈ دے دیا جائے تاکہ جلد از جلد اس مقدمے کا چالان پیش کر دیا جائے۔“

”یور آئر.....!“ وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ”میری مٹکل بالکل بے قصور ہے۔ اسے کسی سوچ سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جارہی ہے فی الحال میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ اس سے آگے والی عدالتی کارروائی کے متاثر ہونے کا شدید خدشہ ہے۔ میری مٹکل کسی بھی قیمت پر اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تھی اور وہ اسے طلاق دینے کے حق میں نہیں تھا۔ مقتول نے طلاق والے معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ سب طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہی اس مجبور و بے بس عورت نے انصاف کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ خلع کا مقدمہ اس کی مجبوری اور..... کے کسی کا کھلا ثبوت ہے۔ دونوں جانب سے حالات و واقعات، ثبوت و شواہد بعد میں عدالتی کارروائی کے دوران میں بھی دسکس کیے جاسکتے ہیں۔ سردست میں معزز عدالت سے پر زور اپیل کروں گا کہ میری مٹکل کی درخواست ضمانت قبول کرتے ہوئے اس کی جھٹکڑی کھولنے کے احکام صادر کیے جائیں۔“

”یور آئر! ملزمہ فوزیہ ایک خطرناک اور عیار عورت ہے۔“ وکیل استغاثہ نے ملزمہ کی ضمانت رکوانے کے لیے ایک بار پھر زور مارا۔ ”اگر اس کی ضمانت منظور کر لی گئی تو تفتیش کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔“

ہمارے درمیان مزید پندرہ بیس منٹ تک اسی نوعیت کی ٹوک جھونک چلتی رہی پھر جج نے میری مٹکل کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے سات روز کے لیے

”جی“ میں سے غلام نبی۔ میں دراصل یہ سمجھا تھا کہ ”اے جی“ شاید کوئی ڈگری وغیرہ ہے یا پھر..... ”اے جی“ کا مطلب اکاونٹ جنرل ہے..... جے ”اے جی سندھ“ بھی کہا جاتا ہے۔“

اس نے میرے تبصرے پر کچھ کہنا مناسب نہ جانا اور چپ چاپ گہری نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”اے جی صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“

”ہمارے روزنامے کے مطابق، یہ اطلاع وقوعہ کے روز یعنی میں فروری کو بذریعہ ٹیلی فون دی گئی تھی۔“ وہ پُرسوج نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور اطلاع کتندہ کا نام ہے نورین.....“

”نورین.....!“ میں نے زیر لب دہرایا پھر مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ نورین کون ہے؟“

”مقتول کی بیوی..... میرا مطلب ہے، مقتول کی بیوہ۔“

”لیکن مقتول کی ایک بیوہ کا نام تو رضوانہ ہے۔“

میں نے تیز نظر سے تفتیشی افسر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اور دوسری بیوی اس کیس کی ملزمہ اور میری مکمل فوری ہے.....“

آپ نے یہ تیسری بیوی کہاں سے پیدا کر لی..... میرا مطلب ہے، کہاں سے نکال لی؟“

وہ میرے اس جیسے ہوئے سوال پر تملاکر رہ گیا

تاہم کوئی سخت قسم کا ردِ عمل ظاہر کرنے کے بجائے اس نے طنز آمیز لہجے میں جواب دیا۔

”نورین کو میں نے نہیں بلکہ اس کے والدین نے پیدا کیا ہے اور جہاں تک کہیں سے نکالنے کا تعلق ہے تو اس میں بھی میرا کوئی ہاتھ نہیں۔“ مقتول نے اس سے باقاعدہ

نکاح کر کے اسے بہادر آباد والے فلیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ مقتول کی تیسری بیوہ ہے۔ نقل چونکہ اس کے فلیٹ پر ہوا تھا

اس لیے اسی نے تھانے فون کر کے ہمیں اس واردات کی اطلاع دی تھی۔“

”اے جی صاحب!“ میں نے جرح کے سلسلے کو

نہایت ہی سنجیدگی سے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ

نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اطلاع آپ کو کتنے بجے دی گئی تھی؟“

”لگ بھگ ڈھائی بجے.....!“ اس نے جواب دیا۔

”یعنی دو بج کر تیس منٹ پر؟“

”جی ہاں..... ڈھائی کا مطلب، دو بج کر تیس منٹ

ہی ہوتا ہے۔“ وہ برا سامنے بناتے ہوئے بولا۔

لحے کے لیے بھی نہ چکتی چاہے اس کے لیے بعد میں مجھے کتنی بھی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑتا۔“

ٹھیک ہے، یہ فوریہ کا ایک جذباتی بیان تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جوش بھرے الفاظ اس کے احساسات کی

سچائی کی ترجمانی بھی کرتے تھے۔ حالات نے اس دکھوں

کی باری کو گھٹ گھٹ کر چھنے کے بجائے ایک ہی بار اذیت

سے گزر کر مر جانے پر راضی کر لیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر ”مرویا

ماردو“ کے اصول پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس

نے اپنے حلیہ بیان میں نرس کی ٹیلی فون کال کی بھی تفصیل

شامل کر دی تھی جو اس کے کیس کو مضبوطی بخشتی تھی۔

استغاثہ کی جانب سے گواہان کی نہایت ہی مختصری

فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہوں کا

تذکرہ کروں گا جن کے بیان میں کام کی کوئی بات موجود

ہوگی یعنی گواہوں کی یہ فہرست اور بھی مختصر ہونے کے روشن

امکانات ہیں۔

استغاثہ کی جانب سے شہادتوں کا سلسلہ شروع ہونے

سے قبل ہی میں نے جج سے درخواست کی۔ ”یور آنز..... میں اس

کیس کے تفتیشی افسر سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

جج نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔

اگلے ہی لمحے تفتیشی افسر وینس باکس (گواہوں

والے کٹہرے) میں آکر کھڑا ہو گیا۔ کبھی کیس میں تفتیشی

افسریاں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی

ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا

ہے۔ اس کیس کا انکوائری آفیسر عہدے کے لحاظ سے ایک

اے ایس آئی تھا۔ وہ ایک فربہ اندام مگر چست و چالاک

پولیس والا تھا۔

میں گواہوں والے کٹہرے کے قریب آگیا اور آئی او

کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”آئی او صاحب!

مجھے پتا چلا ہے، آپ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ”اے جی“ کے

نام سے جانے اور پکارے جاتے ہیں۔ یہ ”اے جی“ کیا

شے ہے؟“

”اے جی!“ وہ زیر لب مکرراتے ہوئے بولا۔

”مطلب عبدالغفار۔“

وہ ایک پست قامت، فربہ اور پھولے پھولے گالوں

والا اے ایس آئی تھا اور جب وہ سکراتا تھا تو اس کے گالوں

میں ڈھپل بھی پڑتے تھے۔ میں نے اس کے جواب پر

سرسری انداز میں کہا۔

”اوہ..... اچھا..... جیسے ”اے ڈی“ سے اللہ دتا اور

آپ نے کیا دیکھا؟“

”جب میں اور دو ماتحت اہلکار جائے واردات پر پہنچے تو دروازہ مقتول کی بیوی نورین نے کھولا تھا۔ وہ ہمیں سیدھی بیڈروم میں لے گئی۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور بیڈروم میں، بیڈ کے اوپر مقتول سفیان کی لاش پڑی تھی۔“

”بیڈ پر لاش پڑی تھی؟“ میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”مطلب، پہلی نظر دیکھ کر ہی آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سفیان علی کو اب زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا؟“

”جی ہاں، یہی بات ہے۔“ اس نے ایک بار پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس کی کھوپڑی کا جو حشر ہو چکا تھا اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی۔ سارا لباس اور بیڈ کا کچھ حصہ بھی خون آلود تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ سفیان علی موت کے گھاٹ اتر چکا ہے۔“

”اوکے اے جی صاحب!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو تو جسے پڑھا ہے؟“

”جی ہاں..... پوری تو جیسے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”پڑھا تو میں نے بھی ہے.....“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں آپ سے چند امور کی تصدیق چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے چند سوالات کے مختصر جوابات دینا پسند فرمائیں گے؟“

”ضرور..... آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں.....“ میں نے پوچھا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتول سفیان علی کی موت تین فروری کی دوپہر ایک اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی؟“

”جی ہاں.....!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس کی کھوپڑی پر سائینسٹر لگے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور سے فائر کیا گیا تھا۔؟“

”درست.....!“

”صرف ایک گولی نے مقتول کا کام تمام کر دیا تھا؟“

”جی..... رپورٹ یہی بتاتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کھوپڑی کے اندر دھنسنے والی کوئی نہ اس کی کھوپڑی کے پرچے اڑا دیے تھے اور بھیجا کھوپڑی کے اندر سے نکل کر ادھر ادھر بکھر گیا تھا۔“

”اور یہ فائر..... بے آواز فائر بہت نزدیک سے کیا

”اوکے.....!“ میں نے اس کی تکلیف پر بھایا رکھتے ہوئے کہا پھر سوال کیا۔ ”مقتول کی بیوہ نورین نے اپنے شوہر مقتول سفیان علی کی موت کی اطلاع کن الفاظ میں دی تھی؟“

”صرف ایک لائن میں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جلدی پہنچیں۔ کسی نے میرے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔“

”آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ نورین نے اپنی آنکھوں سے مقتول کو قتل ہوتے دیکھا تھا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”مگر نورین نے اپنی آنکھوں سے یہ قتل ہوتے دیکھا ہوتا تو پھر اس کے الفاظ یہ ہوتے..... جلدی پہنچیں۔ فوزیہ نے میرے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔“

”تو گویا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ نورین، فوزیہ کی صورت آشنا ہے؟“

”سنوٹوں کو ایک دوسرے کی صورت آشنا تو ہوتا ہی چاہیے۔“ وہ متذبذب انداز میں بولا اور بات ختم کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”یہ کوئی فارمولہ نہیں ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”اس نوعیت کی شادیوں میں شوہر عموماً اپنی دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی کو اپنی پہلی یا دوسری یا تیسری بیوی سے چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ نقص اس کا خطرہ پیدا نہ ہو اور وہ اپنے نصیب کی آسپین کو اپنی مرضی سے پیچھڑوں میں اتارتا رہے۔“

اس نے میری وضاحت پر کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”ٹھیک تین بجے سہ پہر۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور ٹھیک چار بجے آپ نے میری مٹکلی کو اس کے گھر سے اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایم آئی رائٹ.....؟“

”جی، آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کم و بیش چار بجے میں نے ملزمہ فوزیہ کو گرفتار کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے غیر محسوس انداز میں اپنا جال پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ ٹھیک تین بجے جائے وقوعہ یعنی نورین کے فلیٹ واقع بہادر آباد پہنچے۔ فلیٹ کے اندر

کیا تھا؟“

ہے.....؟“

”نہیں.....!“

”تھیک پوائے جی صاحب!“ میں نے تفتیشی افسر پر جرح ختم کرتے ہوئے کہا پھر روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“

آئی او نے سکھ کی ساس لی۔ اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے کوئی گواہ مزید پیش کرنے کی نوبت نہیں آسکی کیونکہ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر آئی فہیدہ کو استغاثہ کی جانب سے پیش کیا گیا۔ آئی فہیدہ کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ وہ درمیانے قد اور بھاری بھر کم بدن کی مالک ایک قبول صورت عورت تھی۔ اس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ موسم کی مناسبت سے اس نے پرنٹڈ لان کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔

فہیدہ آئی اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا چکی تو وکیل استغاثہ نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ میں نے استغاثہ کے اس کردار سے متعلق اپنی تحقیقات مکمل کر کے اچھی خاصی مفید معلومات حاصل کر لی تھیں۔

وکیل استغاثہ نے فہیدہ آئی کو اپنی جرح کے رگڑے سے نکالا تو میں سوالات کے لیے وٹس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے استغاثہ کی گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”فہیدہ صاحبہ! میں آپ کو آئی فہیدہ کہوں یا فہیدہ آئی؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تاہم ضبط کا پلو بڑی احتیاط سے تھامتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ”وکیل صاحب! آپ مجھے صرف فہیدہ کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”فہیدہ صاحبہ!“ میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ ”آپ کی رہائش کس جگہ پر ہے؟“

”طارق روڈ پر۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”طارق روڈ پر کس جگہ؟“

”وہیں..... جہاں ملزمہ فوزیہ کی رہائش ہے۔“ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں بھی اسی بلڈنگ میں رہتی ہوں۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ مقتول پر گولی اس کی بے خبری میں چلائی گئی تھی۔“ میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ”اور یہ گولی مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے سے اس کے پیچھے میں داخل ہوئی تھی یعنی..... قاتل نے مقتول کے عقب سے نہایت ہی کم فاصلے سے اس پر ایک بے آواز فائر کیا تھا؟“

”جی ہاں..... یہی حقیقت ہے۔“ وہ پُر یقین انداز میں بولا۔

میں نے جرح کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے اپنے سوالات میں تیزی پیدا کی اور پوچھا۔ ”یقیناً موقع واردات کی ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد ہی آپ نے ملزمہ کے کھر کا رخ کیا ہوگا؟“

”ظاہر ہے.....!“

”آپ کس کی نشان دہی یا راہنمائی میں ملزمہ فوزیہ کو گرفتار کرنے طارق روڈ کی سمت لپکے تھے؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ”نورین نے فوزیہ کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو وہ پہچان نہیں سکتی تھی کیونکہ آپ ہی کے مطابق وہ ایک دوسرے کی صورت آشنا نہیں ہیں پھر..... پھر آپ نے یہ معاملہ کس طرح ٹھیک کیا؟“

”بات دراصل یہ ہے جناب.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”میں جانے وقوعہ سے ایک ایسا گواہ مل گیا تھا جس نے ملزمہ کو نورین کے فلیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ.....“

”اچھا اچھا.....“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”کہیں یہ وہی گواہ تو نہیں جس کا استغاثہ رپورٹ میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا؟“

”جی..... جی ہاں وہی!“

”کیا میں اس گواہ کا نام جان سکتا ہوں؟“

”فہیدہ..... آئی فہیدہ!“ اس نے جواب دیا۔

”تو آپ کا دعویٰ ہے کہ یہ یعنی شاہد فہیدہ آئی ملزمہ فوزیہ کو شکل سے اچھی طرح پہچانتی ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی بالکل.....!“ اس نے پُر وثوق انداز میں گردن ہلائی۔

”کیا فہیدہ آئی نورین کو بھی پہچانتی اور جاتی

جس کے ایک فلیٹ..... نمبر چار سو چار میں سفیان علی بڑی....
 بے دردی سے سر میں گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا؟“
 ”جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔“
 ”آپ کی خالہ کا نام کیا ہے؟“
 ”صفیہ خالہ.....!“
 ”آپ کی صفیہ خالہ اس بلڈنگ کے کس فلیٹ میں
 رہتی ہیں؟“

”فلیٹ نمبر چھ سو دو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”چھٹے
 فلور پر.....“
 ”کیا آپ اکثر اپنی صفیہ خالہ سے ملنے اس بلڈنگ
 میں جاتی رہتی ہیں؟“
 ”جی ہاں.....!“

”آپ نے ملزمہ فوزیہ کو کس وقت فلیٹ نمبر چار سو
 چار میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”میرا مطلب ہے، جب آپ اپنی صفیہ خالہ سے ملنے
 جا رہی تھیں یا جب وہاں سے واپس آ رہی تھیں؟“
 ”جب میں اپنی خالہ سے ملنے جا رہی تھی۔“ اس نے
 جواب دیا۔ ”اے اس بلڈنگ میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی
 لیکن میں نے اس سے بات کرنا یا کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا
 اور سیدھی اپنی خالہ کے فلیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔“
 ”کیا ملزمہ فوزیہ نے بھی آپ کو اس بلڈنگ میں دیکھ
 لیا تھا؟“

”ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ”میرا
 خیال ہے..... نہیں.....!“

”ابھی تک آپ نے میرے جن سوالات کے جوابات
 دیے ہیں ان میں سے کسی میں کوئی تبدیلی تو نہیں کرتا؟“
 میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
 ”بالکل نہیں..... میں نے جو بھی بتایا ہے، سولہ آنے
 سچ بتایا ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”آپ یہ بات
 کیوں پوچھ رہے ہیں وکیل صاحب؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہ جانا
 اور سوالات کے سلسلے کو ایک انوکھا موڑ دیتے ہوئے پوچھا۔
 ”آپ کی نشان دہی اور راہنمائی میں پولیس نے میری
 مڑوکل کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تھا اور اس امر کی تصدیق
 پچھلی پیشی پر انکوائری آفیسر اے جی نے بھی کی ہے۔ میں
 اپنی معلومات کی خاطر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کس
 طرح پولیس کی راہنمائی فرمائی تھی..... کیا آپ بھی پولیس
 کے ساتھ ہی واپس طارق روڈ والے فلیٹ پر گئی تھیں یا بس

اب کی بار فوزیہ نے بڑی حیرت سے اس کی جانب
 دیکھا۔ اس کی حیرانی بجا تھی کیونکہ وہ اس حقیقت سے واقف
 نہیں تھی کہ فہمیدہ بھی اسی بلڈنگ کی رہائشی تھی جہاں وہ خود
 رہتی تھی۔ میں نے فہمیدہ کے حوالے سے تحقیق کرتے ہوئے
 اس امر کی تصدیق کر لی تھی، تاہم فوزیہ کو اس حوالے سے کچھ
 نہیں بتایا تھا۔ فہمیدہ آنٹی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ واقعی اسی
 بلڈنگ کی رہائشی تھی۔

”لیکن فہمیدہ صاحبہ.....!“ میں نے گواہ کے
 چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میری مڑوکل اور اس کیس
 کی ملزمہ تو آپ کو نہیں جانتی۔ اس نے بھی آپ کو اپنی
 بلڈنگ میں نہیں دیکھا تھا؟“

”دراصل، مجھے اس بلڈنگ میں رہائش اختیار کیے
 ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے
 بولی۔ ”ملزمہ کا فلیٹ سیکنڈ فلور پر واقع ہے جبکہ میں فورٹھ فلور
 کے ایک فلیٹ میں کرائے دار کی حیثیت سے آئی ہوں۔ اسی
 لیے فوزیہ کو میرے بارے میں کچھ علم نہیں۔“

”کمال کی بات ہے فہمیدہ صاحبہ۔“ میں نے
 استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”میری مڑوکل تو آپ کو جانتی تک نہیں
 آپ اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتی ہیں۔“
 ”یہ تو اپنی اپنی جان کا کارڈ کی بات ہے وکیل صاحب!“

”بالکل درست فرما رہی ہیں آپ۔“ میں نے سرسری
 انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے
 کہ آپ استغاثہ کی سب سے زیادہ اہم اور معتبر گواہ ہیں؟“
 ”میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں ایک گواہ
 ہوں۔“ وہ بڑی سادگی سے بولی۔

”صرف گواہ نہیں فہمیدہ صاحبہ!“ میں نے ایک ایک
 لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیس میں استغاثہ کی
 جانب سے آئی وٹنس یعنی عینی گواہ کی حیثیت سے آج
 عدالت میں پیش ہوئی ہیں۔ وقوعہ کے روز آپ نے میری
 مڑوکل فوزیہ کو بہادر آباد والے نورین کے فلیٹ میں داخل
 ہوتے دیکھا تھا۔“

”جی ہاں..... یہ درست ہے۔“ اس نے اثبات میں
 گردن ہلائی۔

”کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ آپ وقوعہ کے روز
 بہادر آباد والی پارمنٹ بلڈنگ میں کیا کر رہی تھیں؟“

”میں وہاں اپنی خالہ سے ملنے گئی تھی۔“ اس نے
 جواب دیا۔
 ”اچھا..... تو آپ کی خالہ بھی اسی بلڈنگ میں رہتی ہیں

”ابھی تک آپ نے میرے جن سوالات کے جوابات دیے ہیں ان میں سے کسی میں کوئی تبدیلی تو نہیں کرتا.....؟“

”نک“ کیا مطلب ہے آپ کا.....“ وہ نکلی آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”یہ سوال آپ پہلے بھی مجھ سے کر چکے ہیں۔“

”آنجناب یور آنر.....!“ وکیل استغاثہ غرہ مستانہ لگاتے ہوئے فوراً اپنی گواہ کی مدد کو لپکا۔ ”جناب عالی! میرے فاضل دوست استغاثہ کی معزز گواہ کو خوشگواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے ہتھکنڈے آزمانے سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

رج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ”جناب عالی! میرے اس سوال کا ایک خاص مقصد ہے۔ اگر استغاثہ کا گواہ صرف ایک بار جواب دے دے تو میں آئندہ بھی بھی ان سے یہ سوال نہیں کروں گا۔“

اب کی بار رج نے سوالیہ انداز میں فہمیدہ آہنی کی طرف دیکھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر سب کچھ بجا بتایا ہے۔ آپ کی مرضی ہے، میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔“

”آپ نے کہا اور میں نے یقین کر لیا فہمیدہ ماسی!“

میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

فہمیدہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گر کر گیا۔ اس نے گہرا کروٹیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ وکیل استغاثہ کچھ زیادہ ہی جوش میں آگیا اور آئندہ لہجے میں بولا۔

”جناب عالی! وکیل صفائی نے تمام اخلاقی حدود کو باہال کر دیا ہے۔ استغاثہ کی معزز گواہ کو ماسی..... یعنی نوکرانی کہہ دینا انتہائی گری ہوئی حرکت ہے..... اسے اٹاؤ بچ پور آنر.....!“

وکیل استغاثہ کے اعتراض پر رج نے تشویش بھرے انداز میں مجھے گھورا اور پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ نے استغاثہ کی گواہ کے لیے اس قسم کے الفاظ کیوں استعمال کیے ہیں..... عدالت وضاحت چاہتی ہے۔“

”جناب عالی!“ میں نے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ اپنی معلومات کے دریا بہاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”پھول کو پھول، مالی کو مالی اور گالی کو گالی کہنا کسی بھی طور اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں ہو سکتی اسی طرح.....“

میں نے دانت توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اسی طرح ماسی کو ماسی کہنا بھی کوئی جرم نہیں پور آنر!“

انہیں میری ٹوکل کا ایڈریس سمجھا دیا تھا؟“

”میں ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔“ اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”بس انہیں گناہ کر دیا تھا۔“

”آپ کا گھر بھی اسی بلڈنگ میں واقع ہے جہاں ملزم کی رہائش ہے۔“ میں نے کرید کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ جتنا بڑا واقعہ پیش آیا تھا اس میں تو آپ کو فوراً اپنے گھر کی جانب ریس ہو جانا چاہیے تھا پھر آپ اطمینان سے اپنی صفیہ خالہ کے گھر میں کیوں بیٹھ رہی تھیں؟“

”میں کسی خاص کام سے صفیہ خالہ سے ملنے گئی تھی اور جب تک وہ کام ہونے جاتا، میں واپس نہیں آسکتی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”پھر یہ واقعہ میرے وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی پیش آ گیا تھا۔“

”چند منٹ.....!“ میں نے پوچھا۔ ”مثلاً کتنے منٹ؟“

”بہی کوئی دس پندرہ یا بیس منٹ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں ابھی جا کر اپنی خالہ کے پاس بیٹھی ہی تھی کہ نیچے سے شورا اٹھا۔ پھر پتا چلا کہ چوتھے فلور کے ایک فلیٹ میں کسی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس بھی تفتیش کے لیے موقع پر پہنچ گئی۔“

”آپ کب اس تحقیقاتی کمیشن یا تفتیشی ٹیم میں شامل ہوئی تھیں؟“ میں نے طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔ ”مطلب یہ کہ پولیس نے آپ سے کب رابطہ کیا یا آپ نے کب پولیس کو بتایا کہ آپ نے میری ٹوکل اور اس مقدمے کی طر مرفوز یہ فلیٹ نمبر چار سو چار کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب کہ جب یہ شور اٹھا کہ فلیٹ نمبر چار سو چار میں کسی بندے کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے تو میرا ہاتھ اٹھنا کیونکہ میں نے بیس بیچیس منٹ پہلے اسی فلیٹ میں فوریہ کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ میں گھر سے نکلی اور چوتھے فلور پر آ گئی۔ خالہ صفیہ بھی میرے ہمراہ تھیں۔ چوتھے فلور پر پولیس تفتیش کرتے ہوئے مختلف لوگوں کے بیانات بھی لے رہی تھی۔ جب مجھ سے انہوں نے پوچھا تو میں نے انہیں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔“

”وہ پھر..... آپ کی نشاندہی پر سیدھے طارق روڈ پہنچے اور آغا فانا میری ٹوکل کو گرفتار کر کے لے گئے۔“ میں نے کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا فہمیدہ صاحبہ.....؟“

”نہیں جی..... آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“

”فہمیدہ صاحبہ!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

بھی خاصا جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ گھبرا گئی اور جلدی سے بولی۔
 ”او..... ہاں..... جی بالکل..... وہ بھی میری سگی خالہ
 ہیں..... آپ نے اچانک سوال کیا تو میں الجھ کر رہ گئی تھی.....“
 ”کوئی بات نہیں۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے
 کہا۔ ”اگر تم اس اجنبی سے نکل آئی ہو تو میں سوالات کے
 سلسلے کو آگے بڑھاؤں؟“

”جج..... جی..... ضرور.....“ اس نے انک انک کر کہا۔
 ”فہیدہ!“ میں نے یہ دستور سخت لہجے میں کہا۔
 ”تھوڑی دیر پہلے تم نے میرے ایک سوال کے جواب میں
 معزز عدالت کو بتایا تھا کہ دفعہ کے روز تم کسی خاص کام سے
 اپنی صفیہ خالہ سے ملنے مقتول والی بلڈنگ میں گئی تھیں یعنی
 بہادر آباد والی اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں جہاں نورین اور
 فوزیہ اور رضوانہ کے شوہر سفیان علی کو قتل کر دیا گیا تھا؟“
 ”جی بالکل..... میں نے یہی بتایا ہے۔“ اس نے

منحصر جواب دیا۔

”وہ ضروری کام کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”جو جب
 تک ہونے جاتا، آپ وہاں سے واپس نہیں آ سکتی تھیں؟“
 ”کیا اس کام کا ذکر کرنا ضروری ہے؟“ وہ ہنسی بھری
 ”جی ہاں۔۔۔ بہت ضروری ہے۔“ میں نے ایک
 ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ نہیں بتائیں گی تو
 مجبوراً اس کا ذکر کرنا پڑے گا کیونکہ میں تو صفیہ خاتم کو بھی
 اچھی طرح جانتا ہوں اور رضیہ خالہ کو بھی.....!“
 اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ایسا
 محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بری طرح پھنس گئی ہو۔ میں نے
 ٹھوس انداز میں کہا۔ ”آپ بتا رہی ہو یا میں یہ قصہ
 شروع کروں؟“

”آئی جیشن پور آؤ!“ وکیل استغاثہ فوراً اپنے سب
 سے اہم گواہ کی مدد کو لپکا۔ ”میرے فاضل دوست خواجہ
 کے سوالات سے استغاثہ کی گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش
 کر رہے ہیں۔“

”میں نہ تو آپ کی گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر
 رہا ہوں اور نہ ہی میرا یہ سوال خواجہ کا ہے۔“ میں نے
 ترکی یہ ترکی کہا۔ ”میں تو معزز عدالت کی جانب سے پوچھے
 گئے ایک سوال کی وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“
 پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور نہایت ہی
 مؤدب لہجے میں کہا۔

”جناب عالی! میرے ایک انکشاف کے جواب میں
 آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ..... آپ کا مطلب ہے،

”آپ کا مطلب ہے، استغاثہ کی گواہ فہیدہ گھروں
 میں کام کرنے والی ایک نوکرائی ہے.....؟“ جج کے استفسار
 سے بے چینی جھلکتی تھی۔
 ”دریں چہ شک!“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔
 ”اور میں اپنے اس دعوے کو اب بھی معزز عدالت کے سامنے
 جج بھی ثابت کر کے دکھا سکتا ہوں۔“
 ”پریشن گرائیڈ.....!“ جج نے بھاری بھر کم آواز
 میں کہا۔

”فہیدہ صاحبہ!“ میں نے استغاثہ کی گواہ کی جانب
 متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ نے ابھی تھوڑی دیر
 پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ آپ اکثر
 اپنی صفیہ خالہ سے ملنے اس بلڈنگ میں جایا کرتی تھیں؟“
 ”جی..... میں نے یہی بتایا ہے۔“ وہ تھوک نگلتے
 ہوئے بولی۔

”معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ صفیہ نامی وہ
 عورت آپ کی سگی خالہ ہے یا سوتیلی؟“ میں نے اس کی
 آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کک..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ بے ساختہ
 بولی۔ پھر گڑ بڑائے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”آپ کہنا
 کیا چاہ رہے ہیں؟“

اس دوران میں، میں استغاثہ کی سب سے اہم گواہ
 فہیدہ آنٹی کے بارے میں اچھی خاصی تحقیق اور تفتیش
 کر چکا تھا لہذا میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں
 جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ویری سہیل..... میں نے یہ پوچھا
 ہے کہ صفیہ رشتے میں آپ کی خالہ ہیں یعنی وہ آپ کی
 والدہ کی بہن ہیں یا پھر محض نام کی خالہ ہیں جیسا کہ کسی بھی
 خاتون کو خالہ کہہ دیا جاتا ہے؟“

”صفیہ خالہ میری سگی خالہ ہیں۔“ اس نے اپنے لہجے
 میں مضبوطی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ویری گڈ.....!“ میں نے استہزاء سے انداز میں کہا
 پھر پوچھا۔ ”اس کا مطلب ہے، آپ رضیہ نامی عورت کو
 بھی جانتی ہوں گی؟“

”کون رضیہ؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”کمال ہے، آپ رضیہ کو نہیں جانتیں!“ میں نے
 اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”بھئی، میں مکشن اقبال والی رضیہ کی
 بات کر رہا ہوں..... جہاں رضیہ خالہ کی سگی بہن..... کیا رضیہ
 کو خالہ کہتے ہوئے تمہیں موت آتی ہے؟“ میں اچانک
 ”آپ“ سے ”تم“ پر اترا آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا انداز

استغاثہ کی گواہ فہمیدہ گھروں میں کام کرنے والی ایک نوکرائی ہے؟“

”تو کیا ایسا ہی ہے؟“ جج نے دلچسپی لیتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔

”جناب عالی! اس سوال کا جواب تو استغاثہ کی سب سے اہم گواہ فہمیدہ آئی دیں گی..... اگر اس کی زبان کا تالا نہ کھلا تو مجبوراً مجھے یہ قصہ بیان کرنا پڑے گا۔“

”بی بی! تم کیا کہتی ہو؟“ جج نے فہمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

اس کے لیے ”نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن“ کی سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے اس نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر بولی۔

”مجھے رضیہ خالہ نے ایک ضروری کام سے صفیہ خالہ کے پاس بھیجا تھا۔“

”کون سے ضروری کام سے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”جج..... جی..... جی..... وہ..... وہ..... وہ بری طرح الجھ کر رہ گئی۔“

”کیا جج لگا رکھی ہے!“ میں نے اس پر چڑھائی کر دی۔

”صاف کیوں نہیں کہتی ہو کہ کسی زمانے میں تم گلشن اقبال میں رہتی تھیں اور رضیہ نامی اس عورت کے گھر میں ایک نوکرائی کی حیثیت سے کام کیا کرتی تھیں۔ رضیہ کی بہن صفیہ کو جب ایک نوکرائی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے اپنی بہن رضیہ سے کہا۔ رضیہ نے تم سے کہا کہ جا کر صفیہ سے مل لو اور تم اپنی ”صفیہ خالہ“ سے ملنے پہنچ گئیں۔“ میں نے صفیہ خالہ کے الفاظ پر اچھا خاصا زور ڈالا تھا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں نہیں.....“ وہ لکنت زدہ لہجے میں بولی۔ ”ایسا ہی تھا۔“

”یور آؤ!“ میں نے فاتحانہ انداز میں جج کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ میں اپنے اس دعوے کو معزز عدالت کے سامنے جج کر کے دکھا سکتا ہوں کہ استغاثہ کی گواہ فہمیدہ آئی گھروں میں کام کرنے والی ایک نوکرائی ہے تو..... یہ بات ثابت ہو چکی لیکن اتنا ثابت ہو جانا کافی نہیں ہے۔“

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب؟“ جج نے متعجب نظر سے مجھ دیکھا۔

”جناب عالی! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معزز عدالت

کے لیے یہ جانتا بہت ضروری ہے کہ رضیہ نے فہمیدہ کو صفیہ کے پاس کس کام کی غرض سے بھیجا تھا۔“

”لیکن آپ بتا تو چکے ہیں کہ صفیہ کو ایک نوکرائی کی ضرورت تھی جیسی رضیہ نے فہمیدہ کو اس کے پاس بھیجا تھا۔“ جج کے استفسار میں حیرت شامل تھی۔

”ایگزیکٹو..... میں نے یہی کہا ہے۔“ میں نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس امر کی وضاحت ہونا ضروری ہے کہ جب صفیہ کے گھر میں ایک ملازمہ پہلے سے کام کر رہی تھی تو پھر کسی اور نوکرائی کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟“

”بی بی! بتاؤ، تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو؟“ جج وٹس باکس میں کھڑی فہمیدہ سے متعجب ہوا۔

”وہ جی..... جج صاحب..... صفیہ خالہ کو نہیں..... بلکہ کسی اور کو ضرورت تھی۔“

”کس کو؟“ میں نے جج سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

”جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔“ وکیل استغاثہ ایک مرتبہ پھر بیچ میں کود پڑا۔ ”صفیہ خالہ کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق۔ وکیل صفائی ادھر ادھر کے غیر ضروری معاملات میں الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔“

اس مرتبہ میں نے وکیل استغاثہ کو آڑے ہاتھوں لیا اور درشت لہجے میں کہا۔ ”میرے فاضل دوست! نمبروں، میں ادھر ادھر کا کوئی بھی غیر ضروری سوال نہیں کر رہا ہوں۔ نمبر نو، میں جو کچھ بھی پوچھ رہا ہوں اس کا زیر سماعت کیس سے گہرا تعلق ہے۔ نمبر تھری، برائے مہربانی میری بات مکمل ہونے سے پہلے آپ صبر اور سکون کے ساتھ کھڑے رہیں.....“ پھر میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ فہمیدہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وکیل استغاثہ نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے کچا چبا جائے گا تاہم وہ منہ سے ایک لفظ نہیں بولا۔ میں نے فہمیدہ سے سوال کیا۔

”ملازمہ کی ضرورت کس کو تھی؟“

”نورین صاحبہ کو.....“ اس نے جواب دیا۔

”کون نورین؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم ای نورین کا ذکر کر رہی ہو جو نور تھر فلور کے فلیٹ نمبر چار سو چار میں رہتی ہے اور اسی فلیٹ میں اس کے شو ہر سفیان علی کو کسی نے قتل کر دیا تھا؟“

”جی وہی نورین صاحبہ، اس نے اثبات میں گردن

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو



3 Plus SHAMPOO

SHIKAKAI

ANTI DANDRUFF

AMLA

HERBAL

ANTI-LICE

EGG

KALONJI

اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا آپ نے یہ نظر کا چشمہ لگا رکھا ہے؟“

”جی! اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”دور کا یا نزدیک؟“

”دور کا۔“

”کیا آپ کے ساتھ یورک ایئز کا بھی کوئی مسئلہ ہے؟“

میں نے بڑی صفائی کے ساتھ اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

”یورک ایئز..... یہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے اچھن زدہ

لہجے میں پوچھا۔

”یہ ایک خاص قسم کا کیمیکل ہے جس کی ایک خاص مقدار ہر انسان کے جسم میں موجود ہوتی ہے۔“ میں نے سادہ الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس مخصوص مقدار میں اگر کسی قسم کی گڑبڑ ہو جائے یعنی کسی یا زیادتی ہو جائے تو انسان کے جوڑوں وغیرہ میں ورم آجاتا ہے اور چلنے پھرنے میں خاصی دشواری بلکہ تکلیف ہوتی ہے۔“

”جی ہاں..... جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ

رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے

بولی۔ ”میرے گھٹنوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہے۔ ٹھنڈے

موسم میں تو درد کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چلنا پھرنا

محال ہو جاتا ہے۔“

”خاص طور پر رزے چڑھنا تو کسی عذاب سے کم نہیں

ہوتا۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”میں نا؟“

”جی بالکل!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”جب آپ طابق روڈ پر کرانے کا فلیٹ لے رہی

تھیں تو اس وقت بھی آپ نے یہ پوچھا تھا کہ وہ فلیٹ کس

فلور پر ہے۔ آپ کو بتایا گیا کہ فلیٹ چوتھے فلور پر ہے تو

آپ کو یہ سن کر اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس وقت آپ کی مجبوری

تھی لہذا آپ نے وہ فلیٹ لے لیا، حالانکہ ڈیبر اور جوری

میں اچھی خاصی ٹھنڈک ہوتی ہے اور گھٹنوں کے درد کے

ساتھ چوتھے فلور پر چڑھنا اور اتارنا ایک عذاب ناک عمل

ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس

نے میرے موقف کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر مجبوری نہ

ہوتی تو میں کبھی چوتھے فلور کا فلیٹ کرانے پر نہ جیتا۔“

”کیا آپ اپنی اس مجبوری کی وضاحت کریں گی؟“

میں نے جیسے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”وہ..... وہ..... وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔“

”یہ کس قسم کی مجبوری ہے؟“ میں نے تیز بدل کر سخت

ہلائی۔ ”میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔ نورین نے اپنی ضرورت کا ذکر صفیہ خالہ سے کیا تھا۔ انہوں نے اپنی بہن رضیہ سے کہا اور اس طرح میں صفیہ خالہ کے پاس پہنچ گئی۔“

”گڈ.....!“ میں نے فہمیدہ کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، تم نورین کو اچھی طرح

جانتی ہو؟“

”اچھی طرح تو نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بس اتنا

ہی جانتی ہوں کہ وہ چوتھے فلور کے فلیٹ نمبر چار سو چار میں رہتی

ہیں اور انہیں ایک گھریلو ملازمہ کی ضرورت تھی۔“

”اس کا مطلب ہے، اس پارٹمنٹ بلڈنگ میں داخل

ہونے سے پہلے تمہیں یہ بات معلوم تھی کہ صفیہ خالہ نے تمہیں

نورین کے کام کے لیے اپنے پاس بلایا ہے۔ وہ نورین جو

چوتھے فلور کے فلیٹ نمبر چار سو چار میں رہتی ہے؟“

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن

ہلا دی۔

”اور جب تم صفیہ خالہ سے ملنے اس بلڈنگ کے چھٹے

فلور کی طرف جا رہی تھیں تو تم نے طرز مز یہ کو نورین کے فلیٹ

میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟“

”جی بالکل..... میں نے دیکھا تھا۔“ اس نے ترت

جواب دیا۔ ”اور مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ فوزیہ

یہاں کیا کر رہی ہے لیکن میں خاموشی سے صفیہ خالہ کی طرف

بڑھ گئی تھی۔“

”اور جب صفیہ خالہ کے پاس بیٹھے تمہیں دس پندرہ

منٹ ہوئے تھے تو بیٹے ایک شورا اٹھا۔ پھر پتا چلا کہ چوتھے فلور

کے ایک فلیٹ میں کسی نفل کر دیا گیا ہے۔ تم صفیہ خالہ کے ہمراہ

فوراً چوتھے فلور پر پہنچ گئیں۔ تب پتا چلا کہ نفل کی واردات

نورین کے فلیٹ میں ہوئی تھی۔ نورین کے شوہر سفیان علی کو کسی

نے نفل کر دیا تھا۔ تم نے چونکہ دس پندرہ منٹ پہلے فوزیہ کو نورین

کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا لہذا تمہارا ہاتھ ٹھنکا اور تم

نے اس سلسلے میں پولیس کی بھرپور رہنمائی کی جس کے بعد

پولیس نے فوزیہ کو اس کے فلیٹ واقع طابق روڈ سے گرفتار

کر لیا۔“ لچاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”حالات واقعات کے بیان میں اگر مجھ سے کوئی غلطی

ہوئی ہو تو تم اس کی تصحیح کر سکتی ہو۔“

”نہیں..... نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”آپ نے جو کہا ٹھیک کہا۔“

”فہمیدہ!“ میں نے انگلی سے اس کے چہرے کی جانب

لہجے میں پوچھا۔ ”وہ..... وہ..... وہ.....!“

روز صفیہ خالہ کے فلیٹ تک لفٹ کے ذریعے پہنچی تھیں نا؟“
”ہاں..... اور یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی
ہوں۔“ وہ جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔
”دوبارہ بتانے سے معاملہ پکا ہو گیا۔“ میں نے معنی خیز
انداز میں کہا۔

”کون سا معاملہ؟“ اس کی الجھن پریشانی میں
بدل گئی۔

”لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور سے سکس فلور تک پہنچنے
کا معاملہ۔“ میں نے کہا۔ ”اس روز لفٹ میں تمہارے علاوہ اور
کون تھا؟“

”کوئی بھی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اکیلی
ہی تھی۔“

”کیا راستے میں کہیں لفٹ رکی تھی؟“ میں نے اس کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”میرا مطلب ہے، کسی
نے لفٹ کو کال کیا ہو۔ راستے میں کوئی لفٹ میں سوار ہوا ہو؟“
”بالکل نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
”یعنی اس روز تم اکیلی ہی لفٹ میں سوار ہو کر گراؤنڈ
فلور سے سکس فلور تک پہنچی تھیں؟“

”ہاں..... ہاں..... ہاں..... وہ روہانسی ہو گئی۔ ”یہ بات
میں کتنی حیرت آپ کو بتاؤں؟“

”بس، اب مزید بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں
نے منہ ہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جتنا کچھ تم نے بتا دیا وہ جہیں
جیل کی دیواروں کے پیچھے پہنچانے کے لیے کافی ہے۔“
”جیل..... کیوں.....“ وہ سر اسیدہ نظر سے مجھے تنکے
لگی۔ ”میں نے کون سا جرم کیا ہے؟“

”غلط بیانی کا جرم۔“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”کسی
کو غلط راہ پر ڈالنے کا جرم..... تمہارا ہر جرم بہت سنگین ہے۔“
”پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ بکھری ہوئی آواز
میں بولی۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”جب حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچو گی تو تمہاری
سمجھ بڑے اچھے انداز میں کام کرنے لگے گی۔“ میں نے ایک
ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”تم استغاثہ کی ایک
اہم گواہ ہو کر نہیں؟“

”جی ہوں۔“ اس نے نجیف سی آواز میں جواب دیا۔
”صرف گواہ نہیں بلکہ معنی گواہ..... آئی وٹنس!“ میں
نے سننا تو ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے معزز عدالت کو
حلفیہ بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم اپنی صفیہ خالہ
سے ملنے بہادر آباد کی اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں پہنچی تھیں تو

”وہ جی، میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ..... اس وقت نیچے
کے کسی فلور پر مجھے اور کوئی فلیٹ مل نہیں رہا تھا اس لیے مجبوری
میں چوتھے فلور کا وہ فلیٹ لے لیا۔“ وہ اپنی مجبوری کی وضاحت
کرتے ہوئے بولی۔ ”دوسری بات یہ کہ اوپر والے فلورز کا
کرایہ بھی نسبتاً کم ہوتا ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہاری صفیہ خالہ کے فلیٹ کا
کرایہ تو کافی کم ہوگا۔“ میں نے جرح کو اختتام کی طرف لاتے
ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”وہ تو اسی بلڈنگ کے چھٹے فلور پر
فلیٹ نمبر تھو سو دو میں رہتی ہیں۔“

”نہیں جی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ عجیب سے لہجے
میں بولی۔

”پھر کیسی بات ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں
دریافت کیا۔

”اول تو وہ فلیٹ صفیہ خالہ کی ذاتی ملکیت ہے۔ وہ
کرائے دار نہیں ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”دوم، اس بلڈنگ میں
لفٹ موجود ہے۔ لفٹ کی سہولت کی وجہ سے ہر فلور کے فلیٹس
کی ویلیو ایک جیسی ہے۔“

”لفٹ کی یہ سہولت تمہارے لیے کسی نعمت سے کم نہیں
ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”لفٹ کی مدد سے نیچے سے اوپر جاتے
ہوئے تمہارے گھٹنوں کو بہت سکون محسوس ہوتا ہوگا؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں
گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں جب بھی صفیہ خالہ سے ملنے
جاتی ہوں تو لفٹ کے ذریعے بڑی آسانی سے چھٹے فلور پر پہنچ
جاتی ہوں۔“

”وقوعہ کے روز بھی تم لفٹ کے ذریعے ہی چھٹے فلور پر
پہنچی تھیں؟“

”جی ہاں..... اس میں کیا شک ہے۔“ وہ حیرت آمیز
لہجے میں بولی۔ ”مجھے تو کوئی شک نہیں البتہ آپ کے بیان سے
وکیل استغاثہ کے لیے بہت بڑی مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔“
”کس قسم کی مشکل؟“ اس کا چہرہ شکن آلود ہو گیا۔

”آپ وکیل استغاثہ کی مشکل کا سوچ کر خود کو دہلا نہ
کریں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ وقت ہے خود کو

بچانے کا۔ آپ ایک خونی دلدل میں گر چکی ہیں۔“
اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، بھر بھرائی ہوئی آواز میں
بولی۔ ”میں نے کیا کیا ہے..... آپ کس دلدل کی بات کر
رہے ہیں؟“

”اس خطرناک دلدل کا نام ہے ”لفٹ“۔ تم وقوعہ کے

تم نے میری ٹوکھل اور اس مقدمے میں ملزم فوزیہ کو اس بلڈنگ کے چار سو چار نمبر فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ تم نے یہی بیان دیا ہے نا؟“

”جی.....“ وہ تھوک نکلے ہوئے بولی۔

”کیا تم اس امر سے انکار کر سکتی ہو کہ فلیٹ نمبر چار سو چار چوتھے فلور پر واقع ہے؟“

”ظاہر ہے چار سو چار نمبر فلیٹ چوتھے فلور پر ہی واقع ہے۔“ اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ پھر ادا طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”وقوع کے روز تو تم بذریعہ لفٹ گراؤنڈ فلور سے سکس فلور تک پہنچ گئیں اور راستے میں لفٹ کہیں رکی بھی نہیں تھی۔“

میں نے اسے گھورا۔ ”پھر تم نے چوتھے فلور کے فلیٹ نمبر چار سو چار میں فوزیہ کو داخل ہونے کیسے دیکھ لیا؟ کیا تم دیواروں کے پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہو؟“

میرا یہ حملہ اتنا کارگر تھا کہ اس کی ٹانگیں کھپا کر رہ گئیں۔

میں نے اسے سنبھلنے کا ذرا موقع نہ دیا اور اس کے جواب دینے سے پہلے ہی سوال کر دیا۔

”تم نے جھوٹ کیوں بولا..... کس کے کہنے پر بولا؟“

وہ کبیرے کی چوٹی پر رینگ کر تھام کر کھڑی گہری سانس لیتے لگی۔ میں نے تاہر تو زحموں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم مقتول سفیان علی کی بیوہ نورین کو نہیں جانتی ہو۔“ مگر تمہاری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ایسا ہی ہے نا؟“

ان لمحات میں وہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر رہی تھی۔ کبیرے کے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”جی، میں نورین کو بالکل نہیں جانتی.....“

”اور کتنے جھوٹ بولوگی۔“ میں نے ہاڑ سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے طارق روڈ پر جو فلیٹ کرائے پر لیا ہے اس کا ڈیپازٹ نورین کے اکاؤنٹ سے ادا کیا گیا ہے۔ اگر تم نورین کو نہیں جانتی ہو تو پھر اس کے اکاؤنٹ کا چیک تم نے ڈیپازٹ میں کیوں دیا؟“

اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ”بپ..... پانی.....“

اس کی زبان سے بس یہ الفاظ ادا ہوئے پھر وہ ٹہرے کے فرش پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگی۔

صورت حال روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی۔ استغاثہ کی سب سے اہم گواہ کی یحییٰ شہادت کا نہ صرف بھانڈا پھوٹ چکا تھا بلکہ میری جرح کے نتیجے میں بھی ثابت ہو گیا تھا

کہ فہیدہ کا نورین کے ساتھ گہرا ربط مضبوط تھا۔

”جناب عالی!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ سفیان علی کے قتل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ فہیدہ ملوث ہے۔ معزز عدالت سے میں درخواست کروں گا کہ فہیدہ کو شبانی تفتیش کیا جائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو سکے۔“

”دیش آل پور آنر.....“

جج نے فوری طور پر متعلقہ عدالتی عملے کو فہیدہ کی گرفتاری کا حکم دیا پھر اس کیس کے انکوائری آفیسر کو ہدایت کی کہ وہ آئندہ پیشی پر فہیدہ سے ہونے والی تفتیش کی رپورٹ کے ساتھ ہی نورین کو بھی عدالت میں پیش کرے۔

اس کے بعد عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

☆☆☆

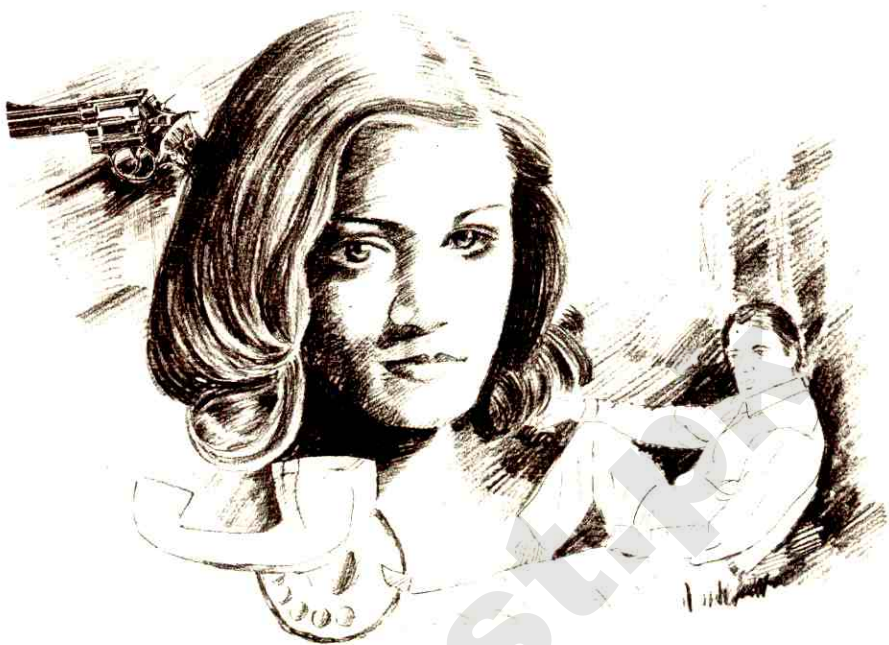
جب کوئی شخص ٹھوس ثبوت کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس سے اقبال جرم کرانے میں پولیس کو چنداں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ فہیدہ نے ایک ہی رات میں زبان کھول دی تھی۔ وہ میری جرح کے جواب میں اس بری طرح گھڑی تھی کہ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

گو یا میرے سوالات نے اس کے جھوٹ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

فہیدہ کے بیان سے پتا چلا کہ نورین نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ سفیان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا چکی تھی۔ اس کا دکھ بھی فوزیہ کے دکھ جیسا ہی تھا لیکن وہ فوزیہ سے زیادہ چال باز اور جوشیلی تھی اور اس نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے ایک خاص پلاننگ کے تحت فہیدہ کو طارق روڈ والے فلیٹ پر بٹایا تھا کہ اس واردات کا ایک عینی شاہد پیدا کیا جاسکے۔ نورین، فوزیہ سے بھی نفرت کرتی تھی۔ لہذا اپنی سوت کو سبق سکھانے اور قتل کی اس واردات میں پھنسانے کے لیے اس نے نرگس بن کر فوزیہ کو فون کیا اور اسے اپنے فلیٹ پر بلا لیا۔ فوزیہ اپنی سادگی کے باعث نورین کے محل میں آئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل آپ جان چکے ہیں۔

سفیان علی کو نورین ہی نے سائنسٹر گھر پر پالور سے قتل کیا تھا لیکن نورین کی گرفتاری کے لیے پولیس کو کافی پاؤڈر بیلنا پڑے تھے۔ جیسے ہی نورین کو پتا چلا کہ فہیدہ پولیس کی گرفت میں آگئی ہے، وہ منظر سے غائب ہوئی تاہم دس پندرہ دن کی تلاش کے بعد آخر کار پولیس نے نورین کو راولپنڈی سے گرفتار کر لیا۔ اپنی جھول میں لانے کے بعد جب پولیس نے اس پر سختی کی تو اس نے سفیان کے قتل کا اقرار کر لیا۔

(تحریر: حسام بٹ)



پیکا

کچھ منظر انسان اپنی سوچوں میں ترتیب دے لیتا ہے اور خود ہی ان کے معنی بھی نکال لیتا ہے مگر ہائے ری قسمت... نہ منظر حقیقی ہوتا ہے اور نہ ہی معنی حسبِ خواہش ہوتے ہیں، ایسے میں انسان گھن چکر بن جائے تو عجب کیا... اس کے پیروں میں بھی کچھ ایسا ہی چکر تھا جسے پورا کرنا لازم تھا۔

کانوں کی سماعت کو بھٹکانے والی ہونٹوں کی جھنجھٹ کا احوال

سیر واقعتاً گزشتہ رات پیش آیا تھا۔
میں فلورنس کو لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن جا رہی تھی۔ اس کی ٹرین کی آمد کا وقت گیارہ بجے کا تھا اور وہ بارہ گھنٹے سے ٹرین میں سفر کر رہی تھی۔ وہ اس ٹرین کے انتظار میں تین گھنٹے تک لیور پول اسٹریٹ میں بیٹھی رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس ٹرین کا ٹکٹ سب سے سستا تھا۔
بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔
میں اسٹیشن سے پہلے سٹنل پر دائیں جانب مڑنے

نے اپنے بازو اس عورت کے شانوں پر رکھے ہوئے تھے اور اسے اس مضبوطی سے خود سے چنایا ہوا تھا کہ اس عورت کے پاس راہ فرار اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی پھر میں نے پوری احتیاط کے ساتھ اس مکان کا نمبر اور سڑک کا نام اپنے پاس نوٹ کیا اور۔۔۔ پولیس کو فون کر دیا۔

فون کال جس کا ٹیلیں نے وصول کی، وہ کوئی گاؤدی ٹائپ کا پولیس مین تھا۔ اسے میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ”آپ کے نام میں دو ‘ٹی’ آتے ہیں یا ایک؟“ اس نے پوچھا۔

جس گس نے بھی خاندانی نام ”اسکاٹ“ سنا ہوگا، کیا یہ نہیں جانتا ہوگا کہ اس نام میں کتنے ”ٹی“ آتے ہیں؟ پھر اپنے پتے کی اسپیلنگ بھی لاتقانی بن گئی۔ اس لیے کہ پولیس کے صوتی الفاظ میں ”کریسٹنٹ“ کے جھے آسان ثابت نہیں ہوئے جبکہ میں صرف ٹینگو، ایکو، رومیو اور جوئٹ کے علاوہ کسی اور ریڈیائی پیغام رسانی کے حروف سے واقف نہیں تھی۔

بالآخر میں اپنی بیٹی کو لینے کے لیے واپس ریلوے اسٹیشن کی جانب چل پڑی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں نے واپسی کی کوشش شروع کر دی لیکن چونکہ میں تاروچ کے اس علاقے میں پہلے بھی نہیں آئی تھی تو بے بسی کی کیفیت میں یہاں گم ہو گئی۔

میرے پاس نہ تو کوئی نقشہ تھا اور نہ ہی جی پی ایس سسٹم!

مجھے جیسے صدیاں بیت گئیں۔ میں ادھر ادھر سڑکوں اور گلیوں میں گھمنا رہی، بھٹکتی رہی۔۔۔۔۔ بالآخر کسی نہ کسی طرح ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔

فلورنس کا منہ بری طرح پھولا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ پر گرجنا شروع کر دے گی۔ جب میں نے اسے پیار کرنا چاہا تو اس نے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اس نے اپنے مختلف بیگ کار کی عقبی نشست پر پرت دیے اور غصے سے اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

جب میں نے اسے تفصیل بتائی کہ کیا واقعہ پیش آ گیا تھا تو اس نے شانے اچکاتے ہوئے اپنی آنکھیں یوں گھمائیں جیسے اس دنیا میں مجھ سے بڑا حق کوئی اور نہیں ہوگا۔

ہوں! میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اگر کسی کی زندگی بچانے کی خاطر میں نے اسے چند منٹ انتظار کر دیا تو اس میں آگ گولا ہونے کی کیا بات ہے؟ اوکے، چند منٹ نہ سہی پون گھنٹا ہی سہی! تو اس میں کون سی آفت آگئی؟

کے لیے رکی ہوئی تھی جب وہ کار میری کار کے برابر میں آ کر رک گئی۔ میں نے ایک اچھتی نگاہ اپنی بائیں جانب ڈالی تو اسے میں بدل لین کی ٹریفک لائٹ سبز ہوئی۔ پھر جوں ہی میرے برابر والی کار نے رفتار پکڑی تو میں نے دیکھا کہ اس کار کی عقبی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے منہ کھول کر میری طرف دیکھتے ہوئے نکارا۔ ”ہیلپ!“ چونکہ کار کا شیشہ چڑھا ہوا تھا، اس لیے مجھے اس کی آواز سنانی نہیں دی۔ البتہ اس کے ہونٹوں کی جھبش سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے مجھے مدد کے لیے پکارا ہے۔

میں ایک لمحے کے لیے سراپمہ ہو گئی۔ میری کار داہنی لین میں تھی اس لیے میں اس کار کے پیچھے سیدھی نہیں جاسکتی تھی۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں داہنی جانب اسٹیشن کی طرف مڑ جاؤں۔ میں نے ناچار اپنی کار ریلوے اسٹیشن کی جانب گھمادی۔

لیکن اسٹیشن کے سامنے پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ فلورنس کی ٹرین کی آمد میں ابھی وقت ہے۔ تب میں نے اپنی کار تیزی سے گھمائی اور اس کار کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔ میں اس عورت کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مجھے اس کار کی جھلک نظر آئی۔ وہ ڈیملر کار تھی جو مجھ سے کچھ فاصلے سے آگے جا رہی تھی۔ درمیان میں تین چار کاریں موجود تھیں۔ ڈیملر کار نگاہوں میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔۔۔ حتیٰ کہ مجھ جیسی کی نظروں سے بھی نہیں جو کاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

اس کے علاوہ رات کے اس وقت سڑکوں پر زیادہ ٹریفک بھی نہیں تھا۔ مجھے ڈیملر کا تعاقب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ وہ ڈیملر تاروچ کی عقبی سڑکوں پر پارک کی ہوئی گاڑیوں کے درمیان سے، پتلی گلیوں اور تنگ راستوں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

ایک موقع پر تو وہ ایک پتھر لی سڑک پر بھی آ گئی۔ مجھے یوں لگنے لگا جیسے ہمارا یہ سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔

بالآخر ڈیملر ایک تین منزلہ وکٹورین ولا کے سامنے جا کر رک گئی۔ اس سڑک پر تمام وکٹورین ولاز تین منزلہ بنے ہوئے تھے۔

میں اتنی احمق نہیں تھی کہ ان تک رسائی کرتی۔۔۔۔۔ البتہ میں فاصلے پر رک کر انہیں دیکھتی رہی۔ کار سے چھٹ چار انچ قامت کا ایک ننھا شخص بیچے اتر ا۔ اس کے ساتھ سنہری زلفوں والی وہ تازک اندام عورت بھی تھی جسے وہ دھکیلے ہوئے ولا کے داخلی دروازے کی جانب لے جانے لگا۔ اس

اگلے روز صبح پولیس ہمارے دروازے پر آگئی۔
انہوں نے مجھے سنہری زلفوں والی اس نازک اندام
عورت کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں اسے جانتی
ہوں؟

میں نے تصویر کا بغور جائزہ لیا اور تصویر واپس کرتے
ہوئے بولی۔ ”نہیں۔ میں نے گزشتہ شب سے پہلے اسے
کبھی نہیں دیکھا تھا!“
”یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے، میڈم!“ پولیس افسر
نے کہا۔

”وہ کیسے؟“
”اس لیے کہ وہ آپ کو جانتی ہے۔“
”کیا؟“

”اس کا کہنا ہے کہ تین ہفتے قبل ایک ڈنر ڈانس پارٹی
میں آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔“
اوہ لا رڈ!

اور تب مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ ہم سب ایک گول سی
بڑی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں ٹھوڑا سا پینا پلاتا بھی رہا
تھا۔ وہ بڑی مہربان محفل رہی تھی۔ ہم سب خوب لطف اندوز
ہوئے تھے۔ خاص طور پر اس پیارے سے جوڑے نے تو
ہم سب کو خوب ہنسا یا تھا۔

لیکن میں اب بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔
”تو پھر اس نے مجھ سے ”ہیلپ“ کے لیے کیوں کہا تھا؟“
میں نے... پولیس افسر نے کہا۔ ”وہ کیا مدد چاہ رہی تھی؟“
میری اس بات پر وہ پولیس افسر مسکرا دیا۔ یہ ہمدردی
اور طنز کی جلی مسکراہٹ تھی۔

”گناہ ہے کہ آپ لب شناسی سے ناواقف ہیں.....
ہیں نا؟ آپ کو ہونٹوں کی جنبش سے بات کو سمجھنا نہیں آتا!“
”کیا مطلب؟“

”اس نے حقیقت میں ”ہیلپ“ نہیں بلکہ آپ کو
”ہیلو“ کہا تھا۔ وہ اس ڈنر ڈانس پارٹی کے حوالے سے آپ کو
پہچان گئی تھی۔ چونکہ ٹریفک سگنل گرین ہو چکا تھا اس لیے وہ
صرف ”ہیلو“ ہی کہہ پائی جسے آپ نے ”ہیلپ“ سمجھا!“
اس موقع پر فلورس بھی وہاں آچکی تھی لیکن پولیس
افسر کی بات سن کر بھی وہ قطعی متاثر نہیں ہوئی۔ اس نے ایک
بار پھر شانے اچکاتے ہوئے اپنی آنکھیں بول گھمائیں جیسے
حقیقت میں اس دنیا میں مجھ سے بڑا اہم کوئی اور نہیں ہوگا۔

ظرافت

ایک فقیر ایک گھر کے پاس آواز لگا رہا تھا۔
”کوئی بابا کو روٹی کھلا دو، بابا راس بھی کھا لیتا ہے۔“
..... بابا آس کریم بھی کھا لیتا ہے۔
..... بابا برگ بھی کھا لیتا ہے۔
..... بابا سینڈویچ بھی کھا لیتا ہے۔“
گھر کے اندر سے آواز آئی ”بابا جوتے بھی
کھا لیتا ہے؟“

بابا۔ ”سخت غذا منع ہے۔“

ایک کالی لڑکی کو جادوگر نے جادو سے پر لگا
دے۔

لڑکی۔ ”واؤ کیا اب میں پری بن گئی
ہوں؟“
جادوگر۔ ”نہیں لگی تم اب ڈیگنی مچھر بن
گئی ہو۔“

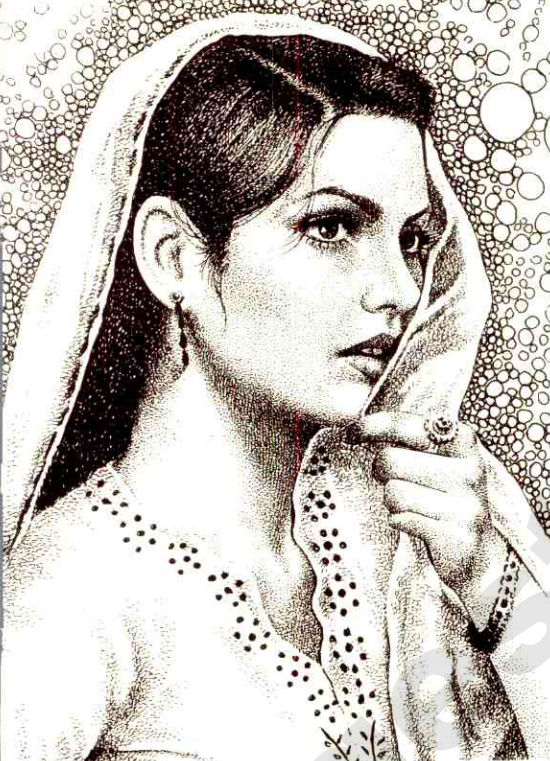
سردار پولیس اسٹیشن میں تصویریں دیکھ کر
بولا۔ ”یہ تصویریں کن لوگوں کی ہیں؟“
پولیس آفیسر۔ ”کرنٹلو لوگوں کی جن کو گرفتار
کرتا ہے۔“

سردار۔ ”تو جب کبھی تھی وہیں پکڑ لیتے۔“

سردار۔ ”P.C.O. کے اندر گیا جیب سے
موبائل نکالا اور بات کر کے باہر آ گیا۔“
آدمی۔ ”سردار جی موبائل سے بات کرنی
تھی تو P.C.O. میں کیوں گئے؟“
سردار۔ ”دوست نے کہا تھا P.C.O. سے
کال کرنا پیسے کم لگیں گے۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کی ریزوی،
اورنگی ٹاؤن، کراچی

محفلِ شہر و سخن



✽ زاہد چودھری..... چمپور کینٹ
فراقِ یارِ قیامت سے کم نہیں
نہ دن کو چین نہ راتوں کو نیند آتی ہے
✽ محمد کمال انور..... نارتھ کراچی، کراچی
ردائے خاک نہیں آسان ہے یہ بھی
کبھی بکھار تو ہوتا گمان ہے یہ بھی
میں اپنی ذات کے اندر بھی جھانک لیتا ہوں
کہ حیرتوں سے بھرا اک جہان ہے یہ بھی
✽ محمد اکبر نانچ..... لودھراں
جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لادے

✽ اظہر حسین پچار..... ہزاری، جتوئی
مجھے بھی شوق تھا نت نئے چہروں کی دید کا
رستہ بدل کے چلنے کی عادت اسے بھی تھی
✽ محمد خواجہ..... کورنگی، کراچی
کتنی معصوم، نازک ہو، حماقت نہ کرو
بارہا تم سے کہا تھا کہ محبت نہ کرو
✽ طالب حسین طلحہ..... نیو سینٹرل جیل، ملتان
ہر جذبہ اُصول رہا جبر کا قیدی
ہر جسم میں بکھرا ہوا انسان رہا ہے
فطرت کے حسیں جذبوں کی آزادی کا سوچیں
ہر شخص کے اندر بھی تو زندان رہا ہے
✽ ایم کامران خالد..... چھب

کرو کچھ رحم میری التجا پر، میری آہوں پر
اشو، بولو، ہنس، دیکھو میں صدقے ان نگاہوں پر
✽ محمد عقیل چٹھہ..... حافظ آباد
روح کے اندر گرانی بھی نہیں
اور دریا میں روانی بھی نہیں
میرے اندر ایک مجھ سا آدمی
مر رہا ہے اور فانی بھی نہیں

✽ عاطف شاہین..... اڈہ ارونی
چلو یہ بات ستارہ شمس سے پوچھیں
کہیں نقیب میں اپنے وصال ہے کہ نہیں
✽ عتیق الرحمن..... فیصل آباد
ہار جاتا میں خوشی سے کہ وفا کا تھا سوال
جیت جاتی وہ اگر شرط لگاتی مجھ سے
✽ اعجاز احمد راحیل..... ساہیوال
مسند عشق ہماری ہے نہ دشت اپنی
کون چلنے دے سردشت حکومت اپنی
اپنے جیسا کوئی انسان تو لٹنے سے رہا
میں بھلا کس پہ جتاؤں گا محبت اپنی
✽ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... نئی منڈی سکھسکی
بادل سے کھلتی رہیں اونچی عمارتیں
بجلی بھی گری تو شہر کے کچے مکان پر

❖ بلقیس بانو.....نواب شاہ

زندگی ہاتھ نہ آئی میرے
اور میں ہاتھ بڑھاتا ہی رہا
جب تلک پاؤں کے نیچے تھی زمیں
آسمان سر پہ اٹھاتا ہی رہا

❖ جہانزیب احمد.....سرگودھا

یہ دنیا بے سکہ و سامان میری
کہاں ہے زندگی آسان میری
یہ کیا خواب آیا ہے اچانک
ہوئی ہے آنکھ بھی حیران میری

❖ دانش عمیر.....گلستان جوہر، کراچی

دل کی دنیا پر حکومت ہو کسی کی
ہاں اجارہ تو ہمارا ہی رہے گا
جس سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں
وہ کنارہ تو ہمارا ہی رہے گا

❖ رضوان تنولی کریڈوی.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

زہر پہلے ہمیں عطا کردو
پھر تم آپ حیات پی لینا

❖ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ شی

نرم لفظوں سے بھی لگ جاتی ہیں چوٹیں اکثر
دوستی اک بڑا نازک سا ہنر ہوتی ہے

❖ شانہ حسن.....لاہور کینٹ

اے زندگی ہمیں توڑ کر ایسے بکھیرو اب کی بار
نہ خود کو جوڑ پائیں ہم نہ پھر سے توڑ پائے کوئی

❖ دلشیں.....کراچی

تم نے تعبیر بتا دی ہم کو
ورنہ ہم خواب ہی ڈھوئے جاتے
اب کسی پیڑ کی صورت ہوتے
ہم اگر خاک میں بوئے جاتے

❖ احمد حسن عرضی خان.....قبولہ شریف بائی پاس

آیا نہ ایک بار بھی عیادت کو وہ مسیحا
سوار ہم نے فریب سے بیمار ہو کے دیکھا

❖ زوبیہ صدیق.....لالہ موبی

فریب نظر کے صحرا تجھے پار کیسے کرتے؟
ہر سو سراپ اور ہم تھے بھی پا پیادہ

❖ روبینہ اشرف.....لاہور

مری وحشت علاج غم ہوئی ہے
کہ رونے سے اذیت کم ہوئی ہے
ہنسی آتی ہے اپنے آنسوؤں پر
کہ یہ برسات بے موسم ہوئی ہے

❖ محمد زاہد.....گجرانوالہ

مری جگہ پہ کوئی اور ہو تو چیخ اٹھے
میں اپنے آپ سے اتنے سوال کرتا ہوں
اگر ملال کسی کو نہیں مرا نہ سہی
میں خود بھی کون سا اپنا ملال کرتا ہوں

❖ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

تب کہیں لوگ کھلے ہیں ہم پر
ان سے جب کام ہمارا نکلا
وہ بھی نکلا نہیں گھر سے اپنے
چاند بھی پھر نہ دوبارہ نکلا

❖ ایم عثمان انصاری.....چوآسدن شاہ (مبوڑہ)

ہوتا تھا ان کے ایک تبسم پہ روزِ قفل
بے ساختہ بنے تو قیامت ہی آگئی

❖ مہرین ناز.....حیدر آباد

وہ ہزار مجھ سے جدار ہے میرے دل سے پھر بھی جدا نہیں
وہی اپنی طرز وفا رہی، وہی ان کی مشق جفا رہی

❖ کہکشاں فاروق.....ساہیوال

یہ بادل جس جگہ سایہ کریں گے
وہاں ہم دھوپ لے جایا کریں گے
اگر حد سے بڑھے گی یہ غموں
تو ہم بھی چیخا چلایا کریں گے

❖ محمد اقبال.....کوریگی، کراچی

اب کشتیوں پہ کس کو بچانے چلے ہو تم
سائل کے آس پاس تو گھر بھی نہیں رہے

❖ ریاض بٹ.....حسن ابدال

آگ لہجے نے ہی جلائی ہے ہمیشہ
لفظ کبھی آتش فشاں نہیں ہوئے

❖ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

پیاد کی جوت سے گھر گھر ہے چراغاں ورنہ
ایک بھی شمع نہ روشن ہو ہوا کے ڈر سے

✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس
موت آگئی نہ ہو میرے ذوقِ امید کو
محرومیوں میں کیف سا پانے لگا ہوں میں

✽ صابر علی..... عزیز آباد، کراچی
قرض تیرا کردوں بے باقی لیکن یہ تو سوچ
پھر بھلا کیا تیرا میرا واسطہ رہ جائے گا

✽ اور لیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
اس غم کدے میں کٹ گئی یوں اپنی زندگی
قیدی پہ جیسے گزر جائے روزِ عید کا

✽ ڈاکٹر ناہید شہ..... سرگودھا
تیری الفت کے طریقوں کو بڑی دیر سے سمجھا ظالم
میرے ارمان جلا کے دل کی بستی اجاڑ دی تو نے

✽ امتیاز علی..... سرگودھا
محبت کے جہانوں میں یہی دستور ہوتا ہے
دوبارہ عشق کی بازی یہاں کھیلی نہیں جانی

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عمر
خوابوں کے آسرے پہ کئی ہے تمام عمر

✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... سکیم ٹاؤن، خانیوال
آج بھی میری عاقبتوں میں شامل ہے
تیرے کوچے سے ہو کر گھر جانا

✽ محمد اسلم..... تحصیل ضلع خانیوال
بھول جانا اور بھلا دینا فقط اک وہم ہے
دلوں سے کب نکلتے ہیں محبت جن سے ہو

✽ ربیہ راضوی..... برطانیہ
تیری قربت سے دور ہوتے ہی
میں نے دوریِ قریب سے دیکھی ہے

✽ راجہ افتخار علی انی..... چوآسدن شاہ (موہڑہ)
آج کی بارش بھی تیرے درد کی طرح ہے
ہلکی ہلکی ہے پر ہوتی جارہی ہے

✽ محمد نعمان ندیم..... صدر کراچی
ہیں ناں میرے خواب بھوٹے دوست
جب بھی دیکھا تجھے اپنے ساتھ دیکھا

✽ احمد خان..... راولپنڈی
وہ کہتا تھا کہ پتھر دل لوگ رویا نہیں کرتے
اسے کیا خبر کہ چشمے ہمیشہ پتھروں سے نکلا کرتے ہیں

✽ مدحت..... کراچی
میرے وجود کی چائیر اس نے مانگی ہے
عجیب خواب کی تعبیر اس نے مانگی ہے

✽ امتیاز احمد..... ملیر، کراچی
ان کی خوشبو نہیں جاتی گھر سے
ایک مدت ہوئی مہمان گئے

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
آج خزاں کی زد میں آئے ہیں تو ہمیں یاد آیا ہے
کل تک ہم بھی صف میں کھڑے تھے مہکے ہوئے ٹکڑوں کی

✽ محسن علی، شتیق الرحمن، اسد عباس..... فیصل آباد
وہ کہہ رہی تھی سمندر نہیں ہے آنکھیں ہیں
میں ڈوب گیا ان میں اعتبار کرتے ہوئے

✽ وقار حسن..... کراچی
نہ سائبان مجھے دھوپ سے بچاتا ہے
نہ دھوپ سر پہ اترتی ہے سائبان چکی طرح

✽ عمران علی..... راولپنڈی
زندگی کم نہیں سزا سے مجھے
اب نکلتا ہے اس فضا سے مجھے

✽ قادر بخش..... کراچی
یہ کیسی رُت پلٹ آئی ہے مجھ میں
کہ سب منظر بکھرتے جارہے ہیں

✽ امبر علی..... حیدر آباد
تو نے رکھا نہیں خیال مرا
ورنہ ہوتا نہ ایسا حال مرا

منہج شعرو سبخت

کوین
برائے
شمارہ
دسمبر
2014

نام : _____
پتا : _____

دعا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

چاہت کسی بھی روپ میں ہو اللہ کو بے حد پسند ہے بہ شرطیہ کہ پُر خلوص ہو اور ایسی محبتیں دور حاضر میں چیدہ چیدہ ہی دیکھنے کو ملتی ہیں... ان کا جوڑا بھی کچھ ایسی ہی مثال پیش کرتا تھا کہ ایک دوسرے سے زندگی کی شراکت کرنے والے غربت و بے بسی کے طوفانوں کے باوجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔

مقدر سے لڑنے والے ایک بے مثال جوڑے کی بے کسی کا اجرا



لگتا۔ یہ سمجھتے، جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ میں نے اپنی سی پوری کو بخش کر لی تھی۔ جو کچھ ہو سکتا تھا، جو ممکن تھا، کسی طرح سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی میں نے۔ اسے دیکھ کر اپنی ناکامی، اپنے فن کی ناکامی، سائنس کی ناکامی، طب کی دنیا

اٹھارہ سال سے وہ میری مریضہ تھی۔ ہر بار کچھ مہینوں کے بعد اس کا شوہر اسے لے کر آ جاتا، اسے دیکھتے ہی مجھے سخت تکلیف ہوتی۔ اندر بہت اندر جیسے کچھ ٹوٹ پھوٹ گئے میں خشکی سی ہوتی اور دل زور زور سے دھڑکنے

میں ہوتی ہوئی ترقی کی ناکامی اور سرجری کے ذریعے کے جانے والے بعض عجیب وغریب آپریشنوں کی کامیابی کے باوجود اپنی سرجری کی ناکامی کا شدید احساس ہوتا تھا مجھے۔

وہ نازک سادہ بلا پتلا لمبے قد کا بڑا سادہ سا انسان تھا۔ بہت سالوں پہلے وہ اپنی بیوی کو لے کر میرے پاس آیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! بڑی دور سے آپ کا نام سن کر آیا ہوں۔ میری بیوی کا علاج کرنا ہوگا آپ کو۔ بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں آپ کے پاس، اسے سچ کر دیں، اچھا کر دیں۔ اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی مجھ سے۔ میں سب کچھ سچ دوں گا اس کے لیے۔ جو کچھ بھی میرے پاس ہے،

خادم بن جاؤں گا آپ کا۔ ساری زندگی احسان نہیں بھولوں گا۔ بس اسے سچ کر دیں آپ۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔“

وہ نہ جانے کیا کیا بولتا چلا جا رہا تھا کہ میں نے اسے اشارے سے روکا اور کہا کہ بھائی، پہلے بیٹھو تو جاؤ پھر آپ کی بات سنوں گا۔

وہ دونوں میرے سامنے پڑی ہوئی بیچ پر بیٹھ گئے تھے۔ کملائے ہوئے، بے کس بے بس چہرے۔ اداس آنکھوں سے درد بہتا ہوا۔ مجھے آج تک ان دونوں کی وہ تصویر نہیں بھولی تھی۔

”جی لی لی اپنا نام پتا اور شکایت بتائیں۔“ میں نے اس سے ہنسی میں شروع کی تھی۔

اس کا نام بانو تھا، شوہر کا نام غلام حسین اور وہ نیوکراچی سے آئی تھی۔ اس کے چار بچے تھے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ چوتھے بیٹے کی پیدائش کے بعد یہ مسئلہ شروع ہوا تھا۔ بیٹا تو مرا ہوا پیدا ہوا۔ اس کی شکل بھی نہیں دیکھ سکی تھی وہ۔ صرف اس ننھے سے جسم کو محسوس کیا تھا اس نے۔

سب بچے گھر میں ہوئے تھے، دانی خدیجہ کے ہاتھوں۔ اس نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا۔ ”اس حمل میں بھی چھ مہینے گزرنے کے بعد میں نے دانی خدیجہ کو گھر بلا یا تھا۔ اس نے دیکھا پھر کہا شاید میرا حساب غلط ہے، بچہ

چھ مہینے کا نہیں سات مہینے کا لگ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ شاید لڑکا ہوگا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، ڈاکٹر صاحب سب کچھ ٹھیک، کوئی شکایت نہیں تھی۔ مجھے پہلے حمل ٹھہرے ویسا ہی حمل تھا وہ بھی۔ میں نے تو کم از کم یہی سوچا تھا اس وقت۔

پہلے بھی چلا۔ بچے گھر میں ہو چکے تھے، دانی خدیجہ کے ہاتھوں، یہ بھی ہو جائے گا۔ کون سی بڑی بات تھی۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر سوچنے سوچنے ذرا رک کر آہستہ آہستہ پھر سے بولنا شروع

کیا۔ ”مگر ایسا ہوا نہیں۔ اس دفعہ کچھ گزر چکی، میرے حساب سے پہلے درد شروع ہو گئے۔ میں نے تو جہ نہیں دی کہ اس طرح کے درد تو ہوتے ہی ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس دفعہ درد بڑے خراب تھے، اتنے شدید تو کبھی بھی نہیں ہوئے تھے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی چاقو سے۔۔۔۔ اندر ہی اندر میرے جسم کو کنگڑے کنگڑے کر کے کاٹ رہا ہے۔

”دانی خدیجہ نے دیکھا۔ تسلی دی پھر کہا کہ چار یا پنج گھنٹوں میں بچہ ہو جائے گا، فکر کی بات نہیں ہے۔ اصلی

کے دو گرم گرم پیچھے پلائے اور کہا کہ ڈاکٹر انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر سب کچھ سچ ہو جائے گا، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”انتظار بہت طویل ہو گیا، چار گھنٹے، آٹھ گھنٹے میں اور آٹھ گھنٹے، سولہ گھنٹوں میں اور پھر صبح سے شام ہو گئی۔ مجھے لگتا تھا کہ اس دفعہ میری جان چلی جائے گی۔ اپنے

بچوں کو اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے میں چلی جاؤں گی۔ عورتیں تو بچہ جننے میں مر رہی جاتی ہیں۔ میری خالہ کی بڑی بیٹی مر گئی۔ میری ماں کی سب سے چھوٹی بہن بھی زندگی کے دوران مر گئی تھی، میں بھی اب نہیں بچ سکوں گی۔ درد کے

آنسوؤں کے ساتھ یہ سوچ کر میں بری طرح رو دی کہ میرے بچے اکیلے رہ جائیں گے۔ کون دیکھے گا انہیں، کون

کراچی کی کڑی میں لو سے بچائے گا۔ کون انہیں اسکول بھیجے گا، کون رات کو سلائے گا، سردی میں ان کے ٹھہرے ہوئے جسم پر چادر ڈالے گا، ڈاکٹر صاحب سخت درد کے

باوجود میں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ میرے اللہ، میرے مالک بچالے مجھ کو۔ میرے بچوں کے لیے بچالے مجھ کو۔ کیا کیا ہے تیرے پاس۔ ایک جان بچ جائے گی تو کیا

فرق پڑے گا۔ میں سچ مکتی تھی، بڑی جدوجہد کے بعد دانی خدیجہ نے میرا اپنا چھوٹا بچہ پیدا کر لیا، میری جان بچ گئی مگر وہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔

”مجھے تو اندازہ بھی نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا، میں تو اتنی نڈھال تھی کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہا کہ کیا کچھ ہو چکا تھا میرے ساتھ۔ مجھے اس وقت کا صرف اتنا ہی یاد ہے کہ دانی

خدیجہ نے مجھ سے سرگوشیوں میں کہا کہ میرا مرا ہوا بچہ پیدا ہوا ہے، پھر میں سو گئی اور نہ جانے کب تک سوئی رہی تھی۔“

”زچلی کے بعد کے چھ سات دن بڑے بوجھ میں گزرے، ایک میری ٹھکن پھر میرا غم۔ وہ میرا بچہ میرا بیٹا جو

مر گیا مجھے یاد آتا رہا، خدا صبر دیتا ہے۔ مجھے بھی صبر آ گیا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو تسلی دی کہ شاید میرے بچے نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر مجھے بچایا ہے تاکہ میں اپنے

امت محمدی ﷺ کی فضیلت

☆.....ان کو ضعیف اور کمزور بنایا تاکہ
غور نہ کریں۔“
☆.....قد میں چھوٹا بنایا تاکہ کھانے پینے
اور لباس کا بوجھ زیادہ نہ ہو۔
☆.....ان کی عمریں چھوٹی کر دیں تاکہ گناہ
کم رہیں۔
☆.....انہیں غریب بنایا تاکہ آخرت میں
حساب ہلکا رہے۔
☆.....اور انہیں سب سے آخری اُمت
بنایا تاکہ قبر میں رہنے کی مدت کم ہو۔

کاری بھی ناکام ہوئی۔ پیشاب کی نئی تھیلی بنانے کی کوشش
کی، وہ بھی نہیں بن سکی۔

مسئلہ یہ ہے کہ مختلف بیماریوں کے لیے دوا میں
اور مصنوعی اعضا بنانے والی بڑی بڑی کمپنیوں کے پاس اس
قسم کے غریب مریضوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ مصنوعی
دل، پیچھے اور ہڈیاں بنا کر تو میسے کا سکتے ہیں، غریب عورتوں
کے لیے پیشاب کی تھیلی بنا کر انہیں کیا ملے گا، دنیا کا نظام اسی
اصول پر چل رہا ہے۔ دنیا امیر کے لیے چل رہی ہے غریب
کے لیے کیا ہے؟ ذلت، دکھ بیماری، بے کسی کی موت۔
آپریشنوں کی ناکامی کے باوجود اس کا شوہر مہینوں
سالوں میں اکیلا اور بھی بھی اس کے ساتھ میرے پاس
آ جاتا۔

”ڈاکٹر صاحب! دنیا میں بہت ترقی ہوئی ہے۔
اخبار میں بیماریوں کے نئے نئے علاج کے طریقوں کے
بارے میں آتا رہتا ہے۔“

اس کے چہرے پر بلا کا درد ہوتا، بیوی کی محبت اور
بیوی کی پریشانی اس کے چہرے پر عیاں ہوتی۔ میں صرف
سوچ کر رہ جاتا کہ کاش میں کچھ کر سکتا۔

ایک دفعہ میں نے ان دونوں کو بتایا کہ ایک طریقے
سے علاج ممکن ہے جس میں ایک دوسرے قسم کا آپریشن
کر کے دونوں گردوں سے آنے والی نالیوں کو آنتوں میں
لگا یا جاسکتا ہے، اس طرح پیشاب بہتا بند ہو جائے گا اور رفع
حاجت کے ساتھ نکل جایا کرے گا مگر میں نے یہ بھی بتایا کہ

بچوں کو اپنے سائے میں بڑا کر سکوں، انہیں پالوں، بڑا
کروں، اپنے شوہر کی خدمت کروں۔

”مگر ڈاکٹر صاحب! وہ آٹھواں نواں ہی دن تھا جب
ایک ایک مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم سے مکمل پیشاب
بہہ رہا ہے۔ صبح بھی تو تمام بستر تھا، کمرے میں پیشاب
کی بدبو کا احساس سب سے پہلے میرے شوہر کو ہی ہوا اور
اب گزشتہ آٹھ سال سے میرا اپنے پیشاب پر کوئی اختیار نہیں
ہے۔ آپ کے اسپتال کا نام سن کر ہم لوگ آئے ہیں، آپ
لوگ اس بیماری کا آپریشن کر کے علاج کرتے ہیں، میرا بھی
علاج کریں ڈاکٹر صاحب!“ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں اور
لرزتے ہوئے لہجے میں التجائی۔

اس کی کہانی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی پیشاب
کی تھیلی میں سوراخ ہو گیا ہے۔

ہندوستان، پاکستان جیسے ملکوں میں جہاں کروڑوں
بچے گھروں پر دانیوں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں، جہاں
بچے کے سر کے پھنس جانے کی صورت میں یہ انتظامات نہیں
ہیں کہ فوری طور پر ان کا آپریشن کر کے بچہ نکال لیا جائے،
پھر ان عورتوں کو یہ بیماری ہو جاتی ہے، فمیلیو لائی بیماری۔ ان
دونوں ملکوں میں ہر سال ہزاروں عورتیں اس بیماری کا شکار
ہو کر ایک دردناک زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

میں سوچتا تھا کہ ہندوستان پاکستان دونوں بڑی فوجی
 طاقتیں ہیں۔ دونوں ایٹم بم کے دھماکے کر چکے ہیں اور
دونوں ملکوں کے حکمران بلند و بالا گمراہی کے دعوے کرتے رہتے
ہیں اور دونوں ملکوں کی عورتیں محض معمولی سہولتوں کے نہ
ہونے کی وجہ سے زندگی میں ہی زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔

میرے اندر جیسے نفرت کا ایک سیلاب اٹھا تھا، ایک
جوار بھانا۔ کاش یہ سیلاب، یہ جوار بھانا ان نام نہاد
حکمرانوں کو بہالے جاتا، ان کے ایٹم بم بنانے والے
سائنس دانوں کو ڈبو دیتا، اسن وال صاف کی راہ میں حائل ان
دانشوروں کو ختم کر دیتا جو دن رات تبلیغ کرتے ہیں کہ ایٹم
بم، میزائل، لڑاکا آبدوز، مضبوط فوج، قومی سلامتی کے
ضامن ہیں۔ کیا قومی سلامتی اور کیا مضبوط فوج۔

اٹھارہ سال پہلے اسے میں نے داخل کیا تھا، یہ ایک
خراب فمیلیو لا تھا۔ گردوں سے آنے والی دونوں نالیوں میں
سے پیشاب آتو رہا تھا لیکن اس پیشاب کو پیشاب کی تھیلی
میں روکا نہیں جاسکتا تھا کیونکہ تھیلی کا نیچا حصہ ختم ہو چکا تھا۔
چار سال کے عرصے میں، میں نے تین دفعہ اس عورت کا
آپریشن کیا۔ سوراخ کو بند کرنے کی کوشش، وہاں پر پوند

میں فارغ ہوا تو وہ جا بکلی تھی۔
چھ سات دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اس دن صبح
سویرے جب اسپتال میں کوئی بھی نہیں آتا ہے اور میں
اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ وہ آہستہ سے
دستک دے کر میرے کمرے میں آگئی۔

اداسی اور غم نے اس کی ساری شخصیت کو اپنے قبضے میں
لیا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب! ابھی بھی
میرا کوئی آپریشن نہیں ہو سکتا ہے جس سے میرا علاج ہو سکے؟“
میں نے اسے پھر اسی آپریشن کے بارے میں بتایا
جس کے لیے غلام حسین نے منع کر دیا تھا۔ میں نے دوبارہ
اسے تفصیلات سمجھائیں۔

”ڈاکٹر صاحب! یہ آپریشن کر دیں۔ بھلے میں
آپریشن کے دوران یا آپریشن کے بعد مر ہی جاؤں۔ اس
بدبو دار زندگی سے تو نجات مل جائے گی۔ جب تک وہ زندہ
تھا تو سب مجھے برداشت کرتے تھے کیونکہ میری اس حالت
کے باوجود وہ مجھے اپنے ماتھے پر رکھتا تھا لیکن اب تو میری
چھوٹی بہو نے کہہ دیا ہے کہ اس سے بدبو دار میرے تاپاک
کپڑے برداشت نہیں ہوتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ رو دی۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ پھر
بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہ بات اس نے مجھ سے اکیلے میں
نہیں کی، میرے بیٹے کے سامنے کی۔ اسی بیٹے کے سامنے
جس کے لیے زندہ رہنے کے لیے میں نے دعائیں کی تھیں،
سارے بہوؤں اور بیٹوں کی نظر بدل گئی ہے میرے شوہر
کی موت کے بعد ڈاکٹر صاحب۔ ایک بیٹی ہے جو مجھے اپنے
گھر لے جانا چاہتی ہے مگر اس کے سسرال، اس بیماری
کے ساتھ تو نہیں جاسکتی ہوں میں۔“ اس کے چہرے پر
بہت سارے سوالات تھے۔ ایسے سوالات جن کا کوئی
جواب نہیں تھا۔

مجھے غلام حسین کا آنسوؤں بھرا چہرہ یاد آگیا۔ مجھے
ایسا لگا جیسے وہ میرے سامنے کھڑا ہے۔ دبلا پتلا، نظر نیچی کیے
ہوئے، آنکھوں میں التجا بھری ہوئی۔ دیرے دیرے
میرے قریب آیا اور آہستہ سے بولا کہ ڈاکٹر صاحب اس کا
آپریشن کر دیں، یہ بیٹوں پر بھاری ہوئی ہے۔ بیٹی کے گھر
میں مرنا اچھا نہیں ہے۔

میں نے بانو کو اسی وقت آپریشن کے لیے داخل
کر لیا۔

اس طریقے سے آپریشن کے بعد یہ ممکن ہے کہ اس کی بیوی
کی آنتوں میں کچھ سالوں کے بعد کینسر ہو جائے۔
وہ تو راضی ہو گئی مگر اس کا شوہر تیار نہیں ہوا تھا۔
”نہیں ڈاکٹر صاحب! ہم ایسے ہی تھیک ہیں۔ اسے اگر کینسر
ہو گیا اور یہ اگر مر گئی تو میں کیا کروں گا؟ میں مر جاؤں گا اس
کے بغیر۔“ اس نے صاف منع کر دیا تھا۔

بانو نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر ہی اس کا خیال
رکھتا ہے، اس کے پیشاب سے آلودہ کپڑوں کو الگ رکھنا،
اپنے کمرے کو صاف رکھنا، کمرے میں اور چھوٹے سے گھر
میں عطر کا چھڑکاؤ رکھنا تاکہ پیشاب کی بدبو محسوس نہ ہو۔ یہ
سارے کام غلام حسین نے اپنے ذمے لیے ہوئے تھے۔
میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کسی بیوی سے اتنی محبت
کرنے والا یہ ایک ہی شوہر دیکھا تھا۔ فسطیو لارڈہ عورتیں
اکیلی آتی تھیں، عام طور پر اپنی ماؤں یا کسی بڑی یا چھوٹی
بہن کے ساتھ۔

عام طور پر فسطیو لارڈہ عورتوں کو شوہر چھوڑ دیتے ہیں۔
زیادہ تر طلاق دے دیتے ہیں اور اگر طلاق نہیں دیتے تو
پھر ان سے کسی بھی قسم کے تعلقات نہیں رکھتے۔ غلام حسین
ایک مختلف شوہر تھا، بالکل مختلف۔

سال گزرتے چلے گئے پھر کئی مہینوں تک نہ غلام
حسین آیا اور نہ ہی بانو آئی۔ میں تقریباً ان دونوں کو بھول گیا
تھا کہ ایک دن وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

میں پہلی نظر میں اسے پہچان بھی نہیں سکا۔ وہ انتہائی
دبلی ہو گئی تھی۔ بال سوکھے ہوئے اور بے ترتیب، چہرہ اجڑا
ہوا، آنکھوں میں زندگی کی رقت تو تھی مگر زندہ رہنے کا شوق،
جذبہ امتنع نہیں تھا۔ اس کے کہنے سے پہلے میں نے اندازہ
لگا لیا کہ غلام حسین کا انتقال ہو چکا ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ رو رو کر بتایا کہ غلام حسین آٹھ
مہینے تک جگر کے کینسر میں مبتلا رہ کر مر گیا۔ ”ڈاکٹر صاحب!
اسے پہلے یرقان ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ کوئی
پھیلاؤ نہیں سی کی بیماری ہو گئی ہے اسے، علاج اتنا مہنگا تھا کہ
ہم لوگ کرا ہی نہیں سکتے تھے پھر وہ خود بخود ٹھیک ہو گیا
اور ہم لوگ سمجھتے تھے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے مگر پھر اسے
دوبارہ سے پھیلا ہو گیا اور پھر سے بیماری بڑھتی چلی گئی۔“

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بے ساختہ بہے
چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی، ایسے بے معنی الفاظ
کہے جو ابے موقعوں پر کہے جاتے ہیں۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا
رہا پھر مجھے آپریشن کرنے کے لیے آپریشن تھیٹر جانا پڑ گیا۔

مسٹر ونرز خاصا دولت مند لیکن گڑا ہوا امیر انسان
ہے اور کبھی کبھار پاگل سا ہو جاتا ہے۔
ونرز جس قسم کو مرده دیکھنے کا خواہش مند تھا، اس کا
نام لینڈر میک کیولم تھا۔ گزشتہ شب کلب میں میک کیولم نے

گزشتہ شب وہ نشے میں تھا۔ آج صبح وہ سنجیدہ تھا
لیکن اب بھی اپنے ارادے پر سختی سے قائم تھا۔ ”میں اسے
مرده دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”ییس سر۔“ میں نے کہا۔

قسمت

بابر نسیم

اس دنیا میں دولت ایک ایسی شے ہے جو ہمیشہ سے ایمان، احساسات
اور جذبات سے نبرداز ماریتی ہے اور اس معرکہ آرائی میں جیت اسی کی
ہوتی ہے جس کا مقدر ساتھ دیتا ہے۔ وہ جو اپنے آقا کا بیت وفادار غلام
تھا، ڈالرز کی مہک نے اسے ہوش و حواس سے بے گانا کر دیا تھا کہ
اچانک ایک مانوس آواز نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔

قسمت کی کٹھنوں کا چونکا دینے والا ایک عجب تماشا



”تو پھر میرے لیے پیشہ ور قاتل ڈھونڈ کر لاؤ۔ تمہارے پاس جتنے تک کی مہلت ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گھلے پر انگلی چلائی جیسے چھری پھیر رہا ہو۔ ”جتنے تک کلیرنس..... مجھے تک!“

☆☆☆

گزشتہ کئی برسوں کے دوران مجھے اپنے آقا کے لیے چند قدرے عجیب اور بڑے ذہب کام سر انجام دینے پڑے۔ لیکن ان کاموں میں بھی کسی کو قتل کرنے کی ترغیب شامل نہیں رہی تھی اور نہ ہی اب میں اس قسم کے کسی کام کے آغاز کا ارادہ رکھتا تھا۔

بہر حال، مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں اس بارے میں یقین تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد ونٹز کو اپنے پاگل بین کا احساس ہو جائے گا کہ وہ کیا تجویز کر رہا ہے اور وہ اپنے مطالبے سے خود ہی دست بردار ہو جائے گا لیکن اس دوران میں اس کو طینان دلانا بھی ضروری تھا۔

ظاہر ہے اب مجھے بناوٹ سے یہ کام لینا تھا کہ میں ایک پیشہ ور قاتل سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور یہ کہ اس قاتل سے گفت و شنید جاری ہے اور اس طرح میں اس معاملے کو طول دیتا رہوں گا۔ طول اور مزید طول! اگلے روز ونٹز نے معلومات اخذ کرنے کے لیے مجھے گھیر لیا۔

”ویل؟“

میں مسکرا دیا۔ ”میں بالآخر ایک پیشہ ور قاتل کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا ہوں، سر۔“

ونٹز یہ سن کر حیران رہ گیا۔ ”واقعی کلیرنس، تم نے کھوج لگالیا؟ تم نے یہ سب کس طرح کیا؟“

”سر! اگر کوئی کسی قاتل کو تلاش کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے فرد کو تلاش کرنا چاہیے جو پہلے بھی قتل کر چکا ہو۔ ایسے قاتلوں کو اخبارات سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ہم ان قاتلوں کے بارے میں مستقل پڑھتے رہتے ہیں جو اپنی عمر قید کے مطلوبہ بارہ سال اور آٹھ مہینے کی سزا بھگت چکے ہیں اور بیروں پر رہا ہو جاتے ہیں۔ جب آپ گزشتہ سہ پہر اپنے کلب کے بے دخلی کمیٹی کے روبرو پیشی کے لیے گئے ہوئے تھے تو مجھے اپنے شہر کے سب سے بڑے اخبار کے دفتر جانے اور پرانا ریکارڈ دیکھانے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے سترہ سال پہلے کے پرانے اخبارات کھنگال کر ان ناموں کو منتخب کر لیا جو بیروں پر رہا بن چکے تھے اور انہیں دوبارہ سے سکونت اختیار کرنے کا خاصا وقت مل چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ

یہ گستاخی کی تھی کہ ونٹز کو تاش کے کھیل میں چیلنج کرتے ہوئے چلا لیا تھا۔ پہلے تو ان کے درمیان سخت الفاظ کا تبادلہ ہوا اور پھر نوبت ہاتھ پائی تک پہنچ گئی۔

ونٹز مجھے گھورنے لگا۔ ”کلیرنس! جب میں نے کہا دیا کہ میں ایک کیلومر مدد دیکھنا چاہتا ہوں تو میرا مطلب ہے کہ میں اسے مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس معاملے میں فوری طور پر عمل کرو اور کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا۔“

”سر!“ میں نے رواداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں آپ مجھ سے جن کاموں کی توقع رکھتے ہیں، ان کی لازمی کچھ حدود بھی ہوں گی۔“

تب اس نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔ ”میرا مطلب یہ نہیں کہ میں چاہتا ہوں تم ذاتی طور پر ایک کیلومر قتل کرو۔ میرا مطلب ہے کہ تم میرے لیے کسی ایسے شخص کو تلاش کرو جو اس کام کو سر انجام دے سکے۔ البتہ دیگر کوئی پیشہ ور قاتل!“

”یس سر۔“ میں نے بے ساختہ کہا اور پھر اس معاملے کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔

میں ونٹز کا پیرسل میکر مٹری، ذاتی خدمت گار، ٹریول ایجنٹ، شو فر اور موقع کی مناسبت سے ہر کام کرنے والا ہوں۔ مجھے ان کاموں کا بہت اچھا معاوضہ ملتا ہے، میں خاصا سفر بھی کر لیتا ہوں۔ ہمیشہ بہترین جگہوں پر رہائش اختیار کرتا ہوں اور نہایت عمدہ کھانوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ بلاشبہ یہ تمام اخراجات ونٹز کے کھاتے میں آتے ہیں۔ ان کاموں میں مجھے جسمانی مشقت نہیں کرنی پڑتی لیکن جو پسینے کی حکم برداری میں رہنا ذہنی بدمزگی اور چڑچڑاہٹ کا باعث ہوتا ہے۔

اگلے روز ونٹز نے دوبارہ مجھے گھیر لیا۔ ”ویل کلیرنس، تم اس بارے میں کیا کر رہے ہو؟“

”کس بارے میں سر؟“

”میرے لیے ایک پیشہ ور قاتل کی تلاش کے سلسلے میں تم نے ابھی تک کیا، کہا ہے؟“

”اوہ وہ سر! ویل، کسی پیشہ ور قاتل کو یوں تلاش کرنا قدرے مشکل ہے..... آپ تو جانتے ہیں کہ وہ لوگ اپنا اشتہار تو شائع نہیں کرتے۔“ میں نے جواب دیا۔

اس بات پر وہ مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”کلیرنس! میں تمہیں بہترین تنخواہ دیتا ہوں اور تم سے بہترین نتائج کی توقع رکھتا ہوں! تاہم یہ کام پسند نہیں ہے؟“

”مجھے پسند ہے سر..... مجھے پسند ہے۔“

سرداریاں

سردار اسپتال کے باہر کھڑا زور زور سے رو رہا تھا۔
 کسی نے پوچھا۔ ”کیوں رو رہے ہو؟“
 سردار۔ ”20 سال بعد بیٹا پیدا ہوا وہ بھی چھوٹا سا۔“



سردار بندوق لے کر دروازے میں کھڑا تھا۔
 بیوی۔ ”کیا کر رہے ہو؟“
 سردار۔ ”شیر کے شکار پر جا رہا ہوں۔“
 بیوی۔ ”تو جاؤ ناں۔“
 سردار۔ ”کیسے جاؤں باہر کتا کھڑا ہے۔“



ایک سردار کو یوفون آفس میں جا بل گئی۔
 پہلے دن ہی کال آئی۔ ”سر میری یوفون کی سم بلاک ہو گئی ہے۔“
 سردار۔ ”تو مائیلی ناری سم ڈال لو، چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے تنگ نہیں کیا کرو۔“



سردار بانیک پر جا رہا تھا کہ ایک لڑکی کو بانیک مار دی۔
 لڑکی۔ ”ہارن نہیں مار سکتے تھے کیا؟“
 سردار۔ ”پوری بانیک تو مار دی اب ہارن الگ نکال کے ماروں کیا؟“



مریض۔ ”ڈاکٹر صاحب یہ دوائی تو کہیں سے نہیں مل رہی۔“
 سردار۔ ”ڈاکٹر اویار، وہ دوائی لکھتا تو ہم بھول ہی گیا ہے تو ہمارا دستخط ہے۔“
 مرسہ۔ رضوان توی کی یڑوی، اور گنگی ٹاؤن، کراچی

انہوں نے اپنے نام بھی ٹیلی فون بک میں درج کرا لیے تھے۔ تب میں نے ان میں سے چند سے محتاط انداز میں فون پر رابطہ بھی کیا تھا۔ ویسے بائی دی وسر، سربکب کی...
 غلطی مبینی نے کیا ایکشن لینے کا فیصلہ کیا ہے؟“

ونٹرز کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”وہ لوگ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں۔ اس پیشہ ور قاتل کا نام کیا ہے، کلیرنس؟“
 ونٹرز پھر اصل موضوع پر آ گیا۔

میں نے ذہنی طور پر اپنی اطالوی انجہانی دادی سے معذرت کرتے ہوئے ان کا نام لے لیا۔ ”ماریشی!؟“

ونٹرز اچھا کر چلا گیا لیکن فوراً ہی باتھ میں فون بک لیے پلٹ آیا۔
 ”اس میں چھ ماریشینی نام درج ہیں۔ ان میں سے وہ کون سا ہے؟“ ونٹرز نے فون بک کا وہ صفحہ کھولتے ہوئے کہا جس پر یہ نام لکھے ہوئے تھے۔

”سب سے پہلا۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”اے ماریشینی؟ اے سے کیا مراد ہے؟“
 ”ا۔ بخلو!“

ونٹرز کو یہ نام بھا گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کا تعلق مافیا سے ہے؟“
 ”جسم و جان کے ساتھ۔“

ونٹرز نے سگار سلا لیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میک کیولم کو اس مجمعے کی رات قتل ہو جانا چاہیے۔ رات آٹھ بجے اور درمیانی شب کے درمیان۔“

”اس مجمعے کی شب، سر؟ یہ تو سخت دباؤ ڈالنے والی بات ہوگی۔“
 ”تجربہ عام طور پر اپنی مرضی سے اور مناسب وقت پر اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا مکمل طور پر جائزہ لینے میں دو یا تین ہفتے لگا دیتا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اس مجمعے کلیرنس۔“ میں رٹم دے رہا ہوں تو کام میری مرضی سے ہوگا۔ میں مجمعے کی شب تھا سن کے یہاں ہوں گا۔ اس کی شادی کی سالگرہ ہے اور اس نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ وہاں پچاس سے زیادہ ایسے افراد موجود ہوں گے جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ میں پوری رات اس کے گھر سے بالکل باہر نہیں گیا۔ یہ میری عدم موجودگی کا ثبوت ہوگا۔“ ونٹرز نے ٹھوس لہجے میں کہا۔
 ”ا۔ بخلو اس کام کا کتنا معاوضہ طلب کر رہا ہے؟“

میں نے فوراً ہی موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اگر میں معاوضہ بہت زیادہ بتاتا ہوں تو شاید ونٹرز اپنا ارادہ تبدیل کر دے اور میک کیولم کو قتل کرانے کا خیال دل سے نکال دے۔
 ”دس لاکھ ڈالر، سر!“

قتل کر دیتا ہے؟ فرض کریں کہ پھر وہ نئرز کو بلیک میل کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے؟ کیا وہ ان دس لاکھ ڈالرز کے علاوہ کئی لاکھ ڈالرز بٹور سکتا ہے؟

میں اس بات سے بہ خوبی باخبر تھا کہ سوال کی حیثیت اب بدل چکی ہے۔ کیا میں ان لاکھوں ڈالرز کے عوض قتل کر سکتا ہوں؟

میں نے اس سوال پر پوری سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے خود کو پانچ منٹ کا وقت دیا۔

پانچ منٹ بعد میرا جواب ہاں میں تھا۔

ان دس لاکھ ڈالرز اور اس کے بعد بلیک میلنگ سے حاصل ہونے والے مزید لاکھوں ڈالرز کے عوض میں یہ قتل ضرور کر سکتا ہوں۔

☆☆☆

ڈنر کے وقت ونٹز نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی پاور بوٹ اسکوڈرن کی میٹنگ میں شرکت کے لیے یاٹ کلب جا رہا ہے اور رات گئے تک وہیں رہے گا اور یہ کہ وہ کار خود ہی ڈرائیو کرے گا۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اپنے لیے ایک مشروب تیار کر لیا۔ یہ معمول سے کئی مقدار میں تھا۔

ونٹز چاہتا تھا کہ میک کیولم کو کل رات قتل کر دیا جائے لیکن چونکہ اب میں نے خود کو اس کام کے لیے تیار کر لیا تھا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج رات ہی اس کام کو نمٹا دیا جائے۔ ونٹز یاٹ کلب میں تھا اور جب اس قسم کی رات کی میٹنگز میں شریک ہوتا تھا تو آدھی رات سے قبل اس کی واپسی کبھی نہیں ہوتی تھی۔

اس طرح وہ جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ٹھوس ثبوت پیش کر سکتا تھا جو میں اسے فراہم کرنے والا تھا۔

میں نے ونٹز کے گن کلکیشن میں سے ایک ریوالور کا انتخاب کیا۔ ونٹز کے پاس مختلف قسم کے پھولے ہتھیاروں کا ذخیرہ تھا۔ میں نے ریوالور کے پیپر میں کارتوس بھرے اور ریوالور جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

پھر میں نے ٹیلی فون بک میں سے لینڈر میک کیولم کا نام اور پتا ڈھونڈ نکالا۔

جب میں میک کیولم کی اپارٹمنٹ بلڈنگ پہنچا تو نیچے ہال میں نصب ڈاک رکھنے کے طاوون کا جائزہ لینے لگا۔

میک کیولم کا اپارٹمنٹ ساتویں منزل پر تھا۔ میں سیلف سروس لفٹ کے ذریعے ساتویں فلور کے لیے روانہ ہو گیا۔

سات سو چھ نمبر کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ

ونٹز کو یہ سن کر حقیقت میں جھکا سا لگا۔ ”دس لاکھ ڈالرز؟ کیا تم کسی سستے قاتل کو تلاش نہیں کر سکتے؟“

”بھل کے اس اسٹیج پر یہ ممکن نہیں ہے، سر۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس مخلوق کو بولی کے اس معاملے پر کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کرے گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ پیشہ ور قاتل ان معاملات میں کتنے حساس ہوتے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

ونٹز نے اپنا سگار چبانا شروع کر دیا۔ ”اوہ، ویل! میرے خیال میں افراط زر کے اس اتار چڑھاؤ میں ہمیں ہر شے کی قیمتوں میں اضافے کی ہی توقع رکھنی چاہیے۔ یہ معاہدہ بچا بچو، بکلیئر۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شام کو جب وہ گھر لوٹا تو اس کے پاس ایک بریف کیس بھی تھا۔ اس نے وہ بریف کیس کھول کر مجھے دکھایا جو گرنری نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ”دس لاکھ ڈالرز۔“

میں نوٹوں سے بھرا ہوا وہ بریف کیس لے کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا اور اسے اپنے بستر پر خالی کر دیا۔

دس لاکھ ڈالرز!

”کیوں نہ میں تمام رقم سیٹ کر یہاں سے بھاگ نکلوں؟“ میں نے سوچا۔

نہیں! کو دس لاکھ ڈالرز کی رقم خاصی بڑی رقم ہوتی لیکن کیا یہ حقیقت میں اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ دوستوں، عزیز و اقارب اور جانی بچائی دنیا سے تمام رشتے ناتے قطع کر کے ایک مفروضہ کی حیثیت سے باقی زندگی گزار دی جائے؟ کوئی اتنی ذہیر ساری رقم سے صرف سال دو سال ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے پھر اس کے بعد؟

میں آہ بھر کر رہ گیا۔

نہیں، مجھے یہ رقم ونٹز کو لوٹا دینی ہوگی اور یہ بتا دینا ہوگا کہ اس مخلوق کو پیشہ ور قاتل نہیں ہے۔ بلاشبہ مجھے ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔ ملازمت چھوٹ جانے سے درحقیقت مجھے ہر کسی قسم کے ڈر یا خوف کا غلبہ نہیں ہوگا لیکن معاشی پریشانی کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا۔

میں نے دوبارہ اپنی نظریں بیڈ پر پڑھیں۔ ہوئی دس لاکھ ڈالرز کی رقم پر مرکوز کر دیں۔ کیا دس لاکھ ڈالرز کے عوض میں کسی کو قتل کر سکتا ہوں؟

یقینی طور پر نہیں۔ دس لاکھ ڈالرز کے عوض بھی نہیں۔ تو پھر میری قیمت کیا ہے؟ کیا میری کوئی قیمت بھی ہے؟ ایک آئیڈیا جو میرے ذہن میں کلپا رہا تھا، اب پختہ ہو گیا۔

فرض کریں کہ اس مخلوق کو مارشینی حقیقت میں میک کیولم کو

چھیڑ چھاڑ یا محتارت آمیز رویہ اختیار کیا جائے۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ سے نکل جانے پر وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

ونٹرز یہ سن کر بے چین سا ہو گیا۔ ”ویل، میرا خیال ہے کہ آخری لحات میں کسی معاملے کو منسوخ کر دینا یقیناً کسی حد تک ناراضگی کا سبب بن سکتا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کیا کرنا چاہوں گا۔“ ونٹرز نے وقت ضائع کیے بغیر فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان سے کہو کہ وہ قتل کے معاملے کو منسوخ کر دیں اور پوری رقم بھی اپنے پاس رکھ لیں۔“ لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ ”سر! جرمانے کا سوال تو اب بھی باقی ہے۔“

”جرمانہ؟ کیسا جرمانہ؟“

”معادہ منسوخ کرنے کا جرمانہ! اسخلو کے ساتھ معاہدے کی گفت و شنید میں اس نے اسی نوعیت کے ایک کیس اور اس کی منسوخی پر عائد کیے جانے والے جرمانے کی بات بھی کی تھی۔“ مافیا یہ خیال کرے گی کہ آپ نے ان سے لطف لینے اور چھیڑ چھاڑ کی خاطر یہ معاہدہ کیا تھا اور یہ کہ ایک قاتل کی خدمات حاصل کرنے کے آپ کے ارادے میں خلوص قطعی طور پر شامل نہیں تھا۔ مزید یہ کہ آپ شاید ان کے طریق کار کے بارے میں کوئی کتاب لکھ رہے ہیں اس لیے سر ضروری ہے کہ ان کے احساسات کی لازمی تسکین کر دی جائے۔ ان کے شبہات کو دور کر دیا جائے۔ رقم لازمی ان تک پہنچا دی جائے اور جرمانے کی رقم بھی ساتھ ہی ادا کر دی جائے جو بلاشبہ معاوضے کی رقم کے برابر ہوگی۔ یعنی مزید دس لاکھ ڈالر! میں نے بتایا۔

ونٹرز نے رومال کی مدد سے اپنی پیشانی پر سے پسینا صاف کیا اور قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اثبات میں سر ہلایا دیا۔ ”آل رائٹ! کل میں لاکھ ڈالر۔ اس معاملے کو خوش اسلوبی سے نمٹا دو، بکلیئر!“

میں نے معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔

میں لاکھ ڈالر کی رقم میری تحویل میں ہے۔ میں نے مزید ایک سال تک ونٹرز کے پاس رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو۔ ایک سال بعد جب میں اس کی بیس لاکھ ڈالر کی رقم کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوں تو وہ ہنسی خوشی مجھے الوداع کہہ دے۔ میں اس کی اجازت سے اس کی ملازمت کو خیر باد کہوں گا۔

اس دوران میں نے اپنے کیلنڈر پر اپنے دن شمار کرنا شروع کر دیے ہیں۔

کر میں نے ڈور بیل کا بٹن دبا دیا اور انتظار کرنے لگا۔ میرا ہاتھ میری جیب میں موجود ریوالور کے دستے پر تھا۔

دروازہ خود میک کیولم نے کھولا۔ وہ مجھے ایک دوسرے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ البتہ یہ چونکہ میرا محتاط رویہ تھا کہ میں ہمیشہ پس پردہ رہا کرتا تھا اس لیے میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔

میں نے گہری سانس لی اور تب مجھے احساس ہوا کہ اپنی شدید گھبراہٹ کے باعث مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ جیب میں رکھا ہوا ریوالور باہر نکل لوں۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ میں ایک انسان ہونے کے ناتے ایک اور انسان کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا گیری بالڈی کی رہائش گاہ یہی ہے؟“

میک کیولم جیسے ناراض سا ہو گیا۔ ”نہیں۔“ اس نے خفگی سے کہا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح لباس تبدیل کرنے کے بعد جب میں بریف کیس لے کر نیچے پہنچا تو ونٹرز کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے بریف میں سر طارن نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”رقم اسخلو کے پاس لے کر جا رہے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے تمہیں بروقت پکڑ لیا۔ میں نے اس پورے معاملے میں دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ ونٹرز نے جیسے دھماکا کیا۔

میں حیرت سے پلکیں جھپکا تا رہ گیا۔

”کلب کی بے دخلی مینیٹی کے چیئرمین نے آج صبح سویرے مجھے فون کیا تھا۔ انہوں نے اس معاملے کو درگزر کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میک کیولم نے مجھ پر الزام لگایا تھا اور میں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس معاملے کا کوئی گواہ گواہ بھی نہیں تھا۔ لہذا اب میک کیولم کو مار ڈالنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس لیے کہ کلب میں میری رکنیت برقرار رہے گی اور میری ممبر شپ خارج نہیں کی جائے گی۔ میں نے اسے مار ڈالنے کا ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔“

میں آنکھیں میھاڑے ونٹرز کو دیکھنے لگا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آرہا تھا۔ ”منسوخ کر دیا ہے؟ کیا آپ اس معاملے کو اتنا آسان سمجھ رہے ہیں جتنی آسانی سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ اسخلو اور مافیا آگ بگولا ہو جائیں گے۔ آخر کار معاہدے کی رقم کا نصف حصہ مافیا کو ملنے کی توقع تھی اور وہ تنظیم اس قسم کی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی



محی الدین نواب

سب سے پہلے

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُر جوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تدریجہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کبھی پھولوں کی عکس، کبھی کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... پرشے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسادیا اور یہ بھی عجب کپیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روناد کو سمیٹتے، نئے رنگ و ابھنگ کا تحیر خیر سنگم۔

محی الدین نواب کی نئی کتاب 'ماروی' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے...





یہ داستان ہے دو دہائی کی مادی اور اس کے عاشق مراد علی بھٹی کی۔ مراد ایک کدو کا گاؤں والا ہے جو اپنے والد اور باری، چاچا چھوڑا اور چاچا بیٹی کے اندر ان سب کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا ڈیرہ شہت جلالی ایک بدلتی انسان تاجیہ نے مادی کا شریک بن کر لیا تھا، جس کا مقصد مادی کی مٹائی تھی۔ مادی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی۔ نتیجتاً انہیں گھوٹ پھوڑا ہوا مراد اور جو کتا ٹوٹی تعلیم یافتہ تھا۔ مادی اور شہت کی فتنی گیری کر رہا تھا۔ ڈیرہ شہت جلالی اور اس کے بیٹے راہتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جانکا دھبے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو بھوکا کر دیا۔ اس کی تنہائیوں کا سامھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک فتنی باہمی جھگڑا دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کرانی کے ایک شافعی علی علاقے میں گھوٹ آئے جہاں مراد اپنے چاچا، چاچا کی ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ بیس مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوئی جو گیسمر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون لیکن موہیہ اور اکامہ محل تھے۔ اس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہمہ شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ شہت جلالی جو کہ خود بھی ہمیر اسمبلی تھا اس کا ڈیرہ بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استغفار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ وہاں تک یہ تھیں جو تھیں اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور دو جوان جمال سے شادی کر لی اور غمش سے فرار ہو گئی۔ دو ڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرانی۔ تا کہ یہ انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک کوئی کرانی جو کہ زلیخا کے قاتل کا تھ کہ فتنی باہمی برادر کر کے لیا اور اس کا چہرہ تیاراب سے مخ کر کے اسے اپنی بیٹی چلی خاہر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔ ارادہ اسے اپنی جگہ کہ خود گھوٹ نشین ہوا تھا، محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف بھٹی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک مالیر اور اوکیر میٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران مادی کی جھگڑا دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرنا لگے۔ ایک بائیزہ جڈہ تاجیہ جس کو کوئی ٹھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بے طور ماڈل مادی کو پتا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے باکوا ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور فرقدور تم کے ساتھ زلیخا کا وہ بھائی لے گئے لیکن اپنے بچے سے مراد راضی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو قتل دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چلی گئی لیکن وہ ڈیرہ پڑا اور بیٹوں کو کہیں بھی کر لیا تھا۔ اور اس کا حال میں ہے۔ مراد راجہ جاتی تھی لیکن مراد سے نا اہل تھی۔ وہ دوسرے بچوں سے بھی نا اہل تھی۔ راضی نہیں کر رہی تھی۔ اس پر اس کے قتل کے بعد جسے ملوث تھا، محبوب چانڈیو مادی کی خاطر اس کے مقتدے کی حیثیت میں مراد سے نا اہل تھی۔ وہ دوسرے بچوں کی ڈیرہ شہت سے فتنی ہوئی یہ بات پانی کے لینڈ ٹینک کی نتیجہ چانڈیو استفادہ سے کر چکا آیا۔ یہ مادی کے دشمنوں میں پیدا ہوئی تھی۔ اسے انوکھ کرانے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی فتنی کی شادی میں شرکت کے لیے گھوٹ میں تاہم محبوب چانڈیو سے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکریت ایجنٹ برادر ڈوکر ہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے سین ایجنٹ مراد سے جو کہ جنرل کی بیٹی ہے دیگر دوسرا سیکریم ہرام اور اوراد الکر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ مرید مراد کو ایک نظر دیکھ کر ہار گئی اور اس سے شادی اسے درغل کر مادی سے دور کر رہی تھی جبکہ مادی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کر لے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقتدے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب ایک بیٹی سے ان کا دھکا دھکا تھا اور جتنی کہ جب مادی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوئی جس میں سیرا بھیر پر مدد کر رہی تھی کہ محبوب مادی کی مدد سے باز آ جائے مگر اس خبر کے بعد وہ ہلر داشت ہو کر خود مادی کی جگہ چل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب مادی کی تلاش کالانچ دے کر مراد کو سیرا بھیر کی مدد سے چل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد سیرا بھیر کی نیت بھانپ کر اسے بھانسا دیتے ہوئے اس کے شہت سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سیرا بھیر اور جٹی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرید مراد کا چچا کرتے ہوئے راتے میں مادی کی جگہ پہنچ گئی اور محبوب سے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کر لیا تو اس خبر سے محبوب میں سنی زندگی دو ٹوٹی۔ مرید اپنے باپ کے مل پر بہت شایرٹ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر میرا بھیر کی جو مرید کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا، اتفاق سے راتے میں مادی چاچا اور چاچا کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں لیکن اس کی کسی طرح اور کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مرید مادی کو کام تھا کہ جو پھر کی پاس سے پاس لے جا رہی ہے لہذا مشکلات سے تیراؤ زما ہوتے ہوئے وہ مادی کو اس کے چنگل سے آزاد کر لیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مادی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہت چرکیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے راز داری کے ساتھ چل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود دسلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ محبوب اور مراد کے جگہ بدلے لینے سے حالات بھی بدلتے جا رہے تھے۔ مرید اور مراد میں فساد ہوتا جا رہا تھا۔ مرید کے ہاتھوں مراد کو کسی طرح چل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا نظریہ ایک مجرم برادر مراد کے ہاتھوں مراد جاتا ہے۔ دوسری جانب مادی کے علاج کے لیے باہر سے ایک ڈاکٹر بند ہو گیا۔ مادی جاتا ہے جو خود بھی دہری شخصیت کا شکار ہے۔ وہ بعد بھیجے سے اور عادل بھی۔ مراد بھی محبوب کے گھر پہنچ گیا تھا کہ مادی محبوب اور مراد دونوں کو بچانے کی کوشش میں مگر اسے کچھ پائینس آ رہا تھا۔ مادی کو عدلیہ کی حقیقت کاظم ہو گیا اور اس نے عدلیہ کو ختم کر کے ساتھ خود سے دور سنبھل کا کہا۔ بعد میں عدلیہ چلی گئی۔ ادھر علی ایجنٹ مراد کو اس کے گھر کا حوالہ دیا۔ مرید مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرید کی قید سے نکل گیا اور مراد کو ماسکو کو بوبو کے ساتھ مل چاؤن طرف سے گھر لیا مگر اس دوران مرید نے دھوا بول دیا۔ مرید مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرید کی قید سے نکل گیا اور مراد کو ماسکو کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مراد ماسکو کی طرف سے ایک کام ملا اس سے پہلے ہی کام کر کے ایک ہزار چالیں لاکھ لاکھ مارا اور اپنے بھتیجے کی تم پاکستان میں موجود ہیں کہ اس وقت میں منتقل کرادی۔ مراد نے دوسرا کام کیا اور مرید کے راستے میں پھر کاؤٹ بن گیا۔ اس نے فخریہ معاہدے کی مانگ کر ماسکو حاصل کر لی اور مرید کو پھر پر کر دیا۔

کہ مراد انڈر ورلڈ کے وینکٹ راؤ کے لیے کام کر رہا ہے اور وہ تمہارا دشمن ہے۔ وہ تم پر نظر رکھتا ہوگا لیکن تم نے اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا۔ اس سے غافل رہیں۔ جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اس مائیکرو فلم سے میں کروڑوں ڈالرز حاصل کر سکتا تھا۔ مراد یہ منافع وینکٹ راؤ کی جھولی میں ڈال چکا ہے۔“

اس کی توہین ہو رہی تھی۔ وہ شدید غم و غصے سے بولی۔ ”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”تم یہاں بیٹھے بیٹھے خیالوں میں اسے قتل کرتی رہو۔ کمزور دعوے کرتی رہو کہ اسے زندہ نہیں چھوڑو گی۔ اس کے برعکس وہ تمہاری زندگی کو عذاب بنا رہا ہے۔ یہ لکھ لو کہ آئندہ بھی کبھی مشن میں اس سے جوٹ کھانے والی ہو۔“ وہ مٹھیاں ہچکنے لگی۔ ”ہرگز نہیں۔ بس ایک بار سامنا ہو جائے پھر آپ کو اطلاع ملے گی کہ وہ میرے ہاتھوں مر چکا ہے یا پانچ بن کر میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔“

”تم نے مجھے کروڑوں ڈالرز کا نقصان پہنچایا ہے۔ وہ نقصان اس طرح پورا کر سکتی ہو کہ مراد کو ہلاک نہ کرو۔ نہ ہی زخمی کرو۔ اسے میرے کام کے لیے راضی کر لو۔ پھر تم دونوں مل کر کام کرو گے تو ناکامی دشمنوں کا مقدر بن جائے گی۔ تم دونوں مل جاؤ تو بڑی کامیابیاں حاصل کرو گے۔“

وہ لاپوشی سے سر ہلا کر بولی۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ کبھی راضی نہیں رہے گا۔“

”سمجھنا چاہو تو اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کو سمجھو کہ وہ تم سے راضی کیوں نہیں رہتا ہے۔ اس کے مزاج کے مطابق ڈھل جاؤ گی تو وہ ضرور تمہارا دوست بن جائے گا۔“

”میں ہتھیلی پر انگارے رکھ کر قسم کھاؤں گی کہ اس کی تابع دار دوست بن کر رہوں گی، تب بھی وہ یقین نہیں کرے گا۔“

”تم اپنے دماغ سے یہ احمقانہ خیال نکال دو کہ اسے اپنا غلام بنا سکو گی اور اس کے ساتھ راستیں کزاز سکو گی۔ وہ ان مردوں میں سے ہے جو عیاش عورتوں کو گھاس نہیں ڈالتے۔“

”میں عیاش نہیں ہوں۔ صرف اس کی طلب گار ہوں۔ میں کتنے ہی شہ زور اور خوبرو جوانوں کو ٹھکرا چکی ہوں۔ وہ مجھے ٹھکراتا ہے تو مجھ سے غصہ برداشت نہیں ہوتا۔“

”پھر تو لکھ لو کہ وہ ٹھکراتا رہے گا اور تم غصہ دکھاتی رہو گی۔ دوستی کبھی نہیں ہو سکے گی۔“

”میری وجہ سے آپ کو کروڑوں کا نقصان پہنچا ہے۔ میں جلد ہی یہ نقصان پورا کروں گی لیکن اس مغرور سے

ماسٹر فرانسس کو بو بو خوشی سے تاپنے لگا۔ مراد اس کے دشمن سے مائیکرو فلم حکیم کر لے آیا تھا اور اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس کا کیچا ٹھنڈا کر چکا تھا۔

اس نے فون پر کہا۔ ”مراد! تم ایک تراشیدہ ہیرا ہو۔ تمہاری قیمت صرف میں جانتا ہوں۔ بانی گاڈ! میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔“

”آج سے تم اپنی ذاتی کمائی کا صرف میں پرسنٹ مجھے دیا کرو گے۔ یہ جو دو کروڑ لائے ہو، اس میں سے صرف پچاس لاکھ لوں گا، بانی تمہارے ہیں۔“

”تم جب چاہو پاکستان جاسکتے ہو لیکن دو چار روز یہاں رک کر پہلے وہاں کے حالات معلوم کرو۔ دانش مندی یہ ہوگی کہ یہاں بیٹھ کر وہاں کے دوستوں اور دشمنوں کو اچھی طرح سمجھو پھر اپنی ہونے والی دہن کے پاس جاؤ۔“

مراد نے کہا۔ ”آپ درست فرماتے ہیں۔ میں وہاں جانے سے پہلے بہت محتاط ہوں۔ میرا ایک جاں نثار ساتھی بلال احمد عرف بلڈ کرائی شہر میں میرے وفاداروں کی ایک ٹیم بنا رہا ہے۔ وہ ایسی خفیہ پناہ گاہیں بنا رہا ہے جہاں میں دشمنوں سے محفوظ رہ سکوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں میں بہت محتاط ہوں اور آپ جلد ہی سنیں گے کہ نیکی البرٹ کی طرح اس کا چچہ عالی جناب بھی جہنم میں پہنچ گیا ہے۔“

”پاکستان کب جانا چاہتے ہو؟“

”میں اپنے دوستوں اور شناساؤں سے یہی کہوں گا کہ ایک ہفتے کے اندر آ رہا ہوں لیکن کس دن آؤں گا؟ یہ نہیں بتاؤں گا۔ آپ سے کہتا ہوں کہ کل ہی جانا چاہوں گا۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی جگ دیو سے بات کرتا ہوں۔“ کو بو بو نے اسی وقت جگ دیو سے رابطہ کیا۔ اس وقت مرینہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔

جگ دیو نے کہا۔ ”ماسٹر! مرینہ یہاں موجود ہے۔ میں وائڈ اسپیکر آن کر رہا ہوں۔“

ماسٹر کو بو بو نے کہا۔ ”ہیلو مرینہ! تمہیں آجہیں اندازہ ہے کہ تم نے وہ مائیکرو فلم حاصل نہ کر کے ہمیں کتنا نقصان پہنچایا ہے؟“

وہ بولی۔ ”میں شرمندہ ہوں ماسٹر! اس خبیث مراد کو پتا نہیں کیسے اس مائیکرو فلم کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ آپ یقین کریں میں بے خبری میں...“

ماسٹر نے بات کاٹ کر کہا۔ ”نا کام ہونے والے طرح طرح کی باتیں بنا کر اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو چھپاتے ہیں۔ ہم کسی بھی مشن میں ایک ہی بات جانتے ہیں۔ کامیابی یا ناکامی..... اور تم ناکام ہو چکی ہو۔ تم جانتی ہو

دوستی نہیں کروں گی۔ اسے تو دیکھتے ہی گولی مار دوں گی۔“ وہ تنہائی میں سوچتی تھی اور مانتی تھی کہ اس کی دیوانی ہو گئی ہے۔ اسے یاد آتا تھا کہ مندر کی تاریکی میں وہ کس طرح اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بوجھ تلے پھڑپھڑاتی رہی تھی شاید اس لیے کہ دل رہائی حاصل نہیں کرتا چاہتا تھا۔ واہ ری عورت...!

وہ کرتی تھی کیا... یہی سب کچھ پیار سے چاہتی تھی اور وہ دھکا دیتا تھا۔ یہ بے عزتی تو وہ بھول نہیں سکتی تھی کہ اس نے اسے بے لباس کر کے گھر سے لے جا کے بیچ بازار میں چھوڑ دیا تھا۔ جیسے وہ کوئی گرمی پڑی بازاری عورت ہو۔

اس نے ماسٹر کو بولو سے کہا۔ ”میرا بچی چاہتا ہے وہ ابھی سامنے آئے اور میں اس کی بوٹی بوٹی کر دوں۔ آپ انتظار کریں۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں جھنجھلا کر ڈنکیں مار رہی ہوں۔ میں جلد ہی انڈر ورلڈ کے وینکٹ راؤ کو اس کی لاش کا حقد دوں گی۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”جب اپنی حسرت پوری کر لو گی تو ہم تمہاری برتری مان لیں گے۔ ابھی جاؤ، آرام کرو۔ مجھے جگ دیو سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ جگ دیو نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد کہا۔ ”لیس ماسٹر! وہ جا چکی ہے۔ اس نے اب تک کوئی کام نہیں دکھایا ہے۔ باتیں بڑی بڑی کرتی ہے۔“

کو بولنے کہا۔ ”لندن اور اسکاٹ لینڈ میں اس نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ مراد کے مقابلے میں اس لیے مات کھا رہی ہے کہ عقل سے نہیں جذبات سے کام لیتی ہے۔ اب اس نے قسم کھائی ہے کہ مراد سے جذباتی لگاؤ نہیں رکھے گی۔ اسے دیکھتے ہی گولی مار دوں گی۔“

جگ دیو نے کہا۔ ”اگر واقعی وہ مراد پر کامیاب قاتلانہ حملہ کرے گی تو ہمیں نقصان پہنچے گا۔ ہمیں سب سے پہلے مراد کی سکیورٹی کو اہمیت دینی ہوگی۔“

”بے شک، مراد ایک انمول ہیرا ہے۔ ہم نہیں چاہیں گے کہ اسے ذرا سا بھی نقصان پہنچے۔ ایسا کر کے ابھی مرینہ سے ایک اور اہم کام لو۔ اگر وہ ابھی ناکام رہی تو اس سے نجات حاصل کر لو۔“

”نیں ماسٹر! یہی ہوگا۔ ہم اسے ایک چانس دیں گے۔ ایک اور معاملے میں اسے آزمائیں گے۔“

”مراد کل ہی سرحد پار کرنا چاہتا ہے۔ اسے پوری سکیورٹی کے ساتھ یہاں سے جانے دو۔“

”میں انتظام کرتا ہوں۔ یہ کام ہو جائے گا۔“

مراد بہت خوش تھا۔ اب سے تیس گھنٹے بعد اپنی ماروی کی صورت دیکھنے والا تھا۔ اس سلسلے میں سوچ رہا تھا کہ وہاں پہنچنے ہی ماروی سے ملنا چاہیے یا نہیں؟ دانش مندی یہ ہو گی کہ وہاں پہنچنے کے بعد دو چار روز چھپ کر رہے اور حالات کا جائزہ لیتا رہے۔ کسی طرح دشمنوں کے ارادوں سے آگہی حاصل کرنا رہے اور محبوب ایسا تھا جو دوست بھی تھا اور دشمن بھی۔ واقعی دانش مندی یہی ہوتی کہ وہاں پہنچ کر ماروی سے ملنے کی جلدی نہ کرتا۔ دل نہ مانتا تو کہیں سے چھپ کر اسے دیکھ لیتا۔

وہ سرحد پار کرنے کے لیے کارڈ رائیو کرتا ہوا دہلی سے جے پور آ رہا تھا۔ پھر جے پور سے دوسرے دن بارڈر پار کرنے کے لیے اس علاقے میں جانے والا تھا جہاں سے ایک رات بھٹکڑ اور اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا آیا تھا۔ وہ ماروی سے دور ہو کر جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے واپس جانے والا تھا۔

اگرچہ وہ جرائم کی دنیا کا ہو کر رہ گیا تھا۔ بڑے حوصلے اور جواں مردی سے اپنا ایک مقام بنا رہا تھا تاہم گمراہی سے کروڑوں روپے کما کر اپنی جان حیات کے پاس جا رہا تھا۔

مرینہ جے پور میں تھی۔ پچھلی رات ناکامی کے بعد جگ دیو کے پاس آئی تھی۔ وہاں اس نے فون کے ذریعے ماسٹر کو بولو سے باتیں کی تھیں۔ پھر اس سے باتیں سننے کے بعد جھنجھلا کر رہ گئی تھی۔ وہاں سے چپ چاپ آرام کرنے کے لیے ایک ریٹ ہاؤس کی طرف جا رہی تھی۔

ایسے وقت اس نے مراد کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ قسم کھا چکی تھی کہ اس کا سامنا ہوتے ہی اسے گولی مار دے گی لیکن وہ جگہ فائرنگ کے لیے مناسب نہیں تھی۔ ٹریفک زیادہ تھا، گولی مارنے کے بعد آسانی سے فرار کا راستہ نہ ملتا۔ وہ قانونی گرفت میں آنے والی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگی۔ سوچ رہی تھی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ کسی ویرانے کی طرف جائے پھروہ آسانی سے اسے شوٹ کر سکے گی۔ یہ اس کی زندگی اور موت کی طرح ایک بہت ہی اہم خواہش تھی۔

لیکن یا حیرت...! اس نے پندرہ یا بیس منٹ کے بعد ہی شدید حیرانی سے دیکھا۔ مراد کی کار جگ دیو کے بیٹگلے کے احاطے میں جا کر رک گئی تھی۔ وہ تو یہی جانتی تھی کہ مراد

ہے۔ فاضل گولیاں نہیں ہیں۔ کیا گھر سے اور لے لوں؟“
 وہ بولی۔ ”میرے پاس بہت ہیں۔ فکر نہ کرو۔“
 وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی شہر سے باہر ایک
 کچے راستے پر آگئی پھر اس نے ایک ویران سی جگہ پہنچ کر
 گاڑی روک دی۔ اپنا یو ایو رکال کرا سے نشانے پر رکھتے
 ہوئے کہا۔ ”دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھو۔“
 وہ حیرانی سے بولا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“
 ”کوئی بات نہ کرو۔ فوراً ہاتھ اٹھاؤ۔“

اس نے دونوں ہاتھ پیچھے گردن پر رکھ لیے۔ مرینہ
 نے اس کے لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر یو ایو رکال لیا۔ پھر
 پوچھا۔ ”مراد اور جگ دیوٹی دوستی کب سے ہے؟“
 ”مراد سے دوستی کیوں ہوگی؟ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“
 ”وہ ابھی جگ دیو کے ساتھ اس پتھلے میں ہے اور تم
 جھوٹ بول رہے تھے کہ جگ دیو باہر کسی سے ملنے گیا ہے۔“
 وہ چپ رہا، مرینہ نے کہا۔ ”کوئی بات بنائے بغیر فوراً
 جواب دو۔ مراد دشمن نہیں ہے۔ اپنا ہی آدمی ہے۔ وہ وینکٹ
 راؤ کے لیے نہیں ماسٹر کو بولو کے لیے کام کر رہا ہے۔“
 ”میں نہیں جانتا، وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے۔“
 مرینہ نے اس کے گھٹنے میں گولی ماری۔ وہ تکلیف کی
 شدت سے چیخنے لگا۔ وہ اس کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے
 دھکا دیتے ہوئے بولی۔ ”باہر جاؤ۔“

وہ کار سے باہر نکلے نکلے زمین پر گر پڑا۔ اپنی زخمی
 ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا۔ ”مجھے نہ مارو۔ میں
 سچ بول رہا ہوں۔ مراد کو وینکٹ راؤ کے آدمیوں نے اغوا
 نہیں کیا تھا۔ تمہیں دھوکا دینے کے لیے اغوا کا ٹانگ رچایا
 گیا تھا۔“

”مجھے دھوکا کیوں دیا جا رہا ہے؟“
 ”تم سے مراد کی غنتی نہیں ہے۔ ماسٹر تم دونوں کو الگ
 رکھ کر دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سے کون زیادہ کام آنے والا
 شاطر ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب آزمائش
 ہی تھا تو مجھ سے نا انصافی کیوں کی گئی؟ ہم دونوں کو ایک
 دوسرے کے مقابلے پر رکھنے کے دوران اسے مجھ سے باخبر
 رکھا گیا اور مجھے اس سے بے خبر رکھا گیا۔ ایسے میں مراد نے
 مردانگی دکھا کر کون سا کمال کیا ہے۔ آئندہ میں اس سے
 باخبر اور محتاط رہ کر کمالات دکھاؤں گی۔“

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”آئندہ تمہارا
 اس سے سامنا نہیں ہوگا۔ وہ یہاں نہیں رہے گا۔ کل رات

اندر ورلڈ کے وینکٹ راؤ کے لیے کام کرتا ہے پھر وہ جگ
 دیو کے پاس کیوں آیا تھا؟

مرینہ نے وہاں سے دور اپنی گاڑی روکی تھی۔ ادھر
 سے ان کی نظروں میں نہیں آسکتی تھی۔ پھر اس نے
 دیکھا، جگ دیو اپنے بیٹکے سے نکل کر مسکراتا ہوا آیا اور بڑی
 خوشی سے دونوں بازو پھیلا کر مراد سے گلے ل رہا تھا۔ اسے
 بڑی عزت سے اپنے بیٹکے کے اندر لے جا رہا تھا۔

مرینہ کے دیدے حیرت سے پھیل گئے تھے۔ جگ
 دیو دشمن کے ایسے آدمی سے گلے ل رہا تھا جس نے کروڑوں
 روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں انہیں حاصل
 ہونے والی مائیکرو فلم بھی چین کر لے گیا تھا۔
 یہ سنا تھا کہ دوستی کی آڑ میں دشمنی کی جاتی ہے لیکن یہ
 کبھی نہیں سنا تھا اور نہ دیکھا تھا کہ دشمنی کی آڑ میں دوستی کی
 جاتی ہے۔

وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ مراد وہاں جگ دیو سے دوستی
 کرنے آیا ہے یا پہلے ہی سے ان کے درمیان درپردہ دوستی
 چلی آ رہی ہے؟

اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ ایک ہفتہ
 پہلے رہائش کے لیے دہلی تھی جی اور مراد کو معلوم ہو گیا تھا کہ
 وہ دہلی آگئی ہے۔ وہ اس کی رہائش گاہ تک بھی پہنچ گیا تھا۔
 مائیکرو فلم کی لین دین کا معاملہ بہت ہی سیکر تھا۔ انتہائی
 رازداری کے باوجود مراد اس مندر میں پہنچ گیا تھا۔

اس کے ذہن میں یہ سوال چچ رہا تھا۔ کیا جگ دیو اس
 کے بارے میں مراد کو معلومات فراہم کرتا رہا ہے؟ وہ جگ
 دیو کے بیٹکے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر ٹھوم رہا تھا۔
 آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسے شخص کے
 ماتحت رہ کر کام کر رہی ہے جو اس کے جانی دشمن سے دوستی
 رکھتا ہے۔

جگ دیو کا ایک خاص ماتحت گنگو... بیٹکے سے نکل کر
 اسی راستے پر آ رہا تھا جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ
 کر ٹھٹھک گیا۔ مرینہ نے کہا۔ ”میں ابھی جگ دیو سے ملنے جا
 رہی ہوں۔ تم کہاں جا رہے ہو؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”دیو بھیا تو گھر میں نہیں ہیں۔ وہ
 کسی سے ملنے گئے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”تم میرے ساتھ آؤ۔ میں جہاں جا رہی
 ہوں وہاں تمہارے جیسے گانڈ کی ضرورت ہے۔“

وہ اس کے ساتھ آ کر کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کسی
 سے ٹکراؤ تو نہیں ہے؟ میرے پاس ایک بھرا ہوا یو ایو

وہ اس کے دل کی بات کہہ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ تمہیں دہلی میں ہی رہنا چاہیے۔ وہاں رہو گی تو مراد پر نظر رکھ سکو گی۔ میں یہ معلوم کر کے بتاؤں گا کہ وہ وہاں کس علاقے میں رہتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”تمہاری مہربانی ہوگی۔ وہ میری نظروں میں آئے گا تو میں اس سے اپنی ناکامی کا انتقام لے سکوں گی۔“

”ہم یہی چاہتے ہیں۔ اس کینت نے ہمیں کروڑوں کا نقصان پہنچایا ہے۔ تم دہلی پہنچو، میں جلد سے جلد اس کے متعلق معلومات حاصل کر رہا ہوں۔“

راباط ختم ہو گیا۔ مرینہ نے اسے بہت ہی غلیظ گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیسے دوغلے اور کینے ہیں۔ میرے ساتھ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ مجھے دہلی بھیجا جا رہا ہے تاکہ میں یہاں رہ کر مراد سے ان کی یاری دوستی کو آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں اور مراد کے سرحد پار کرنے کے معاملے میں رکاوٹ نہ بنوں۔“

”یہ کینے کتنی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ میں ان کی کینگی کی ایسی سزا دوں گی کہ ماسٹر کو یو، مراد کی لاش کو بھی سرحد پار نہیں کر سکے گا اور جگ دیو کو بھی اس کی مکاریوں سمیت جہنم میں پہنچا دوں گی۔“

وہ کارڈ رائیو کرتی ہوئی ریٹ ہاؤس کے احاطے سے نکل کر مین روڈ پر آگئی پھر وہاں سے تقریباً بیس کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں آکر رک گئی۔ وہیں ایک رات گزارنے کا ارادہ تھا۔

شام ہونے تک ایک پولیس اسٹیشن سے جگ دیو کو اطلاع دی گئی کہ انہیں شہر سے دور ایک کپے راستے کے قریب گنگرام عرف گنگو کی لاش ملی ہے۔ وہ آکر اسے دیکھ لے۔

جگ دیو پولیس والوں کی مضیاں گرم رکھتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گنگو اس کا دست راست ہے۔ کسی دشمن سے اس کی ٹھن ٹھنی ہوگی۔ وہ اسے گولی مار کر روپوش ہو گیا ہے۔ جگ دیو نے پولیس اسٹیشن میں گنگو کی لاش دیدی۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگا کہ اپنے ہی علاقے میں اس کے دست راست کو ہلاک کرنے کی جرات کس نے کی ہے؟

اس کی پر اسرار ہلاکت سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ مرینہ کے پہلے حملے نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اور مراد اس بات سے بے خبر تھے کہ آج رات کے بعد دوسری رات وہ جھنجھلائی ہوئی شیرنی ان پر بھی حملہ کرنے والی ہے۔

ابھی مراد اپنی ماروی سے ملنے کی مسرتوں میں مست

بارڈر پار کر کے پاکستان چلا جائے گا۔“

یہ مرینہ کے لیے ایک نئی اور اہم اطلاع تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا واقعی وہ پاکستان جا رہا ہے؟“

”ہاں کل رات کو دیو بھیا اسے سرحد پار کرائے گا۔“

وہ تکلیف سے کراہتا ہوا زمین سے اٹھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”کیوں اٹھ رہے ہو؟ زمین پر ہی آرام کرو۔“

یہ کہتے ہی اس نے دو بار ٹیڑھ کود بایا۔ دو گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ اس نے ابھی جو کہا تھا وہی ہوا۔ وہ زمین پر ہی ہمیشہ کے لیے آرام کرنے لگا۔

وہ شہر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ غصے سے دماغ گرم ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت بڑا فراڈ ہو رہا تھا۔ اسے اتفاقاً معلوم ہو گیا تھا کہ مراد وینکٹ راؤ کا نہیں ماسٹر کو یو کا آدمی ہے۔

یہ معلوم نہ ہوتا تو وہ اندھیرے میں ہی رہتی اور دھوکا دینے والے ماسٹر کو یو اور جگ دیو سے وفاداری کرتی رہتی اور ایسی اندھی وفاداری میں کی دن مراد کے ہاتھوں ماری جاتی۔

وہ کارڈ رائیو کرتی ہوئی دانت چیں کر بڑبڑاتی۔ ”مراد تم... تم پاکستان جاؤ گے؟ اونہ! تمہارا تو باپ بھی نہیں جاسکے گا۔ اب میں باخبر ہوں اور تم بے خبر ہو۔“

”یہ نہیں جانتے کہ کس طرح شب خون مارنے والی ہوں۔ تم دیکھو گے کہ بے خبری میں شد زور بھی کیسے مارے جاتے ہیں۔“

مراد واقعی بے خبر تھا۔ اس کو اور جگ دیو کو اور ماسٹر کو یو کو یہ نہیں معلوم ہونے والا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے فراڈ سے واقف ہو چکی ہے۔ آئندہ کتنی چھری بن کر انہیں کاٹنے والی ہے۔

مراد جگ دیو سے مل کر یہ طے کر چکا تھا کہ کل رات اسے خود یا رہنمائی دیا جائے گا۔ وہ کل تک بے پور میں رہے گا پھر شام کو سرحد کی پستی میں آجائے گا۔

جگ دیو نے کہا۔ ”مرینہ یہاں آئی ہوئی ہے، تم کل تک مجھ سے ملاقات نہ کرنا۔ میں آج رات کو یا کل صبح تک اسے کسی کام سے دہلی روانہ کر دوں گا۔“

اسی وقت مرینہ نے فون پر جگ دیو سے کہا۔ ”ہیلو جگ دیو... ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”ہاں بولو۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے دہلی شہر بہت بھا گیا ہے۔ وہاں رہنے کا مزہ آ رہا ہے۔ خوب انجوائے کر رہی ہوں۔ یہاں بے پور میں میرا کوئی کام نہیں ہے۔ تم کہو تو دہلی چلی جاؤں؟“

”روز فون پر باتیں کرتے ہیں۔ کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ میں کل حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر منت مانگنے جاؤں گی کہ تم آ جاؤ گے تو دیکھیں بکواؤں گی۔“

”ہاں ماروی! غازی بابا کے دربار میں ضرور دعا مانگنے جاؤ۔ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ ہمارے حق میں دعائیں ضرور قبول ہوں گی۔“

”محبوب صاحب اور معروف صاحب مجھے تنہا کوٹھی سے باہر جانے نہیں دیتے۔ کل چاچی تو ساتھ ہوں گی محبوب صاحب بھی ہوں گے۔ میرا نون پر کہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گی۔“

”میں بھی یہاں دعائیں مانگتا رہوں گا۔ تم دیکھو گی کہ جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔“

اس نے یہ نہیں بتایا کہ کل رات اپنے ملک کی زمین پر قدم رکھنے والا ہے اور پرسوں صبح کراچی پہنچ کر دروہی دور سے چھپ کر اپنی جان حیات کی صورت دیکھنے والا ہے۔

☆☆☆

سمیرا جانتی تھی کہ معروف چلی اور حامد دھلتی نے ماروی کو محبوب کی دہن بنانے کے لیے کیسی پلاننگ کی ہے۔ جبکہ وہ خود محبوب کی دہن بننے کے خواب دیکھتی آرہی تھی۔

وہ اپنی پلاننگ کے مطابق ماروی کو اغوا کرانے کے بعد جو ڈرامے پلے کرنے والے تھے، اس کے نتیجے میں ماروی مجبور ہو کر اپنا تن من محبوب کے حوالے کر دیتی اور یہ سمیرا کو منظور نہیں تھا۔

وہ ظاہر ان کی پلاننگ میں شریک تھی لیکن دل میں عہد کر چکی تھی کہ ماروی کو اغوا ہونے نہیں دے گی اور اسے محبوب کی زندگی میں آنے کے لیے زندہ رہنے نہیں دے گی۔

وہ پچھلے دو دنوں سے سوچ رہی تھی کہ اس خوبصورت بلا کو محبوب کی زندگی سے کس طرح دور کر سکتی ہے پھر ایک ہلکا سا کچا کپا سا خاکہ اس کے ذہن میں آیا کہ اسے اوپر پہنچانے کے لیے وہ کیا کر سکتی ہے؟ سوچنے سے کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی تدبیر امتحان کے ذہن میں بھی آئی جاتی ہے۔

وہ کچھ کر گزرنے کے لیے محبوب کے ساتھ ماروی کی کوٹھی میں آگئی۔ ماروی چاچی کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی۔ محبوب کی کار میں آکر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دیوانے نے عقب نما آئینے میں اسے حریت سے دیکھا۔ وہ اس کی برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ سکتی تھی۔ کچھ تو ہنسفر ہونے کی خوشیاں دے سکتی تھی۔

سمیرا نے اوپری دل سے کہا۔ ”ماروی! یہاں

تھا۔ اس نے فون کو بڑے پیار سے دیکھا جیسے رُخ روشن کو دیکھ رہا ہو پھر اسے مخاطب کیا۔ ”ہیلو مراد کی زندگی! مراد کی جان! ایسی ہو؟“

وہ بولی۔ ”بہت خوش ہوں۔ تم آ رہے ہو لیکن تمہارے آس پاس گولیاں چلتی رہتی ہیں۔ میں تصور میں دیکھتی ہوں تو گھبراہٹ طاری ہونے لگتی ہے۔“

وہ مسرتوں کو بھول کر اداس ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں جن حالات سے گزر رہا ہوں وہ مجھے مجرم بناتے جا رہے ہیں اور میرے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔“

”اکثر سوچتا ہوں کہ تمہیں اپنی دہن بنا کر تم سے اسن و سکون چھین رہا ہوں۔ یہ سراسر خود غرضی ہے۔ میں اپنے ساتھ تمہیں بھی عذاب میں مبتلا کرنے والا ہوں۔“

”تمہیں مراد! ایسی باتیں نہ کرو۔ تم مجھے دہن نہیں بناؤ گے تو میں جدائی کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ تم ہی میرا اسن اور سکون ہو۔ تم ہو تو دنیا ہے۔ ورنہ کچھ نہیں ہے۔“

”تمہاری دالہا نہ محبت مجھے نئی زندگی سننے حوصلے دیتی ہے۔ اللہ نے چاہا تو تمہاری سلامتی اور سیکورٹی کے ایسے انتظامات کروں گا کہ کوئی دشمن تمہارے سامنے تک بھی نہیں پہنچ پائے گا اور یہ سن لو کہ میں تمہیں محبوب صاحب سے بھی دور کر دوں گا۔ ان سے ملنے نہیں دوں گا۔ وہ کسی بھی وقت آئین کے خنجر ثابت ہو سکتے ہیں۔“

”میں تمہاری ہوں۔ تمہارے حکم کے مطابق ان سے دور ہو جاؤں گی لیکن کتنی بات ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں لگتے۔ انہوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں اور ان کی منکوحہ بن جاؤں۔“

”ہاں، وہ بڑی حکمت عملی ہے تمہیں متاثر کرتے آرہے ہیں۔ انہوں نے اب تک بڑی مہربانیاں کی ہیں۔ بڑے احسانات کیے ہیں۔ اب بھی یہ کہہ کر نیلی کر رہے ہیں کہ تمہیں ایک مجرم کی شریک حیات نہیں بننا چاہیے۔ پہلے مجھے قہلہ درست کرنا چاہیے پھر شادی کرنا چاہیے۔“

اس نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ ”اور قہلہ درست کرنے تک اور تمام مجرموں سے نجات حاصل کرنے تک جوانی گزر جائے گی بلکہ زندگی ہی گزر جائے گی۔“

وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے کہ وہ میری بہتری اور سلامتی کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے طور پر درست ہیں۔ ہم بھی اپنی جگہ درست ہیں، ہم اپنی محبت کے تقاضے پورے کریں گے۔“

”کیا وہ روز تمہارے پاس آتے ہیں؟“

قوة الآباللہ۔“

سامنے آؤ۔ محبوب صاحب کے ساتھ بیٹھو۔“

چاہی اس کے ساتھ بیٹھیں یا چڑھ رہی تھی۔ محبوب ان کے پیچھے تھا۔ اور پر جانے اور نیچے اترنے والوں کی بھیڑ تھی۔ وہ سب اوپر ہی تھے میں آگئے۔ وہاں ایک طرف کچھ لوگ عبادت میں مصروف تھے۔ دوسری طرف عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔

ماروی نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ ”یا اللہ! حضرت عبداللہ شاہ غازی کے واسطے سے میری کھوئی ہوئی یادداشت میرا کھو یا ہوا ماضی مجھے واپس کر دے میرے مالک!

”یا اللہ! مراد کو مجرموں کی دنیا سے نکال کر عزت اور شرافت کی زندگی گزارنے کی راہ پر پہنچا دے۔ میں بچپن سے اس کے نام ہوں۔ مجھے اس کی شریک حیات بنا دے میرے اللہ! آمین۔“

سمیرا دعا مانگ رہی تھی۔ ”یا غازی بابا...! نہ ماروی کی یادداشت واپس آئے گی، نہ وہ مراد کی دہن بن پائے گی۔ اگر یہ زندہ رہی تو معروف صاحب اور حماد سے محبوب صاحب کی دہن بنا دیں گے۔ اس سے پہلے اسے موت آجائے بابا...! ہم سب کی مشکلیں آسان ہو جائیں بابا...! مجھے حوصلہ دو۔ میں اسے اوپر پہنچا کر سب کی مشکلیں دور کر کے نیکی کمائوں...“

جتنے بندے ہیں اتنے ہی ان کے مقاصد اور ارادے ہیں۔ اپنے ارادوں کے مطابق کوئی آگ لگانے کی دعائیں مانگتا ہے، کوئی آگ بجھانے کے لیے پانی مانگتا ہے۔ کوئی زہر اگلتا ہے، کوئی آب حیات طلب کرتا ہے اور کیا خدا کی قدرت ہے کہ وہ دعائیں قبول کرنے والا قادر مطلق نہ قبول کرنے والی دعائیں بھی قبول کر لیتا ہے۔ یہ وہی معبود جانتا ہے کہ محبت کرنے والوں کے خلاف نفرت کرنے والوں کی مرادیں کیوں پوری کرتا ہے؟

واپسی میں وہ سب اس سیزھی کے اوپر ہی سرے پر آئے تو عورتوں اور مردوں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ماروی کا ہاتھ سمیرا کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے محبوب کو دکھانے کے لیے اسے محبت سے تھام رکھا تھا۔ اس بلندی پر آتے ہی اس نے اپنا دل مضبوط کیا۔ حوصلہ کیا پھر محبوب کی اور چاہی کی نظریں بچا کر اسے زور کا دھکا دے دیا۔

ماروی نے گرتے گرتے اس کی شیطانی حرکت دیکھی۔ ایسا دھکا لگا تھا کہ وہ سنبھل نہ سکی۔ چیخیں مارتی ہوئی لڑھکتی ہوئی نیچے جانے لگی۔ چاہی بھی چیختی لگی۔ محبوب نے

وہ بولی۔ ”وہاں تمہیں بیٹھنا چاہیے۔ میں یہاں چاہی کے ساتھ رہوں گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”مراد آنے والا ہے۔ یہ پرانی ہونے والی ہے۔ اسے اپناتے کے لیے نہ کہو میرا...! یہ ابھی سے پرانی ہو گئی ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ بیٹھو۔“ وہ خوش ہو کر اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ محبوب کے ساتھ ہمیشہ مسلح گاڑز ہوا کرتے تھے۔ وہ تین گاڑز دوسری گاڑی میں تھے۔ محبوب کی کار کے پیچھے وہاں سے چل پڑے۔

جمعرات کا دن تھا۔ سمندر کے کنارے غازی بابا کے مزار پر عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ محبوب کو بزرگان دین سے عقیدت تھی لیکن وہ کسی مزار پر حاضری دینے نہیں آتا تھا۔ پہلی بار ماروی کی خاطر آیا تھا۔

حضرت عبداللہ شاہ غازی کا مزار مقدس بہت بلندی پر ہے۔ ایک پختہ کشادہ سیزھی سیدھی اوپر تک گئی ہے۔ وہاں آنے سے پہلے سمیرا کے ذہن میں وہی سیزھی تھی۔ کئی بار سمیرا کی ساستی آنکھوں نے ماروی کو اس بلندی سے گرتے اور لڑھکتے ہوئے دیکھا تھا۔

ماروی سمیرا چاہی اور محبوب وہاں پہنچ گئے۔ اس سیزھی کے نچلے پائندان پر آگئے۔ پھر اوپر جانے لگے۔ سمیرا دل دہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ ”اے غازی بابا...! یہاں سب اپنی بہتری کی دعائیں مانگتے آتے ہیں۔ میں بھی اپنی بہتری چاہنے آئی ہوں۔ یا غازی بابا...! محبوب علی چاند یومیر سے نام ہو جائیں۔ میں ان کی شریک حیات بن جاؤں۔ یہ میری پہلی دعا ہے یا غازی بابا...! میری دوسری دعا ہے کہ میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے۔“

”میں ماروی مراد اور محبوب کی بہتری کے لیے دعا مانگ رہی ہوں۔ ان کی بہتری اسی میں ہے کہ ماروی ان کے درمیان نہ رہے۔ میرے راستے میں بھی نہ آئے۔ آج اسی سیزھی پر اس کی سانسیں پوری ہو جائیں۔“

ماروی سر پر آچل رکھے ایک ایک پائندان پر قدم رکھتی ہوئی زیر لب پڑھتی جا رہی تھی۔

”لا حول ولا قوة الا باللہ۔ اللہ تعالیٰ قوی ہے قادر مطلق ہے۔ تمام قوتیں اللہ تعالیٰ پر ختم ہیں۔“

”یا اللہ! یا میرے پاک پروردگار! میرے اور مراد کے حالات بدل دے، ہمیں سلامتی عطا فرما۔ لا حول ولا

ہیں۔ لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ عقل اسے روک رہی تھی۔ وہ اسپتال جاتی تو ماروی ہوش میں آتے ہی اس پر انگلی اٹھاتی پھر سب ہی ملامت کرتے۔ اس پر لعنت بھیجتے۔ وہ اقدام قتل کی مرتکب ہو چکی تھی۔

اس نے معروف بجلی سے فون پر کہا۔ ”ہم غازی بابا کے دربار میں ہیں۔ ماروی سیزمی سے گر کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ محبوب اسے کسی اسپتال میں لے گئے ہیں۔ وہ ابھی پریشان ہوں گے۔ اس لیے ان سے فون پر نہیں پوچھا کہ اسے کس اسپتال میں لے گئے ہیں۔ پلیز آپ معلوم کریں۔“ معروف بگلی نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں معلوم کر تا ہوں۔“ وہ فون بند کر کے ایک عیسیٰ میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف جانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ اگر زندہ ہے تو اس کے خلاف ضرور بول رہی ہوگی۔

وہ گھر آ کر فون کال کا انتظار کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ محبوب ماروی کا بیان سنتے ہی فون پر اس کی ایسی کی تیسری کرے گا۔ لیکن ایک گھنٹا گزرنے کے بعد بھی کوئی کال نہیں آئی۔

اس نے خوش ہو کر سوچا۔ ”کیا وہ مر گئی ہے؟“ اس نے حوصلہ کر کے فون پر محبوب کو مخاطب کیا پھر پوچھا۔ ”ماروی کیسی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”ابھی تک بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہے دماغ کو جوٹ پہنچنی ہے۔ آج رات تک یا صبح تک ہوش میں آئے گی۔ میں پریشان ہوں پھر کسی وقت بات کروں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ اسے موت نہیں آئی ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس کے خلاف بیان دینے کے لیے کسی وقت بھی ہوش میں آنے والی ہے۔

اس نے بھجلا کر خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خدا کرے وہ گونگی ہو جائے اس کی قوت گویائی ختم ہو جائے تو بھجھوں گی کہ دعا قبول ہو گئی ہے۔“

اس نے صوفے پر آکر دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ خیال آیا کہ وہ اس نے کبھی دینی تعلیم نہ لے سکی تھی۔ پھر بڑے دنوں کے بعد اتنے یاد آیا کہ مسلمان اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ وہ کھوم کر قبلہ رو ہو گئی پھر اس کے ذہن

چونک کر اسے دیکھا پھر لوگوں کو دھکے دیتا ہوا ماروی کے پیچھے دوڑنے لگا۔ عورتیں گھبرا کر ایک طرف ہونے لگیں، اپنے مردوں کے ساتھ گرنے پڑنے نہ بھگتیں۔

اوپر کے پہلے پیمانہ پر گرتے ہی اس کے سر پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ جھنجھے سے قاصر تھی کہ اس تاریکی میں کن پستیوں کی طرف لڑھکی جا رہی ہے۔ بہت زیادہ بھیڑ کے باعث وہ دور تک لڑھکی ہوئی نہیں گئی۔ لوگوں نے اسے روک لیا۔ محبوب اسے آوازیں دیتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ پھر اسے دونوں بازوؤں میں تھام کر دیکھا۔ سر اور چہرہ لہو سے بھیگ رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ محبوب اسے بازوؤں میں اٹھا کر تیزی سے سیزھیال اترتا ہوا جانے لگا۔ چابی بھی اس کے پیچھے دوڑتی جا رہی تھی۔ سیرا سیزمی کے اوپر سری سرے پر گم گھڑی رہ گئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ ”محبوب صاحب اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ زندہ ہے۔“ پیچھے زیادہ دور تک لڑھکی جاتی تو مر جاتی۔ ہو سکتا ہے اسپتال جاتے جاتے مر جائے۔“

یہ سوچ کر گھبراہٹ طاری ہو گئی کہ وہ بچ گئی تو کیا ہوگا؟ اس نے سیرا کو دکھا دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ زندہ رہ گئی تو بیان دے گی کہ سیرا نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ پھر کیا ہوگا؟ جس کی دہن جتنا چاہتی ہے وہ محبوب کیا اسے زندہ چھوڑے گا؟

وہ سوچتی ہوئی سیزمی سے اترنے لگی۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ”یا غازی بابا...! یہ ادھوری قبولیت ہے۔ اسے اسپتال پہنچنے سے پہلے مرجانا چاہیے۔ ورنہ ڈاکٹر اسے بجالیں گے۔“

”یا غازی بابا...! میں آپ کی کرامات دیکھنا چاہتی ہوں۔ بس یہ آخری دعا ہے۔ ڈاکٹر اسے بچانہ سکیں۔“

اور ماروی نے بھی اپنی اور مراد کی سلامتی کی دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی دعائیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں تھیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی ضدیں پھر دونوں کی مرادیں کیسے پوری ہوں گی؟

وہ باہر سڑک پر آئی تو محبوب کی کار نہیں تھی۔ اس نے اس کا انتظار نہیں کیا تھا۔ ماروی ہمیشہ سے اہم رہی تھی۔ اس وقت اور زیادہ اہم ہو گئی تھی۔ وہ اسے اسپتال لے گیا تھا۔ وہ فون کر کے معلوم کر سکتی تھی کہ کس اسپتال میں گئے

پڑی تھی۔ اپنے مراد کی سلامتی اور واپسی کے لیے دعائیں مانگنے لگی تھی۔ اب وہ سب اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اسے ہوش نہیں آ رہا ہے۔ وہ آنکھیں نہیں کھول رہی ہے۔

حیرانی اور پریشانی میں وہ سوچ رہا تھا۔ ”میری ماروی کے ساتھ ایسا دوسری بار ہوا ہے۔ پہلے بھی اونچائی سے ڈھلان میں لڑھکتی ہوئی ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوئی تھی اور طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آئی تھی۔“

مراد مضطرب ہو کر ٹہل رہا تھا۔ کبھی ادھر جا کر کھڑکی کے باہر دیکھتا، کبھی ادھر آ کر دروازے کے پاس باہر یوں دیکھتا تھا جیسے ابھی دوڑتا ہوا ماروی کے پاس پہنچ جائے گا۔

رات کے نو بجے تھے۔ وہ اگلے تین گھنٹے کے بعد آدھی رات کو سرحد پار کر کے ہی ماروی تک پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت وہ سرحد سے تیس کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی بستی میں تھا۔ وہاں کے رہنے والے اس بستی کو دیوانگری کہتے تھے۔ اسے جگ دیونے آباد کیا تھا۔

وہاں جتنے مرذعورتیں اور کمسن لڑکے لڑکیاں تھے، وہ سب اسمگلنگ کے دھندے میں ملوث تھے۔ دیوانگری کے سب ہی لوگ جگ دیو کے تابع دار اور جاں نثار تھے۔ مراد وہاں شام کو آیا تھا اور آدھی رات کے بعد اپنی ماروی کے پاس جانے والا تھا۔

مریدان کی موت کا سامان کر چکی تھی۔ اس نے فون کی سم بدل کر باڈر آرمی کے ایک اعلیٰ افسر کو منج Send کیا۔

”بی اارٹ آفیسر...! یہ تمہارے لیے ہاٹ انفارمیشن ہے۔“

”بی اارٹ۔ دو روز پہلے ریکارڈ روم سے ایک سیکرٹ فائل کی معلومات چرائی گئی تھیں۔ اور اس چرانے والے ریکارڈ روم کے انچارج کی لاش پرانے مندر میں پائی گئی تھی۔ کسی شک و شبہ کے بغیر اسے قتل کرنے والا اور سیکرٹ فائل کی نائیکو و ظلم لے جانے والا ایک پاکستانی جاسوس ہے۔ تم اس جاسوس کو گرفتار کر سکتے ہو۔“

آفیسر نے تحریری منج کے ذریعے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ فوراً ہمارے پاس آؤ۔ اسے گرفتار کر آؤ۔ تمہیں تعظیم دی جائے گی۔ انعام بھی دیا جائے گا۔“

مرید نے لکھا۔ ”میں دبش بھگت ہوں۔ میں نہ شہرت چاہتا ہوں، نہ مجھے انعام کا لالچ ہے۔ ہمارے دیش

میں سوال پیدا ہوا کہ اگر اس نے کبھی قرآن مجید کو پڑھا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ دعا صرف اللہ تعالیٰ سے مانگی جاتی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی مراد کی پوری کرتا ہے۔ بزرگان دین اور اولیاء کرام دعاؤں کی قبولیت کا وسیلہ ہوتے ہیں۔

وہ تعلیم یافتہ تھی لیکن دین کے معاملات میں سراسر جاہل تھی دل سے دعا مانگی۔ ”یا غازی بابا! ماروی کو کبھی ہوش نہ آئے۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں چل رہی ہے۔ اگر ہوش میں آئے تو ایک بار پھر اس کا دماغ پھر جائے۔ وہ مجھے بھول جائے۔ اسے یاد نہ رہے کہ میں نے اسے دھکا دے کر گرا دیا تھا۔“

اس نے پہلی بار ماروی کو راستے سے ہٹانے کے لیے بڑی ہمت سے ایک کوشش کی تھی اور وہ کوشش اسے ہنگامی پڑ رہی تھی۔ اس کا سکون برباد ہو رہا تھا۔ اس نے پھر ایک گھنٹے بعد فون پر محبوب سے پوچھا۔ ”کیا ماروی کو ہوش آیا؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں، چنانچہ خدا کو کیا منظور ہے؟ اتنی طویل بے ہوشی کبھی نہیں آ رہی ہے۔“

وہ بولی۔ ”اللہ بہتری کرے گا۔ اس کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوں۔“

”ہاں سمیرا...! اس کے لیے دعا کرو۔ یہ آنکھیں بند کیے بستر پر پڑی ہے۔ ہم اسے آوازیں نہیں دے سکتے۔ یہ ہماری آواز سن نہیں سکتی۔ ہمیں دیکھ نہیں سکتی۔ ایسے وقت صرف دعا کا ہی سب سے بڑا سہارا رہتا ہے۔“

ماروی کو انجینئر وارڈ کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔ محبوب اس کے بیڈ سے لگا بیٹھا تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں اور زیادہ معصوم اور پُرکشش لگ رہی تھی۔ دل اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ اگر چاہتی نہ ہوتی، وہ اسپتال کا کمرہ نہ ہوتا تو وہ بے اختیار اس کے پاس آ کر اس سے لپٹ جاتا۔ شاید چوسنے سے وہ ہوش میں آ جاتی۔ دیوانگی میں دل ایسے ہی چلتا ہے۔ دوسرا دیوانہ سرحد پار تھا۔ اس نے فون پر اسے پکارا۔ اس کا فون چابی کے پاس تھا۔ وہ بولی۔ ”بیٹے مراد! یہ تمہاری آواز نہیں سن سکے گی۔ پچھلے چار گھنٹوں سے بے ہوش پڑی ہے۔“

ایک عاشق کے لیے یہ دل دہلا دینے والی اطلاع تھی۔ اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے میری ماروی کو؟“

چابی اسے بتانے لگی کہ وہ کس طرح سیڑھی سے گر

وہ بولا۔ ”ہمیں یہاں سے تیس کلومیٹر تک چھپتے ہوئے پیدل جانا ہوگا کیونکہ رات کو گاڑی کی آواز دور تک جائے گی۔“

”میں اپنی ماروی تک پہنچنے کے لیے دنیا کے آخری سرے تک پیدل جا سکتا ہوں۔ کیا اب ہم چلیں؟“

”ہاں چلو۔ میں تمہیں آدھی رات تک سرحد پار کرا دوں گا۔“

وہ دونوں گمن اور ملٹس کے بیگ اپنی اپنی پشت پر لاد کر مکان سے باہر آئے۔ جگ دیو کے دو جاں نثار وہاں منتظر تھے۔ وہ بھی ساتھ ہو گئے۔

بستی کی عورتیں اور مرد اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں چھوٹا بڑا اسلحہ تھا۔ ایک بوڑھے نے کہا۔ ”جگ دیو! تو ہمیں ساتھ نہیں لے جا رہا ہے! اچھا نہیں کر رہا ہے۔“

جگ دیو نے کہا۔ ”دادا میں نے کہا تھا..... آج دشمنی کرنے والے اسلحوں سے نہیں! آرمی سے خطرہ ہے۔ ان سے مقابلے کے لیے میرے ساتھ آؤ گے تو وہ اس بستی کو اجاڑ کر رکھ دیں گے۔ تم سب کو ان نظروں میں نہیں آتا چاہیے۔“

ایک عورت نے کہا۔ ”ہم تمہاری بات مانتے ہیں۔ تم وعدہ کرو، مصیبت آئے گی تو ہمیں فون کرو گے۔ ہم آندھی کی رفتار سے تمہارے پاس آئیں گے۔“

وہ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے بولا۔ ”وعدہ کرتا ہوں۔ مجھے مدد کی ضرورت ہوئی تو ضرور کال کروں گا۔“

وہ بستی سے باہر آگئے۔ رات کے پچھلے پہر جانور نکلنے والا تھا۔ ابھی تاریکی تھی۔ ادھر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ بھی کبھی نارنج روشن کرتے جا رہے تھے۔

وہ آگے بڑھ کر کلومیٹر تک بے پاکی سے چلتے رہے پھر نارنج بجھا دی۔ اپنے اے فون کے سوئچ آف کر دیے۔ بہت محتاط ہو کر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے جانے لگے۔

تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آگے جھسات کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے ریشمی زین پر گھٹنے ٹیک دیے پھر گھوڑوں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلنے لگے۔

سرحدی تار کانٹے وہاں سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گئے تھے تب ہی جگ دیو نے پیش آنے والے خطرے کو دیکھ لیا۔ سرگوشی میں کہا۔ ”زمین پر لیٹ جاؤ۔“

مراد اور دونوں جاں نثار لیٹ گئے۔ جگ دیو نے

کا ایک راز اس مائیکرو فلم میں ہے۔ وہ پاکستانی جاسوس آج اس مائیکرو فلم کو سرحد پار لے جا رہا ہے۔ اگر آپ نے ابھی سے روروائی شروع کی تو وہ محتاط ہو جائے گا۔ نہ سرحد پار کرے گا، نہ آپ کی گرفت میں آئے گا۔“

آفیسر نے کہا۔ ”تم ہمیں نہ سمجھاؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں کس طرح اسے گھیر کر گرفتار کریں گے۔ تمہاری دلہن بھتیجی کا شکریہ۔ کبھی مناسب سمجھو تو یہاں آ کر ہم سے ملاقات کرو۔“

مرید نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ بچے پور کے قریب ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں تھی۔ اس نے شوہر بن کر رہنے والے کیشو کو دہلی سے بلا لیا تھا۔ دیوانگری سے پچاس کلومیٹر دور رندھاوا نامی بستی میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا اور اسے ابھی طرح سمجھا دیا تھا کہ آج رات کیا کرنا ہے؟

وہ رات کی تاریکی پھیلنے کے بعد کیشو کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر دیوانگری سے کچھ دور آ کر رک گئی پھر اس سے کہا۔ ”بارڈر یہاں سے تقریباً پچیس یا تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ رات کے سنانے کے باوجود وہاں سے چلنے والی کوئیوں کی آواز شاید سنانی نہیں دے گی۔“

”ویسے ادھر سے بھاگنے دوڑنے والے ادھر سے گزر سکتے ہیں۔ یہاں ریت کے اونچے ٹیلے ہیں۔ تم کسی ٹیلے کے پیچھے گاڑی لے جانا۔ میں تم سے فون پر رابطہ رکھوں گی۔“

اس نے کار سے باہر آ کر شاٹ گن اور گولیوں کا تھیلا شانوں سے لٹکایا۔ ایک ریو اور ہاتھ میں لیا پھر وہاں سے جاتے ہوئے تاریکی میں گم ہو گئی۔

رات کے دس بجے جگ دیو نے مراد کے پاس آ کر کہا۔ ”آج شام بستی کے لوگوں نے آرمی کی ایک جیپ کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے۔ بہت دنوں بعد آرمی والے ادھر سے گزر رہے ہیں۔ سوچنا ہوں انہیں کسی طرح کا شہ تو نہیں ہوا ہے؟“

مراد نے مایوس ہو کر پوچھا۔ ”کیا تم خطرہ محسوس کر رہے ہو؟ میں جانتا ہوں گا نا؟“

”ضرور جاؤ گے۔ ہم تو خطرات کا سامنا کرتے ہی رہتے ہیں۔ تمہارے لیے بارڈر کراس کرنے کا یہ پہلا تجربہ ہوگا۔“

مراد نے کہا۔ ”اگر آرمی نے ایک کیا تو میری فکر نہ کرنا۔ جب تک موت نہیں آئے گی نہیں مروں گا۔ کسی طرح یہاں سے نکل بھاگوں گا۔“

مراد کے قریب ہو کر کان میں کہا۔ ”دائیں طرف دیکھو۔ دو بلکے سے سرخ و بے نظر آ رہے ہیں۔ ہمارا کوئی دشمن ہے۔ وہ انہی ڈارک لینس پہنے ہوئے ہے۔“

مراد نے دیکھا۔ ان سے بہت دور بننے کی آنکھوں کی طرح چمک نظر آ رہی تھی۔ پھر اور دو آنکھیں پھر اور دو آنکھیں دکھائی دیں۔ یہ اندازہ ہوا کہ دشمن ایک ایک کر کے انہی ڈارک لینس پہنے جا رہے ہیں اور تاریکی میں دور تک دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وہ چاروں ریت پر اوندھے منہ پڑے ہوئے تھے اس لیے انہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے آگے جا سکتے تھے لیکن احتیاط لازمی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ زمین پر گھسنے کی آواز وہاں تک جا سکتی ہے۔

وہ دم سادھے وہیں پڑے رہے۔ پھر وہ چمکتی ہوئی آنکھیں ایک ایک کر کے کم ہونے لگیں۔ انہیں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ انہی ڈارک چشمے اتار رہے تھے۔

وہ چاروں ٹھہر ٹھہر کر اوندھے منہ رینگنے لگے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ فوجی انہیں ڈھونڈنے کے لیے کیا کریں گے؟

اچانک ہی ایک بڑی سی سرچ لائٹ آن ہو گئی۔ وہ سب روشنی میں نہا گئے۔ مراد نے بڑی پھرتی دکھائی۔ فوراً ہی کروٹ بدلتے ہوئے شاٹ گن کے ٹریک کو دیا۔ تڑا تڑکی آواز کے ساتھ شیشے کا ایک چمٹا کا سا ہوا، سرچ لائٹ بجھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پہلے جیسی تاریکی چھا گئی۔

جگ دیو اور اس کے ساتھیوں نے بھی ہوئی لائٹ کی طرف اندھا دھند فائرنگ کی۔ یکے بعد دیگرے تین چیخیں سنائی دیں۔ وہ چاروں زمین سے اٹھ کر ایک سمت بھاگنے لگے۔ ادھر سے بھی جواباً اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ دو جاں نثاروں کی چیخوں کے علاوہ جگ دیو کی کراہ سنائی دی۔ مراد فوراً ہی زمین پر گر پڑا۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے قریب سے گزرتی تھی۔

اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”جگ دیو! تم ٹھیک تو ہو؟“

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”میری فکر نہ کرو۔ زمین پر رینگتے ہوئے ان کی شوٹنگ رینج سے دور جاؤ۔ پھر اٹھ کر دوڑو۔“

”مجھ میں نہیں آتا، تاریکی میں کدھر جاؤں؟“

وہ پھر کراہتے ہوئے بولا۔ ”جدر بھی جاؤ۔ ان سے دور نکل جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔“

وہ ریت پر تیزی سے رینگتے ہوئے جانے لگا۔ فائرنگ

کی آواز سے ہٹا چل رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کے بعد محتاط رہ کر ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتے آ رہے ہیں۔

وہ نہیں جان سکتا تھا کہ جگ دیو کتنا پیچھے رہ گیا ہے؟ اب وہ چاروں ہاتھ پاؤں کے بل تیزی سے جا رہا تھا۔ فوجی بھی تاریکی میں اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ بھی اتنے محتاط تھے کہ تاریچ روشن کرنے کی غلطی نہیں کر رہے تھے۔

البتہ ایک نے غلطی کی تھی۔ جگ دیو نے زمین سے اٹھ کر گولی مار دی۔ جواباً ایک گولی اسے بھی آ کر لگی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بارڈر پار کرنے والے کتنی تعداد میں آئے تھے۔ انہوں نے زمین پر رینگتے ہوئے قریب آ کر جگ دیو کی لاش دیکھی۔ پھر ادھر ادھر رینگنے کے بعد دو اور لاشیں ملیں۔ بڑی دیر سے گولیاں نہیں چل رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ وہ تین ہی تھے۔

انہوں نے ان کے لباسوں کی تلاشی لی تو مطلوبہ مائیکرو فلم نہیں ملی۔ تب آفسیر نے کہا۔ ”یہ صرف تین نہیں تھے۔ چوتھا بھی تھا اور وہی پاکستانی جاسوس ہوگا۔ مائیکرو فلم اس کے پاس ہوگی۔“

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”سرحدی تارکانوں کی طرف چلو۔ وہ ادھر گیا ہوگا۔“

وہ سب چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے ادھر جانے لگے۔ مراد نہیں جانتا تھا کہ کس سمت میں سرحدی تارکانے ہیں۔ وہ تاریکی میں بھٹک کر دوسری طرف نکل آیا تھا۔

وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ دونوں بیروں سے دوڑتا ہوا کتنی دور نکل آیا ہے۔ جگ دیو نے زمین پر رینگتے وقت کہا تھا کہ بارڈر اب ایک یا ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔ مراد ایک جگہ رک کر ہانپتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ”میں دو کلومیٹر سے بھی زیادہ دور آ گیا ہوں لیکن کہیں تارکانوں کی رکاوت نہیں ہے۔ میں بھٹک گیا ہوں؟“

اس وقت پچھلے پہر کا جاند غرتی میں نہایا ہوا طلوع ہو رہا تھا۔ وہ ویرانہ سرخ چاندنی میں آگ کی طرح سلکتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہ کسی گانڈ کے بغیر تہا اور بے یار و مددگار تھا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھ رہا تھا۔ اسے دور تک تارکانے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ میں انہی سمت میں دوڑتا ہوا حد سے دور آ گیا ہوں؟ یا خدا میں کدھر جاؤں؟

کسی سمت تو جانا تھا۔ پھر اسے ساتھ لے جانے کے لیے اچانک ہی ایک گولی آ کر اس کے پاؤں میں لگی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ اچھل کر گر پڑا۔ سائیکلنر لگے

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

فیکس فیس

ٹی ٹی کی فیکس فیس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگت کو نکھار دیتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گورے پن میں بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ و بے، آنکھوں کے گرد جھلٹے، چہرے اور گردن کی جھریاں گئی دور ہو جاتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے کیساں مفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ اینٹن اور کریمیں ملے پھریں لیکن فیکس فیس کھانا ان کے لئے بہت آسان ہے۔

f www.facebook.com/top treatments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو معجز اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سوماٹروپین (نشوونما کا ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں مکمل اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!



HELPLINE

ملک بھر کے ہر ایچ جے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دوا خانہ پر دستیاب

042-35789145 & 6,0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

نہ ملنے کی صورت میں یا مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے

II

شانے سے شات گن کو بھی اتار کر اسے دور اچھال دیا۔ وہ ٹیلے کے پیچھے سے نکل آئی۔ چاندنی میں صاف نظر آرہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے ربو اور کو تھام کر اس کا نشانہ لیتی ہوئی محتاط انداز میں ٹھہر ٹھہر کر اس کی طرف آنے لگی۔ مراد نے اسے اچھی طرح دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ اس کے دیدے ایسے پھیلے ہوئے تھے، جیسے مراد سے چپک گئے ہوں۔ وہ ذرا بھی ہلکا تو اسے گولی مار دیتی۔

وہ ایک ایک قدم قریب آتے ہوئے بول رہی تھی۔ ”میں نے قسم کھائی تھی کہ تجھے دیکھتے ہی گولی باردوں گی مگر کیا کروں، تیری طلب میں ڈبل مائنڈ ہو جاتی ہوں۔“ آج تجھے ٹریپ کرنے کا منصوبہ بناتے ہوئے سوچا اگر تو میرے ٹھکانے میں بے دست و پا رہے گا تو تجھے زندہ رکھوں گی اور تجھ سے بچ بچ دوستی نہا ہوں گی۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔ اس نے ٹرگر کو دبا دیا۔ ایک گولی آکر اس کے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے پھر زمین پر لیٹ گیا۔

وہ قریب آکر بولی۔ ”تیرے دونوں ہاتھوں کو بیکار ہونا چاہیے تاکہ تو مجھ سے ہاتھ پائی نہ کر سکے۔“ اس نے دوسرے ہاتھ پر گولی ماری۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ کبھی زبردستی زیر۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ ہماری شیر بن گئی تھی۔ جو شیر تھا اسے قربانی کا بکرا بننا ہی پڑا۔

اس نے پھر کہا۔ ”میں پوری ملائیک کے ساتھ آئی ہوں۔ اس بات پر اباب بھی ہتھکڑی سے نہیں نکل سکے گا۔“ اس نے زمین پر دو زانو ہو کر اس کی دونوں کلائیوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ پھر اٹھ کر فون پر کیٹو سے رابطہ کیا۔ اس سے کہا۔ ”گاڑی لے آؤ۔ انہی ٹیلیوں کے درمیان چلے آؤ۔ میں گاڑی کی آواز سنتے ہی مارچ کے ذریعے سگنل دیتی رہوں گی۔“

مراد کو تین گولیاں لگی تھیں۔ وہ گولیاں اسے زخمی کرتے ہوئے گزرتی تھیں۔ زخم گہرے نہیں تھے لیکن وہ ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی گن بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔

اس وقت جب چاب تکلیف برداشت کر رہا تھا اور ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ انڈیا آکر دو بار میرے ٹھکانے میں آئی۔ میں نے اسے زندہ چھوڑ کر غلطی کی۔ اس بات کو نہیں چھوڑوں گا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“ ”تھیک ہے اسے خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہیے۔“

پستول سے گولی چلی تھی۔ اس لیے آواز نہیں ہوئی تھی۔ وہ تکلیف برداشت کرتے ہوئے ربو اور کو مغبوطی سے تھام کر زمین پر لیٹا رہا۔ وہ سمجھتا چاہتا تھا کہ گولی کس سمت سے آئی تھی؟ پھر خاموش فائرنگ ہوئی۔ تین گولیاں آئیں اور اس کے آس پاس کی ریت اڑنے لگی۔ موت گھنٹی بن کر آرہی تھی۔ وہ جہاں تھا وہیں دم سادھے پڑا رہا۔ ایک اندازہ ہوا کہ دائیں طرف جو ریت کا چھوٹا سا ٹیلا ہے، اس کے پیچھے سے فائرنگ ہو رہی ہے۔

پھر ادھر سے سریلی ہنسی سنائی دی۔ وہ ہنسنے کے بعد بولی۔ ”اپنی موت کو پیچھے لگانے والے...! میں آگئی ہوں۔“

وہ حیرانی سے اس ٹیلے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”جب تو اچانک مندر میں آیا تھا تو میں حیران رہ گئی تھی۔ اب تو حیران ہوگا کہ میں یہاں کیسے آگئی؟“ ”جواب میں کچھ کہنے سے پہلے یہ سن لے کہ جہاں ہے وہیں پڑے رہنا۔ وہاں سے ایک ذرا نہ ہلنا۔ اب جو گولیاں چلیں گی، وہ تجھے چھلنی کر دیں گی۔ اور تو جواباً فائر کرے گا تو درجہ آواز جائے گی۔ جن فوجیوں سے بچ کر آ رہا ہے وہ یہاں آجائیں گے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”کیا تیری آواز دور تک نہیں جا رہی ہے؟“ اس نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ ”ہاں مجھے نہیں بولنا چاہیے۔ مجبوراً بول رہی ہوں۔ تو اپنی گن دور چھینک دے گا تو میں چپ چاپ تیرے پاس آؤں گی۔“ وہ سوچنے لگا کیا کرے؟

وہ ایک بلا کی طرح اچانک ہی نازل ہوئی تھی۔ فوراً ہی کوئی تدبیر نہیں سوچ رہی تھی۔

وہ بولی۔ ”اچھی طرح سوچ لے۔ میں ہی تجھے یہاں سے دور لے جاسکتی ہوں۔ گن نہیں پھینکے گا، وہیں پڑا رہے گا تو فوجی کسی وقت بھی یہاں آجائیں گے۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گی اور پانچ منٹ انتظار کروں گی۔ تو نے ہتھیار نہ پھینکا تو فائرنگ شروع کروں گی۔“

وہ جو کہہ رہی تھی وہی ہونے والا تھا۔ وہ فوجیوں کی حراست میں نہیں جانا چاہتا تھا اور جس عورت کو اب تک مات دیتا آیا تھا اس کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

عقل مند یہ تھی کہ فی الحال مرید کی بات مان لیتا۔ بعد میں اس کے ٹھکانے سے نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ وہ بولا۔ ”یہ دیکھو، میں گن چھینک رہا ہوں۔“

اس نے ربو اور کو ایک طرف پھینک دیا پھر اپنے

دیکھ کر معلوم ہو رہا تھا کہ دیوانے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

بہر حال وہ زیادہ دیر تک کوہ میں نہیں رہی۔ رات کے آٹھ بجے چاچی اور محبوب اس کے بید کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تب چاچی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سامیں...! دیکھو یہ حرکت کر رہی ہے۔“

وہ دونوں اٹھ کر اس کے قریب آئے۔ اس نے سرگھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے محبوب کے لیے عقیدت ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ چاچی کی طرف بڑھایا۔

چاچی نے اس کا ہاتھ تمام کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔ محبوب نے کہا۔ ”میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔“

وہ کمرے سے چلا گیا۔ چاچی نے کہا۔ ”سامیں کی حالت دیکھ رہی ہو۔ تمہارے ہوش میں آنے پھر کوما سے نکلنے کے انتظار میں کل سے بیٹھیں ہیں۔ نہ نیند پوری کی ہے نہ کچھ کھایا ہے۔“

ماروی نے پوچھا۔ ”کیا میں کل سے یہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ ہم تو ایک جنگل میں تھے۔“

چاچی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو...؟ جنگل میں...؟ ہم جنگل میں تھے...؟“

”نہیں بیٹی! تم کراچی میں ہو۔ کل غازی بابا کے مزار پر دعائیں مانگنے گئی تھیں۔ وہاں سیڑھی سے گر کر بے ہوش ہوئی تھیں۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں چاچی! ہم سب جنگل میں تھے۔ اندھیری رات تھی۔ مرینہ مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔“

چاچی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں اس سے بچنے کے لیے بھاگی تو گر پڑی۔ مجھے تو بس اتنا ہی یاد ہے کہ میں ایک ڈھلان میں لڑھکتی جا رہی تھی اور کسی پتھر سے ٹکرائی تھی پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔“

چاچی کا منہ بند نہیں ہو رہا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ محبوب ڈاکٹر کے ساتھ آیا تو وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”یہ کیسی باتیں کر رہی ہے؟ کتنی ہے سیڑھی سے نہیں گری تھی۔ ایک جنگل میں تھی۔ مرینہ اسے ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ یہ ڈھلان سے لڑھکتی ہوئی... بے ہوش ہوئی تھی۔“

ڈاکٹر یہ باتیں سن رہا تھا۔ محبوب سوچتی ہوئی نظروں سے ماروی کو دیکھ رہا تھا۔ چاچی نے کہا۔ ”سامیں! اسے کراچی شہر اور غازی بابا کے دربار کی سیڑھی یاد نہیں

اسے اچانک ہی دماغی جھٹکا پہنچاؤں گا۔ میرے زخموں کی مرہم پٹی تو ہو جائے۔“

کیٹھو گاڑی لے کر گیا۔

☆☆☆

سمیرا کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ تمام رات سو نہ سکی۔ یہ دھڑکا لگا رہا کہ میری آنکھ لگے گی! دھڑ ماروی کی آنکھ کھل گئی تو ہوش میں آتے ہی میرے خلاف بیان دے گی! آخر صبح ہوئی۔ دوسرا آدھا دن بھی گزر گیا لیکن محبوب اور معروف کا فون نہیں آیا۔ اس طرح یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ اسے ہوش نہیں آ رہا ہے یا پھر آ گیا ہے۔ اس کی سوچ سہمی ہوئی تھی۔ ”اگر ہوش آ گیا ہے تو وہ میرے خلاف زہر اگل چکی ہوگی اور محبوب غصے میں بھرا ہوا مجھے کوئی مارنے آ رہا ہوگا۔“

اس نے پچھلی رات سے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ جھنجھلا کر سوچ رہی تھی۔ ”مجھے سکون کیسے ملے گا؟ وہ خود تو آرام سے بے ہوش بڑی ہے اور مجھے اندیشوں کے عذاب میں مبتلا کر رہی ہے۔ نہیں مرنو نہیں گئی؟“ اس نے فون پر محبوب کو مخاطب کیا۔ ”ماروی اب کیسی ہے؟“

وہ بولا۔ ”کیا بتاؤں؟ بس زندہ ہے آنکھیں کھول دی ہیں۔ کچھ بولتی نہیں ہے۔“

سمیرا نے دل میں کہا۔ ”خدا کرے کبھی نہ بولے۔“ پھر پوچھا۔ ”ایسا کیا ہو گیا ہے کہ نہیں بول رہی ہے؟ ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟“

”وہ پہلی طرح پھر ایک بار کوما میں پہنچ گئی ہے۔ پتا نہیں بیماری کے ساتھ کیوں ایسا ہو رہا ہے۔“

سمیرا نے اطمینان کی سانس لی۔ اچھی خبر یہ تھی۔ وہ ہوش میں آ تو گئی تھی لیکن پونے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس نے دعا مانگی تھی کہ وہ مر جائے۔ ہمیشہ کے لیے اسے چپ لگ جائے لیکن پوری دعا قبول نہیں ہو رہی تھی۔ دعا کی ادھوری قبولیت نے سکون برادر کیا تھا۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ جس طرح وہ بے ہوشی سے نکل آئی تھی، اسی طرح آج یا کل کو سے بھی نکل آئے گی پھر بولنے لگے گی۔ کیا مصیبت ہے؟

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ یہ شہر چھوڑ کر چل جائے۔ نواب شاہ میں اپنے انکل کے ہاں اس وقت تک رہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوما سے نکل آئی ہے اور اس نے مخالفت میں کوئی بیان نہیں دیا ہے۔

محبوب اس کی سلامتی اور صحت یابی کے لیے پریشان تھا۔ اسپتال سے نہیں جا رہا تھا۔ اس کی جینوں جیسی حالت

ہے۔ اب سے آٹھ مہینے پہلے جنگل میں جو حادثہ پیش آیا تھا وہ اسے یاد ہے۔“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا آٹھ ماہ پہلے بھی اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی؟“

محبوب نے کہا۔ ”ہاں۔ اس وقت بھی ہوش میں آنے کے بعد کو ماہیں پہنچ گئی تھی۔ پھر کو ماہ سے نکلی تو یادداشت گم ہو گئی تھی۔ یہ اپنی پچھلی تمام زندگی کو بھول گئی تھی؟“

ماروی نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں۔ میں نہیں بھولی ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

اسے پچھلی تمام باتیں یاد آ رہی ہیں تو یہ بھول گئی ہے کہ تب سے اب تک آٹھ ماہ گزار چکی ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں آپ لوگوں کی باتیں سن رہا ہوں اور بہت کچھ سمجھ رہا ہوں۔ آپ اپنی بیٹی سے اور باتیں کریں۔ اس نے آٹھ ماہ کا عرصہ آپ کے ساتھ کیسے گزارا ہے؟“

چاچی نے ماروی سے کہا۔ ”کیا تمہیں یاد ہے تمہاری یادداشت واپس لانے کے لیے ایک ایلیڈی ڈاکٹر عدلیہ تمہارے پاس آیا کرتی تھی؟“

ماروی نے انکار میں سر ہلا یا۔ چاچی نے کہا۔ ”مراد تو تمہیں یاد ہے اسے تو کبھی نہیں بھولو گی؟“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ اچھی طرح یاد ہے وہ مجھے تلاش کرنے کے لیے سب کی طرف گیا ہے۔“

”نہیں بیٹی! وہ ہندوستان میں ہے۔ تم سے روز فون پر باتیں کرتا ہے۔ اس نے تم سے کہا ہے کہ وہ ایک نئے کے اندر آئے گا اور تمہیں اپنی دلہن بنائے گا۔“

”مراد نے مجھ سے فون پر کبھی بات نہیں کی۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں کہ وہ ہندوستان میں ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”تم بھی جانتی ہو کہ وہ انڈیا میں ہے۔ تم اس کی دلہن بننے کی باتیں فون پر کرتی ہو۔ میں نے اعتراض کیا تھا کہ تمہیں اس کی شریک حیات نہیں بننا چاہیے وہ مجرموں کی دنیا میں رہنے لگے، خود ایک مجرم بن گیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”سائیں! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ خدا کے لیے اسے مجرم نہ کہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میرے دلہن بننے کی بات کیوں ہو رہی ہے۔ میں نے مراد سے شادی کی کوئی بات نہیں کی ہے۔“

محبوب کے اندر ایک چور خوشی نے کروٹ لی۔ اچانک ہی بازی پلٹ رہی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ بڑی کلن سے روز فون پر اس کی دلہن بننے کی بات کیا کرتی تھی۔ تقدیر نے اسے مراد کے گھر جاتے جاتے روک دیا تھا اور محبوب کے لیے دروازے کھل رہے تھے۔ ماروی کو پھر اپنی طرف مائل کرنے کی راہیں ہموار ہونے والی تھیں۔

ڈاکٹر نے چاچی سے کہا۔ ”آپ لوگوں کی باتیں سن کر یہ معلوم ہوا کہ آٹھ ماہ پہلے آپ کی بیٹی کو ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ سربراہیوٹ لگی تھی۔ دماغ متاثر ہوا تھا اور یہ پچھلی زندگی کو بھول گئی تھی۔“

محبوب نے کہا۔ ”یہ اپنے آپ کو بھی بھول گئی تھیں۔“

پھر اس نے ماروی سے پوچھا۔ ”تم اپنے تمام ماضی

وہ بتی سے بولی۔ ”چاچی! ہم سب سے آگے ایک گاؤں میں آپ کی بہن کے گھر میں رہنے جا رہے تھے۔ ایسے وقت مرینہ ہمیں دھوکا دے کر کہیں لے جا رہی تھی۔“

”جب ہمیں معلوم ہوا کہ سائیں محبوب جیل میں مراد کی جگہ ہیں اور مراد ہماری تلاش میں نہیں جھنک رہا ہے اور مرینہ ہمیں دھوکا دے رہی ہے تو ہم اس سے چھپا چھپانے لگے۔“

اسے پچھلی تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ بولی رہی تھی۔ ”مرینہ ہماری دشمن ہو گئی تھی۔ مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ رات کے وقت جنگل میں بہت اندھیرا تھا۔ میں اس اندھیرے میں بھاگنے وقت ایک ڈھلان میں گر پڑی تھی۔“

پھر وہ محبوب سے بولی۔ ”سائیں! آپ تو جیل میں تھے۔ وہاں سے فون کے ذریعے کئی بار مجھ سے باتیں کر چکے تھے۔ مجھے تمام باتیں یاد ہیں پھر کیوں کہتے ہیں کہ میری یادداشت گم ہو گئی ہے اور میں پچھلی زندگی کو بھول گئی ہوں؟“

محبوب نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے ہوش میں آنے کے بعد مجھے نہیں پہچانا تھا۔ مجھے تو کیا چاچی چاچا اور مراد کو بھی نہیں پہچانا تھا؟“

وہ بولی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو ہوش میں آئی ہوں۔ آپ سب کو پہچان رہی ہوں۔“

”ماروی! میں آٹھ ماہ پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت تم ڈھلان سے گری تھیں اور ایک بڑے پتھر سے ٹکرائی تھیں۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”کیا اس حادثہ کو آٹھ ماہ گزر چکے ہیں...؟ نہیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

چاچی نے کہا۔ ”سائیں سچ کہہ رہے ہیں۔ تم آٹھ مہینے تک اپنی پچھلی زندگی کو بھولی ہوئی تھیں۔ کل بہت اونچی سیڑھی سے گرنے کے بعد بے ہوش ہو گئی تھیں۔“

پھر وہ ڈاکٹر سے بولی۔ ”یہ میری بیٹی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ آٹھ ماہ پہلے اپنی پچھلی زندگی کو بھول گئی تھی۔ آج

دوایا کے کسی نمٹنی کر گئے میں اور ملک کھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے فیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجتا شروع کر دیں گے۔

ایک کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 سسٹینس ڈسٹری بیوٹنگ اتھارٹی میں کوری روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

کے ساتھ خود کو پہچان رہی ہوتا؟“

”بے شک خود کو پہچان رہی ہوں۔ مجھے بچپن سے لے کر اب تک کی تمام باتیں یاد ہیں۔“

ڈاکٹر نے کہا: ”اب تک کی زندگی میں صرف آٹھ ماہ گزارنے والی زندگی کو بھول گئی ہو۔ کیا تم آٹھ ماہ کے دوران ہونے والی کوئی بات بتا سکتی ہو؟“

وہ بولی: ”آپ لوگ کس آٹھ ماہ کی باتیں کر رہے ہیں میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ میں تو اتنا ہی جانتی ہوں کہ ایک جنگل کی اندھیری رات تھی۔ میں کہیں ڈھلان میں گر پڑی تھی۔ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب یہاں اسپتال میں آکر مجھے ہوش آیا ہے۔“

چالچی نے کہا: ”وہ جو حادثہ پیش آیا تھا اور تم۔۔۔۔۔۔ ہوش ہو گئی تھیں۔ تب ہم تمہیں کھر کے ایک اسپتال میں لے گئے تھے۔“

”یہ دوسری بار تمہیں حادثہ پیش آیا ہے۔ بیٹی...! ابھی تم کراچی کے ایک اسپتال میں ہو۔“

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی: ”ڈاکٹر نے کہا۔“ تم اپنے ذہن پر زور نہ ڈالو۔ تمہارا سر زخمی ہے۔ دماغ کمزور ہے اور تھکا ہوا ہے۔ کوئی الجھی ہوئی بات نہ سوچو۔“

وہ چالچی سے بولا: ”پلیز اپنی بیٹی کے سامنے پچھلے

آٹھ ماہ کی باتیں نہ کریں۔ نہ اسے کوئی بات یاد کرنے دیں۔ یہ یاد رکھیں اس کا دماغ کمزور ہے۔ اس کے ذہن پر

بو جھ ڈالا جائے گا تو یہ دماغی مریض بن کر رہ جائے گی۔ یاد

کرنے کے لیے جبر کیا جائے گا تو یہ پاگل ہو جائے گی۔“

”خدا نہ کرے۔ میری بیٹی کو کوئی دماغی نقصان پہنچے۔“

وہ ماروی کا ہاتھ تھام کر بولی: ”تم ڈاکٹر صاحب کی

باتیں سن رہی ہو۔ خاک ڈالو پچھلے آٹھ مہینوں پر۔ ابھی اپنے

دماغ پر بو جھ ڈال کر نہ سوچو کہ تم آٹھ مہینوں تک کہاں گم رہی

تھیں؟ تم کہیں گم نہیں ہو گئی تھیں۔ تم بچپن سے میرے پاس

ہو۔ ان آٹھ مہینوں میں بھی میرے ساتھ ہی رہی ہو۔“

ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے لگا اس نے پوچھا: ”تم

ذہنی اور جسمانی کمزوری محسوس کر رہی ہو؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی: ”نہیں ڈاکٹر...! میں

چالچی کے ساتھ گھر جانا چاہتی ہوں۔“

وہ بولا: ”تمہیں اور ایک دن آہر و رشتہ میں رکھا جائے گا۔ پھر تم جاسکو گی۔“

ڈاکٹر نے دوا نہیں کھیں۔ اسے دودھ پینے اور پھل کھانے کی ہدایات کیں پھر چلا گیا۔

کے کٹوے کرنے لگا۔ تیلی تیلی قاشیں بنا کر اسے دینے لگا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ پھر بولی۔
”آپ بہت اچھے ہیں۔“

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”صرف اچھا ہوں؟ کیا مجھ میں ایسی خوبیاں نہیں ہیں کہ کوئی میری محبت کا جواب محبت سے دے؟“

وہ سیب چبا رہی تھی۔ یکنخت رک گئی۔ منہ بند ہو گیا۔ سر بھی جھک گیا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ سوچ میں پڑ گئی۔
محبوب نے کہا۔ ”رک کیوں گئیں؟ کھاتی رہو۔ میری کوئی بات بوجھ لگے تو کہہ دینا۔ میں وہ بات پھر نہیں کروں گا۔“
وہ آہستہ آہستہ چبانے لگی۔ گہری سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر بولی۔ ”آپ بہت مہربان ہیں۔ آپ کی مہربانیاں اور احسانات اتنے ہیں کہ میں انگلیوں پر نہیں گن سکتی۔ آپ زبان سے نہیں کہتے۔ پھر بھی میرے لیے جو محبت جو دیوا لگی ہے، وہ ان احسانات کے پیچھے سے جھلکتی رہتی ہے۔“

”خدا کا شکر ہے۔ تم میری دیوا لگی کو سمجھتی ہو۔“
”جی جی ہوں اور ابھی رہتی ہوں۔ میرا دل میرا دماغ اور میرا ضمیر کہتا ہے کہ آپ کی محبت کا جواب محبت سے دینا چاہیے۔“

”تم ایسا سوچ رہی ہو۔ میں خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے۔ میری محبت میرا حوصلہ دیکھو کہ میں اب تک تم سے مایوس نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھے ماروی سے محبت کا جواب دل کی سچائی سے اور دلی محبت سے ملے۔“

”میری انجمن یہ ہے کہ مراد مجھے بچپن سے چاہتا ہے۔ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دوں گی تو ایک پیار کرنے والے غریب سے نا انصافی ہوگی۔ میں بہت ڈرتی ہوں۔“
”کس بات سے ڈرتی ہو؟“

”میں نے اسے مایوس کیا تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا۔ میرے بغیر زندہ نہیں رہے گا۔“

”تم نے مجھے مایوس کیا تو یہی خبر سونگ کی جان پر کھیل گیا ہوں۔ تم دیکھ چکی ہو کہ تمہارے لیے کوئی کھا چکا ہوں۔ اپنے اربوں روپے کے کاروبار کو مٹی میں ملا رہا ہوں۔ خدا جانتا ہے، میں بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہوں گا۔“

”میں جانتی ہوں۔ اسی لیے ابھی رہتی ہوں، کسی کو

چاہا اس کے لیے تازہ پھل لے کر آیا۔ چاچی نے کہا۔ ”یہ تم نے اچھا کیا۔ ڈاکٹر نے خوب کھانے پینے کو کہا ہے۔ میں ابھی دودھ گرم کر کے ڈبل روٹی لاتی ہوں۔“

وہ کمرے سے باہر آئی۔ محبوب نے اس کے ساتھ باہر آ کر کہا۔ ”چاچی ایک بات کہنا ہے۔“

”ہاں کہو۔ آج تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اسے بچپن سے اب تک کی تمام باتیں یاد آگئی ہیں۔“

”میں بھی بیان نہیں کر سکتا کہ میرے اندر کتنی خوشیاں بھر گئی ہیں۔ چاچی! میں یہ کہہ رہا تھا کہ مراد کا فون کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ آپ ماروی کو ابھی بات نہ کرنے دیں۔ پہلے آپ بات کریں۔“

چاچی مٹی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”مراد کو فون پر سمجھاؤ کہ ماروی کا دماغ کمزور ہو چکا ہے۔ اس سے پچھلے آٹھ ماہ کی باتیں نہ کی جائیں۔ آپ کے سامنے ہی ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہاں مراد کو اس کے تمام حالات بتاؤں گی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دو چار روز میں آنے والا ہے۔“

”تجربہ ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ فون کیوں نہیں کر رہا ہے؟ جبکہ روز ماروی سے باتیں کرتا رہا ہے۔“
محبوب کو اپنی بڑی مٹی نے اس نے کہا۔ ”چاچی! وہ فون کرے تو اسے خاص طور پر یہ ضرور کہنا کہ ماروی سے دلہن بننے والی باتیں نہ کرے۔ جب یہاں آئے گا تو دیکھا جائے گا۔“

چاچی نے وعدہ کیا کہ مراد کو یہی سمجھا دے گی پھر وہ دودھ گرم کرنے چلی گئی۔ محبوب کے اندر جھلکی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جلد سے جلد مراد کی شادی خانہ آبادی کا معاملہ ختم کر دینا چاہتا تھا۔ تقدیر اسے موقع دے رہی تھی۔ ماروی مراد کی دلہن بننے والی بات بھول گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا اب کوئی اسے یہ بات یاد نہ دلائے۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ رقیب بن کر رہے۔ مراد کو نقصان تو نہ پہنچاے لیکن ماروی سے اب صاف اور سیدھی پیار کی باتیں کرے۔ اسے کسی بھی طرح اپنی طرف مائل کر لے۔

چاچا کمرے سے نکل کر ڈاکٹر کی پرچی دکھاتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ دوا لیںے چاہ رہا ہوں۔ ابھی آ جاؤں گا۔“

وہ چلا گیا۔ محبوب دروازہ کھول کر کمرے میں آیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیب تھا۔ وہ قریب آ کر اس کے ہاتھ سے سیب لے کر بولا۔ ”لاؤ میں کاٹ کر دیتا ہوں۔“

وہ ایک کمری پر بیٹھ کر پلیٹ سے چھری اٹھا کر سیب

دینے میں ناکام رہے گا اس کی اہمیت کم ہو جائے گی۔“
وہ بولا۔ ”پھر تو دوسرے کی اہمیت بڑھ جائے گی تم
اس کنوارے کی قدر کرو گی؟“

”ہاں۔ جو میرے لیے ہوں کو اہمیت نہیں دے گا اور
میرے انتظار میں کسی اور کی طرف مائل نہیں ہوگا میں اس کی
دل و جان سے قدر کروں گی اور اسی کی منکوحہ بن جاؤں گی۔“
محبوب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے
کہا۔ ”تم چپ چپ سی رہتی ہو۔ تمہاری سوچ کا پتا نہیں
چلتا۔ آج تم نے بڑی ذہانت سے یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم اپنے
دونوں جانے والوں کو مایوس نہیں کرو گی۔ دونوں کو برابر
توجہ اور محبتیں دو گی۔ اس طرح ہمارے درمیان رقابت
نہیں رہے گی۔“

”دونوں کو آزادی رہو گی کہ کون شادی اور عورت
کے بغیر رہ سکتا ہے۔ جو نہیں رہ سکے گا وہ خود ہی کم تر ہو جائے
گا۔ جو آزمائش میں کنوارا رہ جائے گا تم اس کی ذہن بن جاؤ
گی۔ آج تمہاری یہ فیصلہ کن باتیں سن کر میں بہت مطمئن ہو
گیا ہوں۔ یہ یقین ہو گیا ہے کہ تم مراد کو مجھ پر ترجیح نہیں
دے گی۔ میری محبت کا جواب ہمیشہ محبت سے دیتی رہو گی۔“

مختی چاچی دودھ گرم کر کے لے آئی۔ ماروی کو سبب
کھاتے دیکھ کر بولی۔ ”شاباش بیٹی! کھاتی پیتی رہو۔ تمہارا
بہت خون بہہ گیا ہے۔ بہت کمزور ہو گئی ہو۔“

محبوب نے کہا۔ ”آپ اسے کھلائی پاتی رہیں گی تو
یہ جلد ہی چلنے پھرنے اور دوڑنے کے قابل ہو جائے گی۔“

چاچی نے اس کے سامنے سہانے کی میز پر دودھ کا
پیالہ اور ڈبل روٹی رکھتے ہوئے کہا۔ ”لو کھاؤ۔“

اسی وقت ماروی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے
لگی۔ چاچی نے کہا۔ ”ضرور مراد ہوگا۔“

اس نے فون اٹھا کر کال کرنے والے کے نمبر پڑھے
پھر مایوس ہو کر بولی۔ ”مراد نہیں ہے۔ ہاں ہے۔“

محبوب نے پوچھا۔ ”یہ بلے کون ہے؟“

چاچی نے کہا۔ ”مراد کا کوئی خاص آدمی ہے۔ یہاں
اس کے لیے کام کرتا ہے، اس کے دشمنوں سے لڑتا ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”یعنی مراد نہیں ہے لیکن اس کی
مجرمانہ کارروائی یہاں بھی جاری ہے؟“

”سائیں! دشمنوں نے اسے بددوق چلانے پر مجبور
کر دیا ہے تو وہ اور کیا کرے گا۔ یہاں ماروی کے پاس
آنے سے پہلے اپنے دشمنوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔“

محبوب نے چور نظروں سے ماروی کو دیکھ کر کہا۔ ”وہ

مایوس نہیں کر رہی ہوں۔“
”کب تک دونوں کی دلیوٹی کرو گی؟“

”میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ مجھے اسی
بات پر عمل کرنا ہوگا۔ یہ سمجھ لیں کہ میں اپنے اندر ایک فیصلہ
کر چکی ہوں۔“

محبوب کے ہاتھ سب کانٹے کانٹے رک گئے۔ اس
نے پوچھا۔ ”کیا فیصلہ کیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”آپ کیوں رُک گئے۔ میں بول رہی
ہوں۔ آپ سنتے رہیں اور کھاتے رہیں۔“

اس نے ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر چپایا۔ ماروی نے
کہا۔ ”ایک ماں اپنے کئی بچوں سے پیار کرتی ہے۔ ہر بچے
میں اس کی جان لگی ہوتی ہے۔ ایک بہن کی بھائیوں کو محبتیں
دیتی ہے۔ ہر بھائی پر قربان ہوئی رہتی ہے۔ پھر کیا ایک
محبوب اپنے دو چاہنے والوں سے برابر پیار نہیں کر سکتی؟

”یہ سننے سے عجیب سا لگتا ہے۔ دنیا دو مردوں سے
پیار کرنے والی کو فوراً ہی بے حیا کہے گی۔ لیکن میں خود کو بے حیا
اس وقت سمجھوں گی جب کسی کے ساتھ بے حیائی کا کوئی قدم
اٹھاؤں گی۔ یہ جو ایک عرصے سے ہماری سلیڈ میں ہوتی ہے اس
کا تقاضا ہے کہ ہم جسمانی ہوں نہ رکھیں۔ کوئی ایسی خواہش نہ
رکھیں جو ایک کو با مراد اور دوسرے کو نامراد کرے۔“

محبوب سن رہا تھا اور جواباً کچھ کہنے کے لیے بے چینی
سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”ہم کسی غرض اور
ہوس کے بغیر ایک دوسرے کو اپنی محبت اپنی توجہ دیں گے
اور ایسی محبت پر فخر کریں گے۔ ساری دنیا سے زیادہ ایک
دوسرے کو اہمیت دیتے رہیں گے۔ اگر ایسی محبت نہیں ہوتی
ہے تو ہم کریں گے اور ایک نئی مثال قائم کریں گے۔“

محبوب نے کہا۔ ”تم دنیا سے نرالی باتیں کر رہی
ہو۔ ایسا کبھی ہوا ہے نہ ہوگا۔ ایک مرد اور عورت کے درمیان
چاہے کتنی ہی جگہ محبت ہو، جسمانی طلب ضرور ہوتی ہے۔“

وہ بولی۔ ”ایسی طلب ہو تو آپ دونوں کسی سے بھی
شادی کر لیں۔ یہ میرا فیصلہ ہے کہ میں کسی سے شادی نہیں
کروں گی۔ دونوں میں سے کسی کو مایوس نہیں کروں گی۔ میں

یہ قربانی دے رہی ہوں کہ اپنے ذہن بننے کا خواب پورا نہیں
کروں گی۔ آپ دونوں کی خاطر بین باہمی رہوں گی۔“

محبوب نے پوچھا۔ ”اگر ہم دونوں میں سے کوئی
شادی کرے گا اور تمہارا بھی دیوانہ رہے گا تو؟“

”تو دیوانہ رہے۔ میں تو اپنے فیصلے پر قائم
رہوں گی۔ جو کنوارا رہنے کی اور شادی نہ کرنے کی قربانی

اسی طرح دشمنوں کو ختم کرنے کی دھن میں قاتل اور خطرناک مجرم بن چکا ہے۔ یہاں سے انڈیا تک گولیاں چلا رہا ہے۔ اپنے دشمنوں کی تعداد بڑھاتا جا رہا ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”آپ مراد کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں راقبت سے نہیں بول رہا ہوں۔ چاچی سے پوچھ لو۔ میری ایک بات بھی غلط نہیں ہے۔“

چاچی نے کہا۔ ”ہاں بیٹی! تم تو پچھلے آٹھ مہینے کی باتیں بھول چکی ہو۔ ورنہ تم بھی جانتی تھیں کہ وہ بددوق اٹھا کر ایسا پھنسا ہے کہ مجرموں کی دنیا سے نکل نہیں پا رہا ہے۔ وہاں انڈیا میں پتا نہیں کیسی خطرناک زندگی گزار رہا ہے۔ یہاں جلتے کے ذریعے دشمنوں کو ختم کر رہا ہے۔“

”اس کام کے لیے تم نے جلتے کو ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ مراد نے فون پر ختم سے کہا تھا کہ جلتے کو مزید رقم کی ضرورت ہو تو میری کال کا انتظار نہ کرنا اسے رقم دے دینا۔“

ماروی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یا اللہ...! مراد کیسی خطرناک زندگی گزار رہا ہے۔ چاچی! ابھی فون پر اس سے بات کراؤ۔“

وہ بولی۔ ”میں کل سے دو بار اسے فون کر چکی ہوں۔ یہی جواب ملتا ہے کہ فون بند ہے۔ رابطہ نہیں ہو سکتا۔“ پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”بیٹی! امیرا دل گھبرا رہا ہے۔ دعا کریں مانگ رہی ہوں کہ وہ خیریت سے ہو۔“

فون سے پھر رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مٹی نے مٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں جلتے! میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی۔ مراد کا فون کل سے بند پڑا ہے۔ وہ کہاں ہے؟ خیریت سے تو ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں کیا بتاؤں؟ میرا بھی اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں ہے۔ ایسا ہوتا ہے چاچی! ہم کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو کئی دنوں تک اپنے گھر والوں سے بات نہیں کر سکتے۔“

وہ بولی۔ ”ایسی زندگی کیوں گزار رہے ہو؟“

”اپنی خوشی سے کون اپنا سکون برباد کرتا ہے۔ میں نے کل ہی اپنی بیٹی سے شادی کی ہے۔...“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”تم نے بیٹی سے شادی کی ہے؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”وہ دراصل اس کا نام بشری ہے۔ میں اسے بیٹی کہتا ہوں۔ شادی کے بعد پریشان ہو کر سوچ رہا ہوں کہ دشمنوں سے نجات ملے گی۔ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ میری طرف آنے والی گولی میری بیٹی کو نہ لگ

جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ میرے اور مراد کے دشمن اس شہر سے ختم ہو جائیں۔ اسی لیے ابھی فون کیا ہے۔ مجھے دو لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ کیا مل سکتے ہیں؟“

وہ بولی۔ ”ماروی بیمار ہے۔ شاید کل تک اسپتال سے چھٹی ہوگی تو ہم گھر جائیں گے۔ برسوں آکر چیک لے جاؤ اور کسی طرح مراد کی خیریت معلوم کرو۔“

”میں خود اس کے لیے پریشان ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ وہ انڈیا میں کہاں ہے؟ اب اسی کی کال آئے گی تو خیریت معلوم ہوگی۔ ٹھیک ہے میں برسوں بینک ٹائم میں آؤں گا۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ چاچی بڑبڑانے لگی۔ ”مراد اسے بڑی بڑی رقمیں دے رہا ہے۔ یہ پہلے ایک لاکھ روپے لے گیا تھا۔ اب دو لاکھ مانگ رہا ہے۔“

محبوب نے پوچھا۔ ”کیا آپ مراد سے پوچھے بغیر اسے یہ رقم دے دیں گی؟“

وہ بولی۔ ”مراد نے ہی کہا تھا کہ کبھی ضرورت کے وقت اسے لاکھ دو لاکھ دے دیا کروں۔ مجھے رقم کی نہیں مراد کی فکر ہے۔ اس کا فون کیوں بند ہو گیا ہے؟“

پھر وہ محبوب کا خلیہ دیکھ کر بولی۔ ”آپ کل سے اسپتال میں ہیں۔ ذرا آئینہ دیکھیں کیا حالت بنارہی ہے۔“

پھر وہ ماروی سے بولی۔ ”بیٹی! یہ تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ دن رات کبھی تمہارے کمرے کے اندر بھی باہر جھنگتے رہتے تھے۔ دیکھو تو اپنا کیا خلیہ بنارکھا ہے۔“

ماروی محبوب کو اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔ اب اپنی محبت ظاہر کرنے میں کوئی جھجک کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ میرے لیے پاگل ہو جاتے ہیں۔ اب تو دیوانگی سے باز آ جائیں۔ چلیں انہیں اور سیدھے گھر جائیں وہاں شاور لے کر نریش ہو کر کچھ کھائیں چائیں اور بھر پور نیند لیں۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم اتنے بیمار سے کہہ رہی ہو تو جانا ہی ہوگا۔ میں دو تین گھنٹوں میں آ جاؤں گا۔“

وہ بولی۔ ”جی نہیں۔ میں نے کہا نا آپ صبح تک بھرپور نیند لیں گے۔ صبح آٹھ بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ جب آئیں گے تو آپ کے ساتھ ناشتا کروں گی۔“

اس نے اب سے پہلے اتنی محبت اور اپنائیت سے بات نہیں کی تھی۔ وہ نہال ہو رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ رات بھر سوئے گا۔ صبح آئے گا۔ پھر وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ پہلی بار ایسی خوشی ملی تھی۔ وہ مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ زمین پر چل رہا

”کیا اس نے ایسا کہا ہے؟“
”آج اس نے میرے ساتھ تنہائی میں ایسی باتیں کی ہیں کہ میں ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔“

اس بار وہ صدمے سے رو پڑی۔ بھر یہی ہو رہا تھا۔ اس کی آدھی دعا قبول ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑے الزام سے بچ گئی تھی۔ لیکن ماروی اس کے محبوب کو کھانسنے کے لیے زندہ رہ رہی تھی۔

آخر محبوب نے بھی دعا مانگی تھی۔ اس کی بھی دعا قبول ہوئی تھی۔ اسی لیے مراد سے ماروی کی شادی کھٹائی میں پڑ گئی تھی۔ اب وہ دعا اس کے محبوب کو ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔

سمیرا سوچ رہی تھی، ماروی نے بھی دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی بھی بہتری ہو رہی تھی۔ اس کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ اب وہ مراد جیسے غریب مجرم کی شریک حیات نہیں محبوب جیسے ارب بتی کی دلہن بننے والی تھی۔

محبوب کی خوشیاں یہی کہہ رہی تھیں اور وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ محبوب نے پوچھا۔ ”کب تک روئی رہو گی؟“ وہ سسکتی ہوئی بولی۔ ”میں کیا کروں؟ آپ کو اتنی

خوشیاں مل رہی ہیں کہ خوشی کے مارے میرے آنسو نہیں رک رہے ہیں۔ پلیز مجھے رونے دیں۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔“

اس نے رابطہ ختم ہوتے ہی شدید غصے سے تلملا کر فون کو سامنے دیوار پر دے مارا۔

جس نے بھی جود دعا مانگی تھی وہ کسی نہ کسی حد تک پوری ہو رہی تھی۔

ان دونوں کے ساتھ آکر دعا مانگنے والے محبوب کا بھی بھلا ہوا تھا۔ وہ محبت کی ہماری ہوئی بازی جیت رہا تھا۔ غازی بابا کے دربار میں سب ہی کے ساتھ انصاف ہوا تھا۔ یہ بات سمیرا کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ ایک آرام دہ بیڈ پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ شامت اسی طرح آتی ہے۔ اس کی دونوں کلائیوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ اس کی ایک ٹانگ اور دو بازوؤں میں گولیاں لگی تھیں۔ وہ ہاتھ پاؤں کے ہوتے ہوئے بھی...

بے دست و پا پڑا ہوا تھا۔ اگرچہ گولیاں جسم میں بیوست نہیں ہوئی تھیں۔ اسے لگ کر گزر گئی تھیں۔ تاہم اسے زخمی نہاکارہ اور بے یار و مددگار بنا گئی تھیں۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر کہیں جا نہیں سکتا تھا۔

مریہ کو ایسے زخم کھانے اور ان کا علاج کرنے کا

تھا اور لگ رہا تھا کہ وہ خلا میں پرواز کر رہا ہے۔ وہ باہر آ کر کار میں بیٹھا تو کانگ ٹون سنائی دی۔ ننھی سی اسکرین پر سمیرا کا نام تھا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ ”آہا سمیرا...! تم کہاں ہو؟ آج میں بہت خوش ہوں آج مجھے ایک نئی زندگی ملی ہے۔“

سمیرا نے سہم سہم کر فون کیا تھا۔ اس کا خیال تھا، ماروی نے ہوش میں آکر ضرور کہا ہوگا کہ اسے سمیرا نے سیزھی کی بلندی سے دھکا دیا تھا۔ پھر محبوب اس سے نفرت کرے گا لیکن وہ تو فون پر خوشی سے جیسے پاگل ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ”بات کیا ہے؟ آپ بہت خوش ہیں۔ کیا ماروی ہوش میں آ گئی ہے؟“

”ہاں۔ ایک عجیب سی بات ہوئی ہے۔ اس کی اشت واپس آ گئی ہے۔ اسے پچھلی زندگی کی تمام باتیں یاد آ گئی ہیں اور یہ تو میرے حق میں اچھا ہی ہوا ہے کہ وہ پچھلے آٹھ ماہ کی تمام باتیں بالکل ہی بھول گئی ہے۔ اسے یہ یاد

نہیں ہے کہ اس نے مراد سے دلہن بننے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ گزرے ہوئے کل کی باتیں بھی بھول گئی ہے۔ یہ بھی یاد نہیں ہے کہ وہ کل شام غازی بابا کے دربار میں گئی تھی۔“

سمیرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیا بچ کہہ رہے ہیں؟ وہ بھول گئی ہے کہ وہاں سیزھی سے گری تھی؟“

”ہاں کہہ تو رہا ہوں۔ اسے پچھلے آٹھ ماہ کی کوئی ایک بھی بات یاد نہیں ہے۔“

وہ فون پر بے اختیار چیخ پڑی۔ ”یا غازی بابا...!“

اس کے سر سے بہت بڑا ہوجہ اتر گیا تھا وہ الزام سے بری ہو گئی تھی۔ یکنخت خوشی کے مارے رو پڑی۔ محبوب نے حیرانی سے سنا وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں رو رہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ماروی بہت اوپر سے گری تھی۔ اسے نئی زندگی ملی ہے۔ مجھے رونے دیں۔ میں خوشی سے رو رہی ہوں۔ غازی بابا نے میری دعائیں سن لی ہیں۔“

وہ بولا۔ ”میری بھی دعائیں سن لی ہیں ہائے سمیرا...! ماروی میری طرف لوٹ آئی ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ محبوب نے کہا۔ ”انجی تم سے کہا ہے تا... اور وہ باتوں کی طرح یہ بھی بھول گئی ہے کہ وہ مراد کی دلہن بننا چاہتی تھی۔ میرے لیے تو یہ معجزہ ہو گیا ہے۔ اب وہ آگے آئے گا تو اس سے شادی نہیں کرے گی۔“

مرینہ نے رفتہ رفتہ اس کی لاعلمی میں اُنجانے میں اسے سستی خواہشات کے کھنچنے میں کس لیا تھا۔ وہ لوہے کی ہتھکڑیوں سے تو نکل سکتا تھا۔ لیکن خواہشات کے کھنچنے سے نکلنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔

وہ ایسے وقت ماروی کو اپنے دھیان میں لے آتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے اس سے کہتا تھا۔ جس طرح تم نے اپنے وجود کو میری امانت کے طور پر سنبھال کر رکھا ہے اسی طرح مجھے صرف تمہارے لیے خود کو سنبھال کر رکھنا چاہیے۔ تم صرف میرے لیے ہو۔ میں صرف تمہارے لیے ہوں۔ تمہارے سوا مجھے اور کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔

ماروی کی طرف دھیان کرنے کے باوجود مرینہ بند آنکھوں کے پیچھے بھی چلی آتی تھی۔ ماروی کے برابر اگر کبھی تھی۔ دونوں کو دیکھو۔ اس کا اپنا رنگ روپ اپنی تنیدگی ہے۔ میرا اپنا حسن اپنی شوخ اور چٹپٹ اداکاری ہیں۔ ماروی گرمی میں ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ میں سردی میں گرمی پہنچانے والی دھوپ ہوں۔

وہ مجبور تھا۔ بیڈ سے اٹھ کر کہیں جانیں سکتا تھا۔ ایک پاؤں اور دو بازو زنجی تھے۔ ہتھکڑیوں نے اور بے بس کر دیا تھا۔ ایک جگہ پڑا ہوا تھا اور وہ آتی جاتی دھوپ کی طرح لگ رہی تھی۔ اسے حرارت پہنچا رہی تھی۔ وہ کوئی ایسی دوا کھلا رہی تھی کہ زخموں سے ٹپٹپٹ نہیں اٹھ رہی تھیں۔ قدرے آرام تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنی حسرت پوری کرنے کے لیے اسے جلد سے جلد آرام پہنچا رہی ہے۔ آج کی رات ماروی کے نام سے رتنے والی پارسائی دم توڑنے والی ہے۔

مرینہ کے رویے میں غرور نہیں تھا۔ وہ فاتحانہ انداز میں اسے طعنے نہیں دے رہی تھی۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ مغرور اس کی کمزوری اور بے بسی کا مذاق نہیں اُڑا رہی تھی۔ وہ ایک گھریلو خدمت گزار شریک حیات کی طرح تنیدگی سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ چونکہ بازو زنجی تھے۔ وہ ہتھکڑی میں تھا اس لیے وہ اپنے ہاتھ سے اسے کھلا رہی تھی۔ اس نے بڑے پیار سے سر کی بالش کی تھی۔ پاؤں دباتی رہتی تھی لیکن اس کی طرح خاموش بھی کچھ نہیں بول رہی تھی۔

آخر اس نے شام کو کہا۔ ”میں صبح سے انتظار کر رہی ہوں کہ کچھ بولو گے لیکن تمہاری خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ہاتھ پاؤں میں جان آتی ہے میرے لیے عذاب بن جاؤ گے۔ یہاں سے نکل بھاگنا چاہو گے۔“ وہ اس کے پاؤں کو چوم کر اس پر سر رکھ کر بولی۔ ”مراد...! دشمنی ختم کر دو۔ میں ہار گئی ہوں۔“

خاصا تجربہ تھا۔ وہ طبی امداد کا تمام سامان پہلے سے اس گھر میں لے آئی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے رستے ہوئے لہو کو روکا اور تمام زخموں کی مرہم مٹی کر دی۔ اسے دوا کی بھی کھلائی تھیں۔ انجکشن بھی لگائے تھے۔ ایسی حالت میں مجرم نہ اسپتال جاتے ہیں، نہ کسی ڈاکٹر کو گھر میں بلا سکتے ہیں کیونکہ گھر میں آنے والے ڈاکٹر تھانے میں مجبوری کر دیتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو رازدار بنائے۔ کسی پر اعتماد کرے اور دھوکے میں ماری جائے۔ وہ بڑی رازداری سے مراد کے ساتھ وہاں رہنے والی تھی۔ بڑی لگن سے میچا بن کر دن رات اس کا علاج کرنے کی دھن میں لگی ہوئی تھی۔ اس مکان کے ایک کمرے میں کٹیو رہتا تھا۔ وہ اس کا زرخیز رازدار ماتحت تھا۔ اس کے تمام احکامات کی تعمیل کے لیے ہمہ وقت دوڑتا بھاگتا رہتا تھا۔ جب مرینہ اسے آواز دیتی تو وہ حاضر ہوتا تھا۔ ورنہ اس کے بیڈروم میں نہیں آتا تھا۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کر کے اس کا علاج اور تیمارداری کر رہی تھی۔

مراد چپ چاپ پڑا رہتا تھا۔ اسے دیکھتا تک نہیں تھا۔ اس سے نظریں چرانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ کم سے کم لباس میں رہتی تھی۔ وہ بڑی مشکل میں تھا۔ جب اس سے منہ پھیرتا تو وہ دوسری طرف خیالوں میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ منظر دکھائی دیتا تھا جب وہ بالکل ہی بے لباس بھی اور وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر کار کے اندر لے گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ خود ہی جیسے سزا پاتا رہا تھا۔ وہ شعلہ بدن اس کے ذہن میں نقش ہو گئی تھی۔

وہ اس حقیقت سے انکار کر رہا تھا کہ مرینہ اس کے حواس پر چھا گئی ہے۔ اسے جانی دشمن کہتا تھا اور اس سے نفرت کرتا رہتا تھا۔ خود نہیں جانتا تھا کہ خواہشات کو بھڑکانے والی ہوس اور اس کی طلب اندر ہی اندر ٹرنگ بنا رہی ہے۔ دوسری بار ہتھکڑیاں پہننے کے بعد اسے یہ فکریں نہیں تھیں کہ اس کے کھنچنے سے کیسے نکلے گا؟ اس کی خود اعتمادی اور قوت ارادی کہہ رہی تھی کہ زخم بھرنے کے بعد وہ ہتھکڑیوں کے باوجود اسے دبوچ لے گا۔

لیکن اس بیڈ روم میں پہنچ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس عورت کے پاس جیسے پہننے کے لیے کپڑے نہیں تھے۔ بڑی ہیجان انگیز خاموش اداؤں سے یاد دلاتی تھی کہ جو بازار میں کیا تھا اب اسی تماشے کو تنہائی میں بھگتو۔ وہ خاموش تھا۔ وہ بھی بڑے اعتماد سے اور بڑی خاموشی سے اس کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ مراد کی پریشانی یہ تھی کہ

میڈی کیم

بلیچ کریم

خوبصورتی سب کے لئے



**New Pack
with Extra
Qualities.**

میڈی کیم بلیچ کریم

آپ کے چہرے پہ لائے ایسا نکھار کہ آپ کو خود سے ہو جائے پیار۔

سچائی کا ثبوت دوں گی۔ صبح سے پہلے ہتھکڑی کھول دوں گی۔“
”ابھی کیوں نہیں کھولو گی؟“

”تم نے ابھی درست کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کا اعتماد دکھو چکے ہیں۔ پلیز ایک رات کی بات ہے۔ میں اعتماد نہ کرنے کے باوجود ہتھکڑی کھول دوں گی۔ اس کے بعد تمہارے زنجی ہاتھوں میں اتنی سکت تو ہوگی کہ میرا گلا دبوج کر یہاں سے جاسکو گے۔“

کسی کی عادت بدل جاتی ہے، فطرت نہیں بدلتی۔ اس وقت پہلی بار اس کی باتوں سے اور سنجیدگی سے لگ رہا تھا کہ مراد کی خاطر اس کی فطرت بدل گئی ہے۔ ویسے بھی مراد کو اس کے رحم و کرم پر رہنا تھا۔ وہ ابھی اس قابل نہیں تھا کہ اس کی کسی بات پر اعتراض کرتا اور وہاں سے اٹھ کر باؤں مردی دکھاتا۔ ایسے ہی وقت عبرت حاصل کی جاتی ہے کہ شہزاد کس طرح اچانک کمزور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔

انہوں نے رات کے آٹھ بجے کھانا کھایا۔ مرینہ نے اسے دو ایمین کھلائیں ایک انجکشن لگایا پھر سونے کے لیے لائش بچھادیں۔ زیرو باؤر کا بلب آن کر دیا۔

پتا نہیں اس نے کون سا انجکشن لگایا تھا۔ وہ ہلکا ہلکا سا سرور محسوس کر رہا تھا۔ وہ باس آئی تو جیسے جادو سے ہلکی سبز روشنی میں سبز پری دکھائی دینے لگی۔ کچھ نشہ تھا اور کچھ جادو۔ وہ بڑی مہارت سے ایسا سحر بھونک رہی تھی کہ نشہ حاوی ہوتا چلا گیا۔ اس کے باوجود وہ سنبھلتا اور کتراتا چاہتا تھا لیکن بہت کمزور ہو چکا تھا۔ مرینہ نے اس کے کان میں ماروی کو اس کی کمزوری بنا کر کہا۔ ”میرے سرکش دلدار...! انکار موت ہے۔ اقرار ماروی کی آغوش ہے۔ میں ہی تجھے اس کی آغوش میں پہنچاؤں گی۔ تو میری راہ گزر سے گزر کر یہی وہاں پہنچے گا۔“

وہ ایک طویل عرصے تک اس سے لڑتا رہا تھا اور اسے مات دیتا رہا تھا۔ ان لمحات میں پہلی بار اس سے مات کھا گیا۔ عورت ارادہ کر لے، دل میں شان لے تو کیا نہیں کر سکتی؟

پہاڑ کو سر کرنا کوئی کھیل نہیں ہے مگر اس نے سر کیا تھا۔ مرینہ نے بڑے پاپڑ پیلے تھے۔ مراد سے اتنی مار کھائی تھی کہ موت کی دہلیز پر پہنچ گئی تھی مگر واہ ری ضدی عورت اس نے اسکاٹ لینڈ یاڈ میں تربیت حاصل کی تھی۔ لندن میں MET آفیسر بن گئی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں اس کے سروں ریکارڈ میں اس کے

مراد نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ایک سرکش عورت کا قدموں میں سر رکھنا اچھا لگ رہا ہے۔ پچھلی رات جب اس ضدی اور سنگدل عورت نے اس پر گولیاں چلائی تھیں اسے زخمی کر کے اپنا قیدی بنایا تھا، تب وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ دشمن ہے اور دشمن ہی رہے گی۔ اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھ کر سوچنا حماقت ہے۔

اب اس کا قیدی بن کر اس پینڈروم میں آکر وہ حیرانی سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی دم سیدی ہو گئی تھی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے اور بڑی اپنائیت سے اس کا علاج کر رہی تھی۔

وہ اس کے قدموں پر سر رکھے کہہ رہی تھی۔ ”دشمنی ہم دونوں کو منگنی پڑتی ہے۔ میں خوب سوچ سمجھ کر تمہیں یہاں لائی ہوں۔ میں نے سوچا ہے۔ یہاں تمہارے ساتھ جتنے بھی دن گزار سکتی ہوں، گزاروں گی۔ دیکھ لینا، تم نفرت کرتے رہو گے میں بخیتیں دیتی رہوں گی۔“

”مجھے یقین ہے تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگو گے۔ یہ یقین اس لیے ہے کہ تمہارے زخم بھرتے ہی میں تمہیں ماروی تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔“

مراد نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے بے یقینی سے دیکھا۔ اس نے پاؤں کو چوم کر پوچھا۔ ”بولو، پھر تو میری عزت کرو گے؟ مجھ سے محبت کرو گے؟“

ماروی کے نام سے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ مرینہ اس کی کمزوریوں کو سمجھتی تھی۔ قدموں سے سراٹھا کر بولی۔ ”مراد...! اب تو کچھ بولو۔“

وہ بولا۔ ”عورت لباس میں اچھی لگتی ہے۔“
وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی بیڈ کے سرہانے الماری کی طرف چلی گئی۔ وہ سرگھبرا کر ادھر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب وہ تھوڑی دیر بعد سامنے آئی تو پورے لباس میں تھی۔

وہ بولا۔ ”تم میری بات مان کر مجھے خوش کر رہی ہو۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ تم نے دوستی کرتے کرتے دشمنی کی ہے۔ میں بھی کم نہیں ہوں۔ میں نے بھی بڑے پیار سے پیش آتے آتے تمہیں سزا میں دی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا اعتماد دکھو چکے ہیں۔ پہلے ہی بتاؤ تمہاری اس محبت فرما منہ داری اور خدمت گزاری کے بعد کیا ہوگا؟“
”میرا تجربہ کہتا ہے دم سیدی نہیں ہوگی۔ تم اپنی حسرتیں پوری کر کے اپنا اصل روپ ضرور دکھاؤ گی۔“
وہ وال کلاک کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”رات ہو چکی ہے۔ بس یہ آج کی رات گزر جانے دو۔ میں اپنی محبت اور

لے گی۔“

وہ خلا میں نکتے ہوتے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ کسی من مہوئی سی تھی۔ ایسی تو کوئی نہیں تھی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ ”میں ابھی اس سے بات کروں گا۔“
وہ بولی۔ ”ذرا صبر کرو۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ ابھی کال کرنا مناسب نہیں ہے۔“

”نہیں مرینہ! میں نے اس کی محبت اور اس کے ساتھ تنہائیوں میں گزارنے والے تمام لمحات تمہیں دے دیے ہیں۔ میرے اندر عجیب سی بے چینی ہے۔ میں اس سے بات کے بغیر سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔“

مرینہ کی گردن فخر سے تن گئی۔ اس نے ماروی کے حقوق چھین لیے تھے۔ وہ جتنا چاہتی تھی اس سے زیادہ حاصل کر چکی تھی۔ مراد اس کے حسن و شباب کا دباؤ نہ ہو گیا تھا۔

اس نے مراد سے بحث نہیں کی۔ ماروی کے نمبر بچ کر کے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر انتظار کرنے لگا۔ رات کے تین بجے تھے۔ سب سو رہے تھے۔ بڑی دیر بعد چابی مفتی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔ کون ہے؟“

”چابی...! میں بول رہا ہوں مراد...“

وہ اس کی آواز سننے ہی اٹھ بیٹھی۔ ”مراد تم کہاں ہو؟ اپنا فون کیوں بند کر دیتے ہو؟ اور یہ تم کسی اور کے فون سے بول رہے ہو۔“

”ہاں، کیا بتاؤں۔ یہ مصیبتیں پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں۔ میں پھر مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ ماروی سے بات کراؤ چابی!“
”نہیں، بتایا تو تھا۔ وہ بے جا رہی۔ ابھی ایک بڑی مصیبت سے نکلی ہے۔ بہت اونچی سیڑھی سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔“

مفتی نے اسے ماروی کے بے ہوش ہونے اور اس کی یادداشت واپس آنے کے بارے میں دوبارہ بتایا۔۔۔۔۔ ”وہ بیمار ہے۔ ابھی گہری نیند میں ہے۔ کیا اسے جگانا مناسب ہوگا؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں۔ اسے آرام سے سونے دو۔ میں کل کسی وقت اس سے بات کروں گا۔“

چابی مفتی سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے مرینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہو گئی ہے۔ ابھی آرام سے سو رہی ہے۔ اب کل ہی اس سے بات کروں گا۔“

وہ بولی۔ ”میں نے تو پہلے ہی سمجھا یا تھا مگر تم اس کی

طرح طرح کے کارناموں کی رپورٹس درج تھیں اور اس کے لیے لکھا گیا تھا۔“ مرینہ کی سب سے خطرناک خوبی یہ ہے کہ وہ ہار ماننا نہیں جانتی۔ ہارتے ہارتے ”مرتے مرتے“ بھی بازی جیت لیتی ہے۔“

ماسٹر کو بولنے انڈیا میں اس کی اور مراد کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ دونوں کو آزار مارا تھا کہ ان میں سے کون زیادہ شاطر ہے؟ اب تک مراد اس پر بازی لے جاتا رہا تھا۔ ماسٹر نے مرینہ کی ناکامی پر جگ دیو سے کہا تھا کہ مرینہ کا صرف نام ہی نام ہے۔ کوئی کام نہیں ہے۔ اسے ایک اور معاملے میں آزمایا جائے۔ اگر وہ ناکام رہے گی تو اسے ختم کر دیا جائے۔ ماسٹر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کتنا بڑا کارنامہ انجام دے گی۔ وہ ماسٹر جسے تراشیدہ ہیرا کہتا تھا جس کے کن گاتا تھا وہ اس سرکش اڑیل گھوڑے کو لگام دے کر اسے جیت چکی تھی۔ مراد چاروں شانے چت پڑا چھت کو تک رہا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار ایسی مسرتیں حاصل ہوئی تھیں جنہیں وہ زلیخا کے بعد بھول گیا تھا۔ وہ ایک عجیب سے سرور میں تھا۔ ابھی تک وہی خواب دیکھ رہا تھا۔ جو اپنی تعمیر پیش کر کے گزر چکا تھا۔

مرینہ اس کے سینے پر سر رکھے لپٹی ہوئی تھی۔ اسے بہت اچھی بہت اپنی لگ رہی تھی۔ عورت ہو یا مرد ہو۔ وہ ایک دوسرے سے ہار کر بھی جیت جاتے ہیں مراد مرینہ سے ہار کر اسے جیت چکا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں اپنی ایک ضد پوری کرنے کے لیے تمہارے آگے اپنا سب کچھ ہار چکی ہوں۔ آج سے میں تمہاری صرف تمہاری ہوں۔ تمہارے نام رہ کر پوری زندگی گزار دوں گی۔ کبھی تم پر آج بھی آئے گی تو تمہاری سلامتی کے لیے جان پر کھیل جاؤں گی۔“

وہ بولا۔ ”آئے والا وقت بتائے گا کہ تم کتنی سچی ہو۔ میں اپنی بات کہتا ہوں کہ آئندہ کبھی تم سے دشمنی نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی کو تم سے دشمنی کرنے دوں گا۔ تم نے جتنا خوش کیا ہے، اتنا ہی میں مغوم ہوں۔ بار بار ماروی یاد آ رہی ہے۔ میں نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔“

”تم اسے جان سے زیادہ چاہتے ہو۔ اس لیے شرمندگی سے ایسا سوچ رہے ہو۔ ورنہ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرتا ہے تم نے حالات سے مجبور ہو کر صرف مجھے اپنایا ہے۔ میں یقین سے کہتی ہوں میرے بعد تم کسی کو منہ نہیں لگاؤ گے۔“

”ماروی تمہارے بچپن کی محبت ہے۔ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ پہلے تو تم سے ناراض ہوگی پھر سمجھوتا کر

آواز سننے کے لیے تڑپ رہے تھے۔“

”اب بھی تڑپ رہا ہوں لیکن اس کے حالات کو سمجھ کر صبر کر رہا ہوں۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ اس کی یادداشت واپس آگئی ہے۔ اسے اپنے بچپن کی محبت یاد آگئی ہوگی۔“

وہ خلا میں نکلے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
”اسے بہت کچھ یاد آ رہا ہوگا۔ اسے بچپن سے جو اب تک گزرے ہوئے تمام پیار بھرے دن رات یاد آ رہے ہوں گے۔ اب وہ بڑے پیار سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“
مرینہ نے کہا۔ ”ابھی یاد نہیں کر رہی ہے۔ گہری نیند میں ہے۔ میری ایک بات مانو گے؟“

”ہاں بولو۔۔۔“

”کل فون پر اس سے ہماری باتیں نہ کرنا۔ یہ نہ کہنا کہ میں تمہاری زندگی میں آگئی ہوں۔“

اس نے سر جھکا کر سوچا پھر کہا۔ ”بات تو چھپانی چاہیے۔ لیکن کب تک چھپانی جاسکتی ہے؟ اور کیوں چھپانی جائے؟“
”صرف کچھ دنوں تک اس لیے کہ اس کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ یہاں کی بات معلوم ہوگی تو اسے زبردست دماغی جھٹکا پہنچے گا۔ پہلے اس کا علاج ہونے دو۔ اسے ابھی صدمہ نہ پہنچاؤ۔“

وہ قائل ہو کر بولا۔ ”تم درست کہتی ہو۔ میں مناسب موقع دیکھ کر اس سے تمہاری بات کروں گا۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”مرد ہماری بات مانے تو اس پر بڑا پیار آتا ہے۔ جسٹ اسے منٹ۔ ابھی آئی۔“

وہ بیڈ سے اتر کر چلی گئی۔ زیرو پاؤر کی روشنی میں وہاں سے جاتے وقت اس کا سراپا دکھائی دیا۔ اسے سر سے پاؤں تک حاصل کرنے کے بعد احساسات بدل گئے تھے۔ وہ کچھ سے کچھ ہو کر بڑی پرکشش لگ رہی تھی۔

جب وہ آئی تو مراد نے کہا۔ ”میرے پاس آؤ۔“
وہ قریب آ کر اس پر چمکی تو اس نے دونوں بازوؤں میں

اسے سمیٹ لیا۔ اسے والہانہ انداز میں پیار کرنے لگا۔ وہ بولی۔ ”کیا کر رہے ہو؟ تمہارے دونوں بازوؤں کی ہیں۔“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ ذرا تکلیف ہو رہی ہے مگر اچھا لگ رہا ہے۔ تم نے تو میری سوچ میرے ارادے میرا مزاج بدل کر رکھ دیا ہے۔“

وہ دل کی گہرائیوں سے قائل ہو رہا تھا۔ اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ مرینہ دل ہی دل میں اس پر قربان ہو رہی تھی۔

وہ بولی۔ ”ایک ذرا چھوڑو۔ ابھی آتی ہوں۔“

”کہاں جاؤ گی؟“

”میں رہوں گی۔ تمہیں دکھاؤں گی کہ میں کتنی سچی ہوں۔“

اس نے چھوڑ دیا۔ مرینہ نے الگ ہو کر اسے ایک چھوٹی سی چالی دکھائی۔ ذرا مسکرائی پھر اس کی پتھری کھول کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوشر آزاد ہو گیا۔ اب مجھے چیر پھاڑ کر میری بوٹی بوٹی کر سکتا ہے۔“

وہ پھر اس کے سر ہانے الماری کی طرف گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ وہ بولی۔ ”یہ بھرا ہوا ہے۔“

اس نے وہ پستول مراد کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پھر بیڈ پر آگئی۔ اس کے پاس لیٹ کر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اداؤں سے کہا۔ ”لو مارو یا چھوڑو۔ تمہاری مرضی۔ پستول دشمنی سے بھرا ہوا ہے اور میں دوستی سے بھر پور ہوں۔“

اس نے پستول کو ایک طرف پیسٹک کراسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ایک طویل عرصے تک جاری رہنے والی بدترین دشمنی کو مرینہ کی حکمت عملی نے دوستی میں بدل دیا تھا۔ اس رات وہ وہیں سکتا تھا۔ مرینہ اسے لمحہ بہ لمحہ متاثر کر رہی تھی اور اس کے اندر اپنے پیار کی سچائی کا سکہ جمارہی تھی۔ اس نے رات کے تین بجے کہا۔ ”میں دوستوں اور دشمنوں کی خبر رکھنا چاہیے۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میں نے ماسٹر سے اور جگ دیو سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ کیا تم نے ان سے بات کی ہے؟“

”ہاں۔ آج صبح جگ دیو کو کال کی تھی۔ دوسری طرف سے کسی اجنبی کی آواز سنائی دی۔ اس نے بڑے رعب دار لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہوتو؟ جگ دیو کو کیسے جانتی ہو؟“

میں نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔ وہ سم بدل دی ہے۔ مراد نے تشویش میں جلتا ہو کر پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔ دوسری طرف کون ہوگا؟“

”کوئی آرمی کا افسر ہوگا۔ پچھلی رات انہوں نے جگ دیو کو گرفتار کیا ہوگا۔ میں یقین سے کہتی ہوں وہ۔“

چارہ بارڈر آرمی کی حراست میں پہنچ گیا ہے۔“
وہ بولا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔ آرمی والے تو اس پر تھرڈ ڈگری کی انتہا کر دیں گے۔ کیا اسے کسی طرح رہائی دلائی جا سکے گی؟“

”آرمی کی قید سے کسی کو نکالنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ وہاں سے جگ دیو کی لاش ہی باہر آئے گی۔“

”کیا تم نے ماسٹر سے بات کی تھی؟“

پناہ گاہ میں پہنچائے ورنہ ہم پکڑے جائیں گے۔“
وہ بولا۔ ”جگ دیواؤں زونمور... ویری سیڈ... آری
والوں نے اسے گولی مار دی ہے۔“
وہ بولی۔ ”اگواڈا ہمارا کیا ہوگا؟“
”فکر نہ کرو۔ میں جو ہوں۔ تم دونوں کو فوجیوں کے
ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔ ایک ذرا انتظار کرو۔ تھوڑی دیر بعد
کال کروں گا۔ مراد کہاں ہے؟ اس سے بات تو کرنا۔“
”میں نے اس کی مرہم پٹی کی ہے اسے نیند کا انکشن
دیا ہے۔ وہ گہری سو رہا ہے۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ مرینہ نے کہا۔ ”وہ تم سے
بات کرنا چاہتا تھا۔ نشے میں ہے۔ ابھی اس سے اپنا کام نکالنا
ہے۔ ہمیں صبح سے پہلے کی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچ جانا چاہیے۔“
تھوڑی دیر بعد اس نے کال کی۔ مرینہ سے
کہا۔ ”جگ دیواؤں یا میں ہمارا جو بیڑا ماسٹر تھا۔ وہ بڑی مہارت
سے اور کامیابی سے اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔ اب اس کی جگہ
ہم نے دوسرا جو بیڑا ماسٹر مقرر کیا ہے۔ اس کا نام چیت راؤ
ہے۔ میں اسے تمہارا نمبر دے رہا ہوں۔ وہ تمہیں کال کرے
گا۔ تم اس سے بات کرو۔ اسے اپنا موجودہ پتا بتاؤ۔ یہ تمہیں
مراد کے ساتھ ایک خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دے گا۔“

دس پندرہ منٹ کے بعد ہی جو بیڑا ماسٹر چیت راؤ کی
آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مرینہ۔ ملاقات ہوگی تو ہم باتیں کریں
گے۔ ابھی اپنا پتا بتاؤ۔“

مرینہ نے اسے اپنا پتا بتایا وہ بولا۔ ”تم اپنا ضروری
سامان بیک کرو۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ آ رہا ہوں۔“
رابطہ ختم ہو گیا۔ مرینہ نے فون بند کر کے
کہا۔ ”تھیکس گاڈ! ہماری سلامتی کا سب سے اہم مسئلہ حل
ہو رہا ہے۔“

وہ مراد کے پاس آکر بڑے پیار سے اس پر جھک گئی۔

☆☆☆

ماروی اسپتال سے گھر آگئی۔ محبوب بھی اس کے ساتھ
جیسے اسپتال کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے بھی گھر آکر شیو کیا،
عسل کرنے کے بعد فریض ہوا اور پھر ماروی کی کونھی میں
آگیا۔ وہاں سمیرا اور معروف بھی پہنچے ہوئے تھے۔ سمیرا نے
ماروی کو بیٹے مسکراتے دیکھا تو جمل بھن کر رہ گئی۔ بے شک
صدمہ پہنچنے کی بات تھی۔ جسے مرانا چاہیے تھا اسے ایک نئی
زندگی مل گئی تھی۔ وہ ماروی کو دیکھ کر اوپر کی دل سے مسکرا کر
بولی۔ ”تم حادثہ کے بعد پہلے سے زیادہ گھبرائی ہو۔ جیسے جادو
ہو گیا ہے۔ کسی پہلو سے بیوقوف لگ رہی ہو۔“

”نہیں۔ اپنا فون بند رکھا ہے۔ اس نے مجھے کال کی
ہوگی۔ میں نے سوچا جلدی کیا ہے پہلے تم سے دوستی کروں
گی پھر اس سے بات کروں گی۔ جیسا کہ تم جانتے ہو۔ ماسٹر
اور جگ دیواؤں میں کیم کھیل رہے تھے۔ تمہیں رازداری سے
اپنا کارندہ بنا کر مجھے دھوکا دیتے رہے تھے اور تمہیں وینکٹ
راؤ کا آدمی کہتے رہے تھے۔“

”میں نے نشے میں قسم کھائی تھی کہ میں بھی انہیں دھوکا دیتی
رہوں گی۔ اب ہماری دوستی ہو گئی ہے۔ تم بولو۔ میں ماسٹر کی
وفادار ہوں یا اس کی طرح میں بھی اسے دھوکا دیتی ہوں؟“
مراد نے کہا۔ ”انہوں نے میری خاطر تمہیں دھوکا دیا
تھا۔ یہ بات بھول جاؤ۔ غصہ تھوک دو۔ ہم انڈیا میں
ہیں۔ ہمیں وسیع ذرائع اور اختیارات رکھنے والے ماسٹر کی
سرپرستی میں رہنا ہوگا۔ ورنہ مارے جائیں گے۔“

”ہاں۔ میرے ذہن میں بھی یہی بات ہے۔ ہم
ابھی سرحدی علاقے سے بہت دور ہیں۔ یہ غریبوں کی ایک
چھوٹی سی بستی ہے۔ پولیس اور آری والے ادھر بھی بھولے
بھٹکے آ جاتے ہیں۔“

”اگر آگئے تو ہم پر شہ کر دیں گے۔ اس لیے کہ مکان
کے سامنے ہماری کار کھڑی ہے ہم اپنے پہنناوے اور رہن
سکن سے یہاں والوں سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ ہم
ماسٹر کی سرپرستی میں رہ کر ہی کہیں سلامتی سے روپوش رہ سکیں
گے۔ ہمیں اس سے بنا کر رکھنی ہوگی۔“

”تو پھر اس سے بات کرو۔ کیا وہ جاگ رہا ہوگا؟“
مرینہ نے کھڑی دیکھ کر کہا۔ ”وہاں ابھی رات کے نو
بجے ہوں گے۔ وہ سوئے سے پہلے پی رہا ہوگا۔“

اس نے اپنے فون میں ٹیم ڈال کر ماسٹر کو کال
کی۔ رابطہ ہونے پر معلوم ہوا کہ واقعی وہ پی رہا تھا۔ اس کی
نشانی آواز سنائی دی۔ ”ہائے مرینہ! تم کہاں مر گئی ہو؟ میں
بہت پریشان ہوں۔ تمہیں کئی بار کال کر چکا ہوں۔“

”سوری ماسٹر! حالات ایسے ہیں کہ میں فون کو آن
نہیں رکھ سکتی تھی۔ ابھی میں مراد کے ساتھ ہوں۔ ہم
دونوں پولیس والوں سے چھپتے پھر رہے ہیں۔“

اس کا نشہ جیسے ہرن ہو گیا۔ اس نے چونک کر
پوچھا۔ ”کیا مراد زندہ ہے؟ تم بہت بڑی خوشخبری سنارہی
ہو۔ باقی داوے وہ میری کال امینڈ کیوں نہیں کر رہا تھا؟“
”میں نے کہا نا۔ ہم نے اپنا فون بند رکھا ہے۔ مراد
بہت زخمی ہے۔ میں کسی طرح اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر
رہی ہوں۔ آپ جگ دیو سے بولیں کہ وہ ہمیں فوراً کسی خفیہ

ہوئے کہا۔ ”ایکسی کمی۔ میں واٹ روم چاہتا ہوں۔“
ماروی نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آؤ
میرے واٹ روم میں چلو۔“

سمیرا اٹھ کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی بیڈ روم میں
آگئی۔ ماروی نے الماری کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”ذرا
ایک منٹ۔ میں نیا صابن اور تویا نکالتی ہوں۔“

وہ اُدھر جانا چاہتی تھی۔ سمیرا نے اس کا ہاتھ پکڑ
لیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو، پھر سمیرا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا
پھر تجسس سے کہا۔ ”سمیرا...! کیا بات ہے تم کا پ رہی ہو۔“
وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ کر
رونے لگی۔ تب ماروی کی سمجھ میں آیا۔ وہ جانتی تھی کہ سمیرا
نے محبوب سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس نے
انجان بن کر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر پوچھا۔ ”کیا
ہو؟ کیوں رو رہی ہو؟“

وہ بولنا چاہتی تھی لیکن روتے روتے بھکیاں آرہیں
تھیں۔ وہ بول نہیں پا رہی تھی۔ ماروی اسے تھکنے لگی پھر وہ
بڑی مشکل سے بولی۔ ”مجھے اسے اپنی توہین برداشت نہیں ہو
رہی ہے۔“

ماروی نے پوچھا۔ ”کیسی توہین...؟“
وہ سسکی ہوئی ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ ”محبوب صاحب نے
آج۔ آج سب کے سامنے...“

وہ پھر سسکنے لگی۔ ماروی نے اسے تھکتے ہوئے
کہا۔ ”ہاں بولو۔ محبوب صاحب سے کیا شکایت ہے؟“

وہ بولی۔ ”انہوں نے آج سب کے سامنے میرے
منہ پر کہا ہے کہ ان کی زندگی میں اور کوئی نہیں آئے گی۔ جبکہ
وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں انہیں جان سے زیادہ چاہتی
ہوں۔ ان کی شریک حیات بننے کے خواب دیکھتی ہوں۔ تم
ہی بولو کیا انہیں میرے منہ پر دل توڑنے والی بات کہنا
چاہیے؟ وہ بھی سب کے سامنے؟“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ واقعی محبوب صاحب سے غلطی ہوئی
ہے۔ چلو ادھر بیٹھو۔ آسو پوچھو۔“

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ماروی نے کہا۔ ”یہاں
چاچی آئیں گی۔ محبوب صاحب آکر دیکھیں گے تو کیا سوچیں
گے۔ اتنے حوصلے والی۔ لڑکی رو رہی ہے۔“

وہ بولی۔ ”میں بڑی سے بڑی بات برداشت کر سکتی
ہوں۔ لیکن محبوب صاحب نے جیسی ناقدری کی ہے وہ
برداشت نہیں ہو رہی ہے۔“

”تم مخالف حالات سے گزرنا جانتی ہو۔ کاروباری

معروف نے کہا۔ ”ماروی کی یادداشت واپس آگئی
ہے۔ یہ اتنی بڑی خوشی ہے کہ اب بیکار نظر نہیں آئے گی۔ میری
دعا ہے کہ یہ اسی طرح جتنی بولتی صحت مندر ہے۔“

پھر وہ محبوب کو دیکھ کر بولا۔ ”محبوب اور مراد ایک
طویل عرصے تک امید و بیم سے گزر رہے تھے۔ دونوں تم
سے آس لگائے ہوئے تھے اور کبھی دونوں ہی مایوس
ہو جاتے تھے۔ اب نہیں ہوں گے۔ تم پر خدا کی رحمت
ہو۔ تم نے ایسا فیصلہ سنایا ہے کہ اب یہ دونوں خوش فہمی میں
جتنا نہیں رہیں گے اور نہ ہی مایوس ہوں گے کہ تم کسی ایک کو
چھوڑ کر دوسرے کی منکوحہ بن جاؤ گی۔“

ماروی نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ دونوں ایک
دوسرے کے رقیب بن کر رہیں۔ اب ان کے ذہنوں سے
یہ بات نکل گئی ہے کہ میں بھی کسی سے متاثر ہو کر اس کی
شریک حیات بن جاؤں گی۔ نہ میں بھی شادی کروں
گی۔ اور نہ ہی یہ دونوں بھی شادی کریں گے۔ جب تک مجھ
سے کسی غرض اور طلب کے بغیر محبت کر سکتے ہیں کرتے
رہیں گے۔ جب میزبان ہو جائیں گے۔ شادی خانہ آبادی
ان کے لیے ضروری ہو جائے گی تو یہ کسی سے شادی کر لیں
گے۔ اس کے بعد عشق کا دعویٰ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ پھر جو
چاہنے والا رہ جائے گا میں اس کی منکوحہ بن جاؤں گی۔“

معروف نے کہا۔ ”شاباش ماروی! تمہارے اس
فیصلے سے محبوب بہت خوش ہے۔ دراصل اس کی دیوانگی اس
بے یقینی کی وجہ سے تھی کہ تم اسے محبت کا جواب محبت سے
نہیں دو گی۔ مراد کو ترجیح دو گی تو یہ ٹوٹ کر رہ جائے گا۔ اب
اسے یقین ہو گیا ہے کہ یہ جب تک شادی نہیں کرے
گا“ اسے تم ایک محبوبہ کا پیار دیتی رہو گی۔“

محبوب نے بڑے پیار سے ماروی کو دیکھتے ہوئے
کہا۔ ”مجھے اور کیا چاہیے؟ صرف اور صرف ماروی کی محبت
اور توجہ۔ اب یہ مجھ مل رہی ہے۔ آپ سب دیکھیں گے کہ
میری زندگی میں اور کوئی نہیں آئے گی۔ میں اسے جتنی
دیتے دیتے دنیا سے چلا جاؤں گا۔“

سمیرا کو یہ بات نکواری دکھائی طرح لگی۔ محبوب نے
واضح کر دیا تھا کہ اس کی زندگی میں اور کوئی نہیں آئے گی اور
یہ بات اس کے منہ پر کھردی تھی۔

یہ ایسا صدمہ پہنچانے والی بات تھی کہ اس سے
برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی لیکن
یہ بات آداب محفل کے خلاف ہوئی۔ وہ تعلیم یافتہ بھی۔ محفل
سے اٹھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلتے

جہانگیر بکس

91

نسیم جہازی کے شاہکار تاریخی ناول

- 450/- انسان اور یوتا**
پہلی سامراج کے علم بردار کی زندگی کی داستان
جس نے اچھوتوں کو راول میں اٹھانے پر مجبور کیا
- 300/- پاکستان سے دیوار تک**
تاریخی پس منظر میں کشمیر کا ایک ایک پس منظر
- 450/- آخری چٹان**
سیر خوارزم میں اہل عرب خوارزمی کی داستان
جس میں ایک چٹان کا نام ہے
- 225/- سوسال بعد**
گاندھی کی قیادت میں اچھوتوں اور مسلمانوں کے
خلاف ساراجی معاہدہ کی تاریخ
- 325/- سفید چریز**
برطانوی کی قیادت میں اچھوتوں اور مسلمانوں کے
خلاف ساراجی معاہدہ کی تاریخ
- 475/- شاہین**
اٹلس میں مسلمانوں کے شہید ہونے کی کہانی
- 475/- معتمد علی**
افغانیوں کی اسلامی تاریخ، میر جعفر کی زندگی، بنگال کی
آزادی، حریت کے لیے جدوجہد، مسلمانوں کی داستان
- 550/- خاک اور خون**
سکھ، برہمن، مسلمان، قیامت خیز مناظر،
تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان
- 450/- کلیسا اور آگ**
فروری 1947ء کی تاریخی مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- 599/- قافۂ تجار**
راوی کے سفر، مسلمانوں کی ایک بے مثال داستان
- 425/- محمد بن قاسم**
عالم اسلام کے 17 سالہ بیرونی تاریخ، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- 300/- پورس کے ہاتھی**
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں مسلمانوں اور مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- 550/- اور تلواریں گئی**
شیر سوار (نور سلطان شہید) کی داستان، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- 500/- گمشدہ قافلے**
انگریز کی اسلامی تاریخ، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- 300/- داستان مجاہد**
مجاہدین کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- 450/- پردیس کی درخت**
مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- 500/- یوسف بن شافین**
مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- 750/- آخری معرکہ**
جس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت خرابی کی
کہانی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- اندھیری رات کے مسافر**
مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- ثقافت کی تلاش**
مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی
- قیصر و کسریٰ**
مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں
کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی، مسلمانوں کی زندگی

سبق آموز کتب سلسلہ

دورنگی طباعت اور تصویریری خاکوں سے مزین



- 165/- اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ**
- 165/- اقوال آئمہ کرام**
- 195/- حکایات گستان سعدی**
- 140/- اقوال شیخ سعدی**
- 180/- حکایات رومی**
- 170/- دلچسپ و عجیب حقائق**
- 199/- حکایات بوستان سعدی**

- 150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں**
- 180/- ایمان افروز و سبق آموز
سچے واقعات**
- 165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات**



اردولفت
(جامع ستویں)
عالمی طرز پر ترقی یافتہ نگارش کے ساتھ اردو و فارسی کا پہلا لغت

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

دنیا میں مخالفین سے کیسے نمٹ لیتی ہو؟ اسی طرح محبوب صاحب سے... بھی نمٹو۔“

وہ بولی۔ ”کاروباری دنیا میں انسان، انسان کے دماغ سے کھیلتا ہے۔ مجھے کھیلنا اور مات دینا آتا ہے۔ لیکن پیار کی دنیا میں دل سے دل کا معاملہ ہوتا ہے۔ کسی کا دماغ الٹا آسان ہے لیکن عاشق کا دل پھیرنا ممکن نہیں ہے۔“

پھر وہ کرسی سے اٹھ کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”معروف صاحب جیسے جہاں دیدہ بزرگ تمہارے فیصلے کی تعریف کر رہے ہیں۔ تمہیں دعا میں دے رہے ہیں۔ کیونکہ محبوب صاحب اب بڑی دل جمعی سے بزنس کی طرف توجہ دیں گے۔“

اس نے واش روم کا دروازہ کھلا رکھا۔ واش بینس پر جھک کر منہ دھوتے ہوئے بولی۔ ”یہ اچھی بات ہے کہ دو عاشقوں کے درمیان رقابت نہیں رہے گی۔ دونوں رہیں گے۔“

لیکن تمہارے اس بہترین فیصلے نے مجھے ڈبو دیا ہے۔ مجھے اچھی طرح سے محبوب صاحب بھی نہ سمجھی تم سے ماپوس ہو کر مجھے لائف پارٹنر بنالیں گے۔ اب یہ امید کم توڑ چکی ہے۔ اب تو میری طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔“

”ایسا نہ کہو وہ تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔ تمہاری ذہانت کی تعریفیں کرتے ہیں۔“

”میں ان سے پیار کرتی ہوں۔ ان سے اپنی ذہانت کی تعریفیں سن نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں وہ میرے دماغ میں نہیں دل میں جھانکتے رہیں اور پیار سے انعام دیتے رہیں۔“

وہ تو لایا سے منہ پونچھنے کے بعد ماروی کے قریب آ کر بولی۔ ”تم چاہو تو مجھے ڈوبنے سے بچا سکتی ہو۔“

وہ اس سے تو لیا لے کر اسے ایک طرف پھیل کر رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں کیسے بچا سکتی ہوں؟“

”اپنے فیصلے میں ایک ذرا تبدیلی کرو۔ ان سے کہو وہ مجھ سے شادی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد بھی تم ان کی محبت کا جواب محبت سے دیتی رہو گی۔“

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”پھر تو مراد کو بھی یہ رعایت دینی ہو گی کہ وہ بھی کسی سے شادی کرے گا تو اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتی رہوں گی۔“

”ہاں۔ تمہارا کیا جائے گا۔ دونوں کو شادی کرنے دو۔ دونوں سے محبت کرتی رہو۔“

ماروی نے کہا۔ ”واہ کیا خوب مشورہ دے رہی ہو۔ وہ دونوں شادی شدہ زندگی کے مزے لوٹتے رہیں

اور میں بن بیانی دونوں کا محبت سے دل بہلاتی رہوں۔“

”تم کنواری نہ رہو۔ تم بھی شادی کر لو۔“

”کیا میرا شوہران دو عاشقوں سے عشق کرتے رہنے کی اجازت دے گا؟“

وہ فوراً ہی کوئی جواب نہ دے سکی پھر بولی۔ ”تم تھانخواہ بحث کر رہی ہو۔ دونوں سے چپک کر رہنا چاہتی ہو۔ صاف کہو تا کہ کسی کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ تمہیں برا تو لگے گا۔ لیکن خود ہی کہو کیا دو مردوں سے پیار کرتے رہنا بے حیائی نہیں ہے؟“

”کیا تم نے اب تک کوئی بے حیائی دیکھی ہے؟ نہ میں بے حیاء ہوں نہ آئندہ ان کے ساتھ بے حیائی سے رہوں گی۔“

”کون یقین کرے گا کہ تم دونوں کے ساتھ ہنسی کھیلتی گھومتی پھرتی ہو اور پارسا بھی ہو؟“

”دنیا والے تو باتیں بناتے ہیں۔ کچھ اچھا لتے ہیں۔ میں پچھلے پندرہ مہینوں سے محبوب کی کوششیں کر رہی ہوں اور عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی ہوں۔ دنیا والے باتیں بنا رہے ہیں کہ محبوب نے مجھے داشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے۔ میں بولنے والوں کی زبان نہیں پکڑ سکتی اور بھی تمہاری بھی زبان نہیں پکڑوں گی۔ لیکن تمہاری بھی مجال نہیں ہے کہ محبوب اور مراد کے سامنے مجھے ان کی داشتہ کہہ سکو۔ جاؤ اپنی سوسائٹی میں مجھ پر کچھڑا اچھالتی رہو اور خوش ہوتی رہو۔“

سمیرا ڈرا چپ رہی۔ وہ ماروی کو باتیں سنا کر محبوب کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”پلیز۔ یہ نہ جھجھکو میں تمہیں ان کی داشتہ سمجھتی ہوں۔ باقی گاؤ تم تو نیک سیرت اور شرم والی لڑکی ہو۔ میں دنیا والوں کی بات کہہ رہی تھی کہ وہ تمہیں پہلے ایک کی داشتہ کہتے تھے اب دو عاشقوں کی۔“

ماروی نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کہنے سے روک دیا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ میں بے حیاء ہوں یا حیاء والی ہوں۔ نیک نامی کی زندگی گزار رہی ہوں یا بدنامی کی؟ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اپنا مسئلہ کرو۔ میں نے محبوب سے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ تم سے دل نہ لگائے اور تم سے شادی نہ کرے۔ تم بلاشبہ بہت حسین اور بہت ہی ذہین ہو۔ عورت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ زاہد و عابد کی توبہ توڑ دیتی ہے۔ شہ زور کے ارادوں کو کمزور بنا دیتی ہے۔ جاؤ اپنی ذہانت کو آزمائو۔ یہاں باتیں نہ بناؤ۔ وہاں جاؤ اور محبوب

”تم نے بھی بہت کیا ہے۔ تم نے میری خاطر وڈیرے کی بیٹی کو اور لاکھوں روپے کو ٹھکرا دیا۔ تم میری خاطر جھوٹے الزام میں جیل گئے۔ وڈیرے سے دشمنی مول لے کر پھانسی کے پھندے تک پہنچنے والے تھے۔ میرے پاس آنے کے لیے خیرے ساتھ رہنے کے لیے دشمنوں سے ایک طویل جنگ لڑتے آ رہے ہو۔ تمہارے ساتھ بہت بُرا ہو رہا ہے۔ میری خاطر گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہو گئے ہو۔“

”مراد! ایسا نہیں ہے کہ میں ایک طرف جھک رہی ہوں اور دوسرے کو نظر انداز کر رہی ہوں۔ تم دونوں میرے سامنے ترازو کے دو پلوں کی طرح برابر ہو۔ تم ایک ذرا سائیں کی تمام مہربانیوں اور نیکیوں کو یاد کرو۔ آخر وہ اتنی نیکیاں کیوں کرتے رہے؟ نہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ وہ بھی مجھے چاہتے ہیں۔ کیا انہیں ان کی نیکیوں کا صلہ نہیں ملنا چاہیے؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ کیا ان کی نیکیوں کے صلے میں وہ محبتیں دوگی جو صرف میرے لیے ہیں؟“

”تم میرے سوال کا جواب دو۔ لیکن دین کی اس دنیا میں وہ میری خاطر اپنا سب کچھ لٹاتے آئے ہیں۔ صرف میری محبت چاہتے ہیں۔ کیا مجھے صلہ نہیں دینا چاہیے؟“

”نہیں ہرگز نہیں...“ وہ غصے سے بولا۔ ”تم صرف میری ہو۔ میرے لیے پیدا ہوئی ہو۔ بے شک انہوں نے بے مثال نیکیاں کی ہیں۔ اس کے عوض ان کے گھر کی نوکرائی بن جاؤ۔ ان کے جوتے صاف کرو لیکن میری محبت کی کوئی دودھ“

”میں انہیں اس طرح محبتیں دوں گی کہ تمہاری محبت تمہاری ہی رہے گی۔ تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں دونوں سے برابر محبت کروں گی۔ پیار کا ترازو میرے ہاتھوں میں ہے۔“

”ناممکن ہے۔“

”ممکن ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ نہ تم سے نہ ان سے۔ کسی کی شریک حیات بن کر نہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ نہ ان کے ساتھ۔“

”ہم تینوں کسی لالچ اور ہوس کے بغیر محبت کرتے رہیں گے۔ ہمارے پیار میں سراسر یائیزگی ہوگی۔“

”کیا بکواس ہے؟ ایسا بھی نہیں ہوتا۔ ایک مرد اور ایک عورت کا پیار جسمانی حصول کے لیے ہی ہوتا ہے۔“

”ہاں۔ پیار اسی لیے ہوتا ہے لیکن عشق جسمانی حصول سے یا کسی طرح کی بھی طلب سے بالاتر ہوتا ہے۔“

”ایسا ہی تو سائیں سے بولو ایسا عشق کرتے

کی تو توڑ دو۔ اسے مجھ سے پھیر دو۔ ایسا نہ کر سکو تو کمزور عورت کی طرح روتی چینی رہو۔ لیکن میرے پاس سو کن بن کر بھی نہ آؤ۔“

اپنے ہی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ چاچی کی آواز سنائی دی۔ ”ماروی! جلدی آؤ۔ مراد کا فون آیا تھا پھر بند ہو گیا۔ ابھی پھر آ سکتا ہے۔“

وہ فوراً ہی کمرے سے باہر آگئی۔ چاچی سے فون لے کر دیکھا۔ اسکرین پر س کال لکھا ہوا تھا اور وہاں مراد کا فون نمبر تھا۔

وہ چاچی اور سمیرا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی۔ اسی وقت پھر رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ماروی جان بوجھ کر سمیرا کو دکھانے کے لیے محبوب کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو مراد...!“

مراد اس وقت ایک خفیہ گناہ میں تھا۔ مرینہ سو رہی تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں آکر بول رہا تھا۔ ”ہیلو ماروی! خدا کا شکر ہے تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ کیا اسپتال سے آگئی ہو؟“

”ہاں۔ گھر میں ہوں۔ چاچی نے بتایا ہوگا کہ میری یادداشت واپس آگئی ہے۔ مجھے پچھلی تمام باتیں یاد آگئی ہیں۔“

”ہاں۔ جب سے میں نے سنا ہے، تب سے سوچ رہا ہوں کہ اب ہمارے بچپن کی محبت کی ایک ایک بات تمہیں یاد آئے گی۔ میرے لیے تمہاری محبت اور مستحکم ہوگی۔ بیچارے سائیں محبوب اور مایوس ہو گئے ہوں گے۔“

ماروی نے کن اکھیں سے پاس بیٹھے ہوئے محبوب کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے سائیں کی تمام نیکیاں یاد آ رہی ہیں۔ تم جتنے عرصے تک جیل میں رہے اتنے عرصے تک سائیں نے مجھے عزت آبرو سے رکھا تھا۔ یہ نہ ہوتے تو دشمن مجھے دو کوڑی کا کر دیتے۔ تم ہی بولو آج میں کس کی مہربانی سے عزت آبرو سے ہوں؟“

وہ بولا۔ ”ہاں۔ یہ درست ہے لیکن...“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”تم جیل میں تھے۔ دشمن مجھے اغوا کر لیتا چاہتے تھے۔ سائیں گولیوں کی بوچھاڑ میں مجھے بچا کر لے گئے اور میری خاطر گولی بھی کھائی۔“

”تم یہ باتیں کیوں کر رہی ہو؟ کیا یہ جتنا چاہتی ہو کہ وہ تمہاری حفاظت اور سلامتی کے لیے بہت کچھ کرتے آئے ہیں اور میں نے کچھ نہیں کیا ہے؟“

رہیں۔ میں تو نہیں کروں گا۔ دوسری کی طرف مائل نہیں ہوگا۔

مگر وہ تو ہو چکا تھا۔ صرف مائل نہیں ہوا تھا۔ وہ تو نکاح کے بغیر ازدواجی رشتہ بھی قائم کر چکا تھا۔ اس نے سوچا تھا، ماروی کا دل نہیں دکھائے گا۔ مرینہ سے تعلقات کی باتیں اس سے چھپاتا رہے گا۔ لیکن اچانک ہی عید کھل گیا تھا۔ وہ رینگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ ادھر سے مرینہ نے ماروی کو ادھر سے ماروی نے مرینہ کو فوراً ہی پہچان لیا تھا۔ وہ ہنسی مچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ دراصل بات یہ ہے ماروی کہ میں تمہیں بتانے والا تھا کہ۔۔۔“

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”کہ تم انڈیا جا کر اسی کے ساتھ رہتے ہو۔ واردات کرتے ہو۔ لاکھوں روپے کما کر میرے اکاؤنٹ میں بھیجتے ہو۔ ادھر اُسے اور ادھر مجھے خوش رکھتے ہو۔“

”یہ بات نہیں ہے۔۔۔“

مرینہ نے کہا۔ ”تم ڈرتے کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں کہ جن ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم اپنی جان بچانے کے لیے ایک مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔“ وہ ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ”لاؤ فون مجھے دو۔ میں اسے سمجھاتی ہوں۔ آج نہیں تو کل ہم تینوں کو پیار محبت سے رہنا ہوگا۔“

ماروی نے کہا۔ ”فون مرینہ کو دو۔ مجھے معلوم تو ہو کہ وہ دشمن سے دوست کیسے بن گئی ہے۔ اس نے ایسا کیا پیار جگایا ہے کہ ہم تینوں کو پیار محبت سے رہنے کی بات کہہ رہی ہے۔ یہاں تو ایک لمبے عرصے سے ہم تین ہیں۔ کیا وہاں بھی تم نے پیار کا تہنکد بنالیا ہے؟ وہ اپنے اور تمہارے ساتھ مجھے کیوں شامل کر رہی ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے مراد؟“ وہ ہنسنے لگا بولا۔ ”کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ تم دونوں کو اس کر رہی ہو۔ دو عورتیں ہمیشہ مصیبت بن جاتی ہیں۔ ادھر سے تم بولتی جا رہی ہو۔ ادھر سے یہ بولتی جا رہی ہے۔“

”اس طرح خواجہ غنہ نہ دکھاؤ۔ فون مرینہ کو دو۔ ابھی اس کے منہ سے سچ نکل رہا ہے۔“

”کوئی سچ نہیں ہے۔ جب تم میری مجبوریاں سنو گی تو دل تھام لو گی۔ تم نہیں جانتیں میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ میں اس وقت زخموں سے چور ہوں۔ ایسی بے یاری و مدد گاری کے وقت مرینہ ایک خفیہ پناہ گاہ میں دیر علاج کر رہی ہے۔“

”ابھی مرینہ پیار محبت سے رہنے کی بات کر رہی تھی۔ کیا تمہارا علاج کرتے کرتے پیار ہو گیا ہے؟“

”وہ تو مان گئے ہیں۔ تمہیں بھی راضی ہونا ہوگا۔“

”وہ تو ضرور مانیں گے۔ اس طرح انہوں نے تمہاری محبت اور توجہ جیت لی ہے اور مجھے تمہارے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے سے محروم کر دیا ہے۔ ماروی! عقل سے سوچو۔ وہ کتنے چال باز ہیں۔ پہلے دن سے ہمیں دولت کی مار مار رہے ہیں۔“

”وہ عام دشمن رقیبوں کی طرح مجھے رقیب نہیں کہتے تھے۔ تمہیں جانتے تھے کہ کتنے اسن پسند اور شریف انسان ہیں۔ تمہاری عزت آبرو کی حفاظت اس لیے کرتے رہے کہ ایک دن تمہیں جیت لینے والے تھے۔ وہ تمہیں اپنی چیز سمجھ کر تم پر اپنی دولت لٹاتے آ رہے ہیں۔ وہ کتنی ذہانت سے سیاست سے اور مکاری سے تمہارے دل و دماغ پر قبضہ جماتے ہیں۔ یہ تمہاری کچھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”تمہیں غصہ آ رہا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ تمہارا حق انہیں دے رہی ہوں۔ جبکہ میری محبت دونوں کے لیے برابر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شادی ازدواجی زندگی لازمی ہے تو تم دونوں میں سے جس کے لیے بہت لازمی ہو جائے گی“ وہ کسی سے شادی کر لے گا اور جو نہیں کرے گا وہ میرا سچا عاشق ہوگا۔

”تمہیں صرف اتنی قربانی دینی ہے کہ میرے عشق میں کسی اور کو اہمیت نہیں دو گے۔ میں بن بیانی رہوں گی تم بھی رہو گے۔“

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ساری عمر صرف تمہارا رہوں گا اور کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔“

اسی وقت مرینہ نے کمرے میں آ کر کہا۔ ”مراد۔۔۔! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ فون پر چیخ چیخ کر کیوں بول رہے ہو؟“

ماروی اس آواز کو سن کر چونک گئی۔ مرینہ بول رہی تھی۔ ”کیا اس طرح جنونی ہو کر بولتے ہیں؟ میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ہوں۔ یہاں آ کر سن رہی ہوں۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم ضرور ماروی سے بات کر رہے ہو۔“

دوسری طرف سے ماروی نے پوچھا۔ ”کیا یہ مرینہ بول رہی ہے؟ میں اس دشمن عورت کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں۔ یا خدا۔۔۔ تم اس دشمن عورت کے ساتھ رہتے ہو؟“

وہ الجھ کر رہ گیا۔ ماروی نے ابھی کہا تھا کہ وہ اسے ترجیح دے گی جو اس کی خاطر ہوس کا طالب نہیں ہوگا۔ کسی

مراد مرینہ کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہے۔
محبوب خوشی کے مارے پم بول نہیں بارہا تھا۔ چاچی
متنی آکر ماروی کا سر سہلار ہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”کیوں رو
رہی ہو۔ جیسی گمراہی کی زندگی وہ گزار رہا ہے۔ وہاں ایسے ہی
گناہ ہوتے ہیں۔ کوئی پارسانہیں رہتا۔ مراد کے ساتھ بھی
یہی ہونا تھا ہو گیا۔ خدا سائیں کو سلامت رکھے۔ یہ تمہاری
آنکھ میں آنسو نہیں آنے دیں گے۔“

محبوب نے کہا۔ ”چاچی! اسے رونے دیں۔ اس
کے اندر۔ دھواں بھرا ہے۔ یہ جسے بچپن سے چاہتی آ رہی
تھی، اس سے یہ توقع نہیں کر سکتی تھی کہ وہ ایسا صدمہ
پہنچائے گا۔ آپ اسے کھل کر رونے دیں۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”آپ درست کہتے ہیں۔ یہ
صدمہ برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ سب کچھ معلوم کر کے بھی
یقین نہیں آ رہا ہے کہ مراد میرے لیے مر چکا ہے۔ پتا نہیں
میں کب تک اس کی میت پر آنسو بہانی رہوں گی۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر اپنا فون چاچی کے پاس پیچیک کر
تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے جانے لگی۔ بچپن سے
جوانی تک محبت کے دم دلا سے دینے والا اچانک ہی کسی
دوسرے کا ہو گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ یہ تو طے تھا
کہ اس نے اپنی اہمیت کھودی ہے۔ ابھی مراد کے بچھڑنے کا
غم بھاری تھا۔ وہ ابھی کسی سے بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اس
لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہاں رو رو کر دل کا بوجھ
ہلکا کر رہی تھی۔

ادھر مراد سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مرینہ نے کہا۔ ”ماروی
کو شک پہنچا ہوگا۔ ابھی وہ صدمہ اٹھار ہی ہوگی۔ اگر وہ رو
رہی ہوگی تو اسے رونے دو۔ زندگی میں پیش آنے والا کوئی
بھی صدمہ ہمیشہ نہیں لاتا۔ تم ذرا صبر کرو۔“

”بہتر یہی ہے مراد۔۔۔ کہ ماروی کو جب صبر کرنا اور
سمجھنا کرنا آ جائے۔ تب اس سے بات کرو۔“

”وہ سمجھنا نہیں کرے گی۔ محبوب اسے کرنے نہیں
دے گا۔ اسے سنبری موقع ملا ہے۔ وہ میرے خلاف اسے
بھڑکا رہا ہوگا۔ لاؤ مرینہ! فون اٹھئے دو۔ میں محبوب کو اپنے
خلاف کوئی کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔“

مرینہ نے ری ڈائل کر کے فون اسے دیا۔ وہ اسے
کان سے لگا کر سننے لگا۔ دوسری طرف تیل جا رہی تھی پھر
چاچی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو مراد تم ہو؟“

”ہاں چاچی۔“ فون ماروی کو دیں۔“

”کیوں ماروی کو دوں؟ بڑا آیا اس سے بات کرنے

”ماروی! طے نہ دو۔ میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ یہاں
میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟“

مرینہ نے اچانک ہی فون چھین کر کہا۔ ”جب وہ مجھ
سے بات کرنا چاہتی ہے تو کرنے دو۔“

پھر اس نے فون پر کہا۔ ”سنو ماروی! تم یقین کرو یا نہ
کرو۔ مراد تمہارا ہے اور تمہارا ہی دیوانہ رہے گا۔ سچ یہ ہے
کہ میں اس پر مرئی ہوں۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پہلے کئی
بار اسے حاصل کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ آخر جس رات یہ
بارڈر پار کر کے تمہارے پاس جا رہا تھا۔ تب میں نے چھپ
کر اس پر فائرنگ کی۔ اسے گولیوں سے زخمی کیا۔ پھر اسے
ہتھکڑی پہنا کر ایک خفیہ جگہ لے آئی۔ اب تم دل کی آنکھوں
سے دیکھو کہ تمہارا یار کس طرح مجبور ہو گیا تھا۔ ایسے وقت
میں نے اسے حاصل کر لیا۔ تم محبت سے سوچو کہ یہ اب بھی
مجبور ہے۔“

”یہ میرے رحم و کرم پر ہے۔ میری خواہشات پوری
نہیں کرے گا تو میں اسے تمہارے پاس جانے نہیں دوں
گی۔ کیسی عجیب سی بات ہے کہ میں اس پر جبر کر رہی ہوں
لیکن اپنی محبت سے مجبور ہو کر۔ میرے پیار کی سچائی یہ ہے
کہ اب میری زندگی میں کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔ میں مراد
کے ہی نام سے زندگی گزار دوں گی۔ میں نے مراد کو زبان
دی ہے کہ زخم بھرتے ہی اسے تمہارے پاس جانے سے
نہیں روکوں گی۔“

”زخموں کا کیا ہے؟ یہ تو ایک آدھہ فتنے میں بھر جاتے
اور یہ تمہارے پاس چلا آتا لیکن ہمیں دوسری مصیبتوں نے
گھیر لیا ہے۔ مراد کے خلاف وارنٹ جاری ہوا ہے کہ وہ
پاکستانی جاسوس ہے۔ پولیس انٹیلیجنس اور آرمی والے اسے
ہر صوبے پر شہر اور ہر علاقے میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ہم
نہیں جانتے کہ ہم کتنے دنوں، کتنے ہفتوں اور کتنے مہینوں
تک یہاں چھپے رہیں گے۔“

ماروی نے کہا۔ ”تمہارا شکریہ۔ تم نے سچ کچھ دیا
کہ اسے دل و جان سے چاہتی ہو۔ اس کے بغیر نہیں رہو
گی۔ میں یہ کہہ دوں کہ مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ تم اس کے
پیچھے دوڑو اور وہ میرے پیچھے دوڑتا رہے۔ میں نے اپنے دو
چاہنے والوں کی دوڑ یہاں کسی طرح ختم کی تھی۔ وہاں تم نے
شروع کر دی ہے۔ بہتر ہے مراد کو وہاں اپنے کلیجے سے لگا کر
رکھو۔ اس سے بوجھ فون نہ کرے۔“

اس نے فون بند کر دیا پھر فوراً ہی آ فونل میں منہ چھپا
کر رونے لگی۔ وہاں بیٹھے ہوئے تمام افراد سمجھ گئے تھے کہ

والا کس منہ سے باتیں کرے گا اس سے؟ بے شرم کہیں کا۔ اُدھر منہ کالا کر رہا ہے۔ ادھر اس سے بولتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟“

”چاچی! میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے یہ میرا خدا جانتا ہے۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔“

”ابھی وہ تم سے تو کیا ہم سے بھی بات نہیں کر رہی ہے۔ اپنے کمرے میں اکیلی ہے۔ اپنی قسمت بد رو رہی ہے۔“

”خدا کے لیے چاچی اسے سمجھاؤ۔ مناد کہ ایک بار مجھ سے بات کرے۔ نہیں تو میں۔ نہیں تو میں۔ کیا کرے گا تو؟ وہ تو اپنے فون سے تیرا نمبر ہی مناد دے گی۔“

”میں دو ملکوں کی سرحدیں تو ذکر آسکتا ہوں۔ یہ نہیں سوچوں گا کہ پولیس اور آرمی والے مجھے گولی مار دیں گے۔ بہت مجبور ہو گیا ہوں۔ میرا ایک پاؤں اور دو بازو جمنی ہیں۔ میں لنگڑا کر چلتا ہوں۔ میں کیا کروں؟ یا خدا۔! ابھی ماروی کے پاس آنا چاہتا ہوں لیکن نہیں آسکوں گا۔“

”آکر کیا کرو گے۔ ماروی کے فیصلے کے مطابق تم اپنی اہمیت کھو چکے ہو۔“

”وہ بے وقوف ہے۔ میں اس کا احقانہ فیصلہ نہیں مانوں گا۔“

”اسے بے وقوف کہو یا عقل مند؟ وہ جسے قبول کرے گی اس کی منکو حہ بنے گی۔“

”محبوب اسے بہکائے گا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے جلد سے جلد اپنی شریک حیات بنانا چاہے گا۔ خدا کی قسم! میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔“

”تم وہاں بیٹھے بیٹھے تملاتے رہو۔ یہاں جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔“

”اچھی بات ہے میں بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کیسے میری ماروی کو مجھ سے چھین لے گا۔ میرا نام مراد ہے۔ دیکھ لیتا! میں یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی زندگی چھین لوں گا۔“

وہ فون بند کر کے اسے مٹھی میں بھینچنے لگا۔ جیسے وہ فون نہیں تھا۔ محبوب کی گردن تھی۔ خیالوں میں اسے دبوچ رہا تھا۔

مرینہ نے اسے تھکاتے ہوئے کہا۔ ”صبر کرو سمجھ داری سے کام لو۔ غصے میں پاگل ہوئے رہو گے تو یہ غصہ تمہیں ماروی کے پاس چھیننے نہیں دے گا۔“

”میں ایک ہی بات جانتا ہوں۔ مجھے کسی بھی طرح

ماروی کے پاس پہنچنا ہوگا۔ کوئی تدبیر کرو۔“

”یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔ پولیس اور آرمی کے لوگ تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔“ اس نے مرینہ کو غصے سے دیکھا اور پرانے روئیے کی شکایت کی۔

وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”گڑے غرے نہ اٹھاؤ مراد! میں نے اس وقت گولیاں چلائی تھیں۔ جب ہمارے درمیان دشمنی تھی۔ ابھی دیکھ رہے ہو کہ کس طرح جی جان سے تمہارا علاج کر رہی ہوں۔ تمہاری خدمت کر رہی ہوں۔“

”خدمت گزارہ نہ کرو۔ کسی طرح ماروی تک پہنچاؤ۔“

”کیوں چیخ رہے ہو اور ہرجمنلا رہے ہو۔ تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ غصہ تھوکر اور ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ کیا وہاں جتنے سے کوئی کام لے سکتے ہو؟ کیا وہ محبوب کو ماروی سے دور کر سکے گا؟“

مراد چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا۔ بھر انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں۔ وہ ایک اچھا شوٹر ہے۔ اندھیرے میں بھی اپنے ٹارگٹ کا صحیح نشانہ لیتا ہے لیکن محبوب علی چاند یو بہت اونچی ہستی ہے۔ وہ بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ انڈر مائنس کا ایک افسر مراد صدیقی جتنے کو پیش کر رکھو گے۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگے۔ پھر اس نے مرینہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”تم نے مجھے ناکارہ بنادیا ہے۔ اب تم میرا کام کرو گی۔ تم پاکستان جاؤ گی۔“

”میں...؟“ وہ چونک کر بولی۔ ”میں تمہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

ماسٹر کے دست راست چہیت راؤ نے انہیں بہت ہی محفوظ جگہ پہنچایا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”تم مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو یہاں میرا خیال رکھنے والے بہت ہیں۔ فوراً ماسٹر کو فون کرو۔ اس سے بولو کہ وہ کسی بھی طرح تمہیں آج رات سرحد پار کرائے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں تمہاری دیواگی اور بے چینی کو سمجھ رہی ہوں۔ تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی مگر جانا ہوگا۔ تمہیں ناراض نہیں کروں گی۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے ماروی کو محبوب کی جھولی میں جانے نہیں دوں گی۔“

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مراد نے کہا۔ ”ماروی ہوگی۔ فون مجھے دو۔“

”ہم تو تمہیں یاد کرتے ہی رہتے ہیں۔ تم نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ تمہیں کبھی بھلا یا نہیں جاسکے گا۔“
”اس کے باوجود مجھے اس ڈیپارٹمنٹ سے نکال دیا گیا۔“

”سوسری مرینہ! تمہارے خلاف فیصلہ کرنے والوں سے غلطی ہوگئی۔ انکوائری بورڈ کی رپورٹ نے بتایا ہے کہ برنارڈ کے سلسلے میں جو ناکامی ہوئی تھی اس کی ذمہ داری نہیں ہو۔ ان دنوں وقتی کسی دشمن نے تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ تم نیم مردہ ہو کر اسپتال میں پڑی تھیں۔“
وہ بولی۔ ”ٹینکس گاڈ! میرے سرے ناکردہ غلطی کا الزام ختم ہو گیا ہے۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“
”لندن آ جاؤ۔ اپنی ڈیوٹی جوائن کرو۔“

”تھینک یو سر! ابھی ایک پرابلم میں ہوں۔ میری ایک مشکل آسان ہوگئی، تب ہی لندن آسکوں گی۔“
”کیا تم کسی مشکل میں ہو؟“

”آپ کے لیے یہ کوئی بڑی مشکل نہیں ہے۔ میرے پاس بھی MET آفیسر کا آئی ڈی کارڈ اور اہم کاغذات ہوتے تو میں قانونی طور پر یہ ملک چھوڑ کر پاکستان پہنچ جاتی۔ میں انڈیا میں ہوں۔ آج رات تک میرا کراچی پہنچنا ضروری ہے۔“

”تمہارا نیا آئی ڈی کارڈ اور اہم کاغذات کل تک تیار ہوں گے پھر تم کسی روک ٹوک کے بغیر کسی بھی ملک میں جاسکوگی۔“

”پلیز آپ مجھے آج رات بارڈر پار کرادیں۔“
”انڈیا میں ہمارا ایک سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔ ہم چاہتے ہیں تم کل ہی یہاں چلی آؤ۔“
”کراچی میں دو چار روز رہوں گی۔ اپنا ایک اہم کام کروں گی۔ پھر آکر ڈیوٹی جوائن کرلوں گی۔“

وہ بول رہی تھی اور مسکرا کر مراد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خوش ہو رہا تھا۔ مرینہ آج کراچی جانے کی بات کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ کر ایک بازو کے حصار میں لے لیا۔

ادھر سے ڈائریکٹر جنرل انتھونی بول رہا تھا۔ ”تمہاری بہت ضرورت ہے۔ تمہیں یہاں آکر اپنی ڈیوٹی کا چارج لیتے ہی پھر برنارڈ کے کسی کو ٹیک آپ کرنا ہے؟“

اس نے پوچھا۔ ”برنارڈ...؟ تعجب ہے۔ کیا برنارڈ کا معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے؟“
”او نو۔ سنڈیکیٹ ریڈارٹ والے بہت زیادہ

”ماروی نہیں ماسٹر کو بولکا کر رہا ہے۔ عجیب اتفاق ہے ابھی ہم اسے کال کرنے والے تھے۔“
مرینہ نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو ماسٹر! ہم آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔“

وہ بولا۔ ”ہائے مرینہ! تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔ لندن کے MET ڈیپارٹمنٹ والے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔“

مرینہ نے پوچھا۔ ”وہ کیا کہہ رہے تھے؟“
”وہ تمہارے بارے میں بہت برے جوش تھے۔ تمہیں اپنے ڈیپارٹمنٹ سے نکالنے کے باوجود تمہاری تعریفیں کر رہے تھے۔ تمہارا فون نمبر مانگ رہے تھے۔ کیا میں انہیں دے دوں؟“

”ہاں دے دیں۔ دیکھتی ہوں وہ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے ہیں اور مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔“
”تو پھر احتیاط کرو۔ اچھی ان کی کال آئے گی۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد نے فون سے کہا۔ ”تم ماسٹر سے آج سرحد پار کرنے کی بات کرنے والی تھیں۔ تم میری بے چینی کو کیوں نہیں سمجھ رہی ہو؟ کیا تمہاری نظروں میں میرے مسائل کی میرے معاملات کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ لندن والوں کی توجہ ملتے ہی ان کی طرف دوڑی جا رہی ہو۔“

”پلیز مراد! غصہ نہ کرو۔ میری نظروں میں تم سے زیادہ کسی کی اہمیت ہو ہی نہیں سکتی۔ ڈراہبر کرو۔ آج ہر حال میں پاکستان جاؤں گی۔ تمہاری ماروی کو محبوب کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”جن لوگوں نے تمہیں شکرا دیا تھا تمہاری ملازمت چھین لی تھی۔ ان سے کیوں بات کر رہی ہو؟“
”میں انہیں کال نہیں کر رہی ہوں۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ سراغ رسانی کی دنیا میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی سب سے زیادہ اہمیت ہے اور MET ڈیپارٹمنٹ ان کا ایک ضمنی ادارہ ہے۔ مجھے ان کی بات سن لینی چاہیے۔“

فون کی رنگ ٹون کہنے لگی ضرور لندن سے کال آرہی ہے۔ مراد نے مرینہ کو دیکھا۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولی۔ ”ہیلو۔“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ہیلو مرینہ! میں MET کا ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی بول رہا ہوں۔“
وہ بولی۔ ”بہت عرصے بعد آپ کی آواز سن کر خوشی ہو رہی ہے۔ فرمائیے کیسے یاد کیا؟“

جھنجھلائے ہوئے ہیں، برناڑ کا قاتل نہ گرفتار ہوا ہے نہ ہی اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔“

مرینہ نے کن انکلیوں سے مراد کو دیکھا۔ اس وقت وہ برناڑ کے قاتل کی آغوش میں تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی، ذرا کسمپاتی ہوئی اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔

ڈائریکٹر جنرل کہہ رہا تھا۔ ”اس قاتل کا نام مراد علی منگی ہے۔ تمہیں وہاں کے اخبارات سے اور الیکٹرونک میڈیا سے معلوم ہوا ہوگا۔ پاکستان میں اسے محب وطن کہہ کر سر پر چڑھایا جا رہا ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں انکوائری کی ہے۔ یہ معلوم کر کے حیرانی ہو رہی ہے کہ وہ ایک دو کوڑی کا گدھا گاڑی والا تھا اور بددوق پکڑنا نہیں جانتا تھا۔“

مرینہ نے بڑے پیار سے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ”ہاں۔ میں اس کی ہسٹری جانتی ہوں۔“

پھر وہ اچانک ہی فریخ لینکوتیج میں بولی۔ ”مسٹر انتھونی! میں نہیں چاہتی کہ یہاں کوئی میری بات سنے اور سمجھے، ہم اس لینکوتیج میں باتیں کریں گے۔“

انتھونی نے کہا۔ ”نو پرا بلیم، کوئی اہم بات کہنے والی ہو کیا؟“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ وہ جو بددوق پکڑنا نہیں جانتا تھا، وہ ایک خطرناک شوٹرن گیا ہے۔“

”میں یہی تم سے کہنے والا تھا۔ اس سمجنت نے ریڈ الارٹ کے کئی شوٹرز کو مار ڈالا ہے۔ پتا نہیں وہ انڈیا کیسے پہنچ گیا ہے۔ فار پور انفارمیشن، وہاں تو اس نے اور ایک دھماکا کیا ہے۔ ریڈ الارٹ کو اور زیادہ شاک پہنچایا ہے۔ ان کے سربراہ میکی البرٹ کو مار ڈالا ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”میکی البرٹ کا ایک بھائی میکی براؤن انڈورلڈ کا ون آف دی ماسٹرز ہے۔ وہ مراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پاکستان اور انڈیا کے انڈورلڈ والوں سے ڈینگ کر چکا ہے۔ میں حیران ہوں! ایک گدھا گاڑی والے کو کتنے ہی ملکوں کے سیکرٹ ایجنٹس اور خطرناک شوٹرز تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہم سے بھی معاہدہ کیا ہے۔ تم آؤ اور فوراً ڈیوٹی جوآن کرو۔ مرینہ! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے اس کی لاش گرا دی تو ہمیں پچاس لاکھ ڈالرز ملیں گے۔“

مراد چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ زبان سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ اس نے

اشارے سے پوچھا۔ ”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“

وہ اردو زبان میں بولی۔ ”وہاں ڈائریکٹر جنرل کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ وہ لینکوتیج میں سمجنتا ہے اس لیے میں بھی یہ زبان بول رہی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”معلوم ہو تو کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“

”تمہارے مطلب کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہاں لندن میں ایک خطرناک قاتل کو ٹھکانے لگانے کی بات ہو رہی ہے۔“

ادھر سے انتھونی نے پوچھا۔ ”وہاں کون ہے؟ تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟“

وہ پھر فریخ لینکوتیج میں بولی۔ ”اپنے پیارے بول رہی تھی۔ آپ کو اور نہ جانے کتنی ہی خطرناک تنظیموں کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ بہت شاطر ہے، کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسی قاتل نے مجھے گولیوں سے چھلنی کر کے اسپتال پہنچایا تھا۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا واقعی؟ اس کا مطلب ہے، اس نے تم سے بھی دشمنی مول لی ہے۔ پھر تو وہ تم سے نہیں بچے گا۔“

”آپ جانتے ہیں۔ میرا سروس ریکارڈ بھی یہی کہتا ہے کہ کوئی مجرم، کوئی دشمن مجھ سے بچ کر زندہ نہیں رہتا۔ اگر کبھی مصلحت کسی کو زندہ چھوڑ دیتی ہوں تو پھر اسے کتنی کا کاچ نچاتی رہتی ہوں۔“

”ہاں مجھے یقین ہو گیا ہے، مراد نے تم سے دشمنی مول لے کر اپنی موت کو پیچھے لگایا ہے۔“

”پیچھے نہیں، میں اس کے آگے رہتی ہوں۔ اس کی دھڑکنوں سے کئی رہتی ہوں۔ اس منہ زور طوفان کو بانہوں کی زنجیریں پہنا کر اپنا قیدی بنا کر رکھتی ہوں۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں سمجھا نہیں بے۔“

وہ بولی۔ ”مسٹر انتھونی! میں نے اس پر کئی حملے کیے اور مات کھائی۔ اس نے مجھے نیم مردہ کر کے اسپتال پہنچا دیا۔ تب میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ میں نے قسم کھائی کہ زندہ رہے گی تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ لیکن یہ تا قابل شکست اور تا قابل تسخیر ہے۔ آپ یقین نہیں کریں گے، میں نے اسے قیدی بنا کر لوہے کی پھٹکری اور بیڑیاں پہنائی یہ نہیں بھی تو ڈر کر نکل گیا۔“

اس نے ہونٹوں کو تختی سے بھیجنے کر چور نظروں سے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ”یہ کتنا مجھے ہرہہ کر کے بیچ بازار میں چھوڑ گیا تھا۔ میرا نام مرینہ ہے۔ کوئی میری ایسی انسٹ

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ پچاس لاکھ ڈالر آج ہی ہمیں ملیں گے تم پاکستان جاؤ لیکن اسے ہماری کھڑی میں دے کر جاؤ۔“

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ”مسٹر انٹونی! پچاس لاکھ ڈالر بہت بڑی رقم ہے، میں اپنے ادارے کو ضرور فائدہ پہنچاؤں گی۔ ہم یہ رقم ضرور حاصل کریں گے لیکن ابھی نہیں...“

”ابھی کیوں نہیں...؟“

”میں اسے اس طرح کمزور بنا رہی ہوں کہ یہ کبھی میرے بغیر کہیں جا نہیں سکے گا۔ ایک تو یہ کہ ابھی اس کے زخم بھرنے میں کئی مہینے لگیں گے۔“

”پھر یہ کہ شراب اور شباب، یہ دو چیزیں بڑے بڑے وروں کو کمزور اور ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ میں اس کا علاج کر رہی ہوں اور برانڈی کا ایک بڑا پیگ دوا کے طور پر پلائی ہوں۔ اسے نشہ کا عادی بنا رہی ہوں۔ آج سے خوراک بڑھا دوں گی۔ اسے ڈبل پیگ دیا کروں گی۔ ابھی یہ میرا عادی ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے حسین کھلاڑی عورتوں کا عادی بنا دوں گی۔ آپ جلد ہی دیکھیں گے کہ یہ جو شیر کی طرح ڈھنڈھاتا رہتا ہے جلد ہی میرے سامنے چومہاں کر رہے گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں جس دن اس کا بچہ میرے پیٹ میں آئے گا، میں اسے آپ کے حوالے کر دوں گی۔“

”اوکا ڈا! تم عورتیں بھی کیا ہوتی ہو۔ بیک وقت دشمن بھی ہوتی ہو اور دیوانی مجبو بہ بھی۔ جس کی جان لیتا جاہتی ہو، اس کی اولاد کو اپنی کونکھ میں رکھنا چاہتی ہو۔ تم شاید نہیں مانو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ تم اس مرد پر مرمتی ہو۔ اس سے انتقام لینے کے لیے سیلو پوائزن کی طرح اسے کمزور بنانے کی باتیں کر رہی ہو۔ جب اس کا بچہ پیٹ میں آئے گا تو تم اس کی اور دیوانی ہو جاؤ گی۔ خوشی سے پاگل ہو کر ناچتی پھر وگی۔“

وہ ذرا چپ رہی۔ جان انٹونی کی بات دل کو لگ رہی تھی۔

اسے پاکستان سے یہاں لانا ضروری نہیں تھا۔ وہیں اسے ٹولی مار سکتی تھی لیکن اس کی ہوس اور طلب نے مراد کو اس کے انتقام سے بجا لیا تھا۔

اس نے فون کو دیکھا پھر کہا۔ ”نہیں سر! میں وعدہ کرتی ہوں۔ صرف چار مہینے انتظار کروں گی۔ اگر ماں بننے کے آثار پیدا نہیں ہوں گے تو میں اسے آپ کے حوالے کر

کرے اور میرے ہاتھوں سے زندہ بچتا رہے، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تب میں نے اس بے ایمان دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا، یہ مرد بے زبردست۔ میں تو اس پر مرمتی ہوں۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے زندہ رکھوں گی اور بڑی محبت سے مارتی رہوں گی۔ درپردہ اسے اس طرح نقصان پہنچاتی رہوں گی کہ یہ کبھی سمجھ نہیں پائے گا کہ اس کے ساتھ کیوں ایسا ہو رہا ہے؟ اور کون ایسا کر رہا ہے؟ یہ قسم کھائی کہ جب بھی ہاتھ آئے گا اسے بہت پیار سے بہت آہستہ آہستہ مارتی رہوں گی۔“

”یہ ابھی پلاننگ ہے لیکن تم ایسے سر پھرے شوٹر کو محبت سے زیر نہیں کر سکو گی۔“

اس نے صوفے پر سکر کر لیٹتے ہوئے اپنا سر مراد کے زانو پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے اپنی جانوں میں قید کر چکی ہوں۔ ان لمحات میں اس کے زانو پر سر رکھے آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔“

وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ ”کیا سچ کہہ رہی ہو؟“

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”جسے سنڈکیٹ اور انڈورلڈ والے ڈھونڈ رہے ہیں، وہ تمہارے پاس ہے؟ یہ، یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم ابھی اس کی آغوش میں ہو؟“

”ہاں۔ اسی لیے اس لینگوئج میں باتیں کر رہی ہوں۔ یہ نہیں سمجھ رہا ہے کہ میں اس کے بارے میں بول رہی ہوں۔“

وہ اپنے ویل فرنڈ آفس میں ایک بڑی سی میز کے پیچھے یو ایس ڈیپارٹمنٹ پر بیٹھا تھا۔ شدید حیرانی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فون کو کان سے لگائے ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولا۔ ”سرینہ! تم کیا ہو...؟ کیا ہو مرینہ...؟ تم نے ہمیشہ اپنے کارناموں سے چونکا یا ہے۔ پلیز مجھے یقین دلاؤ کہ جو کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا ہے، اسے تم نے اپنی ٹانگوں میں دو بوج رکھا ہے۔“

وہ بولی۔ ”مرینہ جھوٹ نہیں بولتی۔ خواہ مخواہ ڈینگیں نہیں مارتی۔ آپ یقین کر لیں کہ یہ میرا سر ہے۔ بیار کی زنجیر، لوہے کی پھٹکڑیوں اور بیڑیوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ یہ میرے سینے سے بھی نکل نہیں سکے گا۔“

”تم ابھی کہاں ہو؟ انڈیا کے کس صوبے کس علاقے میں ہو؟ فوراً پتا بتاؤ۔“

”میں آج ہر حال میں پاکستان جانے والی ہوں۔ یہاں کا پتا پوچھ کر کیا کریں گے؟“

دوں گی۔ لیکن یہ یاد رکھیں اس سے پہلے آپ درپردہ کوئی چال نہیں چلیں گے۔ اپنے خفیہ ذرائع سے یہ معلوم نہیں کریں گے کہ میں نے اپنے یار کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔

”میں صاف کہہ دیتی ہوں۔ میری مرضی کے خلاف آپ کا جو بھی جاسوس اس تک پہنچنے کا وہ زندہ نہیں جائے گا۔ میں اس کی خاطر اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ سے دشمنی مول لے لوں گی۔“

”تم مطمئن نہ رہو۔ ہم تمہارے مزاج کو سمجھتے ہیں، ہم چار ماہ تک انتظار کریں گے۔ پانچویں ماہ کی پہلی تاریخ کو تم اسے ہمارے حوالے کر دو گی۔“

”بے شک وعدہ کرتی ہوں۔ اب آپ اپنے سیکرٹ ایجنٹ سے پوچھیں کہ وہ آج رات ہی مجھے پاکستان پہنچا دے۔“

”میں اسے فون کر رہا ہوں۔ انتظار کرو۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ تمہیں کال کرے گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ فون بند کر کے مراد کے زانو سے سر اٹھا کر بولی۔ ”ابھی ایک سیکرٹ ایجنٹ کی کال آئے گی۔“

وہ بہت خوش تھا۔ مرینہ آج ہی پاکستان پہنچ کر محبوب کو ماروی سے دور کرنے والی تھی۔ وہ اسے گلے لگا کر بولا۔ ”میری جان! تم نے دل خوش کر دیا ہے۔“

وہ اس پر تر بان ہونے لگا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”میں بہت خوش ہوں پھر سے MET آفیسر بن گئی ہوں۔ جانتے ہو نہیں کتنا فائدہ پہنچے گا؟ میں وہاں جا کر محبوب کو اور اس کے ایٹمی جنسز ڈالوں کو تختی کا ناچ نچا دوں گی۔ تم مراد وہ۔ وہ عاشق نامراد ہوگا۔ بھی ماروی کے سائے تک بھی پہنچ نہیں پائے گا۔“

واقعی مرینہ جرائم کی دنیا میں MET آفیسر بن کر وسیع ذرائع اور اختیارات حاصل کرنے والی تھی۔ اس کی پیار بھری دشمنی دو دھاری تلوار تھی۔ وہ بڑی خوبی اور مہارت سے دہری چالیں چل رہی تھی۔ پیار بھری میٹھی بھری بن کر مراد کے گلے میں اترتی جا رہی تھی۔

وہ بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی دانست میں مرینہ سے دوستی کر کے غلطی نہیں کی تھی۔ منافع کا سودا کیا تھا۔ ماروی اس کی غیر موجودگی میں محبوب کی پہنچ سے دور رہنے والی تھی۔

ایک گھنٹے بعد سیکرٹ ایجنٹ نے مرینہ سے فون پر کہا۔ ”میں بھری بدین بول رہا ہوں۔ ڈائریکٹر جنرل نے

کہا ہے: تمہیں کراچی پہنچایا جائے۔ تم ابھی کہاں ہو؟“

”میں جے پور میں ہوں۔“

”تم کسی بھی فلائٹ سے شام تک دہلی آ جاؤ۔ آج رات دس بجے ایک طیارہ لندن کے لیے روانہ ہوگا۔ کراچی اس کی بریک جرنی ہوگی۔ تمہیں وہاں اتار دیا جائے گا۔“

”اس طیارے کا مکمل وقت ضرورت ہماری مرضی سے تبدیل ہو جاتا ہے تم یہاں سے ائر ہوٹل بن کر جاؤ گی۔“

”جس ائر ہوٹل کے کاغذات پر جاؤ گی، وہ ایک عام مسافر کی طرح کراچی تک جائے گی۔ وہاں سے وہ اپنی ڈیوٹی پر آجائے گی۔ کراچی ائر پورٹ پر تمہیں چور راستے سے باہر پہنچا دیا جائے گا۔“

”تھینک یوسٹر ہڈن! میں ابھی سیٹ اوکے کرانے کے بعد فون کروں گی۔“

اس نے اسی وقت جے پور ائر پورٹ کے ایک نمبر پر فون کیا۔ ایک ائر لائن سے معلوم ہوا کہ دو گھنٹے بعد جانے والی فلائٹ میں سیٹ مل جائے گی۔

اس نے مراد سے کہا۔ ”میں ٹکٹ لینے جا رہی ہوں۔ ابھی آ جاؤں گی۔ اپنا خیال رکھو۔“

وہ چلی گئی۔ مراد اپنے زخموں کو اور اپنی بے بسی کو بھول گیا تھا۔ وہ اس خفیہ پناہ گاہ میں رہنے کے باوجود مرینہ کی صورت میں ماروی کے قریب جانے والا تھا۔ اور آج رات کی صبح ہونے سے پہلے اپنے قریب کو اس سے دور کر دینے والا تھا۔ آدمی خوش فہمی میں رہ کر بڑے دھوکے کھاتا ہے۔ مراد کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ بھی بے خبری میں فریب کھاتا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ مرینہ اس کی مسیحا بن گئی تھی۔ خود اس کا علاج کر رہی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اسے ماروی کے پاس پہنچائے گی اور اس کی معشوق کو محبوب کی جھوٹی میں نہیں جانے دے گی۔ وہ اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کے لیے اسی رات پاکستان جا رہی تھی۔ یہ ثباتِ کر رہی تھی کہ وہ اس کی خدمت گزار و فادار رہی نہیں اس کی ماروی کی محافظ بھی ہے۔

کون سوچ سکتا تھا کہ ایسی عورت کے اندر زہریلی ناگن بیٹھی ہوئی ہے؟ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیا کرنے والی ہے؟

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا سبب احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



عورت...! جس کے روپ ہزار... اور ہر روپ دوسرے سے جدا۔ کہیں فولاد کے مانند ڈنٹ جانے والی اور کہیں ریت کی طرح بکھر جانے والی... کہیں برسات کی بوندیں... کہیں جھلستی دھوپ کا احساس... لیکن ہزاروں روپ بدلنے کے باوجود عورت محبت کے نام پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا جو جانے کب سے سارے تانے بانے توڑنے کے درپے تھی کہ چاہے جانے کا ایک پوشیدہ جذبہ اس کے دل کے نازک تاروں اور مضبوط عزائم کو ہلا گیا۔

اعتراف

عسلامت اور

سوکے چوں کے مانند ٹوٹے ہوئے انسان کا اعتراف نکست

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور میں اس کی بات پر مسکرا دیا۔

”تین برس پہلے جب تم نے اسی طرح کا فقرہ ادا کیا تھا تو فقرہ ادھورا نہیں چھوڑا تھا تمہاری آواز میں اعتماد تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ اس نے کسی قدر تیز لہجے میں سوال کیا۔

”تین برس پہلے جب اس نے مجھ سے اظہار کیا تھا کہ ”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“ تو میں نے اس سے کہا تھا کہ ”کیا پاگل ہو گئی ہو؟“ اور آج تین برس بعد جب اس نے کہا کہ ”وہ مجھ سے طلاق چاہتی ہے۔“ تب بھی مجھے پہلا فقرہ دہراتا ہوا۔

”کیا پاگل ہو گئی ہو؟“
”تم جو چاہے سمجھو... اگر تم نے طلاق نہ دی تو....“

”پھر وہ شکار، جس میں شکار کرنے والا خود شکار ہو جائے، وہ ایک طرح کا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے سادہ سے انداز میں کہا لیکن وہ بری طرح چونکی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اس بات کا مطلب؟“ اس نے آہستہ سے سوال کیا۔

”صرف اتنا ڈاکٹر تازیہ احتشام کہ شیر اگر صرف یہ سوچ لے کہ شکار اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کیوں نہیں رہا جیسے کہ اس کے ہر شکار پر ہوتا تھا۔“ میں نے کہا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔

”شاید تم مجھے کوئی دھمکی دے رہے ہو؟“ اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

”میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ لاچار اور مجبور شکار کو دیکھ کر شیر اتنا مطمئن ہو جاتا ہے کہ احتیاط کا دامن بھی چھوڑ دیتا ہے۔“ میں نے کہا تو اس کے ہاتھوں سے ایک بار پھر صبر کا دامن چھوٹ گیا۔

”لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔“ اس کے لہجے میں ایک بار پھر تیزی آ گئی۔

”میں یہ کہہ رہا ہوں کہ شکار کرنے والا اس وقت خود شکار ہو جاتا ہے جب وہ ضرورت سے زیادہ۔۔۔“

”دعا سنتی کہ شکار ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ کاندھے اچکا کر کہنے لگی۔

”تم کہنا چاہ رہے ہو کہ جب تم نے مجھ سے شادی.....“ وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی، میں نے اسے کہنے سے روک دیا۔

”میں نے تم سے نہیں، تم نے مجھ سے شادی کی تھی۔“ میں نے تسلی کی تو اس نے اپنی عادت کے مطابق کاندھے اچکا دیے۔

”ایک ہی بات ہے۔“ اس نے بات ٹالنے والے انداز میں کہا تو میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے مجھے کمرے سے باہر جاتا دیکھ کر سوال کیا۔

”باہر لان میں بیٹھ کر چائے پیتا جا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”چائے تم یہاں بھی پی سکتے ہو۔“ اس نے مجھے روکنا چاہا۔

”جب تک میں چائے پی لوں، تم تین برس پہلے کے واقعات کو اچھی طرح دہراؤ تاکہ میری باتیں تمہاری سمجھ میں پوری طرح آجائیں۔“ میں نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔

”میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ تین برس پہلے تمہاری ریہرسل مکمل تھی لیکن اس بار.....“ میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ وہ غصے کا نہیں، بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

”آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟“ خاموشی کا طویل ہوتا ہوا وقفہ بالآخر اس نے ختم کیا۔

”تم نے اپنے طور پر اچھی کوشش کی لیکن تمہاری آواز کی کپکپاہٹ غصے کی نہیں، احساسِ گناہ کی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور وہ اس جگہ پھر بیٹھ گئی جہاں سے وہ چند لمحوں پہلے اٹھی تھی۔

”میرا کون سا احساسِ گناہ ہے جس کا تم حوالہ دے رہے ہو؟“

”اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں تین برس پہلے کی وہ باتیں یاد دلانا چاہتا ہوں جب تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے خودکشی کر رہی تھیں تو تم غلط سوچ رہی ہو۔“ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر مجھے گھورنے لگی۔

”ہر انسان زندگی میں غلطی کرتا ہے۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”تم نے کبھی شیر کے شکار کے بارے میں پڑھا ہے؟“ میں نے سوال کیا تو وہ یوں دیکھنے لگی جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اس بے وقت کے سوال کا یہاں کیا ذکر ہے۔

”میں نے پڑھا ضرور ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”شیر جب چارے کی جانب بڑھتا ہے تو وہ خود شکار کرنے ہی بڑھتا ہے لیکن شکار کرنے کے بجائے خود شکار ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا لیکن اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی ہے۔

”میں سمجھی نہیں کہ تم کہنا چاہ رہے ہو؟“ میں بولتے بولتے رکا تو اس نے سوال کیا۔

”جلد بازی اچھی چیز نہیں ہے سبز تازیہ احتشام۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”تم کھل کر بات کرو..... شیر..... شکار اور نہ جانے کیا کیا بات سمجھا رہے ہو۔“ طنز کے انداز اپناتے ہوئے اس نے کہا۔

”چارے کو دیکھ کر شیر ضرورت سے زیادہ بلکہ غیر ضروری خود اعتمادی کا شکار ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”شیر کے شکار پر آپ کی تحقیق قابلِ قدر ہے۔“ وہ ایک بار پھر طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

میں لان میں آیا تو وہ بھی ساتھ چلی آئی۔ ملازم نے ہمیں آتا دیکھا تو کرسیوں کی پھر سے صفائی کرنی شروع کر دی۔ ہم دونوں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو وہ وہاں سے چلا گیا۔

”احتشام! میں جانتی ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان معاملہ بغیر کسی تنازع کے حل ہو جائے۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”یعنی میں کسی حیل و حجت کے تمہاری یہ فرمائش بھی اسی طرح پوری کر دوں جس طرح آج تک ہر فرمائش پوری کرتا رہا ہوں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تو اس نے نگاہیں دوسری جانب کر لیں۔

”احتشام..... میں.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ گزربڑا گئی۔

”میں سننے کے لیے بے تاب ہوں ڈاکٹر نازیہ احتشام یا پھر ڈاکٹر نازیہ متین؟“ میں نے کہا۔۔۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز کی کڑواہٹ شامل ہوئی تھی جسے اس نے پوری طرح محسوس کیا تھا۔

”میں اعتراف کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے ہر سہولت دی۔“ اس نے کچھ کہنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ میں ہنس دیا اور وہ جو پہلے ہی نزوس تھی اور زیادہ نروس ہوئی لیکن میں ہنساتی رہا۔ ”کن کن باتوں کا اعتراف کرو گی نازیہ متین؟“ میں نے سوال کیا لیکن اس وقت تک وہ اپنا کھویا ہوا اعتماد کسی حد تک بحال کر چکی تھی۔

”ہر بات کا۔“ اس نے میرے طنزیہ انداز کو محسوس تو کیا لیکن نظر انداز کر دیا۔

”اس بات کا اعتراف کرو گی کہ تمہارے والد میرے دفتر میں اکاؤنٹس کلرک تھے؟“ میرے لہجے کا طنز بڑھ گیا۔

”میں اعتراف کروں یا نہیں، یہ ایک حقیقت رہی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر میرے لہجے کو نظر انداز کیا۔

”یہ اعتراف بھی کہ تمہیں میڈیکل کالج میں ایڈمیشن تو مل گیا تھا لیکن تمہارے والد کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اخراجات برداشت کر سکتے؟“ میں نے کہا تو اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

خاموشی کا یہ وقفہ طویل تر ہوتا چلا گیا۔ اس دوران ملازم چائے کی ٹرائی لے کر آیا۔ جب تک ملازم میرے ساتھ، ہم دونوں ہی خاموش رہے لیکن جب اس نے چائے پانی

چاہی تو اس نے روک دیا۔

”تم جاؤ، میں بناؤں گی۔“ اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے جائے بناتی رہی اور میں صرف اسے دیکھتا رہا۔ ماضی سلائیڈ کی فلم کی طرح میرے سامنے سے گزر رہا تھا، میرا وجود وہاں تھا لیکن میرا ذہن ماضی میں وہاں پہنچ گیا تھا جہاں اکاؤنٹس کلرک عبدالمتین اجازت لے کر میرے پیپر میں آیا تھا۔

”خیریت تو ہے متین صاحب؟“ میں نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”خیریت ہی ہے سر۔“ اس نے بہت ہی نرم آواز میں کہا اور پھر خاموش ہو گیا جیسے جن الفاظ کو چن کر وہ اپنے ساتھ لایا تھا، وہ اچانک کہیں گھوم گئے ہوں۔

عبدالمتین یوں بھی ایک مرجان مرجع قسم کا شخص تھا۔ چھوٹا سا قد اور نحیف شخص جس کی بیوی کا دو برس پہلے انتقال ہو گیا تھا۔

”تم کچھ کہنا چاہ رہے تھے؟“ میں نے نگاہیں نیچی کیے ہوئے عبدالمتین سے سوال کیا تب بھی فوری طور پر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

”سر! میری بیٹی نے انٹر کا امتحان پاس کر لیا ہے۔“ اس نے کہا لیکن اس کی نظریں بدستور نیچے ہی تھیں۔

”یہ تو بہت خوشی کی بات ہے اور تم بغیر مٹھائی کے آگئے ہو۔“ میں نے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

”آپ اس وقت ملک میں نہیں تھے۔“ اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ دو روز قبل ہی میں امریکا سے ناکام واپس آیا تھا۔ میں اپنے گھریلو معاملات سدھارنے گیا تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”سر! نازیہ کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو رہا ہے۔“ عبدالمتین نے یوں کہا جیسے کسی کی موت کی اطلاع دے رہا ہو۔

”یہ تو بہت زبردست خبر ہے۔ اس پر تو ہمیں مٹھائی منگوانی چاہیے۔“ میں نے کہا لیکن عبدالمتین کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس کی نظریں بدستور فرش کی جانب ہی رہی تھیں۔

بالکل کسی مجرم کی طرح جو رگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ لیکن کچھ نہ کہنے کے باوجود میں سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بیوی کی بیماری نے معاشی طور پر اسے تباہ کر دیا تھا اگرچہ اس نے دفتر سے بھی ایڈوائس نہیں لیا تھا۔

”اب ایسا ہے عبدالمتین۔“ میں نے کچھ کہنے کی تمہید

باندھی ہی تھی کہ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”دراصل سر میں اور میری وائف دونوں ہی جا ب کرتے تھے۔“ اس نے کہا تو مجھے کچھ کہنے سے قبل ہی رک جانا پڑا۔ عبدالمتین شاید یہ سمجھا تھا کہ میں اسے جانے کے لیے کہنے والا ہوں۔

”یہ تو اچھی بات تھی۔“ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا تھا۔

”وہ گورنمنٹ اسکول میں ملازم تھی لیکن ہم اس کی تنخواہ بینک سے نکالتے نہیں تھے۔“ اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ عبدالمتین کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔

”ہم چاہتے تھے کہ وہ رقم نازیہ کی تعلیم اور اس کی شادی پر خرچ کر سکیں لیکن.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

”یہ قدرت کا قانون ہے عبدالمتین۔“ میں نے تسلی دینی چاہی لیکن وہ اس سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔

”ہماری تمام جمع پونجی اس کی بیماری میں ختم ہو گئی بلکہ میں قرض دار بھی ہو گیا۔“ اس نے کہا۔

”کتنا قرض ہے؟“ میں نے سوال کیا لیکن اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

”میں اس کی پنشن اس قرض میں ادا کر رہا ہوں بلکہ اب تو قرض بہت کم رہ گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا تو مجھے ایک بار پھر خاموش ہو جانا پڑا۔

”تم کہہ رہے تھے کہ تمہاری بیٹی کا ایڈمیشن میڈیکل کالج میں ہو رہا ہے؟“ خاموشی کا وقفہ طویل تر ہونے لگا تو مجھے ہی خاموشی توڑنی پڑی۔

”سر! اگر مجھے کچھ ایڈوانس مل جاتا تو.....“ عبدالمتین نے سمجھتے ہوئے کہا۔

”اس برس ایڈوانس لوگے اور اگلے برس؟“ میں نے سوال کیا۔

”اگلے برس تک قرض ختم ہو جائے گا اور اس کی ماں کی پنشن اس کی تعلیم پر خرچ کر لیں گے۔“ عبدالمتین نے جواب میں کہا تھا۔

”کیوں نہ ہم ایک سودا کر لیں؟“ میں نے کہا تو عبدالمتین نے عجیب انداز میں مجھے دیکھا۔

”میں تمہاری بیٹی کے تمام تعلیمی اخراجات برداشت کروں گا اگر تمہاری بیٹی یہ وعدہ کرے کہ کسی قابل ہوتی ہے وہ اس سے گنی رقم کسی مستحق بچے کی تعلیم پر خرچ کرے

گی؟“ میں نے اپنی آفر دی تو عبدالمتین سوچ میں ڈوب گیا۔

”یہ وعدہ میں نازیہ سے پوچھ کر ہی کر سکتا ہوں۔“ عبدالمتین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

”تم تو معاہدہ کر چکی نہیں رہے ہو عبدالمتین۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پہلی بار میں نے عبدالمتین کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ دیکھی تھی جیسے اس نے بادلوں میں چھپے عید کا وہ چاند دیکھ لیا جو کسی اور کو نظر نہیں آیا ہو۔

”احتشام.....“ میرے کانوں میں نازیہ کی آواز آئی اور میں چونک کر ماضی سے اچانک حال میں پہنچ گیا۔

ہم دونوں ہی اپنی اپنی چائے کی پیالیاں ختم کر چکے تھے لیکن چائے کے باقی لوازمات اسی طرح موجود تھے جس طرح لائے گئے تھے۔ میں خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن بھی خالی تھا لیکن وہ اسے کچھ اور ہی سمجھی تھی۔

”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ اس نازیہ ستین میں جو پہلی بار میرے دفتر آئی تھی اور اس نازیہ میں کتنا فرق ہے۔“ میں نے کہا تو وہ جھپٹ سی گئی۔

”تم مجھے بار بار ماضی میں گھسیٹ کر کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

”آج سے پہلے میں نے بھی یہ ذکر نہیں کیا حالانکہ.....“ میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا جبکہ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ سننا اور اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

جس دوران میں ماضی میں گھومتا رہا تھا، اس دوران اس نے اپنی گفتگو کو دوبارہ ترتیب دے لیا تھا اور اب اس کا اظہار کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتی، اس کا موبائل بج اٹھا۔

”فوزیہ پہنچ رہی ہے۔“ اس نے اطلاع دی۔

”تمہیں تو شاید اس کے گھر پارٹی میں جانا تھا۔“ میں نے کہا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ چند دن قبل نازیہ نے مجھے بتایا تھا۔

”صرف مجھے ہی نہیں، تمہیں بھی جانا تھا لیکن تم تو شاید.....“ اس نے بات طرز یہ انداز میں ختم کی۔

”علحدگی کا فیصلہ کر لینے کے باوجود تم چاہتی ہو کہ میں بھی تمہاری طرح اداکاری کروں؟“ میں نے کہا لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

شاید اپنی کنبلی کے سامنے وہ ہمارے درمیان موجود جی کوٹھا پر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ وہاں سے گئی تو میں بلاوجہ ہی ایک بار پھر ماضی کی

جانب نکل گیا۔ اس دن کی جانب جب نازیہ عبدلتین سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ عبدلتین سے گفتگو ہونے کے اگلے روز میں دفتر پہنچا تو میری سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ عبدلتین اپنی بیٹی کے ساتھ آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

”مینگ ختم ہو جائے تو انہیں بھیج دینا۔“ مینگ میں جانے سے قبل میں نے ہدایت دی۔

وہ مینگ ایک جاپانی وفد کے ساتھ تھی اور شرمندگی یہ تھی کہ میں تاخیر سے دفتر پہنچا تھا۔ مینگ میری توقعات سے زیادہ بہتر تھی لیکن تفصیلات طے کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ مہمانوں کو رخصت کر کے میں اپنے جیبر میں پہنچا تو سیکرٹری نے اجازت لینے کے بعد باپ بیٹی کو بھیج دیا۔

”سر! میں نے ذکر کیا تھا تو اس نے کہا کہ یہ خود آپ کے سامنے وعدہ کر لے گی۔“ عبدلتین نے اشارہ پا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم دونوں براہ راست واقف ہو گئے۔“ میں نے پہلی بار عبدلتین کی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور وہ جواب میں صرف جی کہہ کر رہ گئی۔

وہ ایک عام سی لڑکی تھی جس کے چہرے پر اس کی آنکھیں اس قدر نمایاں تھیں کہ کسی اور شے کے بارے میں غور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن وہ بلی بلکہ بہت ہی دلی ہونے کے باوجود وہ نہیں سے بھی عبدلتین کی بیٹی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ باپ سے بھی قد میں اونچی تھی اور اس کا رنگ بھی اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔

”تو محترمہ ڈاکٹر نازیہ صاحبہ۔“ میں نے براہ راست ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آگئی۔

”جی سر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کا انداز باپ سے مختلف تھا۔ وہ براہ راست میری جانب دیکھ رہی تھی۔

”یہ معاملہ تحریری نہیں ہوگا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”شکریہ سر۔“ اس نے جواب میں کہا۔

”شکریہ کس بات کا..... میں تمہیں قرض دے رہا ہوں اور تم سرپرست واپس کرو گی۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”شکریہ اس لیے کہ آپ نے میری ذات کی گارنٹی قبول کر لی۔“ اس نے صاف لیکن شائستہ انداز میں کہا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک پُر اعتماد لڑکی ہے۔ اس کا جواب

اس طرح کا تھا کہ میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”اس معاہدے میں کوئی تیسرا فریق نہیں ہے، نہ میرا دفتر اور نہ تمہارے والد۔“ میں نے وضاحت کی۔

”جی بہتر۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

نازیہ واپس آتے ہوئے نظریاتی تو میں ذہنی طور پر بھی وہیں حاضر ہو گیا جہاں جسمانی طور پر موجود تھا۔ وہ خاموشی سے وہیں آکر بیٹھنے کی جہاں سے اٹھ کر گئی تھی۔

”فوزیہ جلدی میں تھی اس لیے گیٹ سے مل کر چلی گئی۔“ میرے کچھ نہ پوچھنے کے باوجود اس نے بتایا۔

”یہ بہت اچھا ہوا۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے گھور کر رہ گئی لیکن اس نے ہنسنے سے گریز کیا۔

”اب تک کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ معاملات اس طرح سے حل نہیں ہوں گے جیسا میں چاہتی تھی۔“ اس نے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا۔

”تم جانتی ہو نازیہ کہ تم میں سب سے اچھی عادت کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا تو اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے سمجھنا چاہ رہی ہو کہ میں اس کی تعریف کر رہا ہوں یا یہ کوئی مختلف انداز کا طنز ہے۔

”تمہارے نزدیک وہ اچھی عادت کیا ہے؟“ اس نے بہت واضح انداز میں طنز کیا۔

”تم اپنا مقصد متعین کر لیتی ہو اور پھر تمہاری تمام تر کوشش اور توجہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔“ میں نے سادہ سے انداز میں کہا لیکن وہ بدستور مجھے گھورتی رہی۔

”احتیاط صاحب! کیا آپ طنز کے بغیر سنجیدگی سے گفتگو نہیں کر سکتے؟“ اس نے سوال کیا تو میں ہنس دیا۔

”یہ بتاؤ کہ اتنا بڑا کاروبار چلانے والا کیا بے وقوف ہو سکتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”کاروبار تو تمہیں وارث میں ملا تھا۔“ نازیہ نے جواب دیا۔

”تم سمیت تمام لوگ جانتے ہیں کہ بابا سے جو درجے میں ملا تھا، آج وہ کاروبار شاید دس گنا سے بھی زیادہ ہے۔“ میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”اس طرح اگر آپ خود کو مکمل ثابت کرنا چاہتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر بہت دیر بعد مسکراہٹ آئی۔

”کاروبار چھوٹا ہو یا بڑا، اسے کامیابی سے چلانے کے لیے اپنے ہر کارکن پر پوری نظر رکھنی ضروری ہوتی

ہے۔“ میں نے اگلی بات کی لیکن اس کے چہرے سے یہی ظاہر ہوا جیسے وہ کچھ نہ سمجھی ہو۔

”شیر کی نفسیات سمجھانے کے بعد کیا اب کاروبار سمجھاؤ گے؟“ نازیہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”صرف اتنا کہہ رہا ہوں، اپنے ورکرز پر نظر رکھنے والا اپنے قریب ترین لوگوں سے کیسے غافل ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس بار براہ راست وار کیا تھا جس کی وہ توقع نہیں کر رہی تھی۔

”تم کہہ رہے ہو کہ تم میری جاسوسی کرتے رہے ہو؟“ اس نے کہا لیکن میں خاموش رہ کر صرف اسے دیکھتا رہا اور وہ بھی یہ کہہ کر خاموش رہی۔

”ابھی تو صرف ایک حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے عینیلی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اور باقی حقائق کا اعتراف آپ کب کریں گے؟“ اس نے غصے اور طنز سے بھر پور لہجے میں پوچھا۔

”شیر کے شکار کی لالچی گفتگو جب تمہاری سمجھ میں آجائے تو بہت سے حقائق بھی سمجھ لوگی۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا ہمارے درمیان کورٹ فیصلہ کرے گا؟“ اس کے انداز میں دھمکی تھی۔

”تم جانتی ہو کہ تم کورٹ نہیں جاسکتیں۔“ میں نے کہا تو وہ ہنسنے سے اکھڑ گئی۔

”کون روکے گا مجھے؟“ اس نے تنک کر کہا۔

”جب تم پر حقیقت پوری طرح آشکار ہو جائے گی تو.....“ میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔

”تب کیا ہوگا؟“ اس کے مزاج کی گری پر رقتھی۔

”ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھ کر شروع سے لے کر اب تک تمام حقائق کو آشکار کرتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔

”جب میں اعتراف کر چکی ہوں کہ میں ہر احسان کو تسلیم کرتی ہوں تو اس نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہم دونوں تصویر کے دونوں رخ جانتے ہیں لیکن اعتراف نہیں کرتے۔“ میں نے جواب میں کہا۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

”کون سے دوسرے رخ؟“ اس کے لہجے میں الجھن بڑھ گئی تھی۔

”کچھ باتیں ہیں جو تم نہیں جانتیں اور کچھ ایسے حقائق ہیں جنہیں تم سمجھتی ہو کہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے دھیمے لہجے

میں کہا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جنہیں تم حقائق سمجھ رہے ہو.....“ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی لیکن میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”باقی باتیں بیڈروم میں ہوں گی اور وعدہ ہے ایک گھنٹے میں ختم ہو جائیں گی۔“ میں نے پہلا قدم اٹھانے سے قبل کہا اور آگے بڑھ گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا نہیں۔ جس طرح وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے پیچھے نہیں آ رہی ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آئے گی ضرور۔

میں نے بیڈروم پہنچ کر چٹخ کر لیا لیکن وہ نہیں آئی اور میں اطمینان سے بیڈروم پر دراز ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ماضی میں جاؤں لیکن غیر ارادی طور پر میرا ماضی کا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

وہ نازیہ کا میڈیکل میں تیسرا سال تھا جب عبدالستین صاحب کا ایکسڈنٹ ہوا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ میں اس وقت ملک میں نہیں تھا لیکن جس روز آیا، اسی روز ان کے گھر گیا تھا۔ حادثے کو سولہ دن ہو چکے تھے اور نازیہ خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ وہ مجھ سے ملی تو کسی حد تک کپکپھنسی لیکن اس کی آنکھوں میں مستقبل کی توشیش ضرور تھی۔

”میں آپ کی اور آپ کے دفتر کے لوگوں کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمارا ساتھ دیا۔“ اس نے فاتحہ کے فوراً بعد کہا۔

”تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟“ میں نے بند لفظوں میں وہ سوال کیا جو مجھے پریشان کر رہا تھا۔

”خالد نے میری درخواست مان لی ہے اور یہ میرے ساتھ شفٹ ہو گئی ہیں۔“ اس نے ساتھ ہی خاتون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ تو بہت بہتر ہو گیا۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

”مجھے یہی سمجھ میں آیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”جس حوصلے کا تم مظاہرہ کر رہی ہو، امید ہے کہ اس حادثے کا تمہاری پڑھائی پر زیادہ اثر نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا تو پہلی بار اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

”ابا کے خواب پورے کرنے کے لیے اب شاید میں اور زیادہ محنت کروں گی۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

”ہمارے معاہدے میں اب ایک چھوٹی سی تبدیلی

یہ کرنی ہوگی کہ اب تم براہ راست مجھے فون کر لو گی میں..... میں نے اپنا فقرہ ادھر اچھوڑ دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

وہ مہر باپ کے ہاتھوں پر چلی بھجوا دی تھی کہ اسے کس مد میں تقبی لم درکار ہوگی اور میں عبدالتین کے ہاتھوں وہ رقم بھجوا دیا کرتا تھا۔

”جی بہتر۔“ اس نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہا۔

میں وہاں زیادہ دیر رہ کر نہیں لیکن واپسی کے سفر میں یہ ضرور سوچتا رہا کہ ان ڈھائی برسوں میں وہ خاصی تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے کپڑوں میں تبدیلی تو آئی ہی تھی، جسمانی طور پر بھی وہ اب پہلے کی طرح ایک دہلی تپتی پٹی خسی لڑکی نہیں رہی تھی۔ چہرہ بھر جانے سے اس کی آنکھوں کے ساتھ اب اس کے دوسرے نقش بھی ابھرنے لگے تھے۔

میں آنکھیں بند کیے ماضی میں سفر کر رہا تھا جب دروازہ بند ہونے کی آواز سے چونکا۔ وہ کمرے میں آچلی تھی لیکن بیڈ کی جانب رخ کرنے کے بجائے وہ بیڈ کے قریب کرسی بٹھچ لائی تھی۔

”میں ایک بار پھر سے آپ کے احسانات کی فہرست دہرائے جانے کی منتظر ہوں۔“ ناز یہ نہ طنز یہ انداز میں کہا تو میں مسکرا ہٹ لائے بغیر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ تین برس ساتھ رہنے کے باوجود میرے بارے میں اس کے اندازے قطعی غلط تھے۔

”میں نے کہا ہے کہ ہم ان حقائق پر بات کریں گے جو تم سمجھتی ہو کہ میں نہیں جانتا یا مجھے یقین ہے کہ تم ناواقف ہو۔“ میں نے کہا تو وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سمجھتی رہی۔

”اور ان حقائق میں سے پہلی حقیقت کیا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔ اس کا لہجہ اب بھی طنزیہ تھا۔

”سب سے پہلی حقیقت یہ ہے ڈاکٹر نازیہ کہ جب تم میڈیکل کالج میں پہنچیں تو پہلی بار دنیا تم پر آشکار ہونا شروع ہوئی۔“ میں نے کہا تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے گھورتا شروع کیا۔

”آپ اپنی اس بات کی وضاحت کریں گے؟“ اس نے کہا لیکن اس بار اس کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا۔

”میڈیکل کالج آئے تک تم اپنے ہی جیسے لوگوں کے درمیان تھیں لیکن میڈیکل کالج میں امیر گھرانوں کی لڑکیوں اور لڑکوں کو دیکھ کر تم نے کچھ اور خواب بھی دیکھنے شروع کر دیے۔“ میری بات مکمل ہوئی تو وہ کاندھے اچکا کر رہ گئی۔

”یہ آپ کے اندازے تو ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت

اعتراف جرم

ایک آدمی نے مرتے وقت اپنے دوست سے کہا۔ ”یار بچھلے سال تمہارے بچپنیں ہزار روپے کا نمین میں نے کیا تھا اور فیکٹری کے مزدوروں کو میں نے ہی بھڑکایا تھا۔ اگر تمہیں بدلہ لیتا ہے تو لے لو۔“

”کوئی بات نہیں، تمہیں زبردستی میں نے ہی دیا ہے۔“

لمبی تان کر سونا

یہ بھی پرانے وقتوں کے رواج میں شامل ہے، کیونکہ جب بھی چادر دستیاب ہی نہ ہو۔ تو اسے لمبی تان کر کیسے سویا جاسکتا ہے؟ کیونکہ آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہر سونے والے کے پاؤں چادر سے باہر ہی ہوتے ہیں البتہ ٹیکسٹائل ملوں کے مالک حضرات چونکہ چادریں خود ہی بناتے ہیں۔ اس لیے سر دست وہ لمبی تان کر سوسکتے ہیں۔ بشرطیکہ انہوں نے خواب آور گولیاں بھی کھا رکھی ہوں، البتہ فوڈری والے لوہے کی چادر بھی تان کر سوسکتے ہیں۔

ظفر اقبال کی کتاب دال ولید سے اقتباس
انتخاب۔ ریاض ہٹ، حسن ابدال

لڑکوں کے ٹاپ 10 جھوٹ

- 1۔ مجھے تمہاری بہت فکر ہے (جھوٹا)
- 2۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری پسند ہو۔ (استغفار)
- 3۔ بہن کی کال ہے (ارد، حد ہوگئی)
- 4۔ سیل فون سائیلٹ پر تھا (لڑکے کا فون اور سائیلٹ پر)
- 5۔ ہماری شادی ضرور ہوگی (خوابوں میں)
- 6۔ تمہارے سواسی سے بات نہیں کرتا (توہ کر دو)
- 7۔ تم نے شادی نہ کی تو کنوارا بیٹھا رہوں گا (ایک ہفتے تک)
- 8۔ تم نے ملیں تو مر جاؤں گا (کسی اور پر)
- 9۔ تمہارے لیے جان بھی دے دوں گا (پتا نہیں کب تک)
- 10۔ تمہارا نہ ہو سکا تو کسی کا بھی نہ ہو سکوں

گا۔ (بڑا جھوٹ)

مرسلہ: سوہا، لاہور کینٹ

نہیں۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہنے کی کوشش کی لیکن اس کا لہجہ پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔
 ”کالج میں تمہارے دو افیئرز چلے تھے اور وہ دونوں ہی.....“ میں وضاحت کرتا چاہ رہا تھا لیکن وہ میرے یہاں تک پہنچنے پر ہی چلا گئی۔

”احتشام! تم مجھ پر گھٹیا الزام لگا رہے ہو۔“
 ”میں کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں..... بلکہ تمہاری شرافت کا مجھ سے بڑا گواہ کوئی نہیں ہے۔“ میں نے اس کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا۔

”لیکن تم یہ کہہ رہے ہو کہ میرے افیئرز تھے؟“ اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

”میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ندیم الحسن اور سعید چٹائے دونوں امیر باپ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے تمہاری خواہشات سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن تم نے خواہش کو کمزوری نہیں بننے دیا۔“ میں نے وضاحت کی تو وہ کچھ دیر خاموش رہی۔
 ”آپ تک ہماری دوستی کو غلط انداز میں پہنچایا گیا۔“ اس نے بہت ہی مدہم آواز میں کہا۔

”میں تو غلط کہہ بھی نہیں رہا ہوں بلکہ.....“ میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے مجھے روک دیا۔
 ”بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع کو یہیں ختم کر دیں۔“ اس نے کہا۔

”وہ نازیہ جو میرے دفتر آئی تھی اور وہ نازیہ جس سے میں اس کے والد کی وفات پر ملتا تھا، ان دونوں میں بہت فرق تھا۔“ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر اس طرح دیکھنے لگی جیسے کچھ نہ سمجھی ہو۔
 ”کیا فرق تھا؟“ اس نے سوال کیا لیکن میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

”یہ فرق مزید واضح ہوتا چلا گیا جب تم سے ہر ماہ ملاقات ہونے لگی۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

”آپ کی وائف کی وفات کے بعد؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا لیکن میں نے ایک بار پھر براہ راست جواب دینے سے احتراز کیا۔

”بہتر مستقبل کے لیے کوئی کوشش کرنا بری بات نہیں ہے اور تم نے اگر ایسا کیا تو غلط نہیں کیا۔“ میں نے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”جو گھٹیا الزامات آپ لگا رہے ہیں، وہ آپ کی سوچ کے سوا اور کچھ نہیں۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا۔

”میں کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں۔“ میں نے تردید کرنی چاہی لیکن اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔
 ”میرے لیے آپ ایک ایسے تنہا شخص تھے جس کی بیوی نے بچوں سمیت اسے چھوڑ دیا تھا۔“ اس کا لہجہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

”اور تم نے تنہا شخص پر ترس کھا کر شادی کر لی؟“ میں نے کہا تو اس نے اس بار بھی سنی ان ہی سنی کر دی۔
 ”میں آپ کی احسان مند بھی اور احسان اتارنے کے لیے ایسی طریقہ سمجھ گیا تھا۔“ اس نے کہا اور باہر کی جانب چل دی۔

”یہ تمہارا کہنا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو وہ جاتے جاتے رک گئی۔

”میں تمہارے الزامات سے بھاگ نہیں رہی ہوں۔“ وہ جاتے جاتے رک گئی۔ ”تمہارے گھٹیا الزامات سے ذہن میں جو غبار جمع ہو گیا ہے، تازہ ہوا میں اسے دور کر کے واپس آتی ہوں۔“ اس نے بات مکمل کی اور باہر چل گئی۔

میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ جس نچر میں نے گفتگو کا آغاز کیا تھا، وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس تمام عرصے میں میری جانب سے ایسا کوئی عمل نہیں ہوا تھا کہ وہ سوچ بھی..... سکتی کہ میں اس کے بارے میں وہ کچھ بھی جانتا ہوں جو اس نے اپنے سامنے سے بھی چھپایا ہوا ہے۔ وہ ایک گفتگو کو ترتیب دے کر آئی تھی جسے اب وہ دوبارہ سے ترتیب دینے لگی تھی۔

”تمہیں ایک بار نہیں سنی بار اس طرح سے جانا پڑے گا کیونکہ گفتگو ہر بار ایک نئے انداز سے ہوگی۔“ میں بلاوجہ بڑبڑایا لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک بار پھر غیر شعوری طور پر مامی میں چلا گیا۔

میں بیوی کی تدبیر سے واپس کراچی پہنچا تو اتر پورٹ پر ڈرائیور کے ساتھ نازیہ کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اپنی اس حیرت کا اظہار کیا تو اس نے کہا تھا۔ ”کل سے تو آپ کے یہاں بڑے لوگ تعزیت کے لیے آئیں گے، میں نے سوچا کہ یہاں آپ تنہا ہوں گے اس لیے.....“ اس نے کہا تو میں صرف شکر یہ ادا کر رہ گیا۔

اتر پورٹ سے روانہ ہوتے تو مجھے بھوک کا احساس ہوا جس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ میں پوری فلائٹ میں سوتا ہوا آیا تھا۔ بیٹے کا فون ملتے ہی امریکا روانہ ہو گیا جہاں سے سیدھا اسپتال پہنچا تھا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ رضوانہ دنیا میں نہیں رہی تھی۔ وصیت کے مطابق اور بیٹیوں کی خواہش پر

وہیں دفن کرنے کے بعد ہی میں نے یہ جاننے کے باوجود کہ وہ انکار کر دیں گے، میں نے بیٹوں سے واپس چلنے کے لیے کہا تھا لیکن ماں کی طرح انہوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔

کار گھر کی جانب رواں دواں تھی جب میں نے ڈرائیور کو گاڑی ہوٹل کی جانب لے جانے کے لیے کہا تھا۔ تازیہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی تو میں نے وجہ بتادی۔

”تمام راستے سوتا ہوا آیا ہوں اس لیے ہموک لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ گھر چلیں، میں دس منٹ میں کھانا تیار کر لوں گی۔“ اس نے آفر کی تھی۔

”پھر کبھی نہ!“ میں نے ٹالا لیکن اس نے اصرار کیا۔

”آپ یقین کریں، میں بہت اچھی لکھ ہوں۔“ میں ہنس دیا تھا۔

”اس قدر ہموک میں یہ رسک نہیں لیا جاسکتا۔“ میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی گئی۔

اس کے ایئر پورٹ پہنچنے پر مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن اس کی موجودگی خوشگوار تھی۔ ہم ہوٹل پہنچے اور جس طرح مجھے وہاں رہیو کیا گیا اس کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک محسوس کی تھی پھر اس کا اظہار کرنے میں اس نے دیر بھی نہیں کی۔ ہم ٹیبل پر بیٹھے ہی تھے کہ وہ بول پڑی۔

”آپ اکثر یہاں آتے ہیں شاید؟“ اس نے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”پہلی بار تو تم بھی نہیں آئی ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے بھی اثبات میں گردن ہلا دی۔

”تیسری بار آئی ہوں لیکن عزت پہلی بار ملی ہے۔“ اس نے کہا اور آہستہ سے ہنس دی۔ میں بھی مسکراتے پر غبور ہو گیا۔

کھانے کے دوران ہم اس کی تعلیم پر بات کرتے رہے تھے۔ شاید دونوں ہی رضوان کی موت کے بارے میں بات کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد بھی میں نے چاہا کہ اسے گھر چھوڑ دیا جائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

”میں رکشا یا ٹیکسی سے گھر پہنچوں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ڈیوٹی کے بعد تقریباً اسی وقت گھر آتی ہوں۔“ اس نے وضاحت کی تھی اور مجھے اس کی یہ احتیاط پسند آئی تھی۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا لیکن یہ سوچ ایک خاص دائرے میں ہی رہی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا تھا جو اپنی محنت سے اپنا راستہ بنا رہی تھی۔ ساتھ ہی ایک خوشی یہ بھی تھی کہ میں ایک صحیح لڑکی کا مددگار ہوں۔

اگلی صبح بیدار ہونے سے قبل ہی تعزیت کرنے والے پہنچنے شروع ہو گئے اور انہی میں مجھے تازیہ بھی نظر آئی جس نے میز بانی کی ڈسے داریاں سنبھال رکھی تھیں۔ اس نے خود کو مہمانوں کے کمرے سے دور رکھا تھا لیکن جس انداز میں کام ہو رہا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انتظام کسی سلیقہ مند ہاتھوں میں ہے۔ شام میں دیر تک وہ نظر آتی رہی اور پھر چپکے سے غائب ہو گئی۔ رات گئے جب مہمانوں کا سلسلہ ختم ہوا تب ملازمین نے بتایا کہ تازیہ بی بی نے یہ کہہ کر گئی تھیں کہ صبح ان کا ٹیسٹ ہے اور انہیں کچھ تیاری کرنی ہے۔

وہ کمرے میں واپس آ چکی تھی۔ مجھے احساس نہ ہو سکا۔ جب اس نے مخاطب کیا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جو الزام تم نے لگائے ہیں، اس کے بعد ہمارا ساتھ رہنا ناممکن ہے۔“ اس نے کہا لیکن میں مسکرا دیا۔

”ابھی تو کتاب کا پہلا ورق کھلا ہے اور تم.....“ میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔

”میں تمہارے بقیہ گھنٹا الزامات کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔“ اس نے سچ انداز میں کہا۔

”میں پھر کہوں گا کہ میں کوئی الزام عائد نہیں کر رہا۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”یہ کیا ہے جو تم کہہ رہے ہو؟“ اس کے لہجے کی تلتلی برقرار تھی۔

”اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے ایک لڑکی کی کوشش بیان کر رہا ہوں جسے میں نے کبھی برا نہیں سمجھا۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”ندیم اور سعید کے ذکر کو کیا کہو گے؟“ اس کا انداز جارحانہ تھا۔

”نا کام کوششوں کو ہر شخص فراموش کرنا چاہتا ہے لیکن وہ پھر بھی ماضی کا حصہ ہوتی ہیں۔“ میں نے جواب دیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہے۔

”تم نے یہ بھی کہا میں نے تمہاری بیگم کے بعد.....“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”جوابات میں نے کبھی تھی، وہ صرف اتنی تھی کہ پہلی بار تمہیں لاشعوری طور پر یہ احساس ہوا تھا کہ میرے ساتھ

”تمہیں زندگی کی کون سی آسائشیں حاصل ہو سکتی ہیں۔“ میں نے کہا تو اس کی گردن نفی میں مل گئی۔
 ”ایسا کوئی خیال میرے دل میں نہیں تھا۔“ اس نے تردید کرنی چاہی۔

”لیکن یہاں میں یہ اعتراف کرتا چاہتا ہوں کہ ان تین چار دنوں میں، میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں تمہیں بڑھاوا دوں گا۔“ میں نے کہا تو وہ بری طرح چونک گئی۔ کچھ دیر وہ صرف خاموشی سے دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر یہ مسکراہٹ گہری ہوئی چلی گئی۔

”احتشام صاحب! آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں بغیر سوچے سمجھے بات نہیں کرتا اور اس حساس موضوع پر تو.....“ میں نے کہا تو وہ بخیدہ ہوتی چلی گئی۔

”جو الزام آپ مجھ پر عائد کر رہے تھے، آپ اس کی تردید کر رہے ہیں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”جس انداز میں تم مرسیڈیز میں بیٹھی تھیں، جو انداز ہوٹل پر تمہارا کھانے کے دوران تھا، جس طریقے سے تم نے گھر پر کنٹرول کیا اور ملازم کو لے کر شاپنگ کی تھی، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا.....“ میں کہہ رہا تھا کہ اس نے قطع کلامی کی۔

”اس نتیجے پر پہنچا کہ میں تمہاری مرحوم بیوی کی جگہ لیتا چاہ رہی ہوں۔“ اس نے اپنے طور پر میرا فقرہ عمل کیا۔

”اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ تم زندگی کی سبکدوشی حاصل کرنا چاہتی ہو۔“ میں نے اس کے فقرے کی تصحیح کی تو وہ طنزیہ ہنسی ہنس دی۔

”لوئر مڈل کلاس کی لڑکی امراء کی محفل میں شامل ہونا چاہتی ہے۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہی میں نے تم پر آہستہ آہستہ آسائشیں بڑھانی تھیں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”اب تک آپ کہتے رہے تھے کہ میں نے آپ کے گلے پر کر شادی کی تھی اور اب کہہ رہے ہیں کہ ایک پلان کے ساتھ آپ نے یہ سب کیا تھا۔“ اس کے لہجے میں طنز کے علاوہ کچھ نہیں تھا لیکن میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

”میں نے گفتگو کی ابتدا میں کہا تھا کہ شر آتا ہے شکار کرنے اور چارے کو آسان شکار سمجھتا ہے لیکن خود شکار ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا تو اس کے چہرے پر اس طرح کا تاثر ابھر اچھے بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آگئی ہو۔

”تو وہ سب میرے لیے چارہ تھا؟“ اس نے سوال کیا۔

”چارہ تو بعد میں لگا تھا ڈاکٹر نازیہ عبد الستینؑ یہ سب تو ہانکا تھا۔“ میں نے کہا اور ہنس دیا۔

”چارہ تھا یا ہانکا لیکن شکار تو مجھے کیا گیا۔“ اس نے آہستگی کے ساتھ کہا۔

”تم آسائشوں کی عادی ہوئے لگیں۔ تمہیں کارل مگنی پھر ہفتے میں دو بار فائیو اسٹار ہوٹلز میں ڈنر اور لچ کرنے لگیں۔“ میں نے کہا۔

”تم تو کہتے تھے کہ تمہیں میرے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔“ اس نے کہا لیکن جو تاثر اس کے لہجے میں تھا، وہ کچھ عجیب سا تھا۔

”تمہاری فرمائشیں بڑھتی رہیں اور میں اسے پوری کر تا رہا کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارے خواہوں کو صرف میں حقیقت میں بدل سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”بقول تمہارا کہ تم میرے گرد ہانکا کرتے رہے اور میں تمہارے جال میں الجھتی چلی گئی۔“ اس کے لہجے میں تاسف نمایاں تھا۔

”تم نے تاج محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور میں نے تمہاری اور تمہاری خالہ کی بکنگ انڈیا کے پانچ شہروں کے اعلیٰ ہوٹلوں میں کروادی۔“ میں نے کہا۔

”میں تسلیم کرتی ہوں کہ تجربے کی حیثیت ہوئی۔“ اس نے کہا تو میں ہنس دیا۔

”جب تم نے شادی کی خواہش کی تھی تو تم ستائیس سال کی تھیں اور میں اٹھاون برس کا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”میں تسلیم کر چکی ہوں کہ تجربہ جیت گیا۔“ اس نے اپنی بات دہرائی لیکن اس بار طنزیہ انداز بڑھ گیا تھا۔

”ابھی حقائق کے کچھ اور باب کھلنے ہیں لیکن اس وقت میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور وہ جو لائق ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی، متوجہ ہو گئی۔

”اور وہ کچھ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں تمہیں کسی طور پر نقصان پہنچاتا نہیں دیکھ سکتا، چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔“ میں نے دونوں کے انداز میں کہا۔

”مجھ میں اپنا اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت ہے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”ایک لمحے پہلے تم کچھ اور تسلیم کر چکی ہو اور میں پورے ثبوت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ تم گہری کھائی میں چھلانگ لگا رہی ہو۔“ میں نے کہا تو وہ دوبارہ سے بیٹھ گئی۔

”کیسے ثبوت.....؟“ اس نے سوال کیا۔ اس کے انداز میں تجسس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”بات اگر ایک جوان لڑکی کو حاصل کرنے کی ہوتی تو اس سے بہت کم سرمائے میں حاصل ہو سکتی تھی۔“ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کیا۔

”تو پھر بات کیا تھی؟“ سوال کرتے ہوئے وہ بے اختیار کچھ آگے ہوئی۔

”ایک دوسرے انداز سے میں نے تمہارے بارے میں سوچنا شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ تم میرے حواس پر قابو پا رہی ہو۔“ میں نے کہا۔ وہ خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو۔

”اور پھر آپ نے وہ کچھ کیا.....“ کچھ دیر بعد اس نے سوال کیا۔

”میں جانتا تھا کہ ستائیس برس کی لڑکی اٹھاون برس کے بوڑھے سے محبت نہیں کر سکتی۔“ میں نے جواب دیا۔

”احتشام..... آپ غلط.....“ اس کے ہونٹوں سے لفظ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

”میں یہ حقیقت بہت پہلے تسلیم کر چکا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے یہ انداز بھی تھا کہ تمہارے بغیر زندگی اور بھی مشکل ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”شاید آپ پوری طرح صحیح نہیں ہیں۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا تھا لیکن اسے اپنی آواز بہت کم سنا ہی دی ہوگی اور میں نے بھی فوری طور پر اس کی تردید نہیں کی۔

”میں نے ابتدا میں تم سے کہا تھا کہ چارے کو آسان شکار سمجھ کر شیر اس کی جانب پوری خود اعتمادی سے بڑھتا ہے لیکن شکار کرنے کے بجائے خود شکار ہو جاتا ہے۔“ میں نے ایک وقفے کے بعد دوبارہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تو وہ ہنس دی۔

”پھر آگیا وہ شیر کا شکار۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ ہنس دی۔

اس کی ہنسی میں پھر سے وہ کھٹکناہٹ آگئی تھی جو کبھی مجھے متناظر کی طرح اپنی جانب پھینکتی تھی۔ ایک بار میرا دل چاہا کہ میں مزید تلخ حقائق پر سے پردہ نہ ہٹاؤں لیکن پھر میں نے خود ہی اپنی تردید کر دی۔

”تم تذبذب کی حالت میں تھیں جب میں نے تمہیں چارے کی جانب متوجہ کیا تھا۔“ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر چونک گئی۔

”کون سا چارہ؟“ اس نے چونک کر کہا۔

”تم نے میری بیماری کی جو رپورٹیں دیکھی تھیں.....“ میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ درمیان میں بول پڑی۔

”وہ سب جھوٹی تھیں؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں بہت پہلے اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔“ اس نے کہا۔

”اس وقت جب میں لندن علاج کے لیے جا رہا تھا اور ڈرائنگ روم میں تم نے وہ رپورٹیں دیکھی تھیں، تب اس نتیجے پر نہیں پہنچی تھیں۔“ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

”آپ فخریہ طور پر لوگوں کو بتا سکتے ہیں کہ آپ کا یہ وار بھی بھر پور طور پر کامیاب رہا تھا۔“ اس نے طنز کیا۔

”یہ بات تو میں نے بھی تم سے بھی نہیں کی۔“ میں نے جواب دیا۔

”جس جان لیوا بیماری کی رپورٹیں آپ نے جالا کی سے مجھ تک پہنچوائی تھیں، اس کے بعد ہی میں فیصلے پر پہنچی تھی لیکن اس طرح نہیں جس طرح آپ سمجھ رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”میں غلط ہوں تو آپ صحیح فرمادیں۔“ میں نے کہا تو وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

”نزد سسٹم کی اس بیماری میں مریض انچ انچ کر کے مرتا ہے۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔

”میں جانتا ہوں۔“

”رپورٹس دیکھنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

”لیکن اس میں مریض بچ بھی جاتا ہے۔“ میں نے وہی کہا جو ڈاکٹر نے مجھے سمجھا تھا۔

”سو میں شاید دو یا تین۔“ اس کا جواب تھا۔

”ہاں..... لیکن.....“ میں نے کہنا چاہا مگر پھر خاموش ہو گیا۔

بہر حال یہ اس کا شعبہ تھا۔

”آپ کی ناکام خانگی زندگی کے بارے میں میرے علم میں سب کچھ تھا۔“ اس نے کہا اور پھر رک گئی۔

”مثلاً کیا کچھ علم میں تھا؟“ میں نے سوال کیا لیکن اس نے میرے سوال کو مکمل نظر انداز کر دیا۔

”میرا فیصلہ تھا کہ ان قسم ہوتے ہوئے لحوں میں کچھ ایسا دوں گی جو اس سے پہلے آپ کو نہیں ملا تھا۔“ اس نے..

”ٹوک انداز میں کہا۔

”اور سال ڈیڑھ سال بعد تمام جانندا بھی تمہارے پاس۔“ میں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

”تین برس میں کتنی بار میں نے وارثت کے بارے میں بات کی؟“ اس نے سوال کیا۔

”تم جانتی ہو کہ وہ دونوں شاید میرے جنازے میں بھی نہ آئیں۔“ میں نے کہا تو وہ آہستہ سے ہنس دی۔
”وہ آپ کے بیٹے ہیں۔ جنازے میں شاید نہ آئیں لیکن جائداد کا حصہ لینے ضرور آئیں گے۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

وہ خاموش ہوئی تو ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے پھر خاموشی کا یہ وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ میرے پاس کہنے کو اب بھی بہت کچھ تھا لیکن میں مزید کچھ کہنے سے گریز کرتا رہا۔

”اگر تم سمجھ رہی تھیں کہ تمہاری آئندہ زندگی احسان کے ساتھ بہتر طور پر گزر سکتی ہے تو.....“ ایک نیچے پر ہنچ کر میں نے کہا۔

”میرا خیال یہی تھا۔“ اس نے کہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

میرے علم میں تھا کہ ان دونوں نے تعلیم جاری رکھنے کے لیے امریکا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ تعلیمی اخراجات کے لیے تازہ کے اکاؤنٹ میں رقم موجود تھی۔ احسان اور تازیہ کو ملوانے میں تازیہ کی سہیلی فوزیہ کا ہم کردار رہا تھا۔ تازیہ کی طرح احسان بھی مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ پانچ برس پہلے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد وہ اپنے گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے نوکریاں کر رہا تھا کیونکہ باپ کی موت کے بعد وہ گھر کا واحد نفیل تھا۔

”میرا خیال ہے مجھے تمہاری اس خواہش کا بھی احترام کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”آپ نے میرے فقرے پر غور نہیں کیا۔“ میں فیصلہ کن انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا تو اس نے مجھے روکنے کے انداز میں کہا۔

”تم نے کیا کہا تھا؟“ میں نے اس کے الفاظ دہرانے چاہے لیکن میں الجھ کر رہ گیا۔

”میں نے کہا تھا کہ میرا خیال یہی تھا۔“ اس نے اپنا فقرہ دہرایا۔

”تمہارا مطلب یہ تھا کہ.....“ میں نے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ شریک حیات اسے بنانا چاہیے جو آپ سے محبت کرے۔“ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے اپنی جگہ دوبارہ بیٹھے بغیر سوال کیا۔

”یہ بھی پڑھا کہ اس کی شریک حیات نہ بنو جس سے محبت کرتے ہو۔“ اس نے کہا اور یہ کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”نازیہ.....“ میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔

”ہم دونوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے احتشام۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا لیکن میں خاموش رہا۔ ”تم کسی غلط فہمی میں تھے اور میری غلط فہمی کچھ اور تھی۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی۔

”تم شاید یہ سمجھ رہی.....“ میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے میرے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

”جو کچھ کہنا تھا اور جو کچھ سننا تھا، وہ ہم دونوں ہی کہہ اور سن چکے۔“ اس نے مجھے خاموش کر کے اپنی بات مکمل کی۔
”میں یہ کہنا چاہ رہا تھا.....“ میں نے دوبارہ سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”احتشام! تمہارے اعتراضات محبت کے بعد میں ایک نئی کیفیت میں ہوں، میرا شراب نہ کرو۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

”تمہاری یہ بات بھی مان لیتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم عورت ہوتے تو سمجھتے کہ عورت ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچ جاتی ہے جب اس کا شوہر اعتراف کر لے کہ وہ اسے والہانہ چاہتا ہے۔“ اس نے کہا اور باہر کی جانب جانے لگی۔
”کہاں.....؟“ میں نے سوال کیا تو وہ رک گئی۔

”فون کر رہی ہوں کہ میرے تمام پروگرام کینسل۔“ اس نے کہا اور باہر کی جانب چل دی۔

وہ قدم بہ قدم جاری تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مجھ سے دور جارہی ہے یا میرے قریب آ رہی ہے۔ اس نے دروازہ کھولا لیکن فوراً ہی باہر گئی کیونکہ دروازے پر درک گئی اور پھر درک دیکھا۔

”ایک بات کہوں احتشام!“ اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھے مخاطب کیا۔

”وہ کیا.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”کچھ کہنے سے قبل اس نے قدم اٹھایا پھر رکی اور کہا۔
”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور..... سب کے لیے جائز ہے۔“ وہ چلی گئی لیکن میں دیرنگ سوچتا رہا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ مجھے جواز مہیا کر رہی تھی..... ”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور..... سب کے لیے جائز ہے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام

رضوانہ ساجد

تیسرا اور آخری حصہ



رب کائنات کی منشا اور حکمت عملی کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ قدرت کا قانون ہے کہ جب اندھیرا حد سے بڑھ جائے تو کہیں قریب ہی اجالا چھپا ہوتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے ظلمت کی یہ چادر سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب مخلوق اپنے خالق سے غافل ہو کر بت پرستی میں مشغول تھی اور صنم خانہ آباد تھے ایسے میں اللہ تعالیٰ کو معجزہ دکھانا مقصود ہوا اور جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زمین پر اتارا جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ذات کے ہونے کی وجہ تلاش کرنے... اپنے خالق کی جستجو اور تسلیم و رضا کے سانچے میں ڈھلنے میں گزرا... اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے خدائوں کو زمین بوس کر کے آپ اللہ نے کسی معبود کے ہونے کا یقین دلا یا اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا... حتیٰ کہ انہی کوششوں میں حج بیت اللہ کے مناسک بھی رقم ہو گئے جن پر رہتی دنیا تک تمام مسلمانان عالم کو عمل کرنا ہے۔

نمرود سے ٹکرانے اور اللہ کی آزمائشوں پر پورا اترنے والے جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات

اس روز حضرت ابراہیم علیہ السلام بے حد ادا اس تھے۔ ادا سی کا بہ ظاہر کوئی سبب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو ادا سی گھر کے آگن میں پھیلی ہوئی تھی اُس کے تودہ عادی ہو چکے تھے لیکن آج ماجرا کچھ دوسرا ہی تھا۔ اللہ نے بڑی دعاؤں کے بعد ایک بیٹا دیا تھا وہ نظروں سے دور ہو گیا تھا۔ مکہ کے صحرا میں بنو جرہم کے بچوں کے ساتھ کھیل کود کر بڑا ہو رہا تھا۔ ابھی بھی اسے جا کر دیکھ لیتے آتے تھے لیکن کوئی دوسری اولاد نہیں تھی جسے ہر وقت آنکھوں کی ٹھنڈک

بنائے رکھتے۔

قربانی کا واقعہ گزر چکا تھا اور اب حضرت اسماعیل علیہ السلام عمر کی تیرہ منزلیں طے کر چکے تھے۔ ادا سی نے ایسا زور باندھا کہ آپ اس خیال سے شہر سے باہر نکل گئے کہ شاید کوئی اجنبی مل جائے اور اسے مہمان بنا کر گھر لے آئیں۔ کچھ دیر اس کی صحبت سے لطف اندوز ہوں، جی بھل جائے۔ آپ ابھی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سیر میں مشغول تھے کہ تین حسین نوجوان دکھائی دیے۔ غور کیا تو یقیناً اجنبی تھے، اس سے پہلے انہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ ان کے اتنے قریب چلے گئے کہ وہ آسانی سے آپ کی بات سن سکیں۔ ”تم تو اجنبی معلوم ہوتے ہو۔“

”آپ نے شک کیجنا۔ ہم اس زمین کے نہیں ہیں۔ ہمارا مطلب ہے ہم آج ہی یہاں آئے ہیں۔“

”خدا جانے کتنی دور سے آ رہے ہو۔ تھک گئے ہو گے؟“

”ہاں تھکن تو ہو گئی ہے۔“

”اگر آپ لوگ مجھے میزبانی کا موقع دیں تو میں آپ کو آرام کی جگہ بٹھاؤں اور بھوک مٹانے کا کچھ بندوبست کروں۔“

”آپ تو ہمیں بہت مہربان آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ہم آپ کی پیشکش ٹھکرا سکتے ہیں؟“

وہ تینوں مہمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ آپ کے گھر چلے آئے۔ آپ نے ان کے لیے پانی کا برتن لا کر رکھ دیا تاکہ وہ ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنے غلام ابیہر کو حکم دیا کہ وہ ریوڑ سے ایک بچھڑا نکال کر ذبح کرے اور اسے بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کرے۔

جب دسترخوان رچ گیا اور بھنا ہوا گوشت مہمانوں کے سامنے رکھ دیا گیا تو دستور کے مطابق حضرت سارہ مہمانوں کی پشت کی جانب کھڑی ہو گئیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام منتظر تھے کہ مہمان کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائیں تو وہ بھی کھانا شروع کر دیں لیکن مہمان ہاتھ بڑھانے کے بجائے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ کہنے کے باوجود ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ رواج تھا کہ دشمن ایک دوسرے کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک گزرا کہ وہ دشمنوں کو گھر لے آئے ہیں۔

”آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ کیا مجھ سے آپ کی کوئی چھپی ہوئی دشمنی ہے؟“

”یہ بات نہیں بلکہ ہمیں کھانے سے کیا سروکار۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”اے ابراہیم! خوف نہ کھاؤ۔“ نوجوانوں نے کہا۔ ”ہم دشمن نہیں اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور تمہیں خوش خبری

سانے آئے ہیں۔ تمہاری بیوی سارہ سے ایک بیٹا پیدا ہو گا۔ تم اس کا نام اسحق رکھنا۔“

سننے کی بات ہی تھی۔ حضرت سارہ کو خبر سن کر بے اختیار مسمیٰ آگئی۔ ”کیا میں اب اولاد کو جنم دوں گی جبکہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور یہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہو گئے ہیں اور پھر میں نوجوانی سے باندھ ہوں۔“

فرشتوں نے کہا۔ ”کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے۔ اے نبی کے گھر والو، تم پر خدا کی رحمت و برکت ہو۔ اللہ ہر طرح قابلِ حمد اور بزرگ ہے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی کچھ کم تعجب نہیں تھا کیونکہ ان کی عمر سو کے قریب ہو رہی تھی۔ فرشتوں نے ان کے تعجب کو پچھانا اور انہیں مزید مضبوط کیا۔

”آپ مایوس ہونے والوں میں نہ ہوں۔ آپ کو حق تعالیٰ نے اسحق اور اس کے بیٹے یعقوب کی بشارت دی ہے۔“

قرآن پاک کے الفاظ یہ ہیں۔

”اور ابراہیم (علیہ السلام) کی بیوی کھڑی ہنس رہی تھی۔ پس ہم نے اسحق کو اور اس کے بعد (اس کے بیٹے) یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی۔“

وہ فرشتے یہ خوش خبری سنانے کے بعد رخصت ہو گئے۔

چراغ درمیان میں تھا۔ ایک طرف حضرت ابراہیم بیٹھے تھے دوسری جانب حضرت سارہ تھیں۔ دونوں خاموش تھے۔ جیسے بولنے کے لیے کسی کے پاس بھی کچھ نہ ہو۔

”کیا جو کچھ ہم نے سنا ہے وہی ہے؟“ حضرت سارہ نے ہمت کر کے کہا۔

”کیا تم خدا کی ذات سے مایوس ہو؟“

”اگر ایسا ہوا تو میری طرح دوسرے بھی نہیں گے۔“

”وہ اگر بیٹے تو خدا پر نہیں گے۔“ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ ”تمہیں یاد ہے، میں اسماعیل کے چلے جانے پر

کتنا اداس تھا۔ اب میں اس کی جدائی کا دکھ بھول جاؤں گا۔“

”اب آپ چاہیں تو اسماعیل کو واپس لے آئیں۔ اب میں باجرہ سے کیوں حسد کرنے لگی۔“

”میں خدا کے حکم سے ماں بیٹے کو فاران کی وادیوں میں چھوڑ کر آیا تھا۔ خدا کا حکم ہوا تو آجائے گا۔ اب تو تم اسحق کے

آنے کا انتظار کرو۔“

حضرت اسحق علیہ السلام کی بشارت کے بعد بھی آپ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خیال رہتا تھا اور آپ ان کے حق میں

دعائیں کرتے رہتے تھے۔

”کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا یہ جواب دیا۔

”اسماعیل کے حق میں، میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس کے بارہ

سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔“ (توریت، باب پیدائش)

☆☆☆

حضرت اسحق علیہ السلام کی پیدائش ہو چکی تھی۔ حضرت سارہ کو اس بڑھاپے میں کھلو تامل گیا تھا۔ قبیلے میں کچھ دن سب

کو تعجب ہوتا رہا اور پھر خدا کی شان سمجھ کر حضرت اسحق علیہ السلام کو قبول کر لیا گیا۔

حضرت اسحق علیہ السلام کی پرورش ناز و نعم میں ہو رہی تھی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام لڑپن کی حدود سے نکل کر جوانی کی عمر میں داخل ہوئے تو ظاہری حسن و جمال میں یکساں تھے۔

حضرت باجرہ کو آپ کی شادی کی فکر ہوئی۔

یہ سعد بن اسامہ بن اکیل العلبائی کا گھر تھا جہاں حضرت باجرہ داخل ہوئی تھیں اور اس لڑکی کا نام عمارہ تھا جس کو آپ

نے حضرت اسماعیل کی ولہن کے طور پر منتخب کیا۔

ایسے با برکت خاندان میں کون شادی کے لیے تیار نہ ہوتا۔ ایک مقررہ تاریخ کو آپ کی شادی عمل میں آگئی۔

اس شادی کے کچھ عرصے بعد حضرت باجرہ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عرصہ ہوا، مکہ نہ جاسکے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش اور پھر حضرت سارہ کی کچھ

عرصہ تک بیمار ہی نے آپ کو فلسطین سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ اس روز بھی بس بیٹھے بیٹھے خیال سا آیا۔

”بہت دن ہو گئے، میں اسحق میں ایسا کھویا کہ اسماعیل کو دیکھنے تک نہ جاسکا۔“ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت

سارہ سے کہا۔

”میں تو خود آپ سے کہنے والی تھی اور یہ بھی کہنے والی تھی کہ بس خیریت پوچھ کر چلے آئیے گا۔ میں زیادہ دن آپ کی

جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔“

”بس اسماعیل کو دیکھوں گا اور زیادہ سے زیادہ ایک شب کے قیام کے بعد چلا آؤں گا۔“

آپ اپنے گدھے پر سوار ہوئے۔ راستے کے لیے کھانے کا کچھ سامان لیا اور روانہ ہو گئے۔

آپ مکہ پہنچے تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ حضرت باجرہ انتقال کر گئی تھیں اور معلوم ہوا حضرت اسماعیل علیہ السلام نے شادی

کر لی ہے۔

آپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر پہنچے تو اتفاق سے حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر پر نہیں تھے۔ ایک عورت

دروازے پر آئی۔ یہ یقیناً آپ کی بھوتی لیکن اپنے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔
اس عورت نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں جس انداز سے باتیں کیں اس سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کے درمیان محبت نہیں ہے بلکہ عورت بد زبان بھی ہے۔ آپ سخت مایوس ہوئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا انتظار کیے بغیر واپسی کا ارادہ کر لیا۔

”تمہارا شوہر واپس آئے تو اس سے کہنا جو آئے تھے، وہ کہہ گئے ہیں کہ اپنی چوکھٹ بدل لو۔“

”آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔“

”بس میرا حلیہ بتا دینا وہ سمجھ جائے گا۔“

وہ عورت یہ کہتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔ ”عجب آدمی ہے، نام تک نہیں بتایا۔“

گھر کے اندر پہنچ کر وہ آپ کے بارے میں سوچنے بیٹھ گئی۔ کچھ اور تو یاد نہیں رہا بس یہ جملہ ہر آتی رہی۔ ”تیرا شوہر

آئے تو اس سے کہنا اپنی چوکھٹ بدل لے۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر واپس آئے تو بیوی نے سب سے پہلے یہی بات کی۔

”ایک بزرگ آئے تھے۔ کچھ دیر وہ ہمارے بارے میں پوچھتے رہے۔ پھر یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ اپنے شوہر سے

کہنا اپنی چوکھٹ بدل لے۔“

”جانتی ہو وہ کون تھے؟ وہ میرے والد محترم تھے۔ چوکھٹ بدلنے سے مراد یہ ہے کہ وہ مجھے حکم کر گئے ہیں کہ میں تجھے

خود سے جدا کر دوں لہذا تو اپنے گھر والوں میں چلی جا۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اسے طلاق دے دی۔ بعد میں آپ نے بنی جرہم کی ایک اور خاتون سے شادی کر لی۔

کچھ عرصے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام دوبارہ تشریف لائے۔ اس مرتبہ بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو گھر پر موجود نہ پایا۔

اس مرتبہ اس نئی بھوک خوش اخلاق اور شکرگزار پایا تو فرمایا۔ ”جب تیرا شوہر آجائے تو اس سے میرا سلام کہنا اور میری

طرف سے حکم دینا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ کو برقرار رکھے۔“

☆☆☆

حضرت اہلق علیہ السلام کی خوش خبری کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے گزارش کی تھی۔ ”کاش! اسماعیل

بھی تیرے حضور اسی طرح حیات رہے۔“ یعنی اس پر بھی برکتوں کی بارش ہو۔

خدا نے جواب دیا تھا۔ ”اسماعیل کے لیے میں آپ کی دعا قبول کرتا ہوں اور اس پر برکتوں کی بارش کرتا ہوں۔“

اس برکت کا غہور اس طرح ہوا کہ زمین پر پہلا گھر جو خدا نے اپنی عبادت کے لیے مقرر کیا (خانہ کعبہ) اس کی تعمیر میں

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو شامل کیا گیا۔

اس وقت تک بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لیے ہیکل اور مندر موجود تھے۔ جہاں جہاں آبادی تھی ان بتوں کے نام

پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو حید کا درس دے رہے تھے لیکن زمین کے کسی حصے پر آپ کے

ماننے والوں کے لیے کوئی گھر تعمیر نہیں ہوا تھا اور نہ آپ کو کبھی خیال آیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ زمین والوں کے لیے خدا کی عبادت کے لیے ایک گھر زمین پر بناؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکم الہی سن لیا لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ گھر کس جگہ تعمیر کیا جائے۔

”اے اللہ! میں تیرا گھر کہاں بناؤں؟ میں بے خبر ہوں۔“

خدا نے یہ پکار بھیجی کہ ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ کا ٹھکانا بتا دیا۔

بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی راہنمائی کے لیے سکینہ (ایک ہوا) نازل فرمائی جو مجسم تھی۔ اس سے

مذکورہ جگہ دکھانے میں آپ کی راہنمائی ہوئی۔ وہ اس کے اشارے پر چل پڑے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس راہنمائی کے لیے اللہ

تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو بھیجا تھا اور انہوں نے یہ بتایا کہ کام کس طرح کرنا ہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ پہنچے تو وہاں

موجود بیت اللہ کے مقام پر سر کے برابر ایک پرندہ دیکھا۔ اس پرندے نے کہا کہ میرے سائے کے نیچے تعمیر کیجیے اور اس میں

کی پیشی نہ کیجیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام تعمیر کی تلاش میں گھر سے نکلے تو سکینہ (ایک ہوا) آپ کی راہنمائی کرتی ہوئی آپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ جب اس کا رخ مکہ کی طرف ہوا تو آپ بے حد خوش ہوئے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان یاد آگیا کہ میں اسماعیل (علیہ السلام) کو برکت دوں گا۔ ہوا اس بستی تک آگئی جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ اس ہوانے ایک ابھرے ہوئے ٹیلے کے گرد چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ پھر ہوا چلنا بند ہوگئی۔ نشاندہی ہوئی تھی کہ تعمیر یہاں کرنی ہے۔

نشاندہی ہو جانے کے بعد آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات کی۔
”اسماعیل، تیرے رب نے اس زمین پر اپنا گھر تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے۔“
”اس کی اطاعت کیجیے۔“

”اس نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کرو گے۔“
”آپ نہ بھی کہتے تو یہ سعادت میں اپنے حصے میں لیتا۔ میرے پاس کھدائی کے لیے اوزار بھی ہیں اور تجربہ بھی۔“
پھر جبرم کے لوگوں نے ایک روح پرورد منظور دیکھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام قریب کے پہاڑوں سے پتھر لارہے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بنیادیں بھر رہے تھے اور زبان پر یہ دعا تھی۔

”اے پروردگار! ہمارا یہ عمل قبول ہو۔ بلاشبہ تویی ہے جو دعائوں کو سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم ہو جائیں اور ہماری نسل سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر دے جو تیرے حکم کی فرماں بردار ہو۔ خدایا! ہماری عبادت کے طور طریقے بتادے اور ہمارے قصوروں کو درگزر کر بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحمان درگزر کی کوئی انتہا نہیں اور خدایا ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے۔“ (البقرہ)

ایک معمار تھا، ایک مزدور۔ دیواریں بلند ہونے لگیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر دیتے جاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام..... انہیں اوپر تلے رکھتے جاتے تھے۔

اس مقام کو جہاں ایک بڑے پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام دیواریں اٹھا رہے تھے ”مقام ابراہیم“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس مقام ابراہیم میں پتھر پر اللہ کے دوست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نشانات قدم اول اسلام سے اب تک موجود ہیں۔

جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں آج حجر اسود نصب ہے تو جبریل علیہ السلام نے ان کی راہنمائی کی اور حجر اسود کو ان کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ رکھ کر دیا جس کو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے۔

”ابا جان یہ پتھر کون آپ کے پاس لایا؟“ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا۔

”وہ جس نے تجھے پر بھروسہ کیا۔ یہ پتھر جبریل علیہ السلام لے کر آئے ہیں۔“

جب کیجیے تعمیر مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ یہ ملت ابراہیمی کے لیے (قبلہ) اور ہمارے سامنے سجدے کا نشان ہے اس لیے کو حید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر سے فارغ ہوئے تو حکم دیا کہ حج کے لیے لوگوں کو آواز دو۔ عرض کیا۔ ”اے میرے رب میری آواز کہاں تک پہنچے گی؟“

فرمایا۔ ”تمہارے ذمے آواز دینا ہے اور ہمارے ذمے اس کا پہنچانا۔“ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آواز دی۔
”اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج بیت اللہ فرض کیا ہے۔“

زمین و آسمان کی تمام مخلوقات نے یہ آواز سنی۔
حضور اکرم ﷺ اور بعض صحابہؓ سے مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسک حج سکھاتے رہے۔

بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس جگہ پر ایک گنبد بنا دیا تھا اور فرشتوں نے ان سے

کہا تھا کہ ہم آپ سے پہلے اس کا طواف کر چکے ہیں اور کشتی نوح نے بھی چالیس دن تک اس کا طواف کیا تھا۔ اس کے برعکس قرآن مجید نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

”بلاشبہ پہلا گھر جو انسان کے لیے بنایا گیا وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔“ صحیح یہ ہے کہ اس سے پہلے یہاں کوئی عمارت نہیں تھی بلکہ یہ جگہ بانی جگہ سے کچھ ابھری ہوئی تھی۔ اس کے ابھرے... ہونے کی وجہ یہ تھی کہ خدا کے علم اور ارادے سے وہ جگہ بیت اللہ کے لیے مقرر ہو گئی تھی۔ حضور اکرم ﷺ سے بھی کہیں مروی نہیں کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنانے سے پہلے تعمیر شدہ تھا۔ یہ اعزاز حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ملنا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کعبۃ اللہ کا پہلا متولی مقرر فرمایا اور خود واپس چلے آئے۔

☆☆☆

وقت کی جب سے چالیس قیسی تھے گر چکے تھے یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ابھی زندہ تھے اور حضرت سارہ بھی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نبوت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدے کے مطابق آپ کو کثرتِ اولاد سے نوازا تھا۔ انہی اولادوں سے آگے چل کر خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کا ظہور میں آنا مقدر ہو چکا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سال خوردہ خاندان کو اپنے پاس بلایا۔

”تو اپنا ہاتھ میری ران کے نیچے رکھ کہ میں تجھ سے قسم لوں۔“

قسم لینے کا یہی طریقہ اس وقت رائج تھا۔ خاندان نے جس کا نام الیجر رد مشقی تھا، اپنا ہاتھ آپ کی ران کے نیچے رکھا اور سوال طلب نگاہوں سے آپ کی طرف دیکھنے لگا کہ دیکھو کیا قسم لیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہنا شروع کیا۔ ”میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اسحاق (علیہ السلام) کی شادی فلسطین کے ان کنعانی خاندانوں میں ہرگز نہیں کروں گا، بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں۔“

”آقا ایسا ہی ہوگا۔“

”وعدہ کر کہ تو میرے وطن فدان آرام میں میرے رشتہ داروں کے پاس جا کر میرے بیٹے اسحاق کے لیے بیوی لائے گا۔“

”ہو سکتا ہے وہ عورت میرے ساتھ نہ آنا چاہے۔ تو کیا میں اسحاق کو اپنے ساتھ لے جاؤں؟“

”میرے خدا نے مجھے وہاں سے نکالا ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ میری نسل کو یہ ملک دے گا۔ اب اسی خدا کا منشا یہ ہے کہ اسحاق وہاں نہ جائے۔ خدا نے چاہا تو وہ عورت تیرے ساتھ چلی آئے گی۔ بس تو وہاں بیٹا ایل (آپ کے بیٹے کا نام) کے گھر جا اور اس کی بیٹی ربقہ کا رشتہ مانگ۔“

الیجر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اونٹوں میں سے دس اونٹ ساتھ لیے اور ان پر بیٹس بھارتھ لاد کر روانہ ہوا۔ جب وہ اس شہر میں پہنچا تو ایک کنوئیں کے سامنے اپنے اونٹوں کو بٹھا دیا اور خدا سے یوں دعا ہو گوا۔

”اے خدا! میں تیری منت کرتا ہوں کہ آج تو میرا کام بنا دے۔ دیکھ میں پانی کے چشمے پر کھڑا ہوں۔ یہاں اس شہر کی بیٹیاں پانی بھرنے کو آتی ہیں۔ تیرا کرم ہو تو ایسا ہو کہ جس لڑکی سے میں کہوں کہ مجھے پانی پلا دے اور وہ کہے لے پی لے اور میرے اونٹوں کو بھی پلا دے تو وہ وہی ہو جسے تو نے اپنے بندے اسحاق کے لیے بھرا دیا ہے۔“

خدا کو کرم کرنا مقصود تھا کہ اسی وقت ربقہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی گور کی بیوی ملکہ کے بیٹے بیتا ایل سے پیدا ہوئی تھی، اپنا گھڑا کندھے پر رکھ کر نکلی۔

الیجر نے اسے دیکھا تو اس کی طرف لپکا۔ وہ گھڑے میں پانی بھر چکی تھی کہ الیجر نے اس سے کہا۔ ”کیا تو مجھے پانی پلائے گی؟“

حکایت

شیخ ابوسعید عبداللہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”میری ایک سولہ سالہ لڑکی تھی۔ ایک روز چھت پر گئی اور گم ہو گئی۔ ہر چند تلاش کی نہ ملی۔ حضرت غوث الثقلین کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا۔ فرمایا ”تم آج رات بغداد کے محلے خرابہ کرخ میں جا کر زمین پر ایک دائرہ کھینچو اور اس میں بیٹھ کر بسم اللہ علی بنت عبدالقادر پڑھتے رہو۔ رات کی تاریکی میں جنات کی ایک جماعت کا اس طرف سے گزر ہوگا، جن کی صورتیں مختلف ہوں گی۔ تم ان سے خوف نہ کھانا۔ صبح کے وقت جنات کا بادشاہ اپنے لشکر کے ساتھ وہاں سے گزرے گا۔ وہ تجھ سے کہے گا۔ بتاؤ کیا کام ہے؟ تم کہنا شیخ عبدالقادر جیلانی نے ہمیں تمہاری خدمت میں بھیجا ہے اور اپنی لڑکی کے گم ہونے کا واقعہ کہہ سنا۔“ پس اس نے ایسا ہی کیا جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا۔ جنات مگروہ درگروہ مختلف شکلوں میں اس طرف سے گزرتے لیکن اس دائرے کے پاس کوئی نہیں آتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کا بادشاہ کھوڑے پر سوار ایک بڑے لشکر کے ساتھ ظاہر ہوا اور دائرے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا ”تیرا کیا کام ہے؟“ میں نے کہا۔ ”شیخ عبدالقادر جیلانی نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ کھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ زمین چومی اور دائرے کے باہر بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا۔ ”کیوں بھیجا ہے؟“ میں نے لڑکی کے غائب ہوجانے کا واقعہ سنایا۔ ”اس نے حکم دیا۔“ اس کی لڑکی کو جو جن اٹھا کر لے گیا ہے وہ فوراً حاضر کیا جائے۔“ تھوڑی ہی دیر میں وہ جن مع لڑکی کے حاضر کیا گیا۔ یہ جن چین کے جنات میں سے تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا۔ ”کیا وجہ ہے کہ تو نے اس لڑکی کو حضرت غوث الاعظم کے حلقے سے اٹھالیا؟“ اس نے کہا۔ ”مجھے اچھی لگی تھی۔“ شاہ جنات نے حکم دیا کہ اس کا سر اڑا دیا جائے اور لڑکی کو میرے حوالے کر دیا۔ میں نے بادشاہ جنات سے پوچھا۔ ”تجھ سے زیادہ میں نے فرمانبردار شیخ کا کسی اور کو نہیں پایا، کیا وجہ ہے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم ان کے فرمانبردار کس طرح سے نہ ہوں۔ جب وہ گھر میں بیٹھ کر تمام دنیا کے جنات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ان کی ہیبت سے جنات ہمارے اٹھتے ہیں۔“



”کیوں نہیں۔“ اس نے کہا اور گھڑا جھکا دیا۔ جب وہ خوب سیر ہو کر پی چکا تو لڑکی نے کہا۔ ”تیرے اونٹ بھی تو پیاسے ہوں گے۔ میں تیرے اونٹوں کے لیے بھی پانی بھر بھراؤں گی۔ جب تک وہ پی نہ چکیں۔“ وہ گھڑے بھر بھر کر حوض میں ڈالتی رہی اور اونٹ پیتے رہے۔ وہ نشانیاں ظاہر ہو چکی تھیں جو ابو جبر نے اپنے خدا سے چاہی تھیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو اس کی لیے خدا نے منتخب کی ہے۔

”لڑکی تیرا نام کیا ہے؟“ ”میرا نام ربقہ ہے اور میں بیوہ ایل کی بیٹی ہوں۔“ ”خدا تجھے یہ نام مبارک کرے۔ کیا تیرے باپ کے گھر میں مجھے اور میرے اونٹوں کو جگہ مل جائے گی؟“ ”وہ ضرور تجھے مہمان بنائے گا۔ تو یہیں ٹھہر کر انتظار کر میں اپنی ماں کو خبر کرتی ہوں۔“ ربقہ دوڑی ہوئی گئی اور اپنی ماں کے سامنے تمام باتیں دہرا دیں۔

”وہ بہت مالدار آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دیکھ یہ سونے کے کڑے بھی اس نے مجھے دیے ہیں۔“ ربقہ کی ماں نے ربقہ کے بھائی لابن کو بلا یا اور اسے حکم دیا کہ چشمے پر جو آدمی کھڑا ہے اسے لے کر آ اور اس کے اونٹوں کے لیے بھوسے اور چارے کا انتظام کر۔

لابن گیا اور البعز رکو لے کر آ گیا۔ گھر کے ساتھ ہی جانوروں کا باڑا تھا۔ اونٹوں کو وہاں باندھ دیا گیا۔ البعز رہا تھمنہ دھو کر تازہ دم ہو گیا تو لابن کے نوکر اس کے لیے کھانا لے کر آ گئے۔

البعز نے کھانے میں اتھوڑنے سے انکار کر دیا۔

”میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک وہ مطلب بیان نہ کر لوں جس کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔“

”اے شخص! تیرا کیا مطلب ہے؟“

”بہتر ہوگا کہ اپنے باپ بیٹو ایل کو بھی یہاں بلا لو کیونکہ جو بات میں کہنے والا ہوں اس کا تعلق بیٹو ایل سے ہے۔“

وہ سب پریشان تھے کہ آخر ایسی کیا بات ہے جو وہ کہنے والا ہے۔ بہر حال لابن نے اپنے والد بیٹو ایل کو بھی بلا لیا اور البعز نے کہنا شروع کیا۔

”میں تمہارے رشتہ دار ابراہیم (علیہ السلام) کا نوکر ہوں۔ اس کو خدا نے بڑی برکت دی ہے اور وہ بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ اس کو خدا نے بھیڑ بکریاں، گائے تیل، سونا چاندی سب کچھ بخشا ہے۔ اس کی بیوی سارہ کا ایک بیٹا اخلق ہے۔ اسی کو اس نے سب کچھ دے دیا ہے اور اب اس کی شادی کی فکر ہے۔ میرا آقا چاہتا ہے کہ اخلق کی شادی اس کے رشتہ داروں میں ہو۔ آپ کی بیٹی ربقہ اس لائق ہے کہ اخلق سے اس کی شادی ہو۔ خدا نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ اس شادی کے لیے تیار ہیں تو مجھے بتادیں ورنہ میں کسی اور طرف چلا جاؤں۔“

لابن اور بیٹو ایل نے جواب دیا۔ ”اے البعز، تجھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات خداوند کی طرف سے ہوئی ہے، ہم تجھے کچھ برا یا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ ابراہیم ہمارے خاندان کا ہے، ہم اس کی بات نہیں ٹھکرا سکتے۔ ربقہ تیرے سامنے موجود ہے۔ اسے لے جا اور اپنے آقا کے بیٹے سے اسے بیاہ دے۔“

البعز نے اس خوشی میں چاندی اور سونے کے زیور اور لباس نکال کر ربقہ کو دیے اور اس کے بھائی اور اس کی ماں کو بھی قیمتی چیزیں دیں۔

یہ رات البعز نے اسی گھر میں گزاری اور صبح ہوتے ہی وہ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

”اب مجھے اجازت دو کہ میں ربقہ کو لے کر اپنے آقا کے پاس جاؤں۔“

”لو کی کو کچھ روز کم سے کم دس روز ہمارے پاس رہنے دو۔ اس کے بعد وہ چلی جائے گی۔“

”نہیں۔ یہ خوش خبری ایسی نہیں ہے کہ زیادہ دن اسے آقا سے چھپاؤں۔ اب مجھے جانے دو تو اچھا ہے۔“

”ہم لڑکی کو بلا کر پوچھتے ہیں۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔ اگر وہ کہے گی تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

ربقہ سے پوچھا گیا تو اس نے جانے کی ہامی بھری۔ تب لابن نے اپنی بہن کو عادی۔

اے ہماری بہن! تو لاھوں کی ماں ہو۔

اور تیری نسل اپنے کیندر کھنے والوں کے پھانک کی مالک ہو۔

ربقہ اپنی دایہ کے ساتھ اونٹ پر سوار ہوئی۔ اس کی سہیلیاں اسے رخصت کرنے کے کچھ دور تک آئیں۔

ایک طویل سفر کے بعد جب یہ مقدس سواریاں کنعان کے علاقے میں داخل ہوئیں تو ربقہ کی نظر ایک نہایت حسین مرد

پر پڑی جو یہ ظاہر انہی کی طرف آ رہا تھا۔

”یہ شخص کون ہے جو یہ ظاہر ہم سے ملنے میدان کی طرف چلا آ رہا ہے؟“ ربقہ نے البعز سے پوچھا۔

”نبی تو ہیں حضرت اخلق علیہ السلام جو یہ دیکھنے آ رہے ہیں کہ تم میرے ساتھ ہو یا نہیں۔“

ربقہ نے یہ سن کر ایک چادر سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ حضرت اخلق علیہ السلام کو اشارہ مل گیا کہ البعز رانا نام نہیں لوٹا ہے۔ گوہر مقصود ساتھ لے کر آیا ہے۔ آپ نے آگے بڑھ کر اونٹ کی رسی تھام لی اور چلتے ہوئے حضرت سارہ کے خیمے تک آئے۔ کیسا مبارک جوڑا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باہر نکل کر استقبال کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ربقہ کو حضرت اخلق علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا۔

☆☆☆

طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ربقہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے بانجھ قرار دے دیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

اور حضرت سارہ کو اللہ نے طویل عمر دی تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہتے۔ اسی لیے یہ فکر روز بروز بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ اپنی زندگیوں میں حضرت اسحق علیہ السلام کی اولاد کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ جب اکیلے بیٹھے تھے یہی باتیں ہوتی تھیں۔ اس رات بھی چراغ بجھانے کا وقت گزر چکا تھا مگر آپ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ وہ کسی سوچ میں گم تھے کہ انہیں احساس ہوا، ان کی شریک حیات بھی ابھی تک جاگ رہی تھیں۔

”کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں؟“

”اللہ کے نبی آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“

”میں سوچ رہا ہوں میں کتنے شوق سے بیٹو ایل کی بیٹی کو اسحق کے خیمے میں لایا تھا اور وہ بانجھ نکلی۔“

”سوچنے کا کیا فائدہ۔ جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔“

”اللہ کی بندی میں اس وقت یہی سوچ رہا ہوں کہ اللہ کا وعدہ کیسے بدل سکتا ہے۔“

”کیا اللہ نے کوئی وعدہ کیا تھا؟“

”کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جب اللہ کے محترم فرشتے ہمارے پاس آئے تھے اور تمہیں اسحق کی خوش خبری دی تھی؟“

”اللہ کے نبی وہ دن میں کیسے بھول سکتی ہوں۔“

”پھر تمہیں وہ بھی یاد ہوگا کہ فرشتوں نے صرف اسحق کی نہیں اس کے بیٹے یعقوب کی بھی خوش خبری سنائی تھی۔“

حضرت سارہ نے مکمل دور پھینک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”میں تو اسے بھول گئی تھی اور پریشان تھی۔ اب میرا دل مطمئن

ہے۔ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔“

”سارہ تمہیں ایسا تو نہیں کہ اسحق دوسری شادی کر لیں اور بیٹا دوسری بیوی سے ہو؟ اگر ایسا ہوا تو بیٹو ایل کو کتنا دکھ ہوگا۔“

”مجھے تو اس سے زیادہ یہ فکر ہے کہ ہماری عمریں اس وقت کا انتظار کریں گی بھی؟ اللہ کے وعدے میں یہ تو نہیں کہا گیا تھا

کہ اسحق کے بیٹوں کو دیکھنے کے لیے ہم زندہ بھی رہیں گے۔“

وہ رات انہی باتوں میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحق علیہ السلام کے خیمے کی طرف گئے

اور انہیں اللہ کا وعدہ یاد دلایا۔ یہ سن کر انہوں نے بھی یہی کہا کہ ہو سکتا ہے میری اولاد دوسری بیوی سے ہو۔ کیوں نہیں دوسری

شادی کر لوں۔

”ایسا ہرگز نہ کرتا۔ میں یہی کہنے آیا تھا۔ ربہ کا باپ بیٹو ایل میرا بھتیجا ہے۔ اسے تکلیف ہوگی۔ ہاں اگر میں نہ رہوں تو

تم آزاد ہو گے۔ اس کے بعد دوسری شادی کر لیتا۔“

حضرت سارہ کا اندیشہ درست تھا۔ اپنی گود میں حضرت اسحق کی اولاد کو دیکھے بغیر آپ انتقال فرما گئیں۔ تو ریت کے

مطابق انتقال کے وقت آپ کی عمر مبارک ایک سو ستائیس سال تھی۔

پھر آگے پیچھے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی وفات پائی۔

ایک قول کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات اچانک ہوئی تھی۔ جبکہ اہل کتاب نے جو ذکر کیا ہے وہ اس کے

خلاف ہے۔

اہل کتاب اپنے قصوں میں کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام بیمار پڑ گئے اور 175 سال کی عمر میں وفات پا گئے اور

حضرت سارہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

”ابراہام کی کل عمر جب تک کہ وہ جیتا رہا ایک سو پچھتر برس کی ہوئی۔ تب ابراہام نے دم چھوڑ دیا اور خوب بڑا ہاپے میں

نہایت ضعیف اور پوری عمر کا ہو کر وفات پائی اور اپنے لوگوں میں جا ملا۔“

یہ روایت بھی سچی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دو سو سال حیات رہے۔

آپ کی وفات 1755 ق م میں ہوئی اور بیت المقدس سے ایک منزل کے فاصلے پر اٹلیل میں دفن ہوئے۔

تحقیق کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر خلیل شہر میں ہے البتہ اس شہر میں کون سی جگہ وہ قبر ہے

اس کے تعین میں کوئی محفوظ مستند خبر نہیں ہے لہذا اس پورے علاقے کا لحاظ کرنا چاہیے اور پورا پورا احترام کرنا چاہیے۔ کیا خبر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر اس زمین کے نیچے ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی حضرت سارہؑ تھیں جن کے بطن سے حضرت اسحاق پیدا ہوئے جنہوں نے مکران ابی مالک کے زمانے میں ملک جرار جو موجودہ لبنان کے جنوب میں بحیرہ روم کے کنارے واقع تھا، ہجرت کی اور سو برس تک دعوت حق دیتے رہے۔
دوسری بیوی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہ تھیں جن کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔
تیسری بیوی حضرت قطورہ رضی اللہ عنہ بنت مفسور تھیں۔ ان کے بطن سے چھ بیٹے پیدا ہوئے۔ تو ریت کے مطابق ان کے نام زمران، یقسان، مدان، مدیان، اسباق اور سوخ تھے۔
چوتھی بیوی حضرت حورہ رضی اللہ عنہ تھیں جن کے بطن سے پانچ بیٹے ناض، لوطان، ایمم، شورخ اور کیسان پیدا ہوئے۔

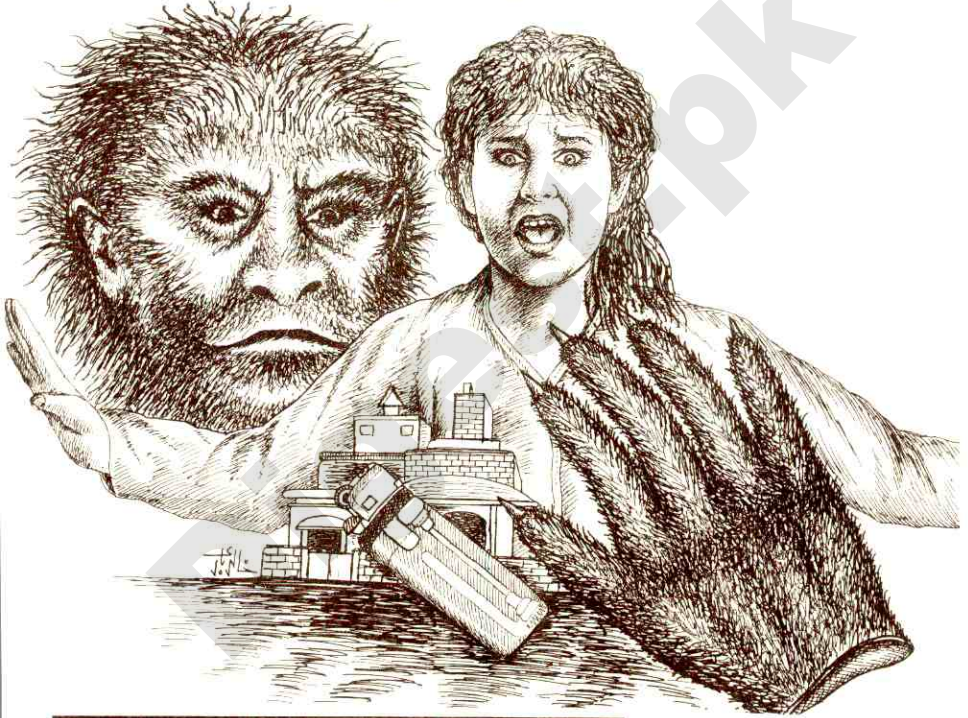
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، میں نے عیسیٰ ابن مریم کو دیکھا اور موسیٰ اور ابراہیم کو دیکھا۔ عیسیٰ تو سرخ رنگ، گھٹنگرے بال اور چوڑے سینے والے تھے اور موسیٰ آدم کی طرح قد آور اور بڑے جسم والے تھے۔ پھر لوگوں نے پوچھا۔ حضرت ابراہیمؑ؟ فرمایا اپنے ساتھی کو دیکھ لو (یعنی مجھے)
بخاری شریف میں حضرت مجاہد سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو دیکھتا ہے تو اپنے ساتھی کو دیکھ لو (یعنی مجھ کو)
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک محل ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ شاید حضور ﷺ نے فرمایا تھا وہ موتی کا ہے۔ آگے حضور ﷺ نے فرمایا اس میں کوئی جوڑ نہیں ہے اور وہ صرف اللہ عزوجل نے اپنے دوست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بطور مہمان نوازی بنایا ہے۔
اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست کہہ کر مخاطب کیا۔
جب حضور اکرم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ ساتویں آسمان پر فرشتوں کے بیت اللہ یعنی بیت معمور کے ساتھ ٹیک لگے استراحت فرما رہے ہیں۔
سبحان اللہ وہ بیت معمور جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں (اور اس کا طواف کرتے ہیں) لیکن پھر بھی کبھی قیامت تک کسی فرشتے کی دوبارہ طواف کرنے کی باری نہیں آئے گی۔
آپ کی اسی عظمت کی شان ہے کہ قرآن مجید نے آپ کے واقعات کو مختلف اسلوب کے ساتھ جگہ جگہ بیان کیا ہے۔
ایک جگہ اگر اختصار سے ذکر ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ایسی جگہیں 35 ہیں۔ ان میں سے پندرہ تو صرف سورہ بقرہ میں ہیں اور اس کے علاوہ یہ پانچ اولوالعزم پیغمبران میں سے ایک ہیں جن کو تمام انبیاء بطور خاص فضیلت عطا فرمائی گئی ہے اور ان کا نام بھی علیہ سے واضح طور پر اللہ نے اپنے کلام مقدس میں سورہ اہزاب اور شوریٰ کے اندر ذکر فرمایا ہے۔
حضرت عبید بن جریحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام لوگوں کی مہمان نوازی بہت فرماتے تھے۔ ایک دن اسی غرض سے کسی کی تلاش میں نکلے لیکن کوئی ایسا نہ ملا تو واپس گھر لوٹے۔ وہاں ایک اجنبی کو کھڑا پایا۔ آپ نے پوچھا، ”اے اللہ کے بندے میری اجازت کے بغیر کیسے میرے گھر میں داخل ہوئے؟ اس شخص نے جواب دیا میں اس گھر کے مالک (پروردگار) کے حکم سے آیا ہوں۔“ آپ نے پوچھا تو کون ہے۔ جواب دیا میں ملک الموت ہوں۔ مجھے اس شخص کے پاس بھیجا گیا ہے جسے اللہ نے اپنا دوست منتخب کر لیا ہے۔“ آپ بے چین ہو گئے۔ ”وہ کون ہے۔“ اگر تو مجھے اس کا پتا بتا دے تو میں اس کے پاس پہنچوں پھر ہمیشہ کے لیے اس کا پرہیز بن کر رہوں۔“
فرشتے نے کہا۔ ”وہ بندے آپ ہی ہیں۔“

(ختم شد)

جنگل کا آدمی

معاشرہ چاہے کتنا ہی مہذب اور قانون سازی سے مزین ہو لیکن درحقیقت اندرون خانہ ہر مقام پر جنگل کا قانون رائج نظر آتا ہے جہاں ہر جانور صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دوسرے کا شکار کرتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی دائرے میں قید تھا لیکن اس کے باوجود وہ شکار کرنا سیکھ نہ سکا... البتہ اسے جانور کے روپ میں زندگی گزارنے کا سلیقہ ضرور آگیا اور اسی روپ میں اسے انسانیت کی معراج بھی حاصل ہو گئی کیونکہ اسے دوسروں کے غم بانٹنے اور پونٹوں پر پھنسی سجانے کا فن جو مل گیا تھا۔



دور دروزگار کی تلاش اور در بدر ہو کر منزل پالینے کا عبرت اثر انداز

کھڑکھڑاتی ہوئی شلوار۔ مولانا کے حجرے میں دو آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حامد نے مولانا کی طرف دیکھتے ہوئے سہیل کا تعارف کرایا۔ ”جناب، سہیل میرا دوست ہے۔ بہت پاٹ دار آواز ہے اس کی۔ بے چارہ... بے روزگار ہے۔“

سہیل کا دوست حامد، اسے مولانا چنگیزی کے پاس لے گیا۔ مولانا چنگیزی، چنگیز خان کی نسل کے دکھائی دے رہے تھے۔ زبردست توند جو اس کے جسم کا حصہ تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جنہیں کھینچ کر بڑی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ سر پر ایک عمامہ، بدن پر ایک دھاری دار کرتہ اور

”اور وہ جوش میں کیسے آتے ہیں جناب؟“ سہیل

نے پوچھا۔

”میں بتا رہا ہوں۔“ مولانا چنگیزی اس مداخلت پر کچھ ناراض ہو گئے۔ ”مختلف نعروں کے ذریعے۔ یہ نعرے تم کو سکھادیے جائیں گے۔ ہفتے میں دو دن ہمارا جلسہ ہوتا ہے جس میں تم کو نعرے لگانے ہیں اور تمہارا ساتھ یہ دونوں دیں گے۔“ انہوں نے دونوں بندوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہر جلسے کے پانچ سو روپے پیش کیے گئے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ سہیل نے گردن ہلائی۔ ”یعنی ہفتے کے ہزار روپے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اور آنے جانے اور رات کے کھانے کے پیسے الگ ہوں گے۔“

”میں تیار ہوں جناب۔ آپ نعرے بتائیں۔“

نعرے کچھ یوں تھے۔ ”بھڑا میں جائیں انگریز، جیوے شاہ چنگیز۔ دم مادم۔ شاہ جی اسلم۔ ہم۔“

سہیل نے اپنی پاٹ دار آواز میں ان بے شک نعروں کی پریکٹس کر کے سماں سا باندھ دیا۔ خود مولانا چنگیزی بھی آنکھیں بند کر کے جھومنے لگے۔ ایڈوانس کے طور پر سہیل کو اس وقت تین سو روپے دے دیے گئے۔ پھر اسے بتایا گیا کہ یہ جلسہ کہاں اور کس وقت ہوتا ہے۔

وہ دونوں مولانا چنگیزی سے اجازت لے کر باہر آ گئے۔ سہیل حامد کو ایک جھوٹے سے ہونک میں لے آیا۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد اس نے حامد سے پوچھا۔ ”ہاں اب بتا، یہ سب کیا چکر ہے؟“

”سیاست کا چکر ہے، اپنی دکانداری چکانے کا چکر ہے۔“ حامد نے بتایا۔ ”مولانا چنگیزی کی بہت دھوم ہے۔ لوگ ان کو ایسا مذہبی ہنما سمجھتے ہیں جو بیٹھکے ہوؤں کو راستہ دکھانے کے لیے آسمان سے اتار گیا ہے۔ ایسی زبردست تقریریں ہوتی ہیں کہ بس مزہ آ جائے۔“

”صرف تقریریں ہوتی ہیں یا اندر بھی کچھ ہوتا ہے۔“

”تم اندر کے چکر میں نہ پڑو۔ باہر ہی باہر دیکھو۔ دو دو گاڑیاں ہیں ان کے پاس۔“

”اور مجھے ان کے لیے نعرے لگانے ہیں؟ کیونکہ میں نعرہ بازوں کا لیڈر ہوں۔“

”ہاں، تمہاری یہی پوسٹ ہے۔“ حامد نے کہا۔

”اب رات کے لیے تیاری کر کے یہیں آ جاؤ ٹھیک آٹھ بجے۔ یہیں سے جلوس روانہ ہوگا اور ہاں راستے میں نعرے لگاتے ہوئے جانا ہے۔“

مولانا نے سہیل کو ٹونے والی نگاہوں سے دیکھا پھر ایک زوردار ہنکاری لی۔ ”نو جوان، تمہاری پریشانی کا سن کر بہت افسوس ہوا۔“

”لیکن میں نے تو ابھی کوئی پریشانی بتائی ہی نہیں ہے۔“ سہیل جلدی سے بولا۔ مولانا کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئیں۔

”بے وقوف، تمہارے فاقہ زدہ منہس چہرے پر کبھی ہوئی ہے پریشانی۔“ سہیل کو بہت برا لگا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن حامد نے جلدی سے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا۔

”جناب، آپ اسے آزاد کر دیکھ لیں۔“ حامد نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم لے کر آئے ہو تو خیال کرتا ہی پڑے گا۔“ مولانا نے اپنی موٹی گردن ہلائی پھر سہیل سے مخاطب ہوئے۔ ”چلو، اپنی پاٹ دار آواز کا نمونہ دکھاؤ۔“

”میں سمجھا نہیں جناب۔“ سہیل سیٹا گیا۔

”کیا دکھاؤں؟“

”کوئی نعرہ لگا کر دکھاؤ۔“

سہیل نے زوردار ہانک لگائی۔ ”سات سمندر پار سے۔ گزریوں کے بازار سے۔ گڑیا چاہے نہ لانا۔ پاپا جلدی آ جانا۔ پاپا جلدی آ جانا۔“

اس نے یہ بول اتنی بلند آواز میں ادا کیے کہ ایک بار خود مولانا چنگیزی تھرا کر رہ گئے۔ کمرے میں موجود دونوں آدمیوں نے جزاک اللہ کے نعرے بلند کرنے شروع کر دیے۔ مولانا چنگیزی نے خود بھی ہنکا دیا۔

حامد کی طرف دیکھا۔ ”ٹھیک ہے۔ تمہارا یہ بندہ کام کا ہے۔ میں آدمی یہی ہوگا۔ دوسرے اس کے بعد شروع ہوں گے۔“

”لیکن جناب مجھے کرنا کیا ہوگا؟“ سہیل نے پوچھا۔

”کیوں، تم نے اسے ابھی سمجھا نہیں ہے کیا؟“

مولانا نے حامد سے پوچھا۔

”نہیں جناب، یہ مجھے راستے میں مل گیا تھا۔ میں اسے لے کر یہیں چلا آیا۔“

”دیکھو جوان، ہم اندر والے لوگ ہیں۔“ مولانا چنگیزی نے سمجھا شروع کیا۔ ”ہم اس کے نام اور اس کے ذکر کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ میں اس تقریریں کرتا ہوں اور لوگوں کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لوگ بہت بے حس ہو چکے ہیں۔ ان کو جوش دلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”چلو۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہوئی۔“ دلدار نے کہا۔ ”یعنی آپ کا یہ وقت پرل جائے گا؟“

”جی ہاں۔“

”بس تو جانتا، دلدار صاحب نے جلد ہی جان چھوڑ دی۔ سہیل دکھا پکڑ کر مولانا چنگیزی کے گھر پہنچا۔ جلوس چلنے کے لیے تیار تھا۔ مولانا اپنی بچپن میں تھے جبکہ دوسروں کے لیے موزوں کی اور ویکٹس کا بندوبست کیا گیا تھا۔ سہیل نے وہاں پہنچتے ہی اپنی ڈیوٹی دینی شروع کر دی۔ ”بھائی میں جاؤں انگریز۔ جو سے شاہ چنگیز“

مولاناؤں نے اس کی آواز میں آواز ملانا شروع کر دی۔ ذرا سی دیر میں ماحول گرم ہو گیا۔ پھر یہ قافلہ جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جلسہ گاہ میں جیسے دن نکلا ہوا تھا۔ اسنے بلب لگائے گئے تھے کہ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو رہی تھی۔ سہیل کو یہ دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ یہ ساری روشنی کنڈوں کی وجہ سے تھی۔ نہ جانے اس متبرک اور مبارک جلسے کے لیے کتنے کنڈے لگائے گئے تھے۔

مولانا چنگیزی کو اسٹیج پر پہنچایا گیا۔ یہ موقع نعرے بازی کا تھا۔ سہیل نے اپنی ٹرک دار آواز میں نعرہ بلند کیا۔

”دیکھئے سرکار۔ کنڈوں کی بہار۔ کتنا مبارک جلسہ ہے۔ کنڈا روشنی دیتا ہے۔“

وہ یہ سارے نعرے خود ہی لگا رہا تھا کیونکہ وہاں اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ان نعروں کو سن کر لوگوں نے زور زور سے ہنسا شروع کر دیا جبکہ مولانا چنگیزی کے بندوں کو ساپ سوکھ گیا پھر انہوں نے ہوش اور جوش میں آ کر سہیل کی ٹھکانی شروع کر دی۔ سب کا یہ خیال تھا کہ یہ مخالف کیب کا بندہ ہے جو کسی سازش کے تحت مولانا چنگیزی کے خیم میں آ کر مشال ہوا ہے۔ اس ہجوم میں دو چار معقول قسم کے لوگ بھی تھے۔ انہوں نے سہیل کو فرار ہونے کا موقع فراہم کیا تو سہیل نے بھاگنے میں ڈیر نہیں لگائی۔ پنڈال کے باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ اندھیرے میں کم ہو گیا۔

اپنے فلیٹ میں پہنچا تو سیڑھیاں چڑھنا اس کے لیے عذاب ہو گیا تھا۔ جوڑ جوڑ در در ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے بہت خشوع و خضوع کے ساتھ اس کو مارا تھا جو مولانا چنگیزی جیسے فرشتہ صفت انسان کے جلسے کو خراب کرنے آ گیا تھا۔

سہیل نے اپنی چونوں کی خود ہی سنائی کی اور مولانا چنگیزی کو برا بھلا کہتے کہتے سو گیا۔

حامد کو روانہ کرنے کے بعد سہیل اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ، جس کا کرایہ بہت زیادہ تھا اور فلیٹ کا مالک بہت ہی چمڑا قسم کا انسان تھا۔ وہ جب آتا دھڑا دے کر بیٹھ جاتا۔ اپنے اصولوں کے بارے میں تقریریں کرتا کہ اس نے زندگی بھر ہی ایمانداری سے گزاری ہے۔ ایک بااختیار سرکاری افسر ہونے کے باوجود اس کے پاس صرف چھ فلیٹس اور سات دکانیں ہیں جن کے کرایوں سے وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔

سہیل کو اس کے سامنے مژدب بیٹھ کر اس کی بکواس اس لیے سننے پڑتی تھی کہ وہ کرایہ تاخیر سے دیتا تھا اور کبھی بھی تو دودھ مہینوں کے کرایے اس پر چڑھ جاتے۔

بہر حال فلیٹ پہنچا تو فلیٹ کا مالک موجود تھا۔ اس وقت سہیل کو اس کی آمد کل گئی کیونکہ اس کے پاس نہ تو جینی تھی اور نہ چائے کی پتی۔ دکاندار نے بھی ادھار دینے سے منع کر دیا تھا۔

”کیوں میاں، میں بے وقت تو نہیں آ گیا؟“ فلیٹ کے مالک نے پوچھا۔ ”کیونکہ تم جانے ہو کہ میں با اصول آدمی ہوں۔ کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ چاہے وہ اپنا کرایہ دہا رہی کیوں نہ ہو۔“

”جی جناب، اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لیے تو آپ کا احترام کرتا ہوں۔ ورنہ فلیٹ کے مالکان تو ہزاروں ہوتے ہیں۔ میں کسی اور کا احترام کیوں نہیں کرتا۔“

”خوش رہو میاں، اندر چلو۔ میں تمہیں اپنی سرکاری نوکری کے زمانے کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔“

سہیل کو اس وقت کوفت ہونے لگی۔ اسے جلسے کی تیاری کرنی تھی۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ سفید کرتے۔ شلوار پہنے گا اور جالی والی ٹوپی بھی سر پر ہوگی۔ اگر ہاتھ میں تسبیح بھی ہو تو پھر بات ہی اور ہے۔

بہر حال حکم مالک مرگ مفاجات۔ وہ دلدار (فلیٹ کے مالک) کو اندر لے آیا۔ دلدار نے بے تکلفی کے ساتھ چائے کی فرمائش کرتے ہوئے کہا۔ ”میاں تم جو چائے بناتے ہو اس کا جواب نہیں ہوتا۔ اس لیے میں صرف تمہارے ہاتھ کی چائے پیتا ہوں۔“

”لیکن آج میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔“ سہیل نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”وہ کیوں؟“

”میں نے پارٹ ٹائم۔۔۔ جاب بھی کر لی ہے۔“

سہیل نے بتایا۔ ”بس تیار ہو کر وہیں جا رہا ہوں۔“

”ارے بابا۔ یہ سب مگر کی باتیں ہیں۔ تم کو ڈاکٹر ز کے پاس جانا ہے۔ ان سے میٹن کی بات کرنی ہے۔ اپنے تجھے پہنچانے ہیں پھر ڈاکٹر مریضوں سے کہیں گے کہ دو ایسی ہو تو آپ حیات میڈیکل اسٹور سے لو۔ ان کے یہاں ہر دوا ملتی ہے۔ بس یہ ہے ساری کہانی۔“

”آپ کے یہاں کی دوا میں کیسی ہوتی ہیں؟“

”اب سارے راز ایک دن میں تو نہیں بتا سکتا۔“

دیانت صاحب نے برا سامنے بتایا۔

”لیکن مجھ سے کام لینا ہے تو بتانا پڑے گا۔“

دیانت حسین بڑی مشکوں سے راز بتانے پر راضی ہوئے اور وہ راز یہ تھا کہ ان کے تعلقات مختلف اسپتالوں کی فارمیسیز اور ڈسپنسریز سے تھے اور وہاں کی ایکسپارٹ دوا میں آپ حیات میڈیکل اسٹور خرید لیتا تھا۔

”دیانت صاحب، داؤں کی بوتلوں یا ڈبوں پر تو ایکسپارٹی ڈیٹ لکھی ہوئی ہے۔“

اس پر دیانت صاحب نے اپنا سر پیٹ لیا اور باقاعدہ واویلا کرتے ہوئے بولے۔ ”ارے بابا۔ یہاں ایک کاربگر موجود ہے جو ان تاریخوں کو اتنی ہوشیاری سے بدل دیتا ہے کہ کسی کا باپ بھی نہیں پکڑ سکتا۔“

”آپ اپنا نام دیانت سے بدویانت رکھ لیں۔ وہ زیادہ اچھا ہوگا۔“ سہیل نے جل کر کہا پھر اپنی پاٹ دار آواز میں نعرے لگانے لگا۔ ”بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔“

”کیا اس آدمی کا دماغ خراب ہے؟“ دیانت صاحب نے حیرت اور غصے سے پوچھا۔

”بھئی بھی خراب ہو جاتا ہے۔“ حامد گڑبڑا کر بولا پھر اس نے سہیل کی طرف دیکھا۔ ”اب چلو یہاں سے۔ ورنہ دیانت صاحب کو غصہ آ جائے گا۔“

”یار تم کیسے آدمی ہو۔“ حامد اس پر برس پڑا۔

”کیوں اپنے ہیروں پر کھڑی مار رہے ہو۔“

”یار کیا بتاؤں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔“

”تو پھر بھوکے مر جاؤ گے اور یہ نعرہ کس ٹائپ کا لگاتے ہو۔ کیا مطلب ہے اس نعرے کا؟“

”اس نعرے کا مطلب ہمارے بزرگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تو میں کیا سمجھاؤں گا۔“ سہیل نے کہا اور اس کے ساتھ ہی... وہاں میں قلابازی کی کھاتا ہوا ایک طرف جا گرا۔ بہت زور کی چوٹ آئی تھی۔ آنکھوں کے آگے ستارے سے جھلملہانے لگے تھے۔

دوسری صبح اس کا دوست حامد اسے برا بھلا کہتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ”خدا کے بندے۔ تیری وجہ سے میری بھی نوکری چلی گئی۔ آخر تجھے اتنی کواس کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

”حامد تم ایمانداری سے بتاؤ۔ کیا میں نے غلط نعرہ لگایا تھا؟ کیا وہاں کنڈ اسٹیم نہیں چل رہا تھا؟“

”چل تو رہا تھا لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی واویلا کرنے کی۔“

”اس لیے کہ میں ایک فرض شناس شہری ہوں۔“ سہیل نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”اور میں اپنا فرض پورا کرتا رہوں گا۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔“

”اس وقت کون سا موقع تھا یہ سب بولنے کا؟“

”اب موقع دیکھنے کے لیے میں ۱۹۳۷ء میں تو واپس نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے جو منہ میں آیا بول دیا۔“

”سہیل نے کہا۔“ اب یہ بتاؤ مولانا صاحب مجھے رہیں گے یا نہیں؟“

”کیا پاگل ہو گئے ہو۔ وہ تو تمہیں دیکھتے ہی تمہارا گلا دبا دیں گے۔“

”تو پھر مجھے کوئی اور کام دلاؤ۔“ سہیل نے کہا۔

”ورنہ یاد رکھو۔ میں تمہارے مولانا چنگیزی کے جلسوں کو اسی طرح خراب کرتا رہوں گا۔“

”اور ان کے عقیدت مند تمہیں جان سے مار دیں گے۔“

”تو کیا کروں۔ بے روزگار بھی تو نہیں رہ سکتا۔“

”اچھا اچھا۔ میں تمہارے لیے کوئی اور کام ڈھونڈتا ہوں۔“

حامد نے اسے دوسرا کام بتایا۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور میں ملازمت کا کام تھا۔ آپ حیات میڈیکل اسٹور۔ جس کا مالک ایک کمزور بدلا پتلا ایسا شخص تھا جو کھاسی کا دائمی مریض دکھائی دے رہا تھا۔ میڈیکل اسٹور چلانے کے باوجود سدا کاروگی دکھائی دے رہا تھا۔ حامد نے اس کا نام دیانت حسین بتایا تھا۔

”بندہ تو بھروسے کا ہے نا؟“ دیانت حسین نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ہاں بہت بھروسے کا ہے۔“ حامد نے کہا ”یہ سمجھ لو کہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ صرف کام کرتا جانتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ دیانت حسین نے اطمینان کے انداز میں گردن ہلا دی پھر سہیل کی طرف دیکھا۔ ”دیکھ بھائی، تیرا کام ہے مریضوں کو پکڑنا۔“

”مریضوں کو کس طرح پکڑوں؟“ سہیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

جھٹک دیا تھا۔

وہ حامد سے ناراض ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ آگئی تھی۔ کپڑے تو پہلے ہی می سے اٹے ہوئے تھے کہ اچانک کسی نے اس کا بازو تھام لیا۔ یہ ایک پولیس والا تھا۔ جو ٹولنے والی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”جناب عالی! میں اس طرح تو آپ کو نہیں جانے دوں گا۔“ پولیس والے نے حیران کن نرمی سے کہا۔ ”میں آپ کو گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔“

سہیل کافی خوش ہو گیا۔ چوٹ کا احساس ہی ختم ہو کر رہ گیا۔ ”نہیں بھائی! میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“

”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ پولیس والے نے کہا۔ ”یہ تو میری ذمہ داری ہے جناب۔ فرض ہے میرا۔“

پولیس والے نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سامنے ہی پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی۔ اس کے اشارے پر موبائل قریب آ گئی۔ ”تشریف رکھیں جناب، اگلی سیٹ پر۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو پیچھے بٹھا یا تو لوگ سمجھیں گے کہ پولیس نے آپ کو پکڑ لیا ہے۔ اس لیے آگے بیٹھیں۔ پوری شان کے ساتھ۔“

”کیا نہیں معلوم ہے کہ میں کہاں رہتا ہوں؟“

”ارے جناب عالی، ہم پولیس والے ہیں۔ ہمیں کیا نہیں معلوم۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔“

سہیل موبائل والے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ پاکستانی پولیس اتنا عمدہ برتاؤ کر رہی ہے۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا کہ پہلی فرصت میں وہ اپنی پولیس کی تعریف میں ایک زبردست مضمون لکھے گا۔ جس میں کہا گیا ہوگا کہ بے وقوفو... تم نے اپنی پولیس کو پہچانا نہیں ہے۔ ان کے قریب جا کر دیکھو۔ تمہیں ایسا لگے گا جیسے خوشی اور اطمینان کے پہاڑ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے ہو۔

وہ اپنے خیالوں سے اس وقت چونکا جب وہ موبائل ایک تھانے کے احاطے میں داخل ہو کر رکنی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟“ سہیل نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ میرا گھر تو نہیں ہے۔“

”اگر نہیں ہے تو بن جائے گا سرکار۔“ پولیس والے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ آئیں میرے ساتھ تشریف لائیں۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی سہیل کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ اسے ایس آج کے کمرے میں لے آیا۔ ”جناب عالی!

اس حادثے کی وجہ وہ بانیق تھی جو سہیل کو نگرہ مارنے کے بعد خود بخود بند ہو گئی تھی اور وہ اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو چار ناکام کوششوں کے بعد وہ سہیل پر پلٹ پڑا۔ ”اندھے ہو تم لوگ دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ سہیل کرہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”ایک تو تم نے نگرہ مادی پھر باتیں بھی مجھے ہی سنا رہے ہو۔“

اس حادثے کے دوران میں حامد نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اس لیے سہیل کو اکیلے ہی اس پہلوان قسم کے بانیق سوار سے غمناک پڑ رہا تھا۔ ”جب تم یہ جانتے ہو کہ بانیق والے سگنل تو ڈکری تیزی سے بانیق آگے بڑھالے جاتے ہیں تو پھر تمہیں راستے میں کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ارے بھئی، میں تو ایک کنارے بس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔“

”اچھا اچھا بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لاؤ تین سو روپے نکالو۔“

”تین سو روپے..... وہ کیوں؟“

”تم نے خود کو میری بانیق سے ٹکرا کر میری بانیق بند کر دیا ہے۔“ پہلوان نے کہا۔ ”اب اس کی مرمت پر سو روپے خرچ ہوں گے۔ لاؤ جلدی دو۔“

”میرے پاس تو ایک پیسا نہیں ہے۔“ اس پر بانیق والا اسے غصے سے گھورتا ہوا بانیق کو کھینچے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔ پھر حامد بھی نہ جانے کس طرف سے نمودار ہو گیا۔ سہیل اسی پر برس پڑا۔ ”خدا کے بندے تم مجھے چھوڑ کر کہاں بھاگ گئے تھے۔ بانیق والے نے میری اچھی خاصی ٹھکانی کر دی ہے۔“

”میں تمہارے لیے مدد لینے گیا تھا۔“

”کسی مدد لینے گئے تھے؟“

”اپنے ایک دوست سے جو قریب ہی رہتا ہے۔ وہ نہیں ملا تو میں یہ سوچ کر جلدی واپس آ گیا کہ خدا جانے تم زندہ بھی ہو یا نہیں۔“

”میں زندہ نہیں ہوں، مر چکا ہوں۔“ سہیل نے غصے سے کہا۔ ”لغت ہے ایسے معاشرے پر۔ کسی نے مجھے سہارا تک نہیں دیا۔ خود ہی روپیٹ کر کھڑا ہو گیا ہوں۔“

”پلوں کی ڈاکٹر کے پاس چلے ہیں۔“ حامد نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”رہنے دو اپنی ہمدردی۔“ سہیل نے اس کا ہاتھ

گیا۔ بستر پر لیٹ جانے کے بعد اسے ہوش نہیں رہا کہ وہ سو رہا ہے یا سرچکا ہے۔ دوسری صبح وہ بیدار ہوا..... اور وہ بھی دروازے پر ہونے والی دنگ سے۔ دروازے پر حامد کھڑا تھا۔ ”یارکل سے کہاں غائب تھے۔ میں تو چکر لگا لگا کر تھک گیا۔“

”یہ مت پوچھو یار۔“ سہیل نے کہا۔ ”تم بیٹھو۔ میں نہا کر فریش ہو جاؤں پھر تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا جب تک تم ہوں سے میرے لیے چائے بنواؤ اور واپسی میں بسکٹ بھی لیتے آتا۔“

”اور پیسے کون دے گا؟“

”یہ مہربانی بھی تم ہی کو کرنی ہوگی۔“ سہیل نے کہا۔ ”میرے پاس تو زہر کھانے کے بھی پیسے نہیں ہیں۔“

”خیر، زہر تو تم کھا بھی نہیں سکتے۔ یہ بہت مہنگا شوق ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”میں چائے اور بسکٹ لے آتا ہوں۔“

چائے پینے کے دوران میں سہیل نے حامد کو ساری کہانی سادی۔ وہ اس کی حالت پر افسوس کرنے کے بجائے ہنسنے لگا۔ ”عجیب آدمی ہو تم ہنس کیوں رہے ہو؟“

”اس لیے کہ ایسی خراب قسمت شاید ہی کسی اور کی ہوگی۔“

”اچھا بکواس مت کرو۔ مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہے۔“ سہیل نے کہا۔ ”کوئی اسٹیٹ ایجنسی ہے۔ ان کو فیلڈ میں کام کرنے والے کسی بندے کی ضرورت ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔“

”یار، ان چکروں میں نہ پڑو۔ میں نے تمہارے لیے ایک جاب تلاش کر لی ہے۔“ حامد نے بتایا۔ ”تم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہی آیا ہوں۔“

”جاب کیا ہے؟“

”توالوں کی پارٹی کے ساتھ کام کرنا ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”آج کل توالیوں کا سیزن چل رہا ہے۔ شوکت علی اینڈ پارٹی کی بہت ڈیمانڈ ہے۔ تم ہر رات مصروف رہو گے۔ پانچ سو روپے ملیں گے۔“

حامد نے بتایا۔ سہیل نے غصے سے اس کا گردیاں پکڑ لیا۔

”بے وقوف انسان۔ تو میرے لیے اسی قسم کے کام ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ اب میں اسی لیے رہ گیا ہوں کہ تالیاں

اعلیٰ خاندان کے لوگوں کا ہو سکتا ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا پھر کیک کی پلیٹ اٹھا کر سہیل کے سامنے آ گیا۔ ”جناب! میرا دل رکھنے کے لیے بس دو پیس اور اٹھالیں۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ مجھ سے جو گستاخی ہوئی ہے اسے درگزر فرمادیں۔ آخر میں بھی بندہ بشر ہوں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟“ سہیل نے اپنے بال توجہ لیے۔ ”خدا کے بندے میں عبدالحزیز نہیں ہوں۔“

اس دوران میں ایک اور پولیس والا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے بھی سہیل کے بیان کی تصدیق کر دی۔ ”جی جناب، یہ بندہ ٹھیک بول رہا ہے۔ یہ اپنے صاحب جی کا بہنوئی نہیں ہے۔ یہ کوئی دھوکے باز ہے جو خود کو ان کا بہنوئی بتا رہا ہے۔“

”ارے خدا کا خوف کرو۔“ سہیل بلبلائے لگا۔ ”میں نے کب بتایا ہے۔ تم لوگ زبردستی میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔“

”اس کو دھکے دے کر باہر نکال دو۔“ ایس ایچ او نے فیصلہ سنا دیا۔

دو پولیس والے اسے نہ صرف دھکے دیتے ہوئے بلکہ سہیل کو مارتے ہوئے تھانے کے گیٹ تک لے آئے اور گیٹ سے دھکے دے کر اسے باہر کر دیا گیا۔

اچانک سہیل کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ تیزی سے واپس مڑا اور ایس ایچ او کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ایس ایچ او اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”کیوں بھائی اب کیوں آیا ہے؟“

”سر! آپ سے ایک بات کہنی ہے۔“

”بول۔“

”بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔“ سہیل نے کہا۔

”اوئے کیا مطلب ہوا اس کا؟“

”یہ آپ سمجھتے رہیں۔“ سہیل اتنا بول کر تھانے سے باہر آ گیا۔

جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اگر وہ ڈی آئی جی صاحب کا بہنوئی ہے پھر تو بہت بڑی بات ہے۔ اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اس کی عزت کرنی چاہیے اور اگر بہنوئی نہیں ہے تو پھر اسے دھکے دے کر نکال دینا چاہیے۔

اسے انتہائی کوفت ہو رہی تھی۔ اس کی چال میں ابھی تک لنگز اہٹ تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے فلیٹ تک پہنچ ہی

بجاتا پھروں۔“

”اچھا یا ر پھر ایک کام اور ہے۔“

”وہ بھی ایسا ہی ہوگا۔“

”نہیں۔ وہ ڈھنگ کا کام ہے۔“ حامد نے کہا۔

”تمہیں ایک ہوٹل کے باہر اچھل کود کرنی ہے۔“

”کس قسم کی اچھل کود؟“

”وہ تمہیں گوریلے کی کھال پہنا دیں گے۔“ حامد نے

بتایا۔ ”تم ہوٹل کے گیٹ پر گاہوں اور بچوں کو خوش کرنے

کے لیے اچھل کود کرتے رہو گے۔ اس میں بھی پانچ سو

روپے روز ہیں۔“

”تم کیوں میری عزت کا جلوس نکلا رہے ہو۔“

”اس میں کون سی عزت جا رہی ہے۔ کسی کے باب کو

بھی پتا نہیں چلے گا کہ اس کھال کے اندر کون ہے۔ ڈیوٹی ختم

کرنے کے بعد کھال اتار دینا۔“

”اور ڈیوٹی کتنی دیر کی ہوگی؟“

”چھ بجے سے رات بارہ بجے تک۔“ سہیل نے کچھ

دیر سوچنے کے بعد ہا ہی بھری۔

حامد اسے اسی وقت ہوٹل کے منیجر کے پاس لے آیا۔

یہ شہر کا ایک بہت مشہور ریسٹوران تھا۔ اس کا منیجر ایک ادھیڑ

عمر کا گنجا انسان تھا۔

”منیجر صاحب“ میں آپ کے لیے ایک بندر لے آیا

ہوں۔“ حامد نے سہیل کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں بابا۔ تمہارا لایا ہوا مال بالکل تھرا ڈکلاس ہوتا

ہے۔“

”منیجر صاحب، میں اس کی گارنٹی لیتا ہوں۔ یہ بہت

اچھا بندر ہے۔ اس کے باب دادا بھی بندر تھے۔“

”پھر تو بروہر ہے۔“ منیجر نے مسکین ہو کر اپنی گردن

بلادی۔ ”تم آج سے ڈیوٹی پر آ جاؤ اور ہاں رات کا

کھانا بھی ملے گا لیکن کھال اتارنے کے بعد اور اس کا

حفاظت کرنا ہے۔ جان چلی جائے لیکن کھال نہ جائے۔

بہت قیمتی کھال ہے۔ افریقہ سے آیا ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ سال کی حفاظت کروں گا۔“

ریٹورنٹ سے باہر آ کر حامد نے سہیل سے پوچھا۔ ”یار! تو

اتنی آسانی سے اس کام کے لیے تیار کیوں ہو گیا؟“

”اس لیے کہ میں نے یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ ہمارے

یہاں انسانوں کی قدر نہیں ہے۔ جانوروں سے پیار کیا جاتا

ہے۔ اگر میں انسان ہی رہتا تو مجھے نوکری نہیں ملتی لیکن بندر

بننے ہی مل گئی۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں

گے پاکستان۔“

”یا تو یہ نعرہ ہر وقت کیوں لگاتا رہتا ہے۔“

”یہ تم نہیں سمجھو گے پیارے۔“

سہیل ٹھیک پانچ بجے ریٹورنٹ پہنچ گیا۔ منیجر نے

اسے دو ملازمین کے سپرد کر دیا۔ ملازمین اسے ایک کمرے

میں لے آئے اور اس کے جسم پر بندر کی کھال چڑھا دی

گئی۔

کھال ایسی تھی جیسے تور سے نکال کر چڑھائی گئی ہو۔

گرمی سے سہیل کا برا حال ہو گیا۔ ”اس میں تو بہت گرمی ہے

منیجر صاحب۔“ اس نے منیجر سے شکایت کی۔

”ارے بابا۔ اس میں اسے سی تو نہیں لگ سکتا۔“

منیجر برا سامنے بنا کر بولا۔ ”اب تم جاؤ گیٹ پر جا کر کھڑا

ہو جاؤ۔“ سہیل ریٹورنٹ کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

اب وہ ایک جانور کی نگاہوں سے اس دنیا کو دیکھ رہا تھا۔

لوگ اسے دیکھ کر خوش ہوتے خوفزدہ ہوتے۔ بچے ہم کر

ماؤں سے لپٹ جاتے۔ وہ اچھل کود کرتا رہتا۔ اس نے اپنی

طرف سے اس انیمٹ میں کچھ تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ جیسے

اسٹول پر بیٹھنا، کولڈ ڈرنک پینا، بسکٹ کھانا اور سگریٹ

پینا۔ وہ کسی تربیت یافتہ بڑے بندر کی حرکتیں کر رہا تھا۔ اس

کی وجہ سے ریٹورنٹ والوں کے مزے آ گئے۔ گاہوں کی

لائسن لگ گئی۔ سہیل دل کھول کر مہمانتیں کر رہا تھا۔ اس نے

اپنے ایک جاننے والے کو بھی دیکھا جو بڑی دلچسپی سے

بندر کے اس تماشے کو دیکھ رہا تھا۔

اسے اب کسی کی پروا نہیں تھی کیونکہ اسے پہچاننے والا

بھی کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کھال کے اندر ایک

بے روزگار نو جوان اچھل کود کر رہا ہے۔

ٹھیک بارہ بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تو ہوٹل والے

اسے اندر لے آئے۔ اس نے اپنی کھال اتار دی۔ اپنے

کپڑے پہنے اور وہ بہترین کھانے کھا کر پانچ سو روپے

جیب میں رکھ کر گھر واپس آ گیا۔ ہوٹل والے اس کی

پرفارمنس سے بہت مطمئن تھے۔

ایک شام خود حامد اس کا تماشہ دیکھنے اس کے پاس

آن .. کھڑا ہوا۔۔۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بہن کو بھی لے آیا تھا

جو بہت خوبصورت اور نیچے نقوش والی لڑکی تھی۔

وہ دونوں زور زور سے ہنس رہے تھے۔ سہیل کو اس

کی بہن روزی بہت اچھی لگی۔ اس نے بندر کے روپ میں

اسے کئی سلام بھی کر دیے جس کی وہ انسان کے روپ میں

کبھی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ روزی کو بہت پسند کرتا تھا

خواب

خواب کیسے آتے ہیں؟ ایک ایسا سوال ہے جس کا آج تک کوئی قطعی جواب سامنے نہیں آیا۔ بہر حال ان تمام نظریات میں سے بعض ایسے ہیں، جو عقل سے قریب تر ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن کی تین حالتیں ہیں۔ ایک شعوری، جو جاگنے کی حالت میں ہوتی ہے۔ دوسری لاشعوری، جو بھیجی سامنے نہیں آتی اور ایک تیسری حالت تحت الشعور کی ہے، وہ یہ حالت ہے جس کے اندر انسان کے جذبات، احساسات اور خیالات راکھ میں چنگاری کی طرح دے رہتے ہیں اور رات کو جب وہ سوتا ہے تو خوابوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق خواب کی حالت میں انسان ایک مخصوص کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں تیزی سے حرکت کرنے لگتی ہیں اور دماغ کا ایک خاص حصہ جاگ جاتا ہے۔ نیند کی اس کیفیت کو نفسیات دانوں نے Rem.sleep کا نام دیا ہے، ہماری نیند کے تمام عرصے میں یہ کیفیت تقریباً ہر نوے منٹ کے بعد آتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 10 سے 60 سال تک کی عمر کے لوگوں میں ان کی پوری نیند کا ایک چوتھائی حصہ Rem.sleep کی حالت میں ہو یا بعض ادویات کے استعمال سے یہ عرصہ کم کر دیا جائے تو نازل حالت میں آتے ہی وہ اس کی کو ضرور پورا کرے گا۔ مشہور ماہر نفسیات اور فلسفی فرائیڈ کے نظریے کے تحت خواب ہماری ان خواہشات کا اظہار ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم جاگنے کی حالت میں زبردستی یا لاشعوری طور پر دبائے رکھتے ہیں۔ لیکن یہ محض خوابوں کی وجہ سے ہے۔

اللہ کے آخری نبیؐ کے ایک فرمان کے مطابق خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری بھی ہوتے ہیں، ایسے خواب سچے ہوتے ہیں۔ خود نبیوں کو بھی خواب آتے تھے جو بالکل سچے ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواب انسان کی پریشانیوں کا اظہار بھی ہوتے ہیں اور ان کی نیکیوں کی جزا بھی، یہی خواب اچھے خواب ہوتے ہیں.....

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

لیکن دل کی بات اس نے دل ہی میں رکھی تھی کیونکہ وہ حامد کی بہن بھی جو اس کا سب سے قریبی دوست تھا۔ اس رات گھر واپس آنے کے بعد وہ بہت دیر تک روزینہ ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔

دوسری صبح وہ خود ہی حامد کے گھر پہنچ گیا۔ روزینہ گھر پر تھی جبکہ حامد سو دالینے گیا ہوا تھا۔ روزینہ نے معمول کے مطابق اس کا استقبال کیا۔ وہ سہیل کو اچھی طرح جانتی تھی۔ روزینہ نے خود ہی ذکر کیا۔ ”سہیل صاحب، کل میں اور حامد بھائی بندر کا تماشا دیکھنے گئے تھے۔“

”اچھا۔“ سہیل مسکرا دیا۔ ”کس بندر کا؟“
”یہ نہیں..... آپ کو تو معلوم ہی نہیں ہے۔ وہ جو بیلیو مون ریستوران ہے۔ ان لوگوں نے کہیں سے ایک بندر حاصل کیا ہے۔ بہت بڑا اُنے کور پلا سمجھ لیں۔ مزے مزے کی حرکتیں کرتا ہے۔ آپ بھی جا کر دیکھیں۔“ اس وقت سہیل کو پتا چلا کہ حامد نے اس بندر کا راز اپنی بہن کو نہیں بتایا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ بتا دے کہ وہ بندر خود ہی تھا لیکن یہ مصلحت کے خلاف ہوتا۔ اس نے روزینہ سے محبت کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کوئی لڑکی کسی بندر سے محبت کرنا کبھی پسند نہیں کرتی۔ ویسے بھی یہ شرم کی بات تھی کہ جب نوکری نہیں ملی تو بندر بن گئے۔

حامد سبزیاں لے کر واپس آ گیا۔ اس نے سہیل کو گلے لگا لیا۔۔۔ ”واہ میرے یار، تو نے تو کمال کر دیا۔ کوئی بندر بھی اتنا شاندار بندر نہیں بن سکتا۔“

”ہاں! میں نے کل تمہیں اور روزینہ کو دیکھا تھا۔“ سہیل نے کہا۔ ”تم نے روزینہ کو تو نہیں بتایا۔“
”نہیں بھائی۔ اسے کیسے بتا سکتا ہوں کہ تم بندر بن گئے ہو۔“ حامد نے کہا۔ ”یہ تو ہم دونوں کی عزت کا سوال ہے۔“

”تمہارا شکر یہ۔“
”روزینہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ بندر کو دیکھ کر۔ اسے بندر شروع سے اچھے لگتے ہیں۔“

”اور انسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے اس کا؟“

”انسانوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”روزینہ اس دوران میں چائے لے کر آگئی۔ چائے رکھ کر وہ اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد حامد نے کہا۔ ”یار! میں اس کے رشتے کے لیے بہت پریشان ہو رہا

دیکھیں نہیں ہے۔“

اس رات اس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ دوسری صبح اسے حامد کا بتایا ہوا کام یاد آ گیا۔ اس لڑکے کو دیکھنے کے لیے جانا تھا۔ اس لڑکے کا نام ذیشان تھا۔ ایک خستہ بلڈنگ کی چھٹی منزل پر کلیرنگ فارورڈنگ کا کوئی آفس تھا۔ ذیشان اس میں کام کرتا تھا۔ زینوں کے پاس ایک لفٹ بھی تھی۔ لفٹ میں داخل ہو کر اس نے چھٹی منزل کا بٹن دبایا اور وہ لفٹ چھٹی منزل پر پھنس گئی۔ سہیل کو لفٹ سے عام طور پر وحشت ہوتی تھی۔ عام طور پر وہ زینے ہی استعمال کرتا تھا۔ اس دن نہ جانے کیوں اس نے لفٹ استعمال کر لی تھی اور لفٹ میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارنا شروع کر دیے امیر جی بٹن دبائے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچانے لگا۔ لفٹ کے اندر کی ہوا بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد باہر سے کسی نے آواز لگائی۔ ”کیا لفٹ میں پھنس گئے ہو؟“

”ہاں بڑی خدا کے لیے جلدی نکالو۔“

”حاموش۔“ باہر سے کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں اور فرنٹ کا دروازہ کئی طرح کھول لیا گیا۔ باہر آتے وقت اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور پورا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے سہارا دے کر اسے ایک طرف بٹھا دیا۔ بہت دیر بعد اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے اسے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔ ”بھائی مجھے ذیشان صاحب سے ملنا ہے۔“

”جی فرمائیں، ذیشان میں ہی ہوں۔“ اس آدمی نے بتایا جس نے اسے سہارا دے کر لفٹ سے باہر نکالا تھا۔

”میں حامد کا دوست ہوں۔“ سہیل نے بتایا۔

”اوہ..... حامد صاحب کا۔“ ذیشان مکرر دیا۔

”آسمیں میرے ساتھ آ جائیں۔“ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آیا۔ حامد کے بیان کے مطابق وہ واقعی ایک خوش اخلاق اور قس کھنم کا انسان تھا۔ ”تو آپ حامد صاحب کے دوست ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ آپ کو میرے پاس

کیوں بھیجا گیا ہے۔“

”جی ہاں آپ کو پسند کرنے کے لیے۔“

”لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے غلط

بیانی کر دیں۔“ ذیشان نے کہا۔ ”روزینہ بہت اچھی لڑکی

ہوں۔ تم تو جانتے ہو کہ باپ کا سایہ نہیں ہے۔ صرف ماں ہے۔ وہ بے جاری کہاں تک تلاش کرے گی۔“

”کیا ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا؟“

”آیا ہے یار، ابھی حال ہی میں ایک رشتہ آیا ہے۔“

حامد نے بتایا۔ ”میں تو اس لڑکے کو دیکھ چکا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک نظر تم بھی دیکھ لو۔“

”کیسا لڑکا ہے؟“

”بس تمہاری طرح ہی ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”مجھے

شروع سے تم جیسے نوجوان پسند آتے ہیں..... لا ابالی اور نرم مزاج کے۔“

سہیل نے سوچا کہ خدا کے بندے جب تجھے مجھ جیسا بندہ پسند ہے تو پھر خود میں ہی کیوں نہیں تیرے دھیان میں آ رہا ہوں لیکن وہ یہ بات کہہ نہیں سکا۔

اس دوران میں حامد نے ایک کاغذ پر اس لڑکے کا نام پتا اور فون نمبر لکھ کر دے دیا۔ ”اس سے ضرور ملنا۔“

”دس وقت ملوں۔ شام کے وقت تو میں بندر بننا رہتا ہوں۔“

”میں نے اس کے دفتر کا پتا بھی لکھ کر دے دیا ہے۔“

”دن کے وقت چلے جانا۔“

اس شام سہیل بہت بچھا بچھا سا تھا۔ ڈیوٹی کے دوران بھی اس سے انسانوں جیسی حرکتیں سرزد ہوتی رہیں یعنی چپ چاپ رہنا، اداسی سے ایک طرف بیٹھ جانا اور تاکام عائن کی طرح آہیں بھرنا۔ منیجر کو اس کی یہ حرکتیں پسند نہیں آئیں۔ ڈیوٹی ختم ہو جانے کے بعد اس نے کہا۔ ”دیکھو بھائی، ہم نے چھپیں انسان بننے کے لیے نہیں بندر بننے کے لیے جاب دی ہے۔ آج تو تم دیو داس بنے بیٹھے تھے۔“

”منیجر صاحب، میں بھی انسان ہوں۔ کبھی کبھی

پریشان بن گیا کرتا ہوں۔“

”یہی تو مسئلہ ہے انسان کے ساتھ کہ وہ پریشانیوں میں

گھرا رہتا ہے۔ جانوروں کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ تم

نے کبھی کسی جانور کو بنگلی کے بل بھرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا

یا وہ مکان کے کرائے کے لیے پریشان رہتا ہو۔ اس کے

لیے جعلی پولیس مقابلہ بھی نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک کہتے ہیں منیجر صاحب۔ آج کا جانور زیادہ

فائدے میں ہے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تمہیں انسان نہیں بندر بننا

چاہیے۔ کم از کم پانچ بجے شام سے رات بارہ بجے تک۔ اس

کے بعد چاہے انسان رہو یا نہ رہو۔ ہوں کو اس سے کوئی

”مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔ دس دفعہ بتا چکا ہوں پھر بھی کو اس کیے جا رہے ہو۔“

”یا گناہ راض کیوں ہوتے ہو۔“ حامد نے کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ کورٹ میرج سے شادی کا مشورہ میں نے ہی روزینہ کو دیا تھا اور وہ اس کے کہنے پر کورٹ میرج کر رہا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“

”یار سمجھا کرو۔ یہ ہے بغیر جینز کے شادی کا آسان طریقہ۔ مجھے روزینہ کو جینز میں کچھ نہیں دینا پڑے گا۔ اب بتاؤ..... اب کیا کہتے ہو؟“

”صرف ایک بات۔“

”وہ کیا.....؟“

”بٹ کے رہے گا ہندوستان اور لے کے رہیں گے پاکستان۔“ سہیل حامد کو حیران چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں واپس آ گیا۔ اب اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی پسند بھی آئی تو اس کے ساتھ عجیب کہانی وابستہ تھی۔

اس شام جب وہ اپنی ڈیوٹی پر ہوئی پہنچا تو منیجر نے اس سے کہا۔ ”مبارک ہو۔ تمہاری ترقی ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب... کیا اب مجھے اعلیٰ کی کھال پہناؤ گے؟“

”ارے نہیں بابا تمہیں چڑیا گھر والوں نے پسند کر لیا ہے۔“ منیجر نے بتایا۔

”چڑیا گھر والوں نے؟“

”ہاں ہزار روپے روز دیں گے۔ ان کے پاس تمہارے سائز کا کوئی بندر نہیں ہے۔ تم کو خاص پنجرے میں رکھا جائے گا۔“

”ابے ابو منیجر کی اولاد۔ میں انسان ہوں۔ دل بہلانے والا بندر نہیں ہوں۔“

”بے وقوف انسان۔ تم یہاں بھی تو دل بہلاتے ہو۔ اب چڑیا گھر چلے جاؤ گے۔ کھانا پینا الگ اور رہنے کے لیے الگ پنجرہ۔ اس کے علاوہ ہزار روپے روز۔“

”کیا میری یہی حیثیت رہ گئی ہے؟“ سہیل بہت دکھ سے بولا۔

”یہ تو بہت زیادہ حیثیت ہے۔ ورنہ ہزار روپے روز آج کل کس کو ملتے ہیں۔ بڑے بڑے جویتاں چننا رہے ہیں۔ تمہارے تو مزے آ جائیں گے۔“

”اور کھال کون سی ہوگی؟“

”جو تم نے پہن رکھی ہے۔ اس کا سودا پچاس ہزار میں ہو گیا ہے۔“ منیجر نے کہا۔ ”اب تمہاری مرضی ہے۔ اگر بولو تو منسوخ کر دیں؟“

”نہیں منسوخ مت کرو۔ میں تیار ہوں۔“

”مبارک ہو۔ ترقی اسی کو کہتے ہیں۔ پندرہ ہزار سے ایک دس تیس ہزار۔“

سہیل کو ایک پنجرے میں بند کر کے چڑیا گھر لے جایا گیا۔ راستے میں لوگ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ دو چار بچوں نے اسے پتھر بھی مارے۔ اس وقت اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

چڑیا گھر میں اسے پنجرے سے اتار کر ڈائریکٹر کے سامنے پہنچا دیا گیا جو اسے مسکرا کر دیکھے جا رہا تھا۔ ”خوش قسمت ہو تو جوان کہ تمہیں ایک ڈھنگ کی ملازمت مل گئی ہے۔“

”آپ اسے ڈھنگ کی ملازمت کہتے ہیں۔“ سہیل منمنایا۔ ”مجھے تو خود پر رونا آ رہا ہے۔ میں نے ایم اے کر رکھا ہے اور مجھے نوکری کیا ملی ہے۔“

”صرف ایم اے۔“ ڈائریکٹر ہنس پڑا۔ ”ہیلو..... میں تمہیں اس شخص سے ملواؤں جو فرسٹ کلاس سول انجینئر ہے اور وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ یہاں بھالو کی کھال میں ہے۔“ ڈائریکٹر نے بتایا۔ ”اب بتاؤ... کیا کہتے ہو؟“

”اب تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ بٹ کے رہے گا ہندوستان اور لے کے رہیں گے پاکستان۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”یہ آپ نہیں سمجھیں گے۔ آپ جلدی سے میرے کپڑے بھجوا دیں۔ میں انسانوں کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔“ سہیل کو گوریلے والے ایجنٹل کپڑوں میں پہنچا دیا گیا۔

اس وقت وہاں بہت سے دیکھنے والے بھی تھے جو اسے دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ پنجرے میں ایک بڑا سا جھولا بھی تھا۔ اسے جھولے پر بیٹھ کر اپنے سہیل دکھانے تھے تاکہ آنے والے خوش ہو کر جائیں اور چڑیا گھر کی تعریف ہو کہ انہوں نے ایسا نایاب گوریلہ حاصل کر لیا ہے۔

یہ بہت سخت ڈیوٹی تھی۔ صبح دس بجے شروع ہوتی اور مغرب تک جاری رہتی۔ اندھیرا ہونے کے بعد وہ اپنی کھال اتار کر پنجرے سے باہر آ جاتا۔

ادھر ادھر کی سرگرتا۔ پرانے دوستوں سے ملتا۔ حامد کے پاس چلا جاتا اور کسی ہوٹل میں رات کا کھانا کھا کر چڑیا

اجلی وردیوں میں ملبوس میرے ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہر طرف سے طرح طرح کے کھانوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں جبکہ کھیل کے بنجرے میں کیلون اور مونگ پھلی کا انبار لگا ہوا تھا۔ وزیر صاحب کے اشارے پر اس نے کیلے کھا کر دکھائے۔ دو بوتلیں کھول کر پنی لیں۔ اور سگریٹ پی کر دکھایا، لوگ تالیاں بجاتے رہے۔

بے شمار تصویریں کھینچی گئیں۔ چینل والوں نے اس کی ویڈیو بنائی۔ ہر ویڈیو میں وزیر صاحب بھی شامل تھے۔ اس موقع پر وزیر صاحب کی تقریر بھی بہت دلچسپ تھی۔ انہوں نے فرمایا۔ ”میرے بھائیو اور بہنو! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا ملک ہماری پالیسیوں کی وجہ سے ترقی کر رہا ہے۔ اس ترقی کا اثر جانوروں پر بھی ہو رہا ہے (تالیاں) آپ خود دیکھ لیں کہ ہماری پالیسیوں کی وجہ سے یہ جانور کتنا خوش حال ہے۔ (تالیاں) جبکہ اپوزیشن ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم صرف کرپشن میں ترقی کر رہے ہیں۔ میرے بھائیو! یہ ایک غلط الزام ہے۔ اب انہیں کوئی سمجھائے کہ ترقی ترقی ہوتی ہے۔ جیسے ڈگری ڈگری ہوتی ہے۔ (تالیاں) میں تو کہتا ہوں کہ پوری دنیا کو آ کر اس جانور کو دیکھنا چاہیے اور یہ جان لینا چاہیے کہ ہمارے یہاں کا جانور بھی ہماری پالیسیوں کی وجہ سے ترقی کر رہا ہے۔“

خوب تالیاں بنجیں۔ اس کے بعد کھانا شروع ہوا۔ بچے اپنی اپنی پلیٹیں لے کر اس کے بنجرے کے پاس آ گئے۔ ایک بچے نے قریب کھڑی ہوئی اپنی ماں سے پوچھا۔ ”ماما، بندر کو بروٹ دے دوں؟“

”نہیں بیٹا۔ یہ بے چارہ یہ سب نہیں کھاتا۔ یہ صرف کیلے کھاتا ہے۔“ بھوک سے کھیل کی حالت پری ہو رہی تھی۔ کیلے کھا کھا کر اس کا دماغ الٹا جا رہا تھا۔ آخر تک کیلے کھا تا رہتا۔ اس کے علاوہ اسے کرب بھی دکھانے پڑ رہے تھے۔

مہمانوں کا ہنگامہ رات گئے تک جاری رہا۔ پھر رات کے وقت اس کے بنجرے کو ایک بڑے سے ہال میں پہنچا دیا گیا۔ اس ہال میں ہر طرف قالین بچھے ہوئے تھے جس پر سفید چاندیاں تھیں۔ ایک طرف دیواروں کے ساتھ گاؤں کیے بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ سازندے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر کھیل کو پتا چلا کہ اس کے آنے کی خوشی میں مجرے کا مہنام کیا گلبہ ارا بھرے

گھر واپس آ جاتا۔ اس کی کارکردگی یہاں بھی بے مثال رہی۔ اسے دیکھ کر احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ انسان ہے بلکہ اب تو وہ خود کو ایک بندر ہی سمجھنے لگا تھا۔

ایک مہینے بعد ڈائریکٹر نے پچکے سے اسے اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔ ”نوجوان، تمہاری قسمت تو بہت زوروں پر جا رہی ہے۔“

”وہ کیوں جناب؟“

”کل ایک وزیر صاحب کی فیملی چڑیا گھر کی سیر کے لیے آئی تھی۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہے اور تمہیں اپنی کوشی میں رکھنا چاہتی ہے۔“

”کیا اس فیملی کو یہ نہیں معلوم کہ میں ایک انسان ہوں؟“

”معلوم ہے۔ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔“

ڈائریکٹر نے کہا۔ ”اس کے باوجود وہ تمہیں لے جانا چاہتے ہیں۔ تنخواہ پچاس ہزار دیں گے۔ خود سوچو ہر مہینے پچاس ہزار۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ورنہ میں خود کھال اوڑھ کر تمہاری جگہ چلا جاتا۔ اس ملک میں پچاس ہزار کہاں ملتے ہیں۔“

”اور آپ کا چڑیا گھر جو خالی ہو جائے گا؟“

”اس کی فکر مت کرو۔ تمہاری جگہ دو چار اور بچھل بندر لاکر رکھ دیے جائیں گے۔ ویسے تم چلے جاؤ تو یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔“

”کیوں۔ آپ پر کیوں احسان ہوگا؟“

”وہ میرے بیٹے کی ترقی کا معاملہ ہے۔ فائل اس وزیر کے پاس ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کو خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وزیر کی فیملی مجھ سے خوش ہوگی۔ وزیر میرے بیٹے کو ترقی دے گا۔“

”اور میری خوشی کا کیا ہوگا؟“

”کیا تمہاری خوشی کے لیے یہ کم ہے کہ تمہیں پچاس ہزار روپے ملیں گے۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔ ”ویسے اب تم وہ ہندوستان اور پاکستان والا نہ رہو نہیں لگا نا۔“

”نہیں..... میں نہیں لگاؤں گا۔ آپ مجھے وزیر صاحب کے یہاں بھیج دیں۔“

کھیل کا بنجرہ جس وقت وزیر صاحب کی کوشی کے احاطے میں اتارا گیا اس وقت وہاں بہت سے اخبار اور چینل کے نمائندے بھی تھے۔ وزیر صاحب نے اپنے کئی دوستوں اور ان کے گھر والوں کو مدعو کر رکھا تھا۔

طرح آپ کا بندر بھی اعلیٰ خاندان سے معلوم ہوتا ہے۔“ وزیر صاحب جزیب ہو کر رہ گئے۔ خدا جانے یہ ان کی تعریف تھی یا توہین کی جارہی تھی۔

وفد کے جانے کے بعد وزیر صاحب سہیل کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ ”بے وقوف، تم نے یہ کیا کیا۔ تمہیں نعرے لگانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”جناب عالی، یہ تو دیکھیں کہ میرے نعرے کی وجہ سے آپ کی کتنی عزت ہوئی ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ وزیر نے گردن ہلائی۔ ”لیکن اس کے علاوہ کچھ اور مت بولنا اور نعرے بھی اس وقت لگانا جب میں اشارہ کروں اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا تم کوئی اور نعرہ نہیں لگا سکتے؟“

”نہیں جناب، جانور بن جانے کے بعد میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں۔ اس لحاظ سے سب سے بہتر نعرہ یہی ہے کہ بٹ کے رہے گا ہندوستان اور لے کے رہیں گے پاکستان۔“

”اس نعرے کا مطلب کیا ہے؟“

”اس کا مطلب نہ پوچھیں۔“

”تجیر یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔“ وزیر صاحب نے کہا۔ ”اب تم آرام کرو۔ کل تمہیں منسٹر صاحب کے پاس لے جایا جائے گا۔ انہوں نے تمہیں دیکھنے کی خواہش کی ہے۔“

”اب تو میں جانور ہوں۔ جہاں جی چاہے لے جائیں۔“

دوسری صبح سہیل کے چنبرے کو منسٹر ہاؤس پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی سہیل نے اپنی حرکتوں سے منسٹر کا دل خوش کر دیا۔ انہوں نے وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم اس بندر کو میرے پاس رہنے دو۔“

”جی سر، میں تو یہی سوچ کر اسے آپ کے پاس لایا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ یہ آپ کو بہت پسند آئے گا۔“

”ہاں، اچھا لگا ہے مجھے۔“

”سر، میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ میرا محکمہ بدل دیں میں آج کل جس محکمے کا وزیر ہوں، اس میں مزہ نہیں آ رہا ہے۔“

”سمجھ گیا۔“ منسٹر صاحب ہنس دیے۔ ”بہت شیطان ہو تم۔ موقع سے فائدہ اٹھالیا۔ چلو کل ہی آرڈر جاری ہو جائے گا۔“ سہیل اب منسٹر ہاؤس میں تھا۔

اس سے پہلے یعنی جب وہ انسان تھا، اس شاندار

میں ملک کی مشہور فلمی اداکارائیں حصہ لے رہی ہیں۔ سہیل کو بندر ہونے کے باوجود بڑا مزہ آ رہا تھا۔ وہ حسنا بھی جنہیں وہ صرف پردے پر دیکھ سکتا تھا اس کے سامنے ڈانس کر رہی تھیں اور ڈانس بھی ایسا کہ بندر ہونے کے باوجود سہیل پسینے پسینے ہونے لگا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ بڑے سرکاری افسران تھے۔ صرف رقص ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ شراب اور کباب کا دور بھی چل رہا تھا۔

رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ دوسری صبح سہیل کے چنبرے کو ایک اور بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ملاقاتیں کا کمرہ تھا اور غنیمت یہ تھا کہ اس کمرے میں اسٹپ لگے ہوئے تھے۔ اس لیے سہیل کے لیے کھال کی گرمی برداشت کے قابل ہو رہی تھی۔

صبح دس بجے کے قریب چند عالموں کا گروپ وزیر صاحب سے ملنے کے لیے آیا۔ وزیر صاحب نے اس موقع پر بہت ہی درد بھری لہجے میں فرمایا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم فرقہ وارانہ فسادات کیوں کر رہے ہیں۔ پیدا کرنے والے نے تو سب کو ایک بنایا ہے۔“

تقریباً دو صاحب کر رہے تھے جو رات بھر جھرا دیکھتے رہے تھے اور شرابی کی کراتنے مدہوش ہو گئے تھے کہ انہیں سہارا دے کر جبر سے والے کمرے سے باہر لے جایا گیا تھا۔

سہیل سے اس وقت برداشت نہیں ہو سکا۔ اس نے زور سے نعرہ لگا دیا۔ ”بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔“

اس نعرے کو سن کر علما کا وفد گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ان سب کی ٹٹی کم ہو گئی۔ ”یہ..... یہ کیا پکڑ ہے..... یہ نعرہ کس نے لگایا؟“

”اس بندر نے۔“ وزیر صاحب نے سہیل کی طرف اشارہ کر دیا۔

”یہ انسانوں کی طرح بولتا ہے؟“

”بولتا نہیں ہے۔ صرف یہ نعرہ لگاتا ہے۔“ وزیر صاحب نے فرمایا۔ ”اس کی اسی کرامت کو دیکھ کر تو میں اسے اپنے پاس لے آیا ہوں۔ یہ کہیں اور بتا تو اس کی قدر نہیں ہوتی۔ میں اسے اپنے بچوں کی طرح رکھتا ہوں۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے اور ویسے بھی یہ ایک اچھی نسل کا بندر ہے۔“

”سمان اللہ۔ سمان اللہ۔“ ایک صاحب نے آگے بڑھ کر وزیر صاحب کا ہاتھ چوم لیا۔ ”جناب عالی آپ ہی کی

عمارت کو دور سے دیکھتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ خود اس شاندار عمارت میں رہنے لگے گا۔

ایسی عظیم الشان ترقی وہ انسان ہوتے ہوئے کبھی کر بھی نہیں سکتا تھا۔ یہاں بھی اس کا بنجرہ اس بڑے کمرے میں رکھا گیا جہاں ملاقاتی آتے تھے۔

سمبل کو پہلی مرتبہ ایسے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ بڑے بڑے وزیر سیاست دان، سوشل ورکرز، مختلف ملکوں کے سفیر، بیوروکریٹس اور نہ جانے کون کون۔ وہ سب مختلف مسائل لے کر آتے تھے۔

ایک بار ایک مشہور وزیر منسٹر کے پاس آ کر منہ بسور لگا۔ ”سرجی، مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔“

”ایسی کون سی غلطی ہو گئی؟“

”سرجی، میں نے ایم اے پہلے کر لیا۔ میٹرک بعد میں کیا ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوا؟“

”سرجی، یہ ٹیکنیکل غلطی ہے۔ پہلے میٹرک ہوتا ہے، پھر انٹر اور بی اے۔ اس کے بعد ایم اے۔ بس ڈگریاں بنانے کے جوش میں یاد ہی نہیں رہا۔“

”تم لوگ کیوں ہمیں بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ ذرا سوچ سمجھ کر ایسی حرکتیں کیا کرو۔“

”آپ تو سنہیال لیں گے نا۔“

”ہاں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

اسی وقت سمبل نے نعرہ لگا دیا۔ ”بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔“

”سرجی۔ یہ بند نعرہ لگاتا ہے؟“ وزیر نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، بس یہی نعرہ لگاتا رہتا ہے۔“

”لیکن یہ تو بہت اوکھا نعرہ ہے سرجی۔ اس کا کوئی بندوست کریں۔“

”لگائے دو۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔“

”سرجی، یہ دو کوڑی کا بندر ہمیں یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ کیا ہم نے اس دن کے لیے ایسے نعرے لگائے تھے۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔“

”فرض کرو اس کے احساس دلانے سے تمہیں اس نعرے کے خطرناک ہونے کا احساس ہو گیا تو کیا اس کے بعد تم کو احساس ہو جائے گا؟“

سپر ہٹ بے عزتی

میٹھ پنچر۔ ”جب میں تمہارے جتنا تھا میرے متخصس میں 100 مارکس آتے تھے۔“

اسٹوڈنٹ۔ ”او بھائی آتے ہوں گے، کوئی اچھا پنچر پڑھاتا ہوگا۔“

شک

بیوی۔ ”مجھے اپنے شوہر پہ شک ہے وہ روز چھپ کر کسی لڑکی سے ملتے ہیں۔“

سہیلی۔ ”اب تم کیا کرو گی؟“

بیوی۔ ”کل ہی ان کے پیچھے اپنے بوائے فرینڈ کو لگا دوں گی۔“

اصل وجہ

ڈاکٹر۔ ”آپ کے 3 دانت کیسے ٹوٹے؟“

مریض۔ ”جی وہ بیوی نے بہت سخت روٹی بنائی تھی۔“

ڈاکٹر۔ ”تو کھانے سے انکار کر دیتے۔“

مریض۔ ”جی وہ ہی تو کیا تھا۔“

شرافت

لڑکی۔ ”آپ مجھے لفٹ دیں گے تو میں آپ کو اپنا موبائل نمبر دوں گی۔“

لڑکا۔ ”جہاں چاہو وہیں چھوڑ دوں گا، نمبر دبیر رہنے دو، بس 100 کا پیٹرول ڈلوادینا باجی۔“

سبق بہیگانی نے لڑکوں کو شریف بنادیا ہے۔

دعا

ایک کشتی طوفان میں ٹھنسن گئی۔

کیپٹن۔ ”کسی کو طوفان سے بچنے کی دعا یاد ہے؟“

مولوی۔ ”مجھے یاد ہے۔“

کیپٹن۔ ”تم دعا مانگو کیونکہ ہمارے پاس ایک لائف جیکٹ کم ہے۔“

مرسلہ: رضوان تھولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہے۔“ نرس نے کہا۔ ”بلکہ ایسا کرو کہ آنکھیں بند کر لو۔ جیسے گہری نیند میں ہو۔“ ایسویٹس رک گئی۔ سہیل کو اسٹرپچر پر لٹایا گیا۔ اس نے نرس کو کہتے ہوئے سنا۔ ”سر، میرا خیال ہے کہ یہ ابھی گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ دوسری آواز شاید کسی ڈاکٹر کی تھی۔ ”تم ہی اس کے ساتھ رہو گی کیونکہ یہ تم سے مانوس ہو گیا ہے۔“

”ییس سر۔“ سہیل کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے نرس کی آواز سنی۔ ”اٹھ جاؤ۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔“

سہیل نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ بہت بڑا اور خوبصورت کمرہ تھا۔ ایک طرف ایک بڑا سفر تاج، قالین، وارڈروب، اے سی، کسی فائبرو اسٹار ہوٹل کے کمرے کی طرح۔ اس نے باہر سے کچھ لوگوں کے رونے دھونے کی آوازیں سنیں۔ یہ کسی آوازیں ہیں؟

”یہ ان لوگوں کی آوازیں ہیں جن بے چاروں کے لیے اسپتال میں جگہ نہیں ہے۔“ نرس نے بتایا۔ ”لیکن میرے لیے تو یہ شاندار روم ہے۔“

”تمہاری بات الگ ہے۔“ وہ ہنس دی۔ ”کیونکہ تم منسٹر صاحب کے بندر ہو۔ تمہارا خیال رکھنا تو ضروری ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے۔“

”ایمن۔“ نرس نے بتایا۔

”ایمن، میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔ پلیز..... تم میرے لیے کسی طرح ایک سوٹ کا بندوبست کر دو تاکہ میں اس کھال سے نجات پاؤں۔“

”میں جارہی ہوں۔ تم اسی طرح آنکھیں بند کر کے لیٹے رہنا۔ کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔“

نرس کے باہر جانے کے بعد سہیل آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے واقعی نیند آگئی۔ اس کی آنکھیں ایمن کی آواز سے کھلیں۔ وہ اس کے لیے سوٹ لے آئی تھی۔

سہیل جوڑا لے کر جلدی سے غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں آتا تو ایمن اسے دیکھتی رہ گئی۔ ”واہ تم تو اچھے خاصے انسان ہو۔“

”ہاں لیکن زندگی نے مجھے بندر بنا دیا تھا۔ ایمن! میں اپنی کھال لے کر یہاں سے فرار ہو رہا ہوں۔“

”کیا لوگ تمہیں پکڑیں گے نہیں۔“

”نہیں سر جی، وہ اب کہاں سے ہوتا ہے۔“ وزیر نے اپنی گردن جھکا لی۔

”تو بس لگانے دو نعرہ۔ خود ہی تھک ہار کر چپ ہو جائے گا۔“ اس دن سہیل بہت دھکی ہو گیا۔ نہ جانے اس کے ارد گرد یہ سب کیا ہو رہا تھا اور کیوں ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس پنجرے سے نکل کر بھاگ جائے لیکن اس کے لیے اب بھاگنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ چیف منسٹر ہاؤس میں پہرے لگے ہوئے تھے۔ وہ کہیں نہیں بھاگ سکتا تھا۔ بھاگ نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا کہ وہ بیمار پڑ جائے۔ اس نے یہی کیا۔ اپنا پیٹ دبا کر زور زور سے اچھلنا شروع کر دیا۔ اس نے بیماری میں بھی اپنے بندر ہونے کا خیال رکھا تھا کیونکہ یہ راز سوائے منسٹر صاحب کے اور کسی کو معلوم نہیں تھا۔

خود منسٹر صاحب اس کے پاس دوڑے چلے آئے۔

”کیا ہوا..... یہ کیا شور کر رہے ہو؟“

”تکلیف جناب۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”پیٹ میں بہت ہی زبردست درد ہو رہا ہے۔“

”اوہ، جنہیں تو اسپتال بھیجنا پڑے گا۔“ وہاں کس بات کی دیر تھی۔ ایک ایئر کنڈیشنڈ ایسویٹس اس کے لیے آگئی۔ جس میں اسے لٹا دیا گیا۔ ایک خوبصورت نرس اس کے پاس بیٹھ گئی۔ جو اس کے پاس بیٹھنے سے خوف زدہ ہو رہی تھی۔

وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سہیل کو دنیا بھر کی روشنیاں بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں پھر اس نے فوری طور پر ایک فیصلہ کرتے ہوئے نرس کا ہاتھ تھام لیا۔ بے چاری نرس بری طرح چیخ اٹھی۔ ”نہیں..... نہیں۔“ تم گھبراؤ نہیں۔ میں انسان ہوں۔“

سہیل نے کہا۔

”کیا.....؟“ نرس حیرت زدہ رہ گئی۔ ”تم انسان ہو۔“

”ہاں، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ تم میرا ساتھ دو۔“

”کیسے ساتھ دوں؟“

”مجھے اسپتال سے فرار کر دینا پھر میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔“ سہیل نے کہا۔ ”پلیز..... میرے لیے بس ایک عدد کرتہ شلوار کا بندوبست کر دینا کیونکہ میں اس کھال میں فرار نہیں ہو سکتا۔“

”ٹھیک ہے، اب تم چپ ہو جاؤ۔ اسپتال آ گیا

”لیکن جنگل ہیں کہاں۔ ٹھیکیداروں نے تو سارے درخت کاٹ دیے ہیں۔“

”خیر ایسا بھی نہیں ہے۔ ابھی بھی تھوڑے بہت رہ گئے ہیں۔ کیا عیش کی زندگی ہوتی ہے جنگل میں۔ نہ بجلی کا بل، نہ ٹیکس کی شکایت، نہ پولیس کا ڈر، نہ فرقہ پرستی، نہ کوئی زبان کچھ بھی نہیں۔ بس کھاؤ پووا گھومتے رہو۔“

”لیکن جنگل میں جانور تو ہوتے ہیں نا۔“

”انسانوں سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتے۔ میں نے جان لیا ہے کہ جانور بن کر کس طرح رہا جاتا ہے۔“

”چلو مرضی ہے تمہاری۔“ حامد نے کہا۔ ”لیکن تم انسانوں سے کٹ کر رہ جاؤ گے۔“

”میرے ارد گرد جو لوگ ہیں اگر وہ انسان ہیں تو پھر ایسے انسانوں سے دوری بہتر ہوگی۔“

حامد کے واپس جانے کے بعد سہیل نے سامان کی فہرست بنانی شروع کر دی۔ اسے کیا کیا اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ فرسٹ ایڈ کس، موم بتیاں، ایمر جسی لائٹ ماچس کے ڈبے، آٹا، دال، چاول، نمک اور چائے کا سامان، ایک کلبھاڑی، جاتو اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں جن کی جنگل میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔

وہ رات گئے تک سامان کی خریداری میں مصروف رہا۔ اس نے چار پانچ جینز اور شرٹس بھی خرید لی تھیں۔

دوسری صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ نرس ایمین اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”ارے تم۔“ سہیل پوچھا۔ ”تم کیسے آگئیں؟“

”بھول گئے تم ہی نے تو مجھے اپنا پتا دیا تھا۔“ ایمین نے بتایا۔

”ہاں یاد آ گیا۔“ ایمین کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔

”تم پرتو کوئی از ام نہیں آ یا؟“ سہیل نے پوچھا۔

”نہیں۔ بس پوچھ کچھ ہوئی تھی۔“ ایمین نے کہا۔

”لیکن یہ کیا کہانی ہے؟“

سہیل نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

”بس یہ ہے میری زندگی۔ انسان سے بندر بن گیا اور اب جنگل ہی میں سیر کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔“

”تمہاری کہانی سن کر بہت افسوس ہوا۔ واقعی یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں ہے لیکن مجھے یہ سب سن کر اس لیے زیادہ حیرت نہیں ہوئی کہ میرے بھی حالات کچھ ایسے ہی رہے ہیں۔ میں نے بھی بہت ٹھوکریں کھائی ہیں اور

”نہیں۔ لوگ تو بندر کو تلاش کرتے رہیں گے۔“

سہیل نے کہا۔ ”اور کسی کو میری صورت بھی نہیں معلوم۔ اس لیے میرے پکڑے جانے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ ہاں تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو میرا پتا یاد کر لو۔“ سہیل نے جلدی جلدی اپنا پتا بتا دیا۔

”اوکے، مجھے یاد رہے گا۔“ ایمین نے کہا۔ ”اور اب میں ڈاکٹر کو بلانے کی ذیونی روٹ میں جا رہی ہوں۔ اس دوران میں تم نکل کر بھاگ جاؤ۔“ ایمین باہر گئی۔ اس کے جاتے ہی سہیل بھی کمرے سے باہر آ گیا۔

اسے اسپتال سے نکلنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے فلیٹ میں تھا۔ شاید وہ صدیوں کا سفر طے کرتا ہوا اپنے فلیٹ میں پہنچا تھا۔

اس دوران میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے۔ کہاں کہاں انصافیاں کی تھیں۔

بہر حال بندر بنے رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ اس کے پاس ہوٹل کی ملازمت سے اچھے خاصے پیسے جمع ہو چکے تھے۔

اس نے اپنی بندر والی کھال اپنے فلیٹ میں چھپا کر رکھ دی۔

کچھ دیر بعد حامد اسے تلاش کرتا ہوا آ گیا۔ ”مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بھاگ کر یہیں آؤ گے۔“

”جہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں فرار ہو گیا ہوں۔“

”یار، پورے شہر میں تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔“

حامد نے بتایا۔ ”لیکن وہ سب ایک بندر کو تلاش کر رہے ہیں۔ تمہاری طرف تو کسی کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔“

”یار، میری صورت ہوٹل والے نے دیکھ رکھی تھی۔ وہ کہیں بتا نہ دے۔“

”اس کی فکر مت کرو۔ اس نے بھی بیان دے دیا ہے کہ اس نے تمہاری صورت نہیں دیکھی ہے۔“ حامد نے اسے اطمینان دلا دیا۔ ”لیکن..... تم بھاگ کیوں گئے؟ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی۔“

”کمال کرتے ہو۔ تم ایسی زندگی گزار سکتے ہو۔ ایک بندر کی طرح۔“

”اب بتاؤ، اب کیا کرتا ہے؟“

”اب میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔“ سہیل نے کہا۔ ”مجھے جانور بنے رہنے کی پرمیٹس ہو گئی ہے۔ اس لیے میں اپنی بقیہ زندگی کسی جنگل میں ہی گزاروں گا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جنگل میں ان کی لکھائی پڑھائی کہاں سے ہوگی۔ وہ تو جاہل رہ جائیں گے۔“

”اوہو، سب ابھی سے کیوں سوچ رہے ہو۔“ ایمن نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے اس وقت کوئی راستہ نکل آئے۔“

پھر ایمن نے سہیل کو اپنے گھر کا پتا اور فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔ میری پھوپھی نے میری پرورش کی تھی۔ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے، یہ پتا میری ایک جاننے والی مہربان خاتون کا ہے۔“

ایمن نے سہیل کا سامان باندھنے میں اس کی مدد کی۔ سامان اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ ”یہ تو اتنا سامان ہے کہ باقاعدہ سوزو کی کرنی پڑے گی۔“ ایمن نے کہا۔

”وہی بس بھی سوچ رہا ہوں کہ میں نے خواہ مخواہ اتنی چیزیں خرید لیں۔“

”پھر کیا کرو گے؟“

”ایک راستہ ہے میرے ذہن میں۔ کسی بس یا ریل میں سفر نہیں کروں گا بلکہ ایک ٹرک کرائے پر لے لوں گا اور جہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے، وہاں سامان اتار کر ٹرک کو واپس کروں گا۔“

”نہیں اس طرح تم پھنس جاؤ گے۔“ ایمن نے کہا۔ ”میری بات مانو صرف ایک بیگ لو اس میں ضرورت کی دو چار چیزیں رکھو اور روانہ ہو جاؤ۔“

”ہاں یہ سب سے بہتر رہے گا۔“

”جاؤ فی امان اللہ۔“ ایمن جاتے جاتے اس کے سینے سے لگ گئی۔ ”دیکھو جنگل میں جا کر مجھے بھولنا نہیں۔“

سہیل نے جنگل جانے کے لیے لانگ روٹ کی بس پکڑی تھی۔ اس نے ٹکٹ ملتان کا لیا تھا اسے معلوم تھا کہ اگر کسی کو ضرورت پیش آئے تو وہ بس رکوا بھی سکتا ہے پھر کئی مسافر اپنی ضرورت رفع کرنے کے لیے بس سے اتر جاتے ہیں اور اندھیرے میں رینگ جاتے ہیں۔ بس والا آوازیں دے دے کر انہیں بلاتا ہے اور کتنی پوری ہونے کے بعد بس آگے روانہ ہو جاتی ہے۔

سہیل نے بھی یہی کیا۔ ایک ویران مقام پر آواز دے کر اس نے بس روکائی اور اپنا بیگ اٹھا کر نیچے اتر آیا۔ اس کے ساتھ دو چار مسافر اور بھی اترے تھے۔ سہیل اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بہت دور تک چلا آیا اور ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بس

پریشانیوں برداشت کی ہیں۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں اپنی داستان سنا دوں؟“

”نہیں تمہارا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی سب ہوتا رہا ہے۔“

”اسی لیے میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اکیلے جنگل کی طرف نہیں جاؤ گے بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”کیا.....؟“ سہیل نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم میرے ساتھ کس طرح جا سکتی ہو، ہمارے درمیان..... میرا مطلب ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں کیسا آدمی ہوں؟“

”دیکھو جس وقت تم بندر کے روپ میں مجھے ملے تھے میں نے اسی وقت ایک کشش سی محسوس کی تھی۔“ ایمن نے بتایا۔ ”میں نے تمہارے بندر میں چپے ہوئے انسان کو محسوس کر لیا تھا۔“

”ایمن یہ سب درست ہے لیکن ہمارا معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔“

”کمال کرتے ہو جنگل میں معاشرہ ہی کہاں ہوگا؟“

”پھر بھی میں اتنی فوری محبت برداشت نہیں کر سکتا۔“

”سہیل، تمہیں میرے لیے کوئی نہ کوئی جگہ نکالنا ہی ہوگی۔“ ایمن نے کہا۔

”چلو اگر تم اتنی ہی ضد کر رہی ہو تو ایک کام کرتے ہیں۔“ سہیل نے سمجھایا۔ ”میں جنگل میں جا کر پہلے وہاں کے حالات کا جائزہ لیتا ہوں پھر ایک جھوپڑی بناتا ہوں۔

پانی کا انتظام کرتا ہوں اس کے بعد شہر واپس آ کر تم سے شادی کر کے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”ہاں بالکل ٹھیک۔“ ایمن خوش ہو گئی۔ ”اب بتاؤ تم جنگل میں کیا کیا چیزیں لے کر جا رہے ہو؟“

سہیل نے اپنی بنائی ہوئی فہرست اس کے سامنے کر دی۔ ایمن نے اپنے حساب سے اس میں کچھ اور چیزوں کا اضافہ بھی کر دیا پھر ایمن ہی نے سہیل کے لیے مزیدار کھانے بنائے اور اس سے دنیا بھر کی باتیں کرتی رہی۔

سہیل کو بالکل گھر یلو زندگی کا مزہ آنے لگا۔ جیسے اس کی بیوی نے اس کے لیے کھانے بنائے ہوں اور سامنے بیٹھ کر دنیا بھر کی باتیں کر رہی ہو لیکن ایمن سے جدا ہو کر اسے جنگل کی طرف جانا تھا البتہ اس خیال سے اسے تقویت مل رہی تھی کہ واپس آ کر وہ ایمن سے شادی کر لے گا۔ اس وقت ایک خیال نے سہیل کو پریشان کر دیا۔ ”یار ایمن ایک بات تو بتاؤ۔ ہمارے بچوں کا کیا ہوگا؟“

دیا۔ ”راستہ بھول کر اس طرف آ گیا ہوں۔“
 ”راستہ کیسے بھول گیا یہ تو جنگل ہے۔ جنگل میں راستہ
 بھول کر کیسے آ نکلا؟“ بچ تادور نہ گردن اڑا دیں گے۔“
 ”بچ یہ ہے بھائیو کہ اس دنیا سے اکتا کر جنگل کی
 طرف آیا ہوں۔“ سہیل نے بتایا۔ ”دنیا میں سوائے
 دھوکے اور جھوٹ کے کچھ بھی نہیں رکھا۔“
 ”تیرے بیگ میں کیا ہے؟“
 ”خود دیکھ لو۔“ سہیل نے اپنا بیگ سامنے رکھ دیا۔
 ”ایک دو جوڑے کپڑے ہیں اور بسکٹوں کے پیٹ ہیں۔“
 ”کیوں نہ اسے سرکار کے پاس لے چلیں۔“ ایک
 نے دوسرے سے کہا۔
 ”کون سرکار؟“

”اوتے تو ہمارے سرکار کو نہیں جانتا۔ پیر کرامت
 شاہ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔“
 ”میں ایسے ہی لوگوں سے تو گھبرا کر بھاگا ہوں
 بھائی۔ تم پھر ایسے ہی بندے کے پاس لے جا رہے ہو۔“
 ”بکو اس مت کر ہمارے سرکار بہت بڑے آدمی
 ہیں۔“ ایک نے کہا۔ ”چل ہمارے ساتھ۔“
 وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی،
 جس میں ایک چھوٹا سا غار تھا۔ پیر کرامت شاہ نے اسی غار
 میں اپنا ڈیرا ڈال رکھا تھا۔
 اس غار میں ایک درمی، ایک جا نماز، ایک عدد لوٹے
 کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پیر کرامت شاہ واقعی ایک پہنچے
 ہوئے بزرگ دکھائی دے رہے تھے۔ ان دونوں نے سہیل
 کو ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔
 ”تم دونوں کیوں واپس آ گئے؟“ پیر کرامت شاہ
 نے ان دونوں سے دریافت کیا پھر سہیل کی طرف دیکھا۔
 ”اور تم کون ہو؟“

”جناب عالی میں اس معاشرے کا ستایا ہوا ایک
 انسان ہوں۔“ سہیل نے کہا۔ ”اگر اجازت ہو تو میں اپنی
 داستان سنا دوں؟“
 ”ضرور سناؤ۔“ پیر صاحب نے کہا۔ پھر ان دونوں
 کو حکم دیا ”تم بھی بیٹھ جاؤ۔“

سہیل نے اپنی پوری داستان سنا دی پیر کرامت شاہ
 نے استغفار پڑھنا شروع کر دیا۔ ”تو بہ تو یہ کیا زمانہ آ گیا
 ہے۔ کیسے لوگ ہیں، بس پر بھروسہ کیا جائے۔“
 ”جناب عالی میں اسی لیے اکتا کر اور بے زار ہو کر
 جنگل کی طرف نکل آیا ہوں۔“ سہیل نے کہا ”اور آپ

والوں نے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ وہ سب اس کو
 تلاش کرتے رہے۔ وہ چھپا بیٹھا رہا پھر بس والے اس سے
 مایوس ہو گئے۔ بس کا انجن جاگ اٹھا۔ اس وقت سہیل کا دل
 چاہا کہ وہ دوڑتا ہوا اس تک پہنچ جائے۔
 آخر وہ کیا کر رہا تھا۔ کیا اس کا دماغ خراب ہو گیا
 تھا۔ بس رینگنے لگی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اب صرف
 گہرا اندھیرا تھا اور پہلی دفعہ اسے احساس ہوا کہ وہ کیا
 حماقت کر رہا ہے۔ یہاں تو دور دور تک سوائے اندھیرے
 اور سائیں سائیں کرتے ہوئے جنگل کے کچھ بھی نہیں تھا۔
 ممکن تھا کہ دن کی روشنی میں یہ سب کچھ خوبصورت دکھائی
 دیتا ہو لیکن اس وقت تو ایسا بھانک محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ
 اچانک بھتوں کی نگری میں پہنچ گیا ہو۔

وہ بہت دیر تک وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا
 چاہیے۔ وہیں سڑک کے آس پاس رہے یا جنگل کی طرف
 سفر شروع کر دے۔

اس نے اپنے بیگ میں ایک بڑی سی نارنج رکھ لی
 تھی۔ اس نے نارنج جلائی اور اس کی روشنی میں آگے بڑھنا
 شروع کر دیا۔ وہ جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کے درمیان سے
 گزر رہا تھا۔ سہیل کو اس وقت بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔
 وہ بہت دور تک چلتا رہا۔ نہ جانے کون سی جگہ تھی۔
 پودوں اور جھاڑیوں کے سلسلے ختم ہو گئے تھے۔ اب اونچے
 اونچے درخت تھے۔ وہ دل ہی دل میں آتیں پڑھتا ہوا
 ان درختوں کے درمیان سفر کر رہا تھا۔ اب اسے ٹکان بھی
 ہونے لگی تھی۔

اس نے عقل مندی یہ کی تھی کہ پانی کی ایک بڑی
 بوتل اور بسکٹ کے پیٹ بھی ساتھ رکھ لیے تھے۔ اس نے
 پانی کی بوتل نکال کر دو چار گھونٹ لیے اور تازہ دم ہو کر پھر
 آگے بڑھ گیا۔

نارنج کی روشنی میں اسے ایک بڑے درخت کا کٹنا
 ہوا تانا دکھائی دے گیا۔ اب اس سے آگے بڑھنا محال ہو رہا
 تھا۔ وہ اس سے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور نہ جانے کس وقت
 اس کو نیند آ گئی۔

دوسری صبح کسی کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس
 کے سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں
 کلہاڑیاں تھیں اور دونوں ہی قد آور تھے۔ ان میں سے
 ایک نے سہیل کو مخاطب کیا۔ ”اوتے کون ہے تو، یہاں کیسے
 آیا ہے؟“
 ”بھائی میں ایک مسافر ہوں۔“ سہیل نے جواب

جیسے بزرگ کو یہاں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔“

”برخوردار تو رہے تو میرا آستانہ شہر میں ہے۔“ پیر صاحب نے بتایا۔ ”لیکن میں ایک سال میں چالیس دن کے لیے چلے کاٹنے کے لیے یہاں آ جاتا ہوں۔ دنیا سے الگ۔“

”واقعی آپ ہی جیسے لوگوں کے دم سے یہ دنیا سلامت ہے۔“

”اب تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟“
”جو آپ حکم دیں۔“

”میرا تو مشورہ ہے کہ تم ہمیں میرے پاس رہ جاؤ۔“
”جی سرکار! اس بندے کو اپنے پاس ہی رکھ لیں یہ آپ کی خدمت کرے گا۔“

”ارے نہیں بھائی میں کیا اور میری خدمت کیا۔“ پیر کرامت شاہ جلدی سے بولے۔ ”بس اس کو میرے ساتھ رہ کر مجاہدے کرنے ہوں گے، ریاضت کرنی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو منزل مل جائے اور اس کے طفیل مجھے بھی کچھ حاصل ہو جائے۔“

سمیل جھوم اٹھا۔ اس دنیا میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں، اتنی بلندی اور ایسی انکساری۔ ”جناب اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا مجھے میری منزل مل گئی ہے۔“ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ پیر صاحب نے اپنی گردن ہلا دی۔
”یہ زمین خدا کی ہے۔ میں کون ہوتا ہوں تمہیں بھگالے والا۔“
”تم بھی ہمیں رہ جاؤ۔“ ان دونوں نے آگے بڑھ کر سیمیل کے ہاتھ چوم لیے کیونکہ اب وہ بھی پیر صاحب کے طفیل بابرکت ہو گیا تھا پھر وہ دونوں اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد پیر صاحب نے کہا۔ ”دیکھو جوان! میں یہاں ہر سال انتہائی سخت مجاہدے کے لیے آتا ہوں۔ اپنے نفس کو مارنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ یہ نفس بڑا ہی ظالم ہوتا ہے۔ اسی لیے تمہاری آنکھیں جو کچھ دیکھیں ان کو جنت سمجھ لیتا کیونکہ یہ آزمائشوں کے مرحلے ہیں۔“
”سمجھتا ہوں سرکار۔“

”اور دوسری بات یہ کہ جو بھی مشاہدہ ہو اس کا ڈھنڈورا نہیں پٹینا اور کسی کو نہیں بتانا کہ تم نے یہاں کیا دیکھا ہے اور نہ ہی مجھ سے کوئی سوال کرنا۔“

سمیل نے کہا۔ ”میری کیا مجال ہے۔“
”بس اب کچھ مت کہنا۔“ پیر کرامت نے اسے مزید کچھ بولنے سے منع کر دیا۔ ”اور ہاں شام کے وقت کچھ

مہمان آئیں گے ان کے لیے تمہیں انتظام کرنا ہے۔“
”جو حکم سرکار۔“

”اس غار کے برابر میں ایک دوسرا غار ہے تم وہاں جا کر آرام کرو۔“ سمیل دوسرے غار میں آ گیا۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس وقت اسے اپنی قسمت پر ناز ہو رہا تھا۔ نقدیر اسے کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔

غار میں آرام کے لیے گدے بچھے ہوئے تھے۔ وہ گدے پر لیٹا اور کچھ دیر کے بعد اسے نیند آ گئی۔ آرام اور سکون کی گہری نیند۔

اس کی آنکھ کچھ آوازوں سے کھلی تھی۔ اندھیرا ہو گیا تھا غار میں کسی نے پیٹروکس روشن کر دیا تھا جب کہ غار کے باہر کچھ چل پھل ہو رہی تھی۔

وہ جلدی سے غار سے باہر آ گیا۔ دو جھپیں کھڑی تھیں۔ دریاں اور گاؤں تکیے اتارے جا رہے تھے۔ ایک جپ میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں اور کچھ لوگ تھے جو جلدی جلدی دریاں، بچھا رہے تھے۔ ہر طرف پیٹروکس روشن تھے جنگل میں مشکل کا سماں ہو رہا تھا پھر پیر کرامت شاہ دولڑکیوں کا سہارا لیے ہوئے اپنے غار سے برآمد ہوئے ان کے پاؤں اس طرح لڑکھڑا رہے تھے جیسے نشے میں ہوں۔ لڑکیوں نے انہیں ایک طرف لے جا کر بٹھا دیا۔ سمیل بہت حیران ہو کر یہ سب دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا ایک طرف بریانی کی دو دیکھیں بھی تھیں جن کی خوشبو... سے پوری فضا بھکی ہوئی تھی۔

خدمت کرنے والوں میں سے ایک سمیل کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”چھوٹے سرکار۔“ وہ بڑے ادب سے بولا۔
”آپ ہاتھ منہ دھو لیں آپ کے لیے کھانا لگا دیا گیا ہے۔“
گو یا وہ چھوٹے سرکار ہو گیا تھا پتا نہیں یہ کس طرح ہوا تھا۔ شاید پیر صاحب نے ہی اس پر اتنی توجہ فرمادی تھی۔ بہر حال اس نے منہ ہاتھ دھو یا اس کے بعد دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ طرح طرح کی چیزیں دسترخوان پر تھیں۔ بریانی، کباب، زردہ، پھل اور نہ جانے کیا کیا۔

اس نے اپنی حیرت دور کرنے کے لیے پیر صاحب سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ بالکل ٹن ہو رہے تھے۔ ایک جپ سے ایک بڑا سار کا رڈو پلیر اتار لیا گیا۔ اس کے بعد تیز موسیقی کے ساتھ رقص کا دور شروع ہو گیا۔ دولڑکیاں بہت ہی خطرناک قسم کا رقص کر رہی تھیں اور پیر صاحب ان لڑکیوں پر نوٹ بچھا کر رہے تھے۔ کافی رات تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر پیر صاحب دولڑکیوں کو لے کر اپنے غار میں

جائیں شراب کی بوتلوں کا اسٹاک موجود ہے اور پیر صاحب ڈاکوؤں کے سر پرست بھی ہیں۔

ایک رات ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی سہیل کے پاس آ کر ٹھڑی ہو گئی۔ وہ بھی ایک جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس وقت دولڑکیاں رقص کر رہی تھیں اور سب کے سب رقص دیکھنے میں مگن تھے۔ اس لڑکی نے سہیل کا ہاتھ تھاما اور آہستہ آہستہ اسے لے کر اس مجمع سے باہر آ گئی۔ یہاں پیٹرکس کی روشنائی نہیں تھی۔

”سنو من شریف آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ اس لڑکی نے سہیل سے کہا۔ ”تم اس ہوس پرست پیر کے بلیا کر رہے ہو؟“

”یہ بہت پتہ چلے ہوئے انسان ہیں۔“

”لغت ہے ایسے پتہ چلے ہوئے پر۔“ لڑکی نے کہا۔

”تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر بھی بے وقوف بن رہے ہو۔“

”اتفاق سے پورے معاشرے میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔“

”ہاں..... تو تو رہا ہے لیکن یہ شخص تو مذہب اور روحانیت کی آڑ میں یہ سب کچھ کر رہا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔

”اور تم اس کا ساتھ دے رہے ہو۔ یہ انتہائی درجے کا عیاش اور بد معاش انسان ہے۔ مجھے تو اس سے نفرت ہے لیکن میری ماں پیسوں کے لالچ میں مجھے زبردستی یہاں بھیج دیتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ شخص سب کو بے وقوف بنا رہا ہے؟“

”ہاں یہ دہرے کردار کا انسان ہے۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”مذہب کے نام پر سیدھے سادے لوگوں کو تباہ کر رہا ہے اسی لیے تمہیں۔“ لڑکی نے کہا۔

یہاں سے بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ۔ چھوڑ دو اس آدمی کا ساتھ۔“

”میں اسی وقت اس پر لغت بھیج کر جا رہا ہوں۔“ سہیل نے کہا۔ ”میں اس کا غلام تو ہوں نہیں۔ آزاد بندہ ہوں اور جنگل میں اپنی مرضی سے آیا تھا۔“

”لیکن تم آئے کیوں تھے؟ کیا پریشانی ہو گئی تھی تمہیں؟“ سہیل نے اس لڑکی کو بھی اپنی کہانی سنائی۔ اس وقت لوگ رقص دیکھنے اور شراب پینے میں مصروف تھے۔ اسی لیے کسی کا دھیان ان دونوں کی طرف نہیں تھا۔

اس کی داستان سن کر لڑکی ہنسنے لگی۔ ”تم بھی عجیب بے وقوف آدمی ہو۔ یہ سب کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بہر حال اب ایسا کرو یہاں سے نکل لو۔“

چلے گئے۔ سہیل دل ہی دل میں حیران ہوتا ہوا اپنے غار میں واپس آ گیا۔

جو کچھ بھی اس نے دیکھا وہ اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کہاں تو پیر کرامت شاہ کی ایسی باتیں اور کہاں یہ حرکتیں۔ انسان پر اسے اس کا اعتماد ہی ختم ہو گیا۔

وہ قافلہ جمع سویرے سارا سامان سمیٹ کر واپس چلا گیا۔ اب کوئی یہ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ رات بھر یہاں کیا ہوا ہوگا۔ دس گیارہ بجے کے قریب پیر صاحب نے اسے آواز دی۔ وہ اپنے غار سے نکل کر پیر صاحب کے پاس آ گیا۔ پیر صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے۔ ”اب تمہیں پتا چلا کہ غضب نفس کیا ہوتا ہے؟“

”نہیں سر کا کچھ نہیں پتا چلا۔“ سہیل نے کہا۔ ”میں تو حیران ہو رہا ہوں۔“

”بے وقوف ہو تم۔“ پیر صاحب مسکرا دیے۔ ”یہ سب نفس کو کھینچنے کے مرحلے ہیں۔ میں ہر سال اس کم بخت کو کھینچنے کے لیے اس ویرانے میں آ جاتا ہوں۔“

”تم نے دیکھا ہوگا کہ میں دولڑکیوں کو اپنے غار میں لے گیا تھا۔“

”جی جناب اب آپ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔“

پیر صاحب شفقت بھرے انداز میں مسکرا دیے۔

”تم چالیس دن تک یہاں یہی سب دیکھو گے اور تمہیں کسی بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔“

”نہیں جناب اب مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔“

”شاباش لگتا ہے تم بہت جلد سارے مرحلے طے کر لو گے۔“ پیر صاحب نے کہا۔ ”بس یہ یاد رکھو کہ تم سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہے۔ سننے ہوئے بھی کچھ نہیں سن رہے۔“

”جی سرکار، اب تو میرے ساتھ ایسا ہی ہو گیا ہے۔“

”شاباش جاؤ آرام کرو۔“ پیر صاحب اپنے غار کی طرف چلے گئے۔ سہیل اپنے غار میں آ گیا۔ پیر صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا وہ اس سے ختم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ نشے میں دھت تھے۔ لڑکیاں رقص کر رہی تھیں اور فرمایا جا رہا تھا کہ یہ سب نفس کو کھینچنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ پتا نہیں کیا نفس تھا جس کو کھینچنے کے لیے اتنے ساز و سامان کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔

بہر حال دوسری رات پھر یہی سب کچھ ہوا۔ اس رات سہیل پر کچھ اور انکشافات بھی ہوئے۔ مثال کے طور پر مجرے کے لیے لڑکیاں بھاری معاضوں پر لا ہو کر لائی

”لیکن جاؤں کہاں؟“

”ماچھی کے پاس چلے جاؤ۔“

”کون ماچھی.....؟“

”اس علاقے کا سب سے خطرناک ڈاکو۔“

”تمہیں کیا مجھ سے دشمنی ہو گئی ہے جو کسی خطرناک

ڈاکو کے پاس بھیج رہی ہو؟“

”تمہاری بھلائی کے لیے بھیج رہی ہوں۔ وہ تمہیں

کچھ نہیں کہے گا بلکہ میرا حوالہ دے گا تو وہ تمہیں اپنے ساتھ

رکھ لے گا۔ یاد رکھنا میرا نام دل نشین ہے۔ دل نشین

دو پٹے والی۔“

”یہ دو پٹے والی کیا چیز ہوئی؟“

”اس لیے کہ میں دو پٹا اوڑھ کر ڈانس کرتی ہوں۔

ذرا سی دیر کے لیے بھی دوپٹا نہیں گرنے دیتی۔ آخر شرم و حیا

بھی تو کوئی چیز ہے۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ سہیل نے نعرہ لگایا۔ ”بٹ کے

رہے گا ہندوستان نے کے رہیں گے پاکستان۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ دل نشین نے پوچھا۔

”خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ کیوں کہتا

ہوں۔ خیر میں جا رہا ہوں ماچھی ڈاکو کے پاس۔“

”تم اس سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ وہ بہت

ایماندار ڈاکو ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو آپ اس ملک میں ایماندار

صرف ڈاکوؤں ہی کے پاس رہتی ہے۔“

”تم اس طرف چلتا شروع کر دو۔“ لڑکی نے اشارہ

کیا۔ ”درختوں کے بیچ سے چلتے جاؤ۔ آدھے گھنٹے کے بعد

تمہیں ایک میدان ملے گا۔ جب تم اس میدان میں پہنچو گے

تو کچھ لوگ تمہیں گھیر لیں گے۔“

”اور مجھے گولی مار دیں گے؟“

”ہاں اگر تم نے ان کے سوالوں کے جواب نہیں

دیے تو گولی مار دیں گے۔“

”اور وہ سوال کیا ہیں؟“

”تین سوال کریں گے جن کے صحیح جواب دیے ہیں۔

پہلا سوال پاکستان کا دارالخلا فکیا ہے؟ تم کو بتانا ہے دینی۔“

”لیکن دینی تو نہیں ہے۔“

”تم کو یہی بتانا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”دوسرا سوال

ہوگا جعلی ڈگری لے کر کیا کرو گے؟ تمہارا جواب ہوگا الیکشن

میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ تیسرا سوال ہوگا وہ کون ہے جس کو لوگ

نوٹ تو دیتے ہیں لیکن ووٹ نہیں دیتے؟“

”یہ تو بہت آسان جواب ہے عبدالستار ایدھی۔“

”شاباش اس کا یہی جواب ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ

تمہیں ماچھی ڈاکو کے پاس لے جائیں گے۔ تم اسے میرے

بارے میں بتاؤ گے وہ ہر طرح تمہارا ساتھ دے گا۔“

”تم سے کیسے ملاقات ہوا کرے گی؟“

”اسی ماچھی ڈاکو کے آڈے پر۔“ لڑکی نے بتایا۔

”میں ہفتے میں ایک بار اس کے پاس بھی جاتی ہوں۔ وہ میرا

بڑا بھائی ہے۔“

”کیا ماچھی ڈاکو تمہارا بھائی ہے؟“

”ہاں، ابا کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔“ لڑکی نے

فخر سے طور پر بتایا۔ ”لیکن اماں کو یہ کام پسند نہیں ہے اسی لیے

انہوں نے اپنی لائن الگ کر لی۔“

”اور اماں کی لائن کیا ہے؟“

”یہی مجھ سے ڈانس کروانا۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”وہ

نہیں چاہتیں کہ میں غلط کاموں میں پڑوں۔“

”میرا خیال ہے کہ میں اب تمہارے ماچھی ڈاکو کی

طرف چل ہی دوں۔“ سہیل نے کہا۔

”ہاں جاؤ۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کھسک لیے

ہو۔“ لڑکی ان لوگوں کی طرف چلی گئی اور سہیل غار سے اپنا

بیگ اٹھا کر باہر آ گیا۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں

دی تھی۔ سب اپنے حال میں مست ہو رہے تھے۔

سہیل پھر گرامت شاہ پر الوداعی نگاہیں ڈالتا ہوا

وہاں سے رخصت ہو گیا۔ پھر صاحب اس وقت بھی دو

لڑکیوں کو گھیرے ہوئے اپنے کم بخت نفس کو کچلنے کی جدوجہد

کر رہے تھے۔

وہ ایک بار پھر اندھیرے جنگل میں آگے بڑھتا جا رہا

تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ آگے جا کر اس کے ساتھ کیا

ہونے والا ہے۔ لڑکی نے تو بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ ماچھی

ڈاکو لڑکی کا نام سنتے ہی اسے اپنے کمپ میں شامل کر لے گا۔

اچانک چھ لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اس پر کئی طرف

سے ٹارچ کی روشنیاں پڑنے لگیں۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ کن

لوگوں کے درمیان گھر گیا ہے۔

”بھائیو میں دوست ہوں۔“ اس نے پکار کر کہا۔

”میں تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔“

”اچھا یہ بتا پاکستان کا دارالخلا فکیا ہے؟“

”دینی۔“ اس نے جواب دیا۔

”بالکل غلط۔“ کسی کی آواز آئی۔ ”پاکستان کا کیپٹل

”لیکن مجھے تو دینی بتایا گیا تھا۔“

”چل اب دوسرے سوال کا جواب دے۔ جعلی ڈگری لے کر کیا کرے گا؟“

”انٹیشن میں کھڑا ہو جاؤں گا۔“

”یہ بھی غلط۔ اس کا جواب ہے ورلڈ ریکارڈ قائم کروں گا۔“

”سردار لگتا ہے یہ ماحی گرپ کا بندہ ہے۔“ کسی نے کسی سے کہا۔

”ہاں۔“ جس کو بتایا گیا تھا اس نے ایک ہکاری لی۔ ”لگتا تو یہی ہے پھر اس نے سہیل کی طرف دیکھا۔ ”بچ بچ بتا تو کون ہے، کہاں جا رہا ہے؟“

”بھائیو، میں اپنی کہانی شروع سے سناؤں یا وہاں سے شروع کروں جہاں سے پیر کرامت شاہ میری زندگی میں شامل ہوا ہے؟“

”ادوہ تو تم پیر سائیں کے آدمی ہو۔“

”ہاں بھائی ان کا خاص آدمی ہوں۔“

”یاد آگیا سردار، یہ بندہ پیر صاحب کی خدمت کرتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ پیر سائیں اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔“

”نہیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ آدمی زور سے دھاڑا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیر سائیں کا یہ خفہ ماچھی کے پاس چلا جائے۔ اس بندے کو برکت کے لیے ہم اپنے پاس رکھیں گے۔ احترام کریں گے اس کا۔ اس کی ہر بات مانیں گے لیکن یہ ہمارے اڈے سے باہر نہیں جاسکے گا۔“

”ارے بھائی تم لوگ کیوں میرے پیچھے پڑ رہے ہو۔ میں ایک سید سادہ شریف آدمی ہوں۔“ سہیل نے کہا۔ ”مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”لیکن ہمیں تم سے تو دلچسپی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیر سائیں جس کا احترام کریں، جس کا خیال رکھیں، ہم اس کو ماچھی کے پاس جانے دیں، ماچھی سے تو ہماری ویسے ہی لگی رہتی ہے۔“

”یہ تمہارا آپس کا معاملہ ہے میں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔“

”اوائے بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہی آدمی دھاڑا۔ ”ہم پیر سائیں کی وجہ سے تیرا احترام کر رہے ہیں۔ ورنہ کس کی مجال ہے کہ بادل ڈاکو کے سامنے کچھ بول سکے۔“

”سائیں لگتا ہے یہ آدمی ہمارے قابو میں نہیں آئے گا۔ اس کے لیے وہی کریں جو آپ کے ابا سائیں نے سید

صاحب کے ساتھ کیا تھا؟“

”ہاں، یہ اچھا مشورہ ہے۔“ بادل ڈاکو نے سہیل کی طرف دیکھا۔ ”دیکھو بھائی معاملہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے دلوں میں تمہاری بہت عزت ہوئی ہے کیونکہ تم سائیں کرامت علی شاہ کے آدمی ہو۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟“

”سہیل۔“ سہیل نے بتایا۔

”یو رانا م بتاؤ سائیں؟“

”سہیل اعظم۔“

”دیکھا۔“ سب کے سب اس کا نام سن کر خوشی سے اچھل گئے۔ وہ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے اور گلے مل رہے تھے۔

”بھائیو مجھے بتاؤ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟“

”سید صاحب آپ ہمارے لیے خیر و برکت لے کر آئے ہیں۔“ بادل ڈاکو نے کہا۔ ”ہم آپ کو اب کہیں نہیں جانے دیں گے۔ آپ سید ہیں۔ آپ کے قدموں کی بدولت ہماری چاندی ہو جائے گی۔ ہمارا ہر ڈاکا کامیاب ہو گا۔ اسی لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو مار دیا جائے۔“

”مار دیا جائے؟“ سہیل کے ہوش اڑ گئے۔ ”وہ کیوں اور کس خوشی میں مار دیا جائے؟“

”ہمیشہ کی خیر و برکت کے لیے۔“ بادل ڈاکو نے کہا۔ ”آپ کی لاش کو ہم یہیں دفن کر دیں گے۔ آپ خرچے کی پروا نہ کریں۔ آپ کا مزار اتنا زبردست ہو گا کہ پورے صوبے میں ایسا کوئی مزار نہ ہو گا۔ ہر سال تو الیاں ہوں گی، چادریں چڑھائی جانی جائیں گی اور.....“ لیکن سہیل اس.... سے آگے کچھ نہیں سن سکا۔ اس نے اندھیرے میں ایک طرف چھلانگ لگا دی اور دوڑتا ہی چلا گیا..... دوڑتا ہی چلا گیا۔

اب آپ اگر بلیو مون ہوئیں گے سامنے سے گزریں تو آپ کو اس گیٹ پر ایک بڑا سبندر اچھلتا کودتا ہوا دکھائی دے گا۔

یہ وہی سہیل ہے جس نے شہر میں آکر اپنے فلیٹ سے بندر والی کھال اٹھائی اور اسی ہوٹل کے منیجر کے پاس اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے کے لیے پہنچ گیا۔

بندر بنتے بنتے وہ انسانوں کی طرح بولنا بھی بھول گیا ہے۔ ہاں اگر آپ اس کے پاس جا کر اسے بولنے کے لیے اکسائیں تو وہ صرف ایک نعرہ لگاتا ہے۔ ”بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔“

ملاقات

ڈاکٹر ساجد امجد

آنکھ بند کرو تو چند لمحوں کے لیے ایک خوب صورت دنیا ہمیں اپنے حصار میں قید کر لیتی ہے اور پھر جب تک ہمارا من اس دنیا میں رہنے پر اکساتا ہے ہم آنکھ نہیں کھولتے... اس دوران چاہے ہم خود کو تاج محل میں لے جائیں یا کسی ویرانے میں کچھ تلاش کرتے پھریں... لیکن آنکھ کھلتے ہی یہ بساط کچھ اس طرح بکھرتی ہے کہ کرجیاں اٹھاتے اٹھاتے ہاتھ زخمی اور دل بوجھل ہو جاتا ہے... ایسا صرف اسی وقت ہوتا ہے جب ہم پوری شدتوں سے اس ماحول میں گم ہو جائیں۔ وہ بھی اس خواب کی کیفیت سے نکلنا نہیں چاہتی تھی مگر اسے نکلنا تھا، نہ صرف خوابوں سے بلکہ کسی کے دل سے بھی اور... اپنے گھر سے بھی... ورنہ موت کا رقص اس کے آس پاس ہی جاری تھا گویا وہ مفاد پرستی اور وفا پرستی کے درمیان پس رہی تھی اور رفتہ رفتہ رشتوں کی پہچان بھولتی جا رہی تھی کہ اچانک ایک ایسا تعلق استوار ہوا کہ دل کی دنیا میں ہلچل مچ گئی لیکن مفاد پرست رشتوں نے اس خوب صورت ہلچل کو تباہ کن بھونچال میں بدل دیا اور اس طوفان میں اس کے دل سے ہر جذبے کو مٹا دیا۔ جب ریت کے مانند تمام سنبھلے پل اس کے ہاتھ سے پھسل گئے تو اچانک جیون کے تپتے صحرا میں برسات ہو گئی اور اس جل تھل میں سب کے اصل چہرے سامنے آتے گئے اور اسے حیران کرتے گئے... یہی زندگی ہے کون، کب، کیا روپ دھار لے کچھ خبر نہیں ہوتی۔

ابنوں کے دھوکے میں زندگی تمام کرنے والی ایک اجنبی حسینہ کی

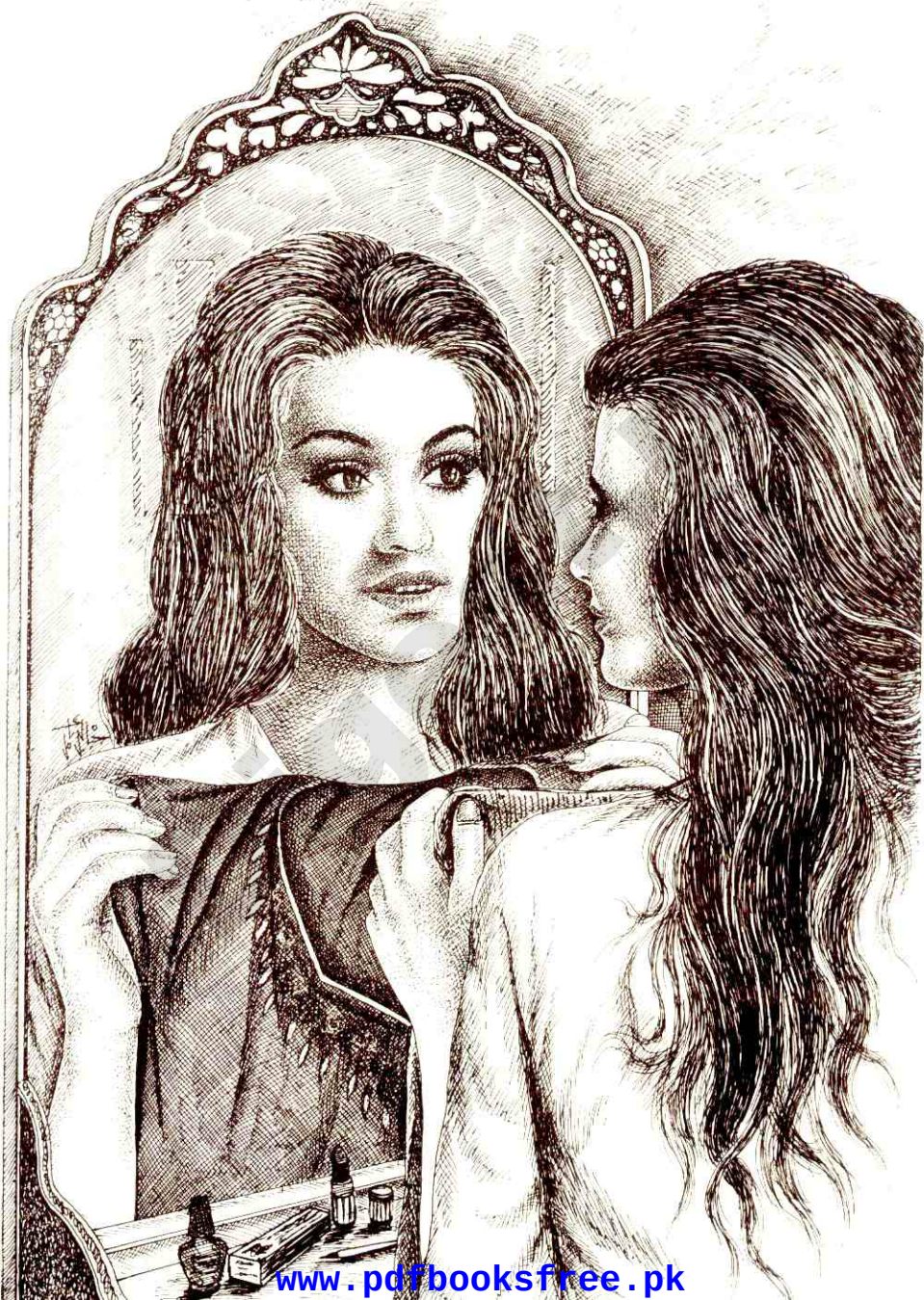
داستان رنگارنگ

پھیلا دیے تھے۔ یہ چوکی اتنی مضبوط تھی کہ اعجاز احمد اگر کچھ سوچتا بھی تھا تو اس کی خبر کرم نواز کو ہو جاتی تھی۔ اعجاز احمد بھی اتنا گھاگ تھا کہ دیواروں تک کے کان کٹوا دیے تھے۔ کسی کے آگے مشورے تک کے لیے زبان نہیں کھولتا تھا۔ صرف اس کا منہ رضوان تھا جس کے سامنے وہ دل کی بات کہہ لیتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ اس وقت سے تھا جب والد کے انتقال کے بعد اعجاز نے بزنس اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اس کی والدہ کی طرف سے اس کی کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ اس لیے اس پر شک کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

اتنی احتیاط کے باوجود اعجاز احمد نے منہ کھولا اور سانس کی گرمی کرم نواز تک پہنچ گئی۔ اس کا داماد اس کی بیٹی پر سوکن لانے کے ارادے باندھ رہا ہوا اور وہ اس جلتی ہوئی آگ پر ہاتھ تپا رہا جائے۔ وہ دولت میں اپنے داماد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن اپنے کاروبار کی نوعیت کے حوالے سے ایسے

کرم نواز کے پیشے کا تقاضا تھا کہ شہر بھر کے نامی گرامی غنڈے اس کی دلہیز پر پڑے رہیں۔ شریف، بد معاش بھی اور بد معاشوں کے بد معاش بھی۔

وہ دنیا کی نظروں میں بہت بڑا بزنس مین تھا لیکن اس نے بڑی ہوشیاری سے بزنس اور اسمگلنگ کے درمیان فاصلے ختم کر دیے تھے۔ اس کے کالے کرتوت بہت دیر سے دنیا کی نظروں میں آئے تھے۔ اس وقت تک اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہو گئی تھیں کہ اس پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے رشتوں کا جال اتنی دور تک پھیلا دیا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنے والا خود پھنسنے کر رہ جاتا تھا۔ اعجاز احمد پر بھی اس کی حقیقت بہت بعد میں کھلی ورنہ وہ اس کی بیٹی سے شادی ہی کیوں کرتا۔ حقیقت کھل جانے کے بعد اس نے کرم نواز سے فاصلے بڑھا دیے تھے لیکن کرم نواز اپنی بیٹی سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ خود وہاں نہیں جاسکتا تھا لیکن اپنے آدمی اعجاز احمد کے گھر تک



لوگ اس کی مٹھی میں ضرور تھے جو اس کا دماغ درست کر سکتے تھے۔ ایک فون کرنے کی دیر تھی اور اعجاز احمد کے پاؤں زمین میں دھنسنے جاتے۔ اس نے فون گھمادیا۔

اعجاز احمد کے ذہن میں اس وقت زلزلے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی جب اس نے عام انسانوں سے ہٹ کر کسی مخلوق کو اپنے سامنے دیکھا۔ وہ آدمی ہی تھا لیکن یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر یہاں آ گیا ہے۔ چھ فٹ سے ٹکٹا ہوا قد، چوڑا سینہ، چہرے پر خباثت کے ساتھ ساتھ کسی گہرے زخم کا نشان جو اس کی آنکھ کے نیچے سے ہوتا ہوا اوپر کے ہونٹ تک چلا گیا تھا۔ بھدی اور موٹی انگلیاں، رنگ البتہ سرخ سپید تھا جس نے اس کی بد بیتی کو کچھ کم کر دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ اعجاز احمد اس سے کچھ پوچھتا وہ سامنے پڑے صوفے میں دھنسن گیا اور نہایت بے ہودگی سے اپنی دونوں ٹانگیں جوتوں سمیت اس کی میز پر رکھ دیں۔ ”ام ظالم خان ہے۔ ہسٹری شیئر ظالم خان، تم ابی پولیس کو فون کرو تو تمہیں پانچ لاکھ کا انعام ملے گا۔“

”خان صاحب کیوں مذاق کرتے ہو، کام کی بات کرو کس لیے آئے ہو۔“

”خزیر کا بچہ! تم امارا بی بی کا بھائی ہے جو ہم تم سے مذاق کرے گا۔“

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ نکتے پیسے تمہیں چاہیے ہیں؟“

”ام ظالم خان ہے کوئی فقیہ نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے خان صاحب۔ آپ کے آنے کا مقصد کیا ہے؟“

”تم کو بولنے آیا ہے تم تیسرا شادی نہیں کرے گا۔“

”تیسری شادی میرا ذاتی معاملہ ہے، تمہارا اس سے کیا تعلق؟“

”ام نے جو بول دیا بول دیا۔ تم تیسرا شادی نہیں کرے گا۔“

”میں سمجھ گیا تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ تم اس معاملے سے ہٹ جاؤ۔ شادی کرنا گناہ نہیں ہے جو تم روکنے آئے ہو۔“

”قسم بخدا۔ تم اگر کرم نواز کا رشتہ دار نہ ہوتا تو تمہارا گردن پتکی سے مصل دیتا۔ ظالم خان سے کوئی اس طرح بولے اور زندہ رہ جائے۔ ابی تم وعدہ کرتا ہے یا نہیں۔“

”کیا وعدہ؟“

”تم تیسرا شادی نہیں کرے گا۔“

”میری مرضی میں کروں یا نہ کروں۔“

”پھر ام اپنا مرضی کرے گا۔ ام تمہارا بیٹی کو اسکول

جاتے ہوئے دیکھ چکا ہے۔ کیا تمہیں یہ برداشت ہوگا کہ وہ اسکول سے نہ آئے۔“

”تم اتنے بڑے غنڈے ہو کر بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ کیسے ہسٹری شیئر ہو؟“

”کرم نواز کا بیٹی حکم ہے۔ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔“

”تمہارو ظالم خان۔“

”ام تمہارے باپ کا نوکر ہے جو تمہارے کہنے سے رک جائے گا۔“

”میں کرم نواز سے بات کروں، اس کے بعد کوئی قدم اٹھانا۔“

ظالم خان نے اس کی آواز سن کر ضرور ہونگی لیکن پلٹ کر دیکھنا تک گوارا نہیں کیا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ اعجاز

اس کے پیچھے دوڑا ضرور تھا لیکن دفتر کے لوگوں کے سامنے وہ کوئی تماشہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے آواز دیے بغیر

اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اتنا خطرناک آدمی باہر نکلنے کی کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ میں اس کا ہاتھ نہیں روک سکتا لیکن اس کے اٹھتے ہوئے قدم تو روک

سکتا ہوں۔ اس نے اپنے کمرے میں آئے ہی اپنی بیٹی لائبہ کے اسکول فون کر دیا کہ وہ لائبہ کو اس وقت تک اسکول میں

روکے رکھیں جب تک اسے لینے وہ خود اسکول نہیں آ جاتا۔ دوسرا فون اس نے کرم نواز کو ملا یا۔ کرم نواز جیسا چالاک آدمی

فون اٹھاتے ہی سمجھ گیا کہ اعجاز پر کیا غزری ہے۔

”کہو اعجاز، کیا ظالم خان سے ملاقات ہوگئی؟“

”مجھے تم سے یہ امید گھٹیں تھی کہ ایسا گھٹیا حربہ استعمال کر دے۔“

”گھٹیا آدمی کے لیے گھٹیا حربہ ہی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ میری بات تو تمہاری سمجھ میں آئی نہیں۔ اس لیے میں

نے ظالم خان کو بھیجا ضرور سمجھا۔“

”میں تمہارا داماد ہوں۔ تم نے اس کا خیال بھی نہیں کیا۔“

”وہ غالباً تمہیں یہی سمجھانے آیا تھا کہ تم صرف میرے داماد بنے رہو، کسی اور کے داماد نہ بنو۔“

”یہ میرا اور تمہارا معاملہ تھا مگر وہ میری بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔“

”بھئی وہ تمہاری پہلی بیوی کی بیٹی ہے۔ میری بیٹی کی

اسے مشکل کا اندازہ ہوا۔ اب اسے اس خطرے سے نمٹنا تھا اس کے بعد کوئی قدم اٹھانا تھا۔ لائبہ درمیان میں نہ ہوتی تو وہ کسی بھری شینر سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

لائبہ کے اسکول کی چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔ کرم نواز سے اس کی بات ہو چکی تھی لیکن اس نے پھر بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ اسے لینے ہمیشہ کی طرح ڈرائیور کو بھیجے۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ خود بھی بیٹھا اور لائبہ کے اسکول پہنچ گیا۔ وہ لائبہ کو پرسنل کے روم میں بیٹھا دیکھ کر اس طرح پریشان ہو گیا جیسے برسوں بعد اسے دیکھا ہو۔ آگے بڑھا اور لائبہ کو گود میں اٹھالیا۔

”ڈیڈی، میں اب بچی نہیں ہوں جو مجھے گود میں اٹھا رہے ہیں اور وہ بھی میڈم کے سامنے۔“

”میری بچی تم ٹھیک تو ہوتا؟“

”ڈیڈی آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بخار تو آپ کو ہو رہا ہے۔ آپ کے ہاتھ تکتے گرم ہو رہے ہیں۔“

”ہاں مجھے کچھ ٹمبر ہورہا ہے۔“

”آپ کیوں آئے۔ ڈرائیور انکل مجھے لے جاتے۔“

”بس کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے آنا پڑا۔“

پرسنل دونوں کی گفتگو سن رہی تھی اور لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”آپ کی بیٹی اتنی ہی پیاری باتیں کرتی ہے جتنی پیاری یہ خود ہے۔“

”اس کی باتیں ہی تو اسے نظر لگا دیتی ہیں۔“

”سر، میں آپ سے ایک بات پوچھوں۔“

”پوچھیے۔“

”آپ کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہیں۔ اسے لینے بھی خود آئے ہیں، کوئی خاص بات؟“

”نہیں کوئی خاص بات نہیں، آئندہ بھی اسے لینے میں خود آؤں گا۔“

”جی بہتر۔“

وہ پرسنل کو کیا بتاتا کہ اس کے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔ اس نے لائبہ کو ساتھ لیا اور گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لائبہ کو لے کر کہیں دور چلا جائے۔ راحیلہ کا کیا بھروسہ۔ وہ اس کی سوتیلی ماں ہے اور کیا خبر اپنے باپ کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ جو کام ظالم خان نہ کر سکا وہ کر گزرے، مجھے لائبہ کے سامنے کو بھی اس سے بچانا چاہیے۔ کرم نواز کو میری کمزوری کا علم ہو گیا ہے۔ اسے آئندہ جو بات بھی منوائی ہوگی وہ یہی حربہ استعمال کرے گا۔

میں تو ہے نہیں کہ میں سن کر پریشان ہو جاؤں۔ ہمت ہے تو اسے روک لو۔“

”مجھے معلوم ہے وہ تمہاری زبان بول رہا ہے۔ تم اس سے کہو وہ ایسی حرکت نہ کرے۔“

”میرے حکم کے بغیر وہ کچھ نہیں کرے گا لیکن تمہیں بھی وہ کرنا پڑے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ اگر تم وعدہ کرو کہ شادی نہیں کرو گے تو وہ تمہاری بیٹی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں لیکن میری بیٹی.....“

”جب تک میری بیٹی تمہارے پاس ہے تمہاری بیٹی بھی تمہارے پاس رہے گی۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں مگر آپ بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے۔“

کرم نواز نے کوئی جواب دیے بغیر فون رکھ دیا اور اعجاز احمد یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کرم نواز نے کوئی واضح جواب نہیں دیا، اس کے دل میں ضرور کوئی چور ہے۔ وقتی طور پر خطرہ ٹل گیا ہے لیکن اس کا کوئی بھر و سامنہ نہیں۔ جو وقت مجھے مل گیا ہے اس میں کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔

پھولوں کی پتیوں سے بنی ہوئی گڑیا کا نام لائبہ تھا۔ حسن کے جتنے رنگ ہو سکتے ہیں وہ ان سب کا مجموعہ تھی وہ اکلوتی تھی، اس کی کوئی دوسری مثال اس لیے بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اعجاز احمد کو اپنی بے پناہ دولت سنبالنے کے لیے بیٹے کی ضرورت تھی۔ اپنا یہی خواب پورا کرنے کے لیے اس نے کرم نواز کی بیٹی راحیلہ سے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس شادی کے بعد بھی وہ بیٹے سے محروم رہا ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا کہ راحیلہ بچہ نہ ہے۔ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ اعجاز نے جلد بازی پھر بھی نہیں کی۔ لائبہ تین سال کی تھی جب اس نے راحیلہ سے شادی کی تھی اور اب لائبہ آٹھ سال کی ہوئی تھی۔ خواب کو تعبیر بننے دیکھنے کے لیے پانچ سال بہت ہوتے ہیں۔ اب اس نے تیسری شادی کا ارادہ کیا تھا۔ شاید کسی کے سامنے اس نے اس کا اظہار بھی کیا ہو لیکن اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ راحیلہ کا باپ کتنا ہی بااثر ہوا ہے میرے فیصلے کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں ہو سکے گی۔ دوسری یا تیسری شادی پر آؤ تو وہ عورتیں بھاتی ہیں جن کی روٹی چھین رہی ہو۔ راحیلہ کو میں نے سب کچھ دے دیا ہے۔ وہ اگر کہے گی تو اور بہت کچھ اس کے نام کر دوں گا۔ پھر بھی نہیں مانی تو طلاق کا راستہ کھلا ہے۔ وہ بہت آسان سمجھ رہا تھا لیکن اب بنی صورت حال سامنے آئی تو

وہ گھر تک پہنچا نہیں تھا کہ لائبہ کو ملک سے باہر بھیجنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے کرم نواز کو ایک مرتبہ پھر فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ تیسری شادی کا ارادہ ترک کر چکا ہے لہذا اس کی بیٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ کرم نواز نے بھی اسے یقین دلایا کہ جب تک وہ اپنے وعدے پر قائم ہے اپنی بیٹی کو محفوظ رکھے۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ سوچنے بیٹھ گیا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ آئندہ کا لائحہ عمل کس طرح ترتیب دینا ہے۔ وہ لائبہ کو ایک محل کے لیے بھیجے گا جس سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن زندہ رہنے کے لیے اسے دور بھیجنا ضروری تھا۔ لائبہ ان بھیڑیوں کے ہاتھوں سے دور چلی جائے گی تو وہ کتنا طاقتور ہو جائے گا۔

وہ دوسرے دن لائبہ کو اسکول چھوڑتے ہوئے اپنے دفتر پہنچا تو رات بھر کے سوچے ہوئے خیالات اس کے ذہن میں تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کمرے میں بلا دیا۔

”رضوان صاحب، میں جو بات آپ سے کہنے والا ہوں اسے راز میں رکھنا ہے۔ کسی کو کالوں کا ان خبر نہیں ہونا چاہیے۔“

”سر، آپ سے جو بھی تبادلہ خیال ہوتا ہے وہ اپنے تک ہی رکھنا ہوں اور اب تو آپ نے تاکید کر دی ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک لفظ بھی باہر نکلے۔“

”میں لائبہ کو امریکا بھیجنا چاہتا ہوں۔ آپ وہاں کے مختلف اسکولوں سے خط کتابت کر کے معلومات حاصل کریں تاکہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ اسے کس اسکول میں داخل کرانا ہے۔ بورڈنگ وغیرہ کے اخراجات کا بھی علم ہو جائے گا۔ جب یہ معلومات مجھے مل جائیں گی تو میں خود امریکا جاؤں گا اور لائبہ کو داخل کرا کے وہاں آجاؤں گا۔ یاد رہے کہ یہ سفر میں بظاہر بزنس کے لیے کروں گا۔“

”آپ کا حکم سر آکھوں پر لیکن لائبہ بی بی ابھی بہت چھوٹی ہیں۔“

”تم سے جتنا کہا جا رہا ہے صرف اتنا کرو۔“

”جی بہتر، میں آج ہی اسے کام شروع کیے دیتا ہوں۔“

اس نے اپنے فیصلے کے اظہار میں حد درجہ رازداری برتی تھی۔ فیصلہ رضوان کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا لیکن تقریباً ایک ہفتہ بعد ہی راجیل کی زبان پر اس کے الفاظ آگئے۔

”میں نے سنا ہے آپ لائبہ کو ملک سے باہر بھیج رہے ہیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“ وہ ہلکا ہٹ میں انکار کرنا بھول گیا۔

”اس کا مطلب ہے جو میں نے سنا ہے وہ درست ہے

ورنہ آپ انکار کر سکتے تھے۔“

”اگر یہ درست بھی ہے تو تمہیں کسی نے تو بتایا ہوگا۔“

”مجھے کسی نے بھی بتایا، کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ اسے مجھ سے دور کر رہے ہیں۔“

”وہ وہاں تفریح کرنے نہیں جا رہی ہے۔ میں اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ وہ میری بیٹی ہے۔ اس کے حق میں جو بہتر سمجھ رہا ہوں وہ کر رہا ہوں۔“

”میں نے اسے پیدا نہیں کیا لیکن پالا تو ہے۔ مجھے اس سے محبت تو ہے۔ میری اپنی تو کوئی اولاد ہے نہیں۔ ایک لائبہ ہے اسے بھی آپ مجھ سے دور کیے دے رہے ہیں۔“

”میں جو بھی کروں، تم دخل دینے والی کون ہوتی ہو۔“

”میں آج تک آپ سے کسی بات پر نہیں لڑی لیکن اب لڑوں گی۔ جس طرح چھی ہوا ہے روکوں گی۔ ایک ماں سے آپ اس کی اولاد نہیں چھین سکتے۔ وہ میری اولاد ہے۔ وہ بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

راجیل جیسی مضبوط اعصاب کی عورت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اعجاز احمد کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی، لائبہ کی بھیک مانگ رہی تھی۔

اعجاز احمد حیران تھا۔ وہ ابھی تک راجیل کی مکاری پر ہنس رہا تھا لیکن اس کے آنسو کوئی اور ہی تصویر پیش کرنے لگے تھے۔ وہ رونے جیسی شکل بنا سکتی تھی لیکن اتنی بڑی اداکارہ نہیں تھی کہ آنکھوں میں آنسو بھی لے آتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پس منظر سے واقف نہیں اور لائبہ سے واقعی محبت کرتی ہے۔ یہی وہ وقت تھا کہ اعجاز احمد حقیقت حال

بتا کر اسے باپ کے خلاف بھڑکا سکتا تھا۔ اس نے اپنی محبت جتانے کے لیے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

”مجھے معلوم ہے اس وقت تمہارے جذبات کیا ہیں لیکن جو حالات ہو گئے ہیں اس میں یہی راستہ بچا ہے کہ میں لائبہ کو دشمنوں کی دسترس سے باہر بھیج دوں۔ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اس کے اغوا کی دھمکی دی گئی ہے۔ دھمکی دینے والا کوئی اور نہیں تمہارا باپ کرم نواز ہے۔“

”آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈیڈی ایسا کیوں کریں گے۔“

”انہوں نے ایسا کیا ہے۔ انہوں نے اپنا پالتو غنڈا میرے پاس بھیجا تھا جو مجھے دھمکا کر گیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اس غنڈے کی آپ سے کوئی دشمنی ہو اور اس نے ڈیڈی کا نام لے دیا ہو۔“

”نومبر 2014ء

240

سپینس ڈائجسٹ

www.pdfbooksfree.pk

”شادی کا معاملہ میرا اور تمہارا ہے۔ اس سے ہم بعد میں منٹ لیں گے فی الحال تو لائبہ کا معاملہ سامنے ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ ڈیڑی سے مل کر انہیں مجبور کروں کہ وہ آپ سے اپنے رویے پر معذرت کریں۔“

اعجاز احمد نے بھی بات کو یہیں ختم کرنا مناسب سمجھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کرم نواز کا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔ اسے یہ خوشی ہو رہی تھی کہ وہ راحیلہ کو اس کے باپ کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

اس کی خوشی نے اس کے دل میں ابھی روشنی اتاری ہی تھی کہ گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ راحیلہ تک یہ خبر پہنچی کیسے؟ میں نے صرف رضوان کے سامنے اس منصوبے کا ذکر کیا تھا۔ تو کیا رضوان، راحیلہ سے ملا ہوا ہے؟ اس نے اگر راحیلہ سے ہمدردی جتائی ہے تو بھی وہ بھروسے کے لائق نہیں۔ اس سے پہلے شادی کا منصوبہ بھی کرم نواز تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کوئی اندر کی خبریں باہر پہنچاتا ہے۔ کرم نواز نے میرے کچھ لوگ خریدے ہوئے ہیں۔ یہ دو واقعات تو میرے علم میں آگئے اور نہ جانے کیا کیا باتیں راحیلہ اور کرم نواز تک پہنچی ہوں گی۔ میرے تو کاروباری راز بھی میں سمجھتا ہوں محفوظ نہیں۔ رضوان اکیلے یا کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ کسی اور کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن رضوان تو اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ پرانے لوگوں میں وہی ایک ہے جسے میں نے اب تک نہیں نکالا۔ اس سے پوچھ گچھ ضروری ہے۔ دوسرے دن وہ لائبہ کو اسکول چھوڑتے ہوئے دفتر پہنچا تو سب سے پہلا کام یہی کیا کہ رضوان کو اپنے کمرے میں بلوایا۔

”مسٹر رضوان، کہیے کچھ کام آگے بڑھا؟“

”کس سلسلے میں سر؟“

”میں نے لائبہ کے داخلے کے سلسلے میں آپ سے کچھ

کہا تھا۔“

”سر، میں نے خط لکھ دیے ہیں۔ جونہی وہاں سے

لنچرچ آئیں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

”اچھا یہ بتائیے، آپ نے کسی سے اس کا ذکر تو نہیں کیا۔“

”میری کیا مجال جب آپ نے منع فرمایا تھا۔“

”میں نے آپ کے سوا کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا

لیکن مجھے حیرت ہوئی جب میرے بتائے بغیر اس کا علم

راحیلہ کو ہو گیا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے بتائے بغیر

اسے کس طرح علم ہو گیا۔“

”پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن جب میں نے کرم نواز کو فون کیا تو تصدیق ہو گئی کہ یہ گھٹیا حرکت انہی کی ہے۔“

”اف میرے خدا!“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا

سر تھام لیا۔ ”ڈیڑی کو یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش

آئی۔ آپ نے وجہ تو معلوم کی ہوئی، وہ لائبہ کو نقصان

پہنچانے کے کیوں درپے ہیں۔“

”تمہیں معلوم ہے میری لقمی خواہش ہے کہ میں ایک

بٹے کا باپ بنوں اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ تم اولاد پیدا نہیں

کر سکتیں۔ اسی لیے میں ایک شادی اور کرنے کے حق میں

ہوں۔ لائبہ لڑکی ہے، ایک لڑکا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ

میرے بڑھاپے تک اس قابل ہو جائے کہ کاروبار سنبھال

سکے۔ میرے اس ارادے کی خبر نہ جانے کیسے تمہارے باپ

کو ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اس شادی سے روکنے کے لیے یہ

گھٹیا قدم اٹھایا ہے۔ میں اگر شادی کر رہا ہوں تو گناہ نہیں کر

رہا۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ ایک کیا کئی شادیوں کا

بوچھا اٹھا سکتا ہوں۔“

”آپ ڈیڑی ہی کو کیوں قصور وار ٹھہرا رہے ہیں۔

ایک باپ کی حیثیت سے اس خبر کا ان پر منفی اثر ہوا ہوگا۔

انہوں نے محض آپ کو دھمکانے کے لیے آپ کے پاس کسی کو

بھیجا ہوگا۔“

”میں ان کا دیا ہوا نہیں کھاتا۔ انہیں کیا حق ہے کہ وہ

میرے ذاتی معاملات میں دخل دیں۔“

”آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں،

ان کی بیٹی یعنی میرا معاملہ بھی ہے۔“

”اگر وہ شریف آدمی ہوتے تو بیٹھ کر مجھ سے بات

کرتے۔ یہ کیا طریقہ ہے۔“

”ہاں اتنی بات آپ کی درست ہے۔ میں ان سے

بات کروں گی۔ وہ آپ سے معذرت کریں گے ورنہ میں ان

سے قطع تعلق کر لوں گی۔“

”انہوں نے جن لوگوں کا سہارا لیا ہے ان کی نفسیات

کو تم نہیں جانتیں۔ آج وہ کرم نواز کے کہنے پر آئے تھے کل

وہ خود آئیں گے۔ جب تک لائبہ یہاں رہے گی وہ مجھے بلیک

میل کرتے رہیں گے۔ اب لائبہ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔“

”اگر اب آپ نے لائبہ کو باہر بھیجے گی بات کی تو کوئی

غصہ انہیں میں آپ کے راستے میں کھڑی ہو جاؤں گی۔“

”اب یہ تمہارے اوپر ہے تم مجھے شادی کی اجازت

دے دو۔ لائبہ کو میں باہر نہیں بھیجوں گا۔ تمہارا باپ دخل

انداز میں نہ کرے۔“

اطلاع انہوں نے ہمیں فراہم کی ہے اس کا نتیجہ یہی ہوتا تھا۔
بہر حال ان کی نوکری سے اہم وہ اطلاع ہے ورنہ ہمیں معلوم
بھی نہیں ہوتا اور لائبہ باہر جا چکی ہوتی۔ اب ہمارا بھی فرض
ہے کہ ہم ان کی نوکری کا بندوبست کریں۔“

”میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔ کل ہی میں ان کے
لیے کچھ کرتا ہوں۔“ کرم نواز نے کہا۔ ”میں پریشان تو اس
لیے ہوں کہ اب اندر کی باتیں ہمیں کون پہنچائے گا۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں کہنے والے بہت ہوتے
ہیں۔ کسی کو بھی خریدیں گے۔ اس وقت تو ہمیں یہ سوچنا ہے
کہ اعجاز کو اس کے ارادے سے کیسے باز رکھا جائے۔ میں
نے اپنے آنسوؤں سے اسے وقتی طور پر روک تو لیا ہے لیکن وہ
ابھی تک آپ کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ کسی وقت
بھی لائبہ کو باہر بھیج دے گا۔“

”بھیجتا ہے تو بھیج دے۔ میرے پاس اسے بلیک میل
کرنے لیے اور بہت کچھ ہے۔ اس کے لیے ظالم خان کی
دہشت ہی بہت ہے۔“

”جی بات تو یہ ہے کہ میں نہیں چاہتی کہ لائبہ مجھ سے
دور ہو۔ میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔ میری ممتا کو
تسکین ملتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں کسی کو بھیج کر اسے کھلوا دیتا ہوں کہ
وہ لائبہ کو باہر بھیجنے کی غلطی نہ کرے۔“

”ڈیڈی آپ ہر وقت طاقت کے استعمال کا کیوں
سوچتے ہیں۔ اس وقت مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس
سے ملاقات کریں اور اپنے رویے پر معذرت کریں۔“

”اس سے کیا ہوگا۔“

”اس سے یہ ہوگا کہ اس کے دل سے خوف نکل جائے
گا۔ میری اور آپ کی طرف سے اس کا دل بھی صاف
ہو جائے گا۔ دشمن کو غافل کر کے آسانی سے مارا جاتا ہے۔
میں آہستہ آہستہ اس کی دولت پر ہاتھ صاف کرتی ہوں۔
دولت ہی اس کی بڑی طاقت ہے، اگر اس کے بعد اس نے
شادی کر لی تو وہ کمزور ہو چکا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہاری خاطر یہ ذلت بھی برداشت
کیے لیتا ہوں لیکن اگر اس نے ملنے سے انکار کر دیا تو یہ تو ہیں
میں برداشت نہ کر سکوں گا۔“

”وہ اتنا خوف زدہ ہے کہ ملاقات ہی میں غافیت سمجھے گا۔“
”میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ وہ تم پر سوکن لائے اور
تمہاری دولت کا بنوارہ ہو۔“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اول تو میں اسے شادی

”آپ قسم لے لیں۔ میں نے ایک لفظ بھی کسی سے
نہیں کہا۔“
”لکھ کر دیا ہوگا۔“

”میں اپنی تحریر کیوں چھوڑوں گا۔“ اس کی آواز میں
لرزش تھی۔ ”ہوسکتا ہے میرے علاوہ بھی اس وقت آپ کے
کمرے میں کوئی موجود ہو۔“

”اور آپ نے کہا وہ چلوں رہا ہے تو سننے دو۔ جب
آپ اتنے بے خبر ہیں تو میرے ساتھ رہنے کی ضرورت
نہیں۔ آپ اکاؤنٹس میں جا کر اپنا حساب کر لیں۔“

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے مجھے نوکری سے نکال
دیا ہے؟“

”آپ کو اب بھی کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے؟“
”سر، مجھ پہ ظلم نہ کریں۔“

”مجھے خوشامد سے نفرت ہے۔ چلے جائیے۔“
رضوان کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا اور پھر کمرے سے
نکل گیا۔

☆☆☆

کرم نواز کی وسیع و عریض کوٹھی کے انڈر گراؤنڈ کمروں
میں سے ایک میں کرم نواز، رضوان اور ظالم خان جمع تھے۔
اس وقت چونکہ کرم نواز گھر پر تھا اس لیے اس کے گارڈ
غیر معمولی گنرائی کا فرض انجام دے رہے تھے۔ ابھی ابھی
انسپکٹر فیاض نے خبر پہنچا کر گیا تھا کہ ظالم خان کی گرفتاری کے
لیے جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ وہ جب تک یہاں
پناہ لیے رہے گا محفوظ رہے گا۔ اس وقت ظالم خان یہی
موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ اسے یہ یقین دلا یا جا رہا تھا کہ موقع
ملنے ہی اسے شہر سے باہر فرار کر دیا جائے گا۔

کمرے میں لگا اطلاعی بلب روشن ہو گیا۔ اس کا
مطلب تھا کہ کوئی آیا ہے۔ خود کار دروازے کو جنبش ہوئی اور
توقع کے مطابق راجیلہ اندر داخل ہوئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔
”راجیلہ ان کاموں میں کوئی اتنی دیر لگا تا ہے۔ کب
سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔“

”میں آپ کا فون سننے ہی روانہ ہوئی تھی۔ راستے
میں ٹریفک اتنا تھا کہ بس نہ پوچھیے۔“
”تمہیں کچھ معلوم ہوا؟“

”کس بارے میں۔“
”مشر رضوان کو تمہارے میاں نے نوکری سے نکال
دیا ہے۔“

”نہیں مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن جو

”آپ کے بھیجے ہوئے دو کوڑی کے غنڈے نے میری جو بے عزتی کی ہے اس کا کوئی ازالہ ہو سکتا ہے اسے آپ کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو اس کی اتنی ہمت ہوتی؟“

”میں نے کہا نہ میں سخت شرمسار ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری بیٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ راجیلہ تمہاری بیٹی سے بہت پیار کرتی ہے اسے لائبرے سے جدا مت کرو۔“

”تو اب مجھے یہ وعدہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں تیسری شادی نہیں کروں گا۔“

”دیکھو اعجاز احمد، میں ایک باپ کی حیثیت سے یہ نہیں چاہوں گا کہ تم میری بیٹی پر سوکن لاؤ لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپس کے اختلافات میں تمہاری بیٹی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ویسے بھی یہ مجھ سے زیادہ راجیلہ کا معاملہ ہے۔ تم اس سے بات کرو، اگر تم یہ چاہو کہ میں خوشی سے اجازت دے دوں تو یہ کیسے ہوگا۔“

اعجاز احمد نے بھی سوچا کہ لائبرے کی حفاظت کا معاملہ زیادہ اہم ہے۔ اس وقت اسی پر ٹکایا گیا۔ میں راجیلہ کو منانے کی کوشش کروں گا۔ کرم نواز خود چل کر میرے پاس آیا ہے۔ اس وقت اس کی معذرت قبول کر لینی چاہیے۔

یہ معاملہ اتنے احسن طریقے سے منٹ جائے گا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں راجیلہ کا کردار بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لائبرے کو بہت چاہتی ہے۔ اسی لیے تو اس نے اپنے باپ کا سر میرے سامنے جھکا دیا۔ میں اگر شادی نہ کروں تو وہ مجھ سے بہت خوش رہے گی لیکن ایک بیٹے کی آرزو کیا ہوگا؟

وہ دو کشتیوں میں سوار ہو گیا تھا۔ ایک طرف راجیلہ کی محبت اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ دوسری طرف بیٹے کا سوال تھا جو وہ اسے نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے اس وقت یہی سوچا کہ کچھ دنوں کے لیے شادی کا خیال دل سے نکال دے۔ یہ دیکھے کہ کرم نواز کس حد تک اپنے وعدے پر قائم رہتا ہے۔ اس عرصے میں راجیلہ پر نواز شوں کی بارش کرتا رہے شاید وہ خوش ہو کر شادی کی اجازت دیدے۔

وہ کرم نواز کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد راجیلہ کو مٹھی میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ لائبرے کے اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں تو وہ راجیلہ اور لائبرے کو لے کر ورلڈ نر پر نکل گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لائبرے کو خوش کر رہا ہے یا راجیلہ کو۔ وہ کسی کو بھی خوش کر رہا ہو لیکن خوش راجیلہ ہو رہی تھی۔ اعجاز سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس

کرنے نہیں دوں گی اور اگر کر بھی لی تو اس وقت تک اس کی آدھی دولت بھتیا چکی ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے، تم ملاقات کا انتظام کرو۔ میں اس ناپسندیدہ آدمی سے ملنے کو تیار ہوں۔“

”میں اس سے بات کر کے آپ کو فون کر دوں گی۔“

ظالم اب تک خاموش بیٹھا تھا لیکن اب خاموش نہ رہا۔

”آپ لوگ اپنا عقل لڑا چکا ابی ام کچھ بولتا ہے۔“

”کہو خان تم کیا کہتے ہو۔“

”جب تک بچی نہیں اٹھے گا وہ آپ لوگوں کو پاگل بناتا رہے گا۔ آپ بولو تو شیر کو بھیج کر بچی اٹھا لوں۔“

”وہ آج کل لائبرے کو اسکول چھوڑنے اور لینے خود جاتا ہے۔“ راجیلہ نے کہا۔

”شیر ورنٹا نہیں ہے جوڑ جائے گا۔ آپ حکم بولو، بچی کو اسکول کے اندر سے اٹھا کر لے آئے گا۔ پولیس کا باپ بھی بچی کو ڈھونڈ نہیں سکے گا۔“

”نہیں خان نہیں۔ راجیلہ ٹھیک کہتی ہے۔ جب سیدی اٹھیں تو سبھی نکل رہا ہے تو انکی میز بھی کیوں کی جائے۔“

ظالم خان اس فیصلے سے خوش نہیں تھا لیکن کرم نواز کے فیصلے کی زیادہ مخالفت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

کرم نواز اس کا خسر ہونے کے باوجود کچھ نہیں دو دو سال بعد اس کے گھر آیا تھا۔ جب سے اعجاز احمد کو یہ معلوم ہوا تھا کہ کرم نواز غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہے اس نے کرم نواز سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ کرم نواز کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس کے گھر کے چکر کاٹتا پھرے۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کی بیٹی خوش ہے۔ اس نے بیٹی کے گھر آنا بند کر دیا تھا لیکن ایسا انتظام ضرور کر دیا تھا کہ ایک ایک مہینے کی خیر اس تک پہنچتی رہے۔ اس کی غیرت اب بھی یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ وہ معذرت کرنے اعجاز کے گھر جائے لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ کچھ دیر کے لیے غیرت کی آنکھیں بند رکھے۔ اپنی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں کو بجھا دے۔ اعجاز احمد کی آنکھوں میں الیت ابھی تک نفرت کے چراغ جل رہے تھے۔ یہ چراغ کرم نواز نے معذرت کی ہوا سے بجھا دیے۔

”اعجاز احمد مجھے معلوم ہے تم مجھ سے خفا ہو۔ تمہیں ہونا بھی چاہیے۔ مجھے اگر تمہاری شادی پر اعتراض بھی تھا تو تم سے خود بات کرنی چاہیے تھی۔ کسی کو بھیج کر میں نے بہت بڑی غلطی کی۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“

اس کے بعد دونوں طرف خاموشی ہو گئی۔ راحیلہ کو جو کچھ

کہنا تھا اس نے کہہ دیا۔ اعجاز کو جو کچھ سننا تھا اس نے سن لیا۔

دو چار مرتبہ اعجاز نے ہمت کر کے پھر بات پھیر لی

لیکن وہی ڈھاک کے تین بات۔ پہلے سے بھی سخت جواب

ملا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ راحیلہ موم کی بنی گڑیا نہیں۔ اگر اس

کے ساتھ زبردستی کی گئی تو وہ پھری ہوئی تاکن بن جائے گی۔

عدالت سے تو میں منٹ لوں گا لیکن کرم نواز کے غنڈوں سے

کون نمٹے گا۔ سب کہتے ہیں جان ہے تو جہان ہے۔ وہ کہہ رہا

تھا لائبہ ہے تو جہان ہے۔ اب وہ سیانی ہوئی ہے۔ اغوا ہوئی

تو عمر بھر کی بدنامی کا داغ لگ جائے گا۔ اس نے شادی کا

خیال دل سے نکال دیا۔ اب لائبہ ہی اس کا بیٹا تھی۔

راحیلہ کی طرف سے اس کے دل میں پھر کرم بڑ گئی

تھی۔ راحیلہ بھی اس سے کھنٹی کھنٹی رہنے لگی تھی۔ یہ عورت کسی

بھی وقت اسے تباہ کر سکتی ہے۔ ایک دولت ہی ہے جو میری

طاقت ہے۔ یہ عورت مجھے کمزور کرنے میں دیر نہیں لگائے

گی۔ یہ خیال اسے اس لیے آیا کہ کچھ دنوں سے راحیلہ کی

فضول خرچیاں بڑھ گئی تھیں۔ اسے یقین اس وقت آیا جب

روبی جیولرز کا مالک اس کے آفس آیا اور اسے بتایا کہ راحیلہ

نے اس کی دکان سے ڈائمنڈ کا سیٹ خریدا ہے۔

”انہوں نے فرمایا تھا کہ بے منٹ آپ گروں گے۔“

بات عزت کی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم نے

میری اجازت کے بغیر سیٹ کیوں اسے فروخت کیا۔ بے

منٹ سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ

آئندہ وہ اس کے ہاتھوں کوئی چیز فروخت نہ کرے۔ بس

دبے لفظوں میں اتنا کہہ سکا کہ عورتوں کو تو تم جانتے ہی ہو۔

کاروبار کے اتار چڑھاؤ کو تو دیکھتی نہیں ہیں اور فرمائش کرتی

رہتی ہیں۔ آئندہ فون پر مجھے بتا دیا کرنا۔ چیک کاٹ کے

جیولر کو دے دیا۔

گھر پہنچ کر ہلکی سی تکرار ہوئی لیکن جب لائبہ بھی ماں کی

حمایت میں بولنے لگی تو اسے ہنس کر چپ ہو جانا پڑا۔ لائبہ کو

راحیلہ نے اپنی سچی میں کر لیا تھا۔ اس لیے اعجاز کو دباؤ نہ تھا۔

☆☆☆

”ڈیڈی میں راحیلہ بول رہی ہوں۔“

”ہاں بیٹا بولو۔ کیا بات ہے۔“

”ڈیڈی وہ نجس آدمی اب بہت باتھ پاؤں چلائے

لگا ہے۔ میرے اخراجات پر نظر رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کہ

وہ بالکل ہی دامن سمیٹ لے اس کا کچھ انتظام کیجیے۔“

”تم ہی نے کہا تھا میں اسے نہ چھیڑوں۔“

کے ساتھ سفر پر نکلی تھی۔

سفر سے واپس آئی تو اس میں بہت سی تبدیلیاں آچکی

تھیں۔ اعجاز کی طرف سے اس کے دل میں ایسا نرم گوشہ پیدا

ہو گیا تھا جس کا اظہار بار بار ہو رہا تھا۔ اعجاز اس جنت کو

اجازت نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شادی کا نام سننے ہی

وہ بھڑک اٹھے گی۔ اس لیے وہ اس سے شادی کے متعلق بات

کرتے ہوئے بھجھکتا رہا۔

لائبہ اپنے باپ کی الجھنوں سے بے خبر عمر کی منزلیں

طے کرتی ہوئی ہائی اسکول تک آ گئی۔ اب اعجاز احمد کو محسوس

ہوا کہ وقت ساتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ وہ

اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دے۔ اس نے طے کر لیا کہ

اب وہ راحیلہ سے ددو کہ بات کرے گا۔

وہ اس وقت راحیلہ کے ساتھ بیڈ روم میں تھا۔ لائبہ

اپنے کمرے میں تھی۔ اسے ابھی ابھی فون پر ایک بڑی ڈیل

کی خبر ملی تھی۔ اس ڈیل سے اسے لاکھوں کا منافع ہو سکتا تھا۔

راحیلہ بھی سن رہی تھی۔ اعجاز نے جیسے ہی فون رکھا، راحیلہ نے

اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”کتے دنوں سے میں ڈائمنڈ کے سیٹ کی ضد کر رہی

ہوں۔ اب آپ کو میری ضد پوری کرنی پڑے گی۔ اب یہ

مت کہہ دینا کہ کاروبار میں گھما ہو رہا ہے۔“

”میں تمہاری فرمائش ضرور پوری کروں گا لیکن تمہیں

بھی میری ایک بات ماننی ہوگی۔“

”میں نے آپ کی کوئی بات بھی ٹالی ہے؟“

”ایک بات ایسی ہے جو تم ہمیشہ ٹالتی رہی ہو۔“

”میں آپ کو شادی تو ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔“

”دیکھو راحیلہ، میں شادی اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ تم

مجھے پسند نہیں ہو بلکہ اس کی وجہ تم جانتی ہو، مجھے بیٹے کی خواہش

ہے۔ اگر تم سے اولاد ہو سکتی تو میں یہ قدم ہرگز نہ اٹھاتا۔“

”میں کوئی دلیل سننے کی روادار نہیں ہوں۔ اگر آپ

نے شادی کی تو میں ڈیڈی کی کوروک نہیں سکوں گی۔“

”وہ مجھ سے معاہدہ کر چکے ہیں۔ لائبہ کو نقصان نہیں

پہنچائیں گے۔“

”معاہدہ آپ توڑ رہے ہیں۔“

”اجازت میں تم سے مانگ رہا ہوں۔ ڈیڈی درمیان

میں کہاں سے آگئے۔“

”میں اجازت نہیں دوں گی۔ اگر آپ نے شادی کی تو

میں نے آپ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے۔ لائبہ کو اغوا میں بھی

کر سکتی ہوں۔“

کا خیال آیا۔ وہ تو ابھی سو رہی ہوگی۔ اس تک یہ خبر کہاں پہنچی ہوگی۔ اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر ہاتھ ہٹچ لیا۔ فون پر یہ خبر سنا تو کیا اچھا لگوں گا۔ کرم نواز جیسا بھی تھا اس کا باپ تھا، مجھے اس سے تعزیت کرنی چاہیے۔ اس نے ڈرائیور کو بلا لیا اور دوبارہ گھر پہنچ گیا۔ راحیلہ ابھی تک سو رہی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ کمرے میں آہٹ ہوتے ہی راحیلہ کی آنکھ کھل گئی ورنہ اسے چگانا مشکل ہو جاتا۔

”آپ ابھی تک گئے نہیں؟“

”آج جی چاہ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ ناشتا کروں۔

اس کے بعد جاؤں۔“

”آپ جائیں، ابھی مجھے ناشتے کی ٹیبل تک پہنچنے میں

آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔“

”میں انتظار کر لوں گا۔“

وہ بستر سے اٹھی اور واش روم کی طرف چلی گئی۔

تیار ہو کر نکلی تو واقعی آدھا گھنٹا سے زیادہ ہو چکا تھا۔ وہ

ناشتے کے دوران کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ناشتے کے

دوران بھی وہ یہی سوچتا رہا کہ وہ راحیلہ کو یہ اندوہناک

خبر کیسے سنائے۔ اس کی یہ مشکل ٹیلی فون کی گھنٹی نے حل

کر دی۔ شیف ناشتا لگانے کے بعد ٹیبل کے قریب ہی

ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ

فوراً حاضر کر دے۔ فون کی آواز سنتے ہی وہ فون اٹھانے

کے لیے بڑھا لیکن راحیلہ نے اسے روک دیا۔ یہ شاید

وہی وقت تھا جب اعجاز کے چلے جانے کے بعد کرم نواز

راحیلہ کو فون کر لیتا تھا۔ اس لیے راحیلہ نے مناسب سمجھا

کہ وہ فون خود اٹھائے۔ اس نے فون اٹھایا۔ ادھر سے

کوئی ایسی اطلاع ملی تھی کہ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ

گیا۔ اعجاز بھی اٹھ کر رہا گا اور راحیلہ کو گرنے سے بچا لیا۔

”ڈیڑی کو کسی نے کوئی مار دی ہے۔“ وہ اتنا کہہ سکی

اور قریب بڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ اسی لیے میں آفس سے واپس

آ گیا تھا۔ ناشتے کے بعد تمہیں بتانے والا تھا۔ صبر کرو۔ ہم

ابھی چلیں گے، جا کر صورت حال معلوم ہوگی۔“

☆☆☆

منظر تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن راستے

سے ہٹ گیا تھا۔ اب اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب وہ

شادی کر سکتا تھا لیکن راحیلہ اپنی انجمنوں میں گھری ہوئی تھی۔

اس وقت اس سے بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ اب تک یہی

سمجھ رہی تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد تمام دولت اس کے

”اب نہیں کہہ رہی ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ میری

سائٹ والی فیکٹری کے دوسرے کاغذات بخوار کچ دے۔

آپ اسے پہنچے گا بندوبست کریں۔“

”ایک فیکٹری کیا میں تو ایسا بندوبست کر رہا ہوں کہ ایک

ایک کر کے اس کی ساری فیکٹریوں پر تلے ڈال دوں گا۔“

”وہ میری فیکٹری کی تاک میں لگا ہوا ہے۔“

”تم اسے میرے ہاتھوں بچ دو۔ میں اپنے آدمی وہاں

بٹھا دوں گا۔ پھر اعجاز کی کیا مجال جو ان سے اچھے، کسی اور کے

ہاتھ پیچو کی وہ انہیں ڈرا دھکا کر قبضہ چھڑالے گا یا عدالت میں

جائے گا کیونکہ اس نے جب یہ فیکٹری تمہارے نام کی تھی تو

کاغذات میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اس کی رضامندی کے بغیر

اسے نہیں بچ سکوگی۔ میرے خلاف وہ عدالت میں نہیں جائے گا

اور گیا تو صرف جائے گا، واپس نہیں آئے گا۔“

دونوں میں سودا طے ہو گیا۔ رقم راحیلہ کے اکاؤنٹ

میں منتقل ہوئی۔

فیکٹری ہاتھ سے چلی گئی ہے اس کا علم اعجاز کو ایک مہینے

بعد ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خریدنے والا کرم نواز ہے۔ اس

نے کیوں خریدی ہے یہ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کیونکہ جب

وہ راحیلہ سے الجھا تو اسی دن ایک گنام فون اسے موصول

ہو گیا۔ کہنے والا کہہ رہا تھا کہ اگر وہ عدالت گیا تو اس کے

ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ

فون کس کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔

راحیلہ کی نیت اس پر ظاہر ہو گئی تھی۔ وہ اتنی خود سر ہو گئی

ہے کہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ کرم نواز کے زور پر کود رہی تھی

اور وہ اس سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے دو ہی طریقے ہوتے

ہیں یا تو حملہ کیا جاتا ہے یا اپنا دفاع کیا جاتا ہے۔ اس نے

دفاع کا راستہ اختیار کیا اور اپنی دولت آہستہ آہستہ ملک سے

باہر منتقل کرنی شروع کر دی لیکن اس رازداری کے ساتھ کہ

کسی کو کانوں کاں خبر نہ ہو۔

اس رازداری کے باوجود میں ممکن تھا کہ کرم نواز کو اس

کی ہینک پڑ جاتی لیکن وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ

تھا۔ خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا والا معاملہ ہو گیا۔ کرم

نواز اور ظالم خان کے ایک ساتھی کے درمیان پیسوں کے لین

دین پر جھگڑا ہوا۔ جس نے اس کے سینے میں ایک ساتھ کئی

گولیاں اتار دیں۔

یہ اطلاع اسے دفتر پہنچنے ہی اخبار کے ذریعے ملی تھی، کسی

کی موت پر خوش ہونا نہیں چاہیے لیکن اسے خوشی ہوئی تھی۔ اس کا

ایک بڑا دشمن راستے سے ہٹ گیا تھا۔ خبر پڑھتے ہی اسے راحیلہ

”ڈیڈی مجھے آپ کو ہرٹ کرنا مقصود نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ مجھے آپ آئرش کے مضامین پڑھنے دیں۔ اگر میں نے زبردستی کامرس کے مضامین لے بھی لیے تو میں شوق سے نہیں پڑھ سکوں گی۔ آج فرسٹ آئی ہوں پھر تھرڈ بھی نہیں آؤں گی۔“

بات اعجاز کی سمجھ میں بھی آگئی۔ زبردستی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

راحیلہ جب باپ کے صدمے سے باہر آئی اور اس کا حصہ اس کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکا تو اعجاز احمد کے دل میں تیسری شادی کے خیال نے پھر کروٹ لی۔ راحیلہ کے بھائی امریکا جا چکے تھے لہذا میدان صاف تھا۔ اس نے سوچا وہ آخری مرتبہ راحیلہ سے بات کر لے مانتی ہے، تو مانے بہر حال وہ شادی کر لے گا۔

بہت دن بعد اس نے لان میں کرسیاں ڈلوای تھیں۔ وہ راحیلہ کے ساتھ وہاں بیٹھ کر چائے پیتا چاہتا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی تھی لیکن ایسی نہیں تھی کہ ناگوار ہو۔ اس نے ملازم سے کہا کہ وہ کافی بنائے اور خود راحیلہ کے ساتھ لان میں جا کر بیٹھ گیا۔

ابھی ادھر ادھر کی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ لائبر لان کی طرف آتی دکھائی دی، اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔

”واؤ، آپ لوگ یہاں بیٹھے ہیں، اس کا مطلب ہے میں اچھے موقع پر آگئی۔ گرم گرم کافی کا آسرا ہو گیا۔“

”کیا خود غرضی ہے؟“ اعجاز احمد نے کہا۔ ”تعارف نہیں کراؤ گی۔“ اس نے اس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ، سوری ڈیڈی! میں تو بھول ہی گئی۔ یہ دونوں میرے ساتھ کالج میں پڑھتی ہیں۔ یہ تانیہ ہے اور یہ نیلو فر!“

”نیٹھو۔ کافی آتی ہی ہوگی۔“ راحیلہ نے کہا اور وہ تینوں بیٹھ گئیں۔

اعجاز احمد نے ان دونوں لڑکیوں کی طرف ایک مرد کی نظر سے دیکھا۔ وہ دونوں جوان تھیں۔ پھر اس نے لائبر کی طرف دیکھا۔ وہ اسے چھوٹی ہنسی ہی معلوم ہوتی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ جوان ہو چکی ہے۔ لائبر کے قہقہے لان میں پھول کھلا رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی کبھی کبھلا کراہٹیں پڑتی تھیں۔ کافی آگئی تھی۔ تینوں لڑکیوں نے کافی ختم کی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

”ڈیڈی، میں اپنی دوستوں کو اپنا کمرہ دکھانے لاتی تھی۔“

ہاتھ آجائے گی لیکن نئی صورت حال یہ پیدا ہوگئی تھی کہ اس کے دونوں بھائی امریکا سے آگئے تھے۔ برسوں سے انہوں نے خبر نہیں لی تھی لیکن اب کرم نوازی کا جائداد بھٹانے کی فکر میں تھے۔ کرم نوازی بدبینی تھی کہ اس نے زندگی میں کوئی وصیت نہیں کی تھی جس کا نتیجہ اب راحیلہ کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اس کے بھائی اسے ایک دھیلا دینے کو تیار نہیں تھے۔ اس نے بھائیوں کے خلاف عدالت میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اعجاز احمد کو معلوم تھا کہ ایسے مقدمات کا اتنی جلدی فیصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے خود اس کے بھائیوں سے ملنا پڑتا کہ وہ انہیں راحیلہ کا حصہ دینے پر راضی کر سکے۔ راحیلہ بعد بھی کہ وہ عدالت میں یہ ثابت کرے گی کہ کرم نوازی نے اپنے بیٹوں کو عاق کر دیا تھا، اس لیے جائداد پر ان کا حق نہیں۔ اعجاز احمد اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ عاق کر دینے کے بعد بھی بیٹوں کو ان کا حق دینا پڑتا ہے۔ اگر کرم نوازی اپنی زندگی میں کوئی وصیت کر جاتے یا جائداد کا کچھ حصہ تمہارے نام کر جاتے تو وہ الگ بات تھی اب تو جو کچھ ملے اسی پر اکتفا کرو، تم کہو تو میں تمہارے بھائیوں سے بات کروں۔

راحیلہ کو راضی کرنے میں اسے کئی مہینے لگ گئے۔ پھر بھائیوں کا مسئلہ تھا۔ راحیلہ کا حق کروڑوں میں جتا تھا۔ اس کے بھائی تیار نہیں ہو رہے تھے بڑی مشکل سے انہیں تیار کیا۔ اس میں بھی چند مہینے لگ گئے۔

لائبر کا رزلٹ آچکا تھا۔ اس نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ اب اسے کسی اچھے کالج میں داخل کرانے کا مرحلہ تھا۔ نمبراتے اچھے تھے کہ اسے کسی بھی کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ اعجاز احمد کا اصرار تھا کہ وہ آئی کام کرے۔ کامرس پڑھے گی تو اسے بزنس کا شعور آئے گا۔ اس کے بزنس کی دیکھ بھال کر سکے گی لیکن لائبر کا مزاج شاعرانہ تھا۔ چھپ چھپ کر شعاعی بھی کرتی رہی تھی۔ اعجاز احمد نے اسے لاکھ بھجایا کہ شوق اپنی جگہ ہے کاروبار اپنی جگہ۔

”بیٹا تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میرے بعد میرے کاروبار کو تمہیں سنبھالنا ہے۔ تم بی کام کرو تا کہ تمہیں آسانی ہو۔“

”اگر میں بھی نہ ہوتی تو بھی آپ کے کاروبار کو کوئی سنبھالتا نہیں۔ آپ مجھیں میں نہیں ہوں۔“

”لائبر بیٹی، ایسا نہیں کہتے، تمہیں کیا خبر میں نے تمہیں کس طرح پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ تمہیں محسوس نہیں ہونے دیا کہ تم سویتلی ماں کے ساتھ رہ رہی ہو۔“

وہ اس کے کمرے میں گیا بھی تھا۔ اس سے بات بھی کی تھی لیکن اس نے نہایت سختی سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ابھی پڑھنا چاہتی تھی۔ اس نے دیدہ دلیری سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ جب بھی شادی کرے گی اپنی پسند سے کرے گی۔ اس کی شادی کے لیے انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

اعجاز احمد کو اس سے اس گستاخی کی امید نہیں تھی۔ وہ سر جھکا کر چلا تو آیا لیکن لائبریری اس گستاخی کا سبب اس نے راحیلہ کو مضربرایا۔ سوتیلی ماں ہے۔ اس نے یہ تربیت ہی نہیں دی ہوگی کہ باپ کا ادب کیسے کیا جاتا ہے۔ راحیلہ مجھ سے کس طرح بات کرتی ہے، لائبریری بھی دیکھتی ہوگی۔

راحیلہ کی طرف سے اس کے دل میں مزید نفرت پیدا ہوئی۔

اس دن کے بعد سے وہ راحیلہ سے صرف اتنی ہی بات کرتا تھا جتنی ضروری ہوتی۔ راحیلہ نے بھی اس کی سردمہری کو دیکھتے ہوئے اپنا راستہ الگ کر لیا تھا۔ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتی تھی۔ نئے نئے دوست بنا لیے تھے۔ اس کے پاس اس کی ذاتی دولت اتنی ہوئی تھی کہ اعجاز احمد کی محتاج نہیں تھی۔ اپنی دولت دونوں ہاتھوں سے دوستوں پر بھجوا کر رہی تھی۔ اس کی سرگرمیاں بے راہ روئی کی حد تک پہنچ گئی تھیں مگر اعجاز کو اس کی پروا نہیں تھی۔

ایک دوسرے اس نے لائبریری سے راحیلہ کی شکایت کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس نے راحیلہ کی حمایت کی تو اعجاز احمد کو اپنی زبان بند کر پڑی۔

☆☆☆

راحیلہ کی اعجاز سے بات چیت کم ہی تھی لیکن وہ کبھی کبھی اس کے آفس کا چکر لگایا کرتی تھی تاکہ اس کے ملازمین کے لیے وہ انجینی بن کر نہ رہ جائے۔ اعجاز کے کمرے میں بھی اسی طرح چل جاتی تھی جیسے پہلے جاتی تھی اور اس طرح مسکرا کر نکلتی تھی جیسے اندر بڑی خوشگوار باتیں ہوئی ہوں حالانکہ وہ ہمیشہ یہ سن کر اٹھا کرتی تھی کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔

اس دن بھی وہ ملازمین پر اپنا رعب جھاڑتی انہیں ڈانٹ پلائی اعجاز کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس نے اعجاز کے کمرے سے ایک نوجوان آدمی کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ یہ شخص اتنا وجہ اور خوب صورت تھا کہ کسی عورت کو بھی متاثر کر سکتا تھا جبکہ راحیلہ کچھ دنوں سے اس راہ پر چل پڑی تھی۔ نئے نئے مردوں سے دوستی کرنا اس کا شیوہ بن گیا تھا۔ اس شخص کی خوب صورتی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ کون تھا یہ۔ اعجاز کا دوست تو وہ نہیں سکتا کیونکہ اس کی عمر تیس سال

”ہاں بیٹا جاؤ، انہیں کمرہ دکھاؤ۔ گپ شپ کرو، مجھے تمہاری امی سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“
”وش یو لڈک۔ آپ باتیں کریں۔“

وہ دور تک انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں خیالوں کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا۔ مجھے احساس ہی نہ ہوا اور لائبریری جو اب ہوئی۔ کیا میں اب شادی کرتے ہوئے اچھا لگوں گا۔ اسے اپنی دوستوں کے سامنے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ نئی آنے والی عورت کو وہ برداشت کر لے گی؟ اب مجھے اپنی نہیں لائبریری کی شادی کی فکر ہونی چاہیے۔

”آپ کچھ کہنے والے تھے۔“
”میں، مجھے کیا کہنا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔“
”آپ ابھی لائبریری سے کہہ تو رہے تھے کہ مجھے تمہاری امی سے کوئی بات کرنی ہے۔“

”اچھا، وہ تو میں نے اس لیے کہہ دیا تھا کہ کہیں لائبریری یہ نہ سمجھ لے کہ ہمارے تمہارے درمیان بات چیت ہی نہیں۔“

”آپ کے انداز سے پتا چل رہا ہے کہ آپ کچھ کہنے والے تھے جواب نہیں کہنا چاہتے۔“

”ارے کچھ نہیں۔ اب نہیں یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ سردی بڑھنے لگی ہے۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ راحیلہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ حیران تھی کہ اچانک اعجاز کو ہوا گیا۔ وہ اسے لے کر لان میں آیا تھا اور اب اس طرح منہ پھیر کر چل دیا جیسے اسے جانتا ہی نہ ہو۔

اعجاز احمد کو معلوم تھا کہ وہ اس کا چچا کرتی ہوئی بیڈروم تک آئے گی اور وہ اس وقت کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ بیڈروم میں جانے کے بجائے ریڈنگ روم میں چلا گیا اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ اس وقت یہاں پڑھنے نہیں آیا تھا بلکہ اپنی اسی کیفیت کو چھپانے آیا تھا۔ جس سے وہ ابھی انجینی دو چار ہوا تھا۔ اگر اس نے شادی کی تو لائبریری کیا سوچے گی۔ راحیلہ نے اگر مزاحمت کی تو وہ لائبریری کے سامنے تماشا بن کر رہ جائے گا۔ لائبریری اور راحیلہ کے درمیان اگر ان بن ہوئی تو بھی کوئی بات تھی۔ راحیلہ نے اسے اس طرح منہ می میں جکڑ لیا ہے کہ وہ میری نہیں اسی کی حمایت کرے گی۔ مجھے کرم نواز کی پروا کیے بغیر اسی وقت شادی کر لینی چاہیے مگر اس وقت لائبریری کی زندگی کا سوال تھا۔ اگر میں لائبریری کی شادی کروں تو؟

سے زیادہ نہیں تھی۔ ہاتھ میں کچھ فائلیں بھی پکڑی ہوئی تھیں۔
یقیناً کوئی ملازم ہوگا۔ وہ یہی سوچتی ہوئی اعجاز کے کمرے میں
چلی گئی۔

”ابھی میں آ رہی تھی تو ایک لڑکے کو کمرے سے نکلتے
ہوئے دیکھا۔ کون تھا؟“ اس نے لڑکا جان بوجھ کر کہا تھا۔ یہ
کہتے ہوئے اسے انجان سی خوشی ہوئی تھی۔

”میرا سیکرٹری ہے جمال۔“
”اس سے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔“

”ابھی اس نے پرسوں جو ان کیا ہے اور ہاں میرے
ملازمین کے بارے میں زیادہ تجسس کی ضرورت نہیں۔ میں
جس کو چاہوں نکالوں جس کو چاہوں رکھوں۔ پچھلے سیکرٹری
کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ میرے دشمنوں کے لیے
کام کر رہا ہے۔ میں نے اسے نکال دیا۔“ اعجاز احمد نے
راجیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

راجیلہ اتنی چیخی نہیں تھی کہ اس اشارے کو نہ سمجھتی۔
اسے معلوم تھا کہ وہ دشمن کے کہہ رہا ہے۔

”اچھا میں چلتی ہوں۔ کچھ خاص لوگ ہیں جن سے مجھے
ملنا ہے۔“ اس نے کہا اور پرس اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

اسے جمال کے کمرے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی
کیونکہ اعجاز کے کمرے سے جتنی ہی اس کا کمرہ تھا۔

”میں راجیلہ ہوں، مسز اعجاز، تمہارے مالک کی بیگم۔“
تعارف سننے ہی جمال کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”وہ..... بیگم صاحبہ، آپ نے مجھے بلوایا ہوتا، خود
کیوں تشریف لے آئیں۔“

”یہ بتانے کے لیے کہ یہ آفس اعجاز احمد کا ضرور ہے
لیکن یہاں محکم میرا چلتا ہے، جیسا میں کہوں ویسا کرتا ہے۔“

”میں آپ کے حکم سے باہر تھوڑی ہوں۔“
”اس وقت میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔ میرا

نمبر نوٹ کرو۔ یہ میں کسی کی خوش قسمت کو دیتی ہوں۔ یہ فون
میرے بیڈروم میں ہے۔ آج کل میں اور اعجاز صاحبہ الگ

الگ کمروں میں سوتے ہیں۔ تم مجھے رات میں فون کرنا۔
اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“

وہ چلکی گئی اور جمال حق وق دروازے کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ اس کا کمرہ ابھی تک خوشبو میں بھرا ہوا تھا۔ یہ

محترمہ ایک ہی دن میں اتنی بے تکلف ہو گئیں کہ اپنے
بیڈروم کا نمبر دے ڈالا۔ وہ اپنے کئی قصے سن چکا تھا جن کے

مطابق بڑی عمر کی عیاش عورتیں کم عمر مردوں سے دوستی
گاٹھ لیتی ہیں۔ یہ سوچتے ہی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی

مسکراہٹ آ گئی۔ ہر شخص اپنی ترقی کے لیے سہارے
ڈھونڈتا ہے۔ یہ سہارا تو خود بخود اس کے پاس چل کر آ گیا
تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اس موقع کا بھرپور فائدہ
اٹھائے گا۔ اس کے اور اعجاز صاحبہ کے بیڈروم الگ
الگ ہیں۔ اس کا مطلب ہے دونوں کے تعلقات کشیدہ
ہیں۔ اس کے باوجود وہ آفس آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا
ہے یہاں کے سیاہ سفید میں اس کا دخل ہے۔ ایسی عورتوں
کو ایک مخبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھی مجھ سے کچھ
اطلاعات چاہتی ہوگی۔ اس لیے مجھ سے بے تکلف ہو رہی
ہے۔ میں اپنی ترقی کے لیے اس کا پورا ساتھ دوں گا۔

اس کے ان خیالات کی شام سے پہلے پہلے تصدیق بھی
ہو گئی۔ دفتر ہی کے ایک صاحبہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

انہیں یہ جرات اس لیے ہو گئی تھی کہ اعجاز دفتر سے جا چکا تھا۔
”جمال صاحب! سنا ہے بیگم اعجاز آپ کے پاس آئی تھیں۔“

”آئی تو تھیں۔“

”کیا کہہ رہی تھیں۔“

”کچھ بھی نہیں۔ مجھے ڈانٹ ڈپٹ رہی تھیں کہ میں
وقت کی باندی کروں اور کام ٹھیک ٹھیک کروں۔ اعجاز

صاحبہ تو کسی کو کچھ کہتے ہی نہیں ہیں لیکن میں تمہاری نگرانی
کرتی رہوں گی۔“

”بھائی بڑی مرد مار عورت ہے۔ اس سے ڈرتے
رہنا۔ اس آفس میں اعجاز صاحبہ کی نہیں اس کی چلتی ہے،

اعجاز صاحبہ کو خوش رکھو نہ رکھو، اسے خوش رکھنا۔“
”یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ آفس اعجاز صاحبہ کا ہے۔

انہیں منع کرنا چاہیے کہ وہ دخل اندازی نہ کرے۔“
”صاحبہ! اڑے، ہم برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اعجاز

صاحبہ اس کے سامنے دم نہیں مار سکتے۔ شریف آدمی ہیں اپنی
عزت سے ڈرتے ہیں۔ جانتے بھی ہو وہ کسی کی بیٹی ہے۔“

”کس کی بیٹی ہے۔“
”مشہور اسمگلر کرم نواز کی بیٹی ہے۔ سنا ہے شہر کے

مشہور غنڈوں سے بھی اس کی دوستی ہے۔ جب ٹیڑھی اگھویں
سے کام لینا ہوتا ہے وہ انہیں کام میں لاتی ہے۔“

یہ اطلاعات فراہم کر کے وہ صاحبہ چلے گئے اور
جمال کے لیے سوچنے کو بہت سا مواد چھوڑ گئے۔ سوچتے

سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ابھی کچھ بھی کہنا قبل از وقت
ہوگا۔ پہلے میں اسے فون کر لوں اس کے بعد سوچوں گا کہ کیا

کرنا ہے۔
وہ گھر پہنچ کر رات ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا

”جمال تم پر سوٹ بہت چلتا ہے۔ کتنے سوٹ ہیں تمہارے پاس۔“

”صرف دو سوٹ ہیں جو خاص خاص مواقع پر پہن لیتا ہوں۔ اس سے خاص موقع کیا ہو سکتا تھا کہ میں آپ سے ملنے آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک پہن کر آیا گیا ہوں۔“

”تمہارے پاس سوٹ صرف دو ہیں، تیسری ملاقات میں کیا پہنوں گے۔“

وہ کیا جواب دیتا۔ ایک خفیف سی ہنسی کر چپ ہو گیا۔

”آپ مذاق اچھا کر لیتی ہیں۔“

”یہاں سے اٹھ کر ہم ابھی طارق روڈ چلیں گے۔ تم ہر ملاقات میں نیا سوٹ پہنوں گے۔“

”میری اتنی آمدنی کہاں ہے کہ ہر ملاقات میں نیا سوٹ پہنوں۔“

”جمال تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھتا اب میری ذمہ داری ہے اور تم سوٹ پہنویں تمہاری نہیں میری ضرورت ہے۔ سوٹ میں تمہیں دلوں کی۔“

”جی، بیگم صاحبہ میرا مطلب ہے راحیلہ۔“

”شاباش مجھے اسی نام سے پکارا کرو۔ کسی چاہنے والے کی زبان سے یہ نام سننے کو میرے کان ترس گئے ہیں۔ ہر شخص مجھے مسز اعجاز کہہ کر پکارتا ہے۔ تم مجھے راحیلہ کہو گے۔“

”جی راحیلہ۔“

”کیا بیوے کے چائے یا کافی؟“

”کافی۔“

کافی پینے کے بعد انہیں طارق روڈ جانا تھا۔ ہوٹل سے نکلے ہی وہ اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ وہ اپنی موٹر سائیکل پر طارق روڈ جائے گا اور راحیلہ اپنی گاڑی میں وہاں پہنچے گی۔

”تمہارے پاس کون سی گاڑی ہے جمال۔“

”میں تو بایک پر آیا ہوں۔“

”گاڑی کیوں نہیں لائے۔“

”میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔“

”اے..... گاڑی کے بغیر کراچی میں گھومتے ہو۔ خیر ایسا کرو۔ اپنی بایک سنبھال رہے دو۔ میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔ واپسی میں اپنی بایک اٹھا لیتا۔“

وہ اس کی گاڑی میں اس کے ساتھ طارق روڈ پہنچ گیا۔

”ابھی میں تمہیں چھ سوٹ دلاتی ہوں۔ اس کے بعد دیکھنا ہوگا کہ تم مجھ سے کتنی ملاقاتیں کرتے ہو۔“

رات میں دیر سے فون کرے یعنی اس وقت جب وہ سونے کے لیے بیڈ روم میں پہنچ چکی ہو۔ اسے ایسی ہی بے چینی تھی جیسے زلزلے آنے کے انتظار میں ہوتی ہے۔ جب آدھی رات گزر گئی تو اسے یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں وہ سو نہ گئی ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے نیم غنودہ آواز سنائی دی۔

”ہیلو۔“

”بیگم صاحبہ میں جمال بول رہا ہوں۔ اعجاز صاحب کا سیکرٹری۔“

”اس بے ہودہ انسان کا نام مت لو۔ تم اس کے نہیں میرے سیکرٹری کو صرف میرے بلکہ میرے جمال۔“

”بیگم صاحبہ لیکن تنخواہ تو وہی دیتے ہیں مجھے۔“

”میں تمہیں تنخواہ سے زیادہ دوں گی اور یہ بیگم صاحبہ کیا ہوتا ہے، تم اکیلے میں مجھے راحیلہ کہہ سکتے ہو۔ تم سے زیادہ بڑی نہیں ہوں۔“

”جی راحیلہ، اب بتائیے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

”تم خوب صورت ہو لیکن بے وقوف بھی ہو۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد بھی تم پوچھ رہے ہو، میں کیا کہنا چاہتی تھی۔ جمال کے بچے کل شام کو میرے لیے کچھ وقت نکالو۔“

”آپ کہاں ملیں گی۔“

راحیلہ نے اسے اس ہوٹل کا بتا دیا جہاں اسے آفس سے نکلنے ہی پہنچنا تھا۔ راحیلہ وہاں پہلے سے موجود ہوگی۔ اس کی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نیند میں نہیں نشے میں ہے۔ یہ بھی ایک روپ تھا جو جمال کے سامنے آیا تھا البتہ وہ یہ سوچ کر ڈر گیا تھا کہ اگر اس نے بھی اسے شراب پیش کی تو وہ انکار کیسے کرے گا۔

اس نے جس طرح بے تکلفی سے اس کا نام لیا تھا اس کے بعد یہ سمجھنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ بات صرف تجزی کی نہیں ہے بلکہ وہ اس پر عاشق ہوئی ہے۔ یہ زیادہ امید افزا صورت حال تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کی دولت لوٹ سکتا تھا۔

وہ دوسرے دن خوب تیار ہو کر دفتر پہنچا اور دفتر سے اٹھتے ہی اپنی موٹر سائیکل پر اس ہوٹل پہنچ گیا جہاں اسے راحیلہ سے ملنا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے سامنے رکھی اینٹ رُٹے میں سگریٹ کے دو دوائے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے انتظار میں دوسرے سگریٹ پھونک چکی ہے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ مہترہ اسموکنگ بھی کرتی ہیں۔

غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ناشتے کی میز پر آگئی۔
ناشتا کرنے کے بعد دوستوں کو فون کرنے میں مشغول ہوگئی۔
ایسا نہیں تھا کہ وہ صمدانی کو بھول گئی ہو۔ وہ جان بوجھ کر انہیں
انتظار کر رہی تھی تاکہ وہ اس کی طرف سے زیادہ توقعات نہ
باندھ لیں۔

وہ اچھی طرح ہر کام سے نمٹنے کے بعد ڈرائنگ روم
میں پہنچی تو صمدانی صاحب تقریباً اونگھ رہے تھے۔ اسے دیکھتے
ہی ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔

”کیسے ہیں صمدانی صاحب، کیسے آتا ہوا۔“
”آپ کو معلوم تو ہو گیا ہوگا کہ اعجاز صاحب نے مجھے
نوکری سے فارغ کر دیا ہے۔“

”ہاں معلوم تو ہوا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں جو
جی چاہیں کریں، میں کیا کر سکتی ہوں۔“

”بیگم صاحبہ، جتنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن بات
ٹکلی ہے تو کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کے کتنے کام آیا ہوں۔
ایک ایک ٹکڑی خبریں آپ کو پہنچاتا رہا ہوں بلکہ میری نوکری
اسی جرم میں گئی ہے۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ آپ اندھوں کی طرح
مجھے خبریں پہنچاتے رہیں۔ آپ کو ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا
چاہیے تھا۔ آپ کی بے احتیاطی نے مجھے ان کی نظروں میں
گرا دیا۔“

”بیگم صاحبہ، میرا کچھ خیال کریں۔ دو جوان لڑکیاں
شادی کے لیے بیٹھی ہیں، آپ اعجاز صاحب سے میری
سفارش کر دیں۔“

”آپ کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نیا آدمی رکھ لیا ہے۔“
”آفس میں کوئی اور کام ہی مجھے دے دیں۔“

”آپ بدنام ہو گئے ہیں، اب وہ آپ کو نہیں رکھیں
گے۔ آپ کوئی اور نوکری تلاش کر لیں۔“

”آپ نے مجھ سے کہا تھا آپ بڑے وقت میں میرا
ساتھ دیں گی۔ مجھے اکیلا نہیں چھوڑیں گی۔“

”میں نے کہا ضرور تھا لیکن اب حالات بدل گئے
ہیں۔ اعجاز سے اب میری بات چیت ہی نہیں ہے۔ میں اس
سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”آپ کے اتنے تعلقات ہیں، کسی اور جگہ میری
نوکری کا بندوبست کر دیں۔“

”اگر کوئی بندوبست ہو گیا تو میں آپ کو اطلاع
کردوں گی اور پلیز یہاں آنے کی دوبارہ کوشش مت کیجیے
گا۔ اعجاز کو معلوم ہو گیا تو غضب ہو جائے گا۔ مجھے ایک جگہ

سوٹ دلوانے کے بعد وہ اسے جوتوں کی دکان پر لے گئی۔
”ہر سوٹ کے بعد جوتا بھی نیا پہنوں گے۔“

شاہنگ ختم ہوئی تو پچھلی سیٹ پر سامان ہی سامان تھا۔
”تم اتنا سامان اپنی بائیک پر نہیں لے جا سکتے گے۔
میں ایسا کرتی ہوں تمہارے گھر چلتی ہوں۔ تم سامان گھر میں
پہنچا کر میرے ساتھ ہو جاؤ چلو گے اور وہاں سے اپنی بائیک
اٹھا لو گے۔“

”جی راجیلہ۔“

”آج تمہاری شاہنگ ہوئی کل مجھے اپنی شاہنگ کرنی
ہے۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔ کل تم بائیک پر سٹ آنا۔ میں
جہیں دفتر سے لے لوں گی۔“

”ایسا غضب مت کرنا۔ کسی کی بھی نظر پڑ سکتی ہے۔“
”تم آفس سے نکل کر چورنگی تک آ جانا۔ میری گاڑی
وہاں کھڑی ہوگی۔“

وہ اتنی شاہنگ کے بعد گھر میں داخل ہوا تو اس کی ماں
اور دونوں بھائیوں کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔
”بھائی، تمہیں تو ابھی تنخواہ بھی نہیں ملی۔ اتنی شاہنگ
کہاں سے کر لی۔“

”یاد قدرت جس کا ہاتھ بکڑ لے۔ میرے پاس مجھ پر
اتنے مہربان ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنے ساتھ لے جا کر
شاہنگ کرائی ہے۔ شاید چند مہینوں بعد گاڑی بھی دلا دیں۔
کہہ رہے تھے تم میرے سیکرٹیری ہو۔ ہر دوسرے تیسرے
دن نیا سوٹ پہن کر آیا کرو۔“

اس کی والدہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس کے پاس کو دعائیں
دینے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں ہنگے لگا کہ مہربانیاں کس کی
ہیں، دعائیں کس کے لیے رہی ہیں۔

وہ اگلے دن آفس پہنچا تو اس کی شان ہی دوسری تھی۔
سیکرٹیری کم آفس کا مالک زیادہ لگ رہا تھا۔ وہ کسی کام سے
اعجاز احمد کے کمرے میں گیا تو وہ بھی اس کی طرف تجسس
بھری نظروں سے دیکھتے بغیر نہ رہ سکے۔

☆☆☆

دن کا وقت تھا۔ راجیلہ ابھی سو کر اٹھی تھی۔ اعجاز آفس
جا چکا تھا۔ ملازم نے اسے انٹرکام پر اطلاع دی کہ کوئی صمدانی
صاحب آئے ہیں اور اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ ”اس بڈھے کو
بھی چین نہیں ہے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

”اسے بٹھاؤ اور خوب انتظار کرنے دو۔ چائے وغیرہ
پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“
وہ کچھ دیر اور بستر پر لیٹی رہی۔ پھر بے دلی سے اٹھی۔

راحیلہ کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ جمال کے ساتھ بیرونی سڑکوں میں مشغول ہوئی لیکن لائبہ کا کوئی انتظام کرنے کی فکر میں تھی کیونکہ اس کا وجود اب اسے گلے لگا تھا۔

☆☆☆

لائبہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ یونیورسٹی پہنچی تو ہر لڑکا اس کا عاشق نظر آنے لگا۔ اس کے حسن کے چرچے یونیورسٹی میں پھیلے ہوئے تھے۔ لڑکیاں اسے گھیرے ہوئی تھیں، لڑکے اس کے قریب آنے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے لیکن اس کا غور حسن یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ کسی کو قریب آنے کا موقع دے۔

بڑے گھرانوں کی لڑکیاں عام طور پر آزاد خیال ہوتی ہیں۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی تھی اس میں لڑکوں سے دوستی کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن الگ تھلگ رہنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ یونیورسٹی سے باہر بھی اس کی دوستیاں لڑکیوں تک محدود تھیں۔ کلب بھی جاتی تو چند لڑکیاں تھیں جن کے سامنے وہ خوب چہیتی۔ لڑکیوں کو تعجب ہوتا تھا کہ اب تک وہ کسی کے دام محبت میں گرفتار کیوں نہیں ہوئی۔ اس کی ماں راحیلہ کو اہلیت یقین تھا کہ یونیورسٹی میں اس کی کسی نہ کسی لڑکے سے دوستی ضرور ہوئی ہوگی لیکن اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جسے کام میں لا کر وہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتی یا کسی کو اس کی نگرانی پر مامور کرتی۔ دراصل وہ چاہتی تھی کہ لائبہ کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آجائے تاکہ اگر کسی وقت وہ اسے جمال کا طعنہ دے تو وہ اس کا منہ بند کر سکے۔ دونوں کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہو جائے۔ وہ جمال کے ساتھ مل کر رہے اور لائبہ اس لڑکے کے ساتھ۔

وہ اس کی کمزوری ہاتھ میں لینے کے لیے بے چین تھی۔ پہلے اس کا دھیان جمال کی طرف گیا کہ وہ اسے لائبہ کی نگرانی کے لیے مقرر کرے لیکن فوراً ہی اس خیال کی تردید بھی کر دی۔ لائبہ چونکہ جمال کو جانتی تھی اس لیے وہ نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صبح کے وقت آفس میں ہوتا تھا۔ اسے تو کسی ایسے لڑکے کی تلاش تھی جو پابندی سے یونیورسٹی جائے اور عرابی ہو کہ طالب علم لگے۔ یہ انتظام اس نے جلد کر بھی لیا۔

یونیورسٹی میں مشاعرہ تھا۔ کئی دن سے وہ اس کے چرچے سن رہی تھی۔ خود بھی تھوڑی بہت شاعری کرتی تھی لیکن شاعری پڑھنے اور سننے کا وہ جنون کی حد تک شوق تھا۔ یہ مشاعرہ رات کے بجائے دن کے وقت ہو رہا تھا اس لیے لائبہ اس میں آسانی سے شرکت کر سکتی تھی۔

جانے کے لیے تیار ہونا ہے لہذا اب آپ جائیں۔“ اس نے صدا کی گئی اسٹے کا انتظار بھی نہیں کیا اور کمرے سے نکل گئی۔

اگر جمال سے اس کی ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو ممکن ہے وہ صدا کی مدد کرتی۔ اعجاز سے کہہ کر اسے دوبارہ ملازمت پر رکھوائی یا کوئی اور بندوبست کرتی مگر اب تو وہ اس کے لیے ناکارہ تھے۔

☆☆☆

جمال سے اس کے تعلقات روز بہ روز بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ اس پر بے دریغ مبنی لٹا رہی تھی۔ اسے نئی گاڑی بھی خرید کر دے دی تھی۔ جمال آفس سے اٹھنے کے بعد کہیں نہ کہیں اس سے مل جاتا تھا اور پھر وہ رات گئے گھر لوٹتی تھی۔ گھر میں لائبہ موجود تھی لیکن اسے اس کی بھی پروا نہیں تھی، کبھی کبھی جمال کو گھر بھی لے آتی تھی۔ لائبہ کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی ماں اس شخص میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ یہ رشتہ ہرگز ایسا نہیں ہے جو مالک اور نوکر کے درمیان ہوتا ہے۔

یہ شک اس وقت حقیقت میں بدل گیا جب اعجاز احمد بزنس ٹور پر ایک ہفتے کے لیے ملک سے باہر گیا۔ لائبہ کو شک ہوا کہ اس کے کمرے میں جانے کے بعد راحیلہ کے بیڈروم میں کوئی آیا تھا۔ اس نے دوسری رات چھپ کر دیکھا تو یہ جمال تھا جو اس کے بیڈروم میں آیا تھا۔ وہ بیٹی ہی تو تھی، اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ ماں کو رنگے ہاتھوں پکڑتی لیکن ماں کی طرف سے اس کے رویے میں ایسی تبدیلی آئی تھی جسے راحیلہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اس نتیجے پر پہنچنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ لائبہ کے کانوں میں اس کے اور جمال کے تعلقات کی جھینک پڑ گئی ہے۔ اسے یہ ڈر ضرور ہوا تھا کہ وہ اپنے باپ کو باخبر نہ کر دے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔

اعجاز احمد کے آنے تک یہ کھیل جاری رہا لیکن جب وہ آگیا تو راحیلہ نے جمال کو رات کے وقت بلانا چھوڑ دیا۔ اب اگر اعجاز نے پوچھا بھی تو وہ صاف انکار کر دے گی۔ اب وہ دونوں پہلے کی طرح باہر ملتے تھے۔ لائبہ نے جو کچھ دیکھ لیا تھا اس کے بعد اس کا رویہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا ماں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چنگار یاں برسائے لگتی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ باپ کو اعتماد میں لے لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اعجاز احمد بیوی کو تو کچھ کہہ نہیں سکے گا اپنا ہی کوئی نقصان کر بیٹھ گا۔

جب اعجاز کی طرف سے کوئی بات سامنے نہ آئی تو

”مشاعرے کے بعد تو آپ سے بات کرنے کا موقع ملے گا نہیں۔ سو چار ساری انرجی ابھی خرچ کر دوں۔“
 ”اجھا اب آپ مشاعرہ سننے دیں گے؟“
 ”ان شعرا کا کیا سننا۔ ایک شاعر ابھی آنے والا ہے۔ اسے گئے گا دھیان سے۔“
 ”کیوں اس میں کیا خاص بات ہوگی۔“
 ”وہ آپ کے بہت قریب ہوگا۔“
 ”میرے قریب؟“

”جی ہاں، آپ کو افسوس ہوگا کہ میں اب تک اسے پہچانی کیوں نہیں تھی۔“
 وہ سمجھ گئی کہ اور کچھ نہیں وہ اسے باتوں میں الجھا رہا ہے تاکہ میں اس سے ہوتی رہوں۔ اس نے اب کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک طرف دیکھنے لگی۔ ذرا فاصلے پر ایک لڑکا کھڑا تھا جو مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ لائبہ نے اس کی طرف سے گردن گھمائی۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر اس طرف دیکھا۔ لڑکا اب بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یونیورسٹی میں ایسے سیکڑوں آوارہ لڑکے ہیں، اس نے سوچا، یہ بھی انہی میں سے ایک ہوگا۔ جانتا ہے کہ میں یہاں سے اٹھ کر نہیں جاسکتی۔ اس لیے اس طرف دیکھ جا رہا ہے۔ اس نے اس کی شکل اچھی طرح ذہن نشین کر لی تاکہ پھر بھی نظر آئے تو وہ اسے اچھی طرح دیکھ لے۔

وہ شاید اس آٹھ بجوئی سے مزید لطف اندوز ہوتی کہ اسے ہونے والی انٹرنیٹ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

”اب ہم ایک ایسے شاعر کو دعوت کلام دیتے ہیں جو اس یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن پورے ملک میں پہچانا جاتا ہے۔ اس کے باکمال اشعار اردو شاعری میں ایک خاص مقام حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ اس باکمال شاعر کا نام نامی ہے دانش کمال۔“

اسے محسوس ہوا کہ اس کے برابر بیٹھا لڑکا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا ہے۔ وہ سمجھی کہ کام سے جا رہا ہوگا لیکن وہ ان کی طرح بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ اسے پہچان گیا۔ یہ ہے دانش کمال! دانش کمال اس کا پسندیدہ شاعر تھا۔ اس کے پاس اس کا مجموعہ کلام بھی تھا۔ کئی شعر زبانی یاد تھے۔ یہ دانش کمال ہے۔ اف میرے خدا! میں اتنی دیر اس عظیم شاعر کے پاس بیٹھی رہی اور میں اسے جانتی ہی نہیں تھی۔

اس نے غزل پڑھنے سے پہلے لائبہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو اجازت ہے۔ لائبہ کی ایک

وہ بے چینی سے مشاعرے والے دن کا انتظار کر رہی تھی لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ جس دن مشاعرہ تھا اسی دن اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ مشاعرے کا وقت دس بجے تھا اور وہ ساڑھے نو بجے سو کر اٹھی۔ آدھے گھنٹے میں اسے تیار بھی ہونا تھا اور یونیورسٹی تک پہنچنا بھی تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوئی اور ناشتا کیے بغیر ہی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے رستہ واضح میں نام دیکھا۔ سو اداں ہو رہے تھے۔ وہ کم سے کم ساڑھے دس بجے یونیورسٹی پہنچ سکتی تھی۔

گاڑی پارک کرتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ مشاعرہ شروع ہو چکا ہے۔ وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی مشاعرہ گاہ میں پہنچی تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ تمام کرسیاں بھر چکی ہیں۔ اسی وقت ایک آواز اس کے کانوں میں آئی۔ کوئی اس کا نام لے رہا تھا۔

”لائبہ۔“
 اس نے پلٹ کر دیکھا۔
 ”لائبہ، کوئی نشست خالی نہیں ہے۔ آئیے میرے ساتھ آئیے۔ میں آپ کو ان نشستوں پر بٹھا دوں جو شعر اے کے لیے مخصوص ہیں۔“ اس وقت انکار کرنے یا سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی شعرا کی نشستوں کے قریب پہنچ گئی۔ اس کی خوشی کا اس وقت شکنا نہیں تھا جب وہ اپنے پسندیدہ شعر اے کو اسے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے بہت سوں کی اس نے صرف تصویریں دیکھی تھیں۔ یہاں دو کرسیاں خالی تھیں اور اتفاق سے برابر برابر کی تھیں۔ ایک پر وہ بیٹھ گئی دوسرے پر وہ لڑکا۔

”معاف کیجیے گا کوئی اور کرسی خالی نہیں اس لیے مجھے یہاں بیٹھنا پڑ رہا ہے۔“ اس لڑکے نے نہایت مہذب انداز میں کہا۔ اس لڑکے کا لہجہ نہایت مہذب تھا لیکن اس کے باوجود وہ دل ہی دل میں ہنس پڑی۔ ”ہے کتنا ہوشیار، اس نے پہلے ہی دیکھ لیا ہوگا کہ یہ دو کرسیاں خالی ہیں۔ میرے قریب بیٹھنے کے لیے مجھے یہاں لے آیا۔“
 ”آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔“ لائبہ نے اپنا تجسس ختم کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

”میں اس یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے مجھے آپ کا نام معلوم نہ ہو۔“ لائبہ نے دوسری ہے تو کیا ہوا۔ ہوں تو یہیں کا طالب علم۔ میرا ایک دوست آئرس ڈیپارٹمنٹ میں ہے اس لیے میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔“
 ”آپ کچھ زیادہ باتونی نہیں ہیں؟ میں نے ایک بات پوچھی تھی آپ نے تقریر کر ڈالی۔“

مسکراہٹ نے اسے اجازت دے دی۔

جھانکتے ہوئے کہا۔

”کوشش کی کارہی جائے گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ یہ تو وہ بازی ہے کہ ہمارے بھی جیت لی جاتی ہے۔“

مشاعرے کے اختتام کا اعلان ہو رہا تھا۔ انہیں بھی اٹھنا پڑا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے کار پارکنگ تک آگئے۔

”آپ چاہیں تو میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کر سکتی ہوں۔ میرے پاس گاڑی ہے۔“

”میں اپنی عادت خراب کرنا نہیں چاہتا لیکن اس لالچ میں بیٹھ جاتا ہوں کہ کچھ دیر آپ سے بائیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

”آپ ہر چیز میں اپنا فائدہ ہی کیوں دیکھتے ہیں؟“

”یہ میرا نہیں میرے اندر چھپے ہوئے شاعر کا فائدہ ہے۔ بہت دن سے کوئی اچھی غزل نہیں ہوئی ہے۔ رات میں کوئی اچھی غزل کہہ لوں گا۔“

”اچھا ابھی تو بیٹھے شاعر صاحب۔“

اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر برابر والا دروازہ کھول دیا۔ وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”اب بتائیے آپ کا شیش ٹکس کہاں واقع ہے۔ تاکہ میں گاڑی اسی طرف لے چلوں۔“

دانش کمال نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ لائبہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”بائیک پر دوڑو کہ ہیں جو ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ ڈرائیونگ میں دیکھو۔“

”بھئی سوچ رہے ہوں گے یہ لڑکی اتنے مشہور آدمی کے ساتھ کیوں ہے۔ جل گئے ہوں گے یہ چارے۔“

”کمال، سنجیدہ ہو جاؤ، ان لڑکوں کی نیت اچھی نہیں لگتی۔ میں گاڑی آہستہ کرتی ہوں تو وہ بھی سلو ہو جاتے ہیں۔ میں تیز چلائی ہوں تو وہ بھی اسپید کپڑ لیتے ہیں۔“

”یونیورسٹی کے لڑکے ہوں گے۔ مجھے جانتے ہوں گے تمہارا نہیں میرا پیچھا کر رہے ہوں گے۔“

”ان میں سے جو بائیک چلا رہا ہے اسے میں نے مشاعرے میں بھی دیکھا تھا۔ بڑی بے ہودگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شکل سے اسٹوڈنٹ بالکل نہیں لگتا۔“

”کسی جگہ گاڑی روک لو۔ انہیں قریب آنے دو۔ پھر میں ان سے پوچھوں گا کہ تعاقب کیوں کر رہے ہو۔“

”نہیں کمال، ان سے کچھ بعید نہیں۔“

دونوں بائیک والے گاڑی کے بالکل قریب آ گئے

ایک شعر موتیوں میں تولنے کے لائق تھا۔ طلبہ و طالبات تالیوں کی گونج میں ان موتیوں کو بورے تھے۔ اتنی داد کسی شاعر کے حصے میں نہیں آئی تھی جتنی وہ وصول کر رہا تھا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہوم گراؤنڈ پر کھیل رہا تھا۔ اس نے مسلسل تین غزلیں پڑھیں۔ اس کے بعد بھی اصرار جاری تھا لیکن وہ یہ کہہ کر اسے پیچھے اتر آیا کہ ابھی بہت سے شعر باقی ہیں آپ انہیں ملاحظہ فرمائیں۔

وہ جب اسے اتر کر اس کی طرف آنے لگا تو اسے خود پر غرور ہونے لگا۔ اتنا بڑا شاعر میرے قریب آ کر بیٹھے گا۔ اسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ وہ اسے پہچانی ہی نہیں

حالانکہ اس کے مجموعہ کلام پر اس کی تصویر دیکھ چکی تھی۔

”اچھا تو دانش کمال آپ ہیں۔“

”جی ہاں یہ بندہ ہی ہے۔ مجھے آج احساس ہوا کہ میں کتنا گنہگار ہوں۔ میری پڑون بھی مجھے نہیں جانتی۔“

”اب آپ شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ کو پہچانی نہیں یہ الگ بات ہے ورنہ آپ کے بہت سے اشعار مجھے زبانی یاد ہیں، کہیں تو سناؤں۔“

”اگر اشعار بھی آج سن لیے تو اگلی ملاقات میں کیا کریں گے۔“

وہ اس کی ہوشیاری کی ایک مرتبہ پھر قائل ہو گئی۔ کس خوب صورتی سے اس نے اگلی ملاقات چنی کر لی۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ خود بھی اس سے متاثر ہوئی تھی۔ اس لیے ہنس کر چپ ہوئی۔

باتیں کرتے کرتے اس کی نظر پھر ایک طرف اٹھی۔ دو آنکھیں پھر اسے گھور رہی تھیں۔ وہ لڑکا اب بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا مصیبت ہے، کون ہے یہ۔ آج سے پہلے میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ یونیورسٹی میں اتنے لڑکے ہیں میں کس کس کو نظر میں رکھوں گی۔

”ارے باتوں باتوں میں ہم نے کسی کو سنا ہی نہیں۔ صدر مشاعرہ کلام پڑھ رہے ہیں۔ مشاعرہ ختم ہونے والا ہے۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ ایک شاعر آنے والا ہے اسے سنئے گا دھیان سے۔ اسے آپ نے دھیان سے سن لیا۔ کافی ہے۔“

”سچ کہا ہے کسی نے، شاعروں سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ ان سے جیتنا آسان نہیں۔“

”حسین کو جیتنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔“

”کبھی کوشش کی ہے؟“

”کرتو رہا ہوں۔“ اس نے لائبہ کی آنکھوں میں

کرنا تھا کہ میں کس کے ساتھ جاری ہوں اور کہاں جاری ہوں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ دانش راستے میں اتر گیا۔ اگر وہ لوگ اس کا گھر دیکھ لیتے تو اس کی مصیبت آ جاتی۔ کسی وقت وہ لوگ اس کے گھر پہنچ سکتے تھے۔ میری خاطر وہ کیوں کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ یہ میں خود سے زیادہ اس کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں؟ وہ خود سے شرمائی۔ ایک ہی ملاقات میں کسی کے میں اتنے قریب جاسکتی ہوں، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس میں میرا قصور نہیں، وہ ہے ہی ایسا کہ اسے چاہا جائے۔ دوسرے لڑکوں سے کتنا مختلف ہے۔ شاعر ہے اس لیے گفتگو کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے، کس خوب صورتی سے اس نے کل کی ملاقات طے کر لی، اس نے ایک بھر پور انگڑائی لی۔ انٹرکام پر ملازم سے کافی لانے کو کہا اور خود غسل کرنے چلی گئی۔ وہ واٹس رووم سے نکلی تھی کہ ملازم کافی لے کر آ گیا۔

”بیگم صاحبہ گھر پر ہیں؟“ لائبہ نے ملازم سے پوچھا۔
 ”وہ تو جی جی نہیں چلی گئی تھیں۔“
 ”کچھ معلوم ہے کہاں گئی ہیں۔“
 ”کچھ کہہ کر تو نہیں گئیں۔ جمال صاحب آئے تھے ان کے ساتھ گئی ہیں۔“

جمال کا نام سنتے ہی لائبہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ”تم جاؤ۔“

کافی کے چند گھنٹہ حلق سے اتارنے کے بعد وہ گزرے ہوئے واقعات پر پھر غور کرنے لگی۔ ان لڑکوں کو کس نے بھیجا ہوگا۔ اس کا دھیان راحیلہ کی طرف گیا۔ میں ان کی رنگ رلیوں میں حائل ہو رہی ہوں۔ وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتی ہیں یا پھر مجھے خوف زدہ کر کے ہٹانا چاہتی ہیں کہ میں خاموش رہوں لیکن اب میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ ڈیڑی کو بتانا ہی پڑے گا کہ ان کے گھر میں کیا ہیل کھلا جا رہا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب میری ہی نہیں دانش کی جان کو بھی خطرہ ہے، اسے میرے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

☆☆☆

راحیلہ سیٹھ بدرالدین کے سامنے بیٹھی تھی۔ جمال ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا کیونکہ وہ زیادہ دیر آفس سے غائب نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ دن میں نہیں چلتی تھی بلکہ رات میں بھی کبھی کبھی ہی چلتی تھی لیکن اس وقت سیٹھ بدرالدین کے اصرار پر اس نے بھی اپنے لیے گلاس بنالیا تھا۔

”تم بہت آہستہ چل رہی ہو۔ اعجاز احمد بڑی تیزی سے اپنی دولت باہر منتقل کر رہا ہے اور تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے

تھے اور گاڑی کے ساتھ چل رہے تھے۔ لائبہ نے گاڑی صرف اس لیے آہستہ کر لی تھی کہ ان لڑکوں کو قریب سے دیکھ سکے۔ وہ بھی شاید اس لیے قریب آئے تھے۔ لائبہ نے گاڑی کو فوڑتھ میں ڈالا اور ان سے دور نکل گئی۔ اب ان لڑکوں کا کہیں پتا نہیں تھا لیکن لائبہ بری طرح نزوس ہو گئی تھی۔

”تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو۔ بعض لڑکے چھیڑ خانی کے لیے ایسی حرکت کرتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی واردات کرنی ہوئی تو اب تک کر چکے ہوتے۔“

”یہ مجھے عام لڑکے معلوم نہیں ہوتے۔ میرا اندازہ کچھ اور کہہ رہا ہے لیکن ابھی میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔“

”بہن! تم بڑے لوگوں کے دس مسائل ہوتے ہیں۔ مجھے تو اس میں کوئی انہونی بات معلوم نہیں ہوتی۔“

”آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے۔ میں کس طرف چلوں۔“

”میں ابھی گھر نہیں جاؤں گا۔ آپ مجھے کہیں بھی اتار سکتی ہیں۔“

”پھر بھی کوئی جگہ تو ہوگی۔ میں کہاں روکوں گاڑی۔“
 ”بس یہیں روک دیجیے۔“

لائبہ نے گاڑی روک دی۔
 ”میں ایک شرط پر اتروں گا وعدہ کیجیے کل آپ مجھ سے ملیں گی۔“

”کہاں ملیں گے۔“
 ”آپ کینے فیملیا میں مل جائیے گا۔ پھر ہم وہاں سے کہیں اور چلیں گے۔“

”یونیورسٹی تک ٹھیک ہے ہمیں کہیں اور نہیں جانا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے ہماری نگرانی کی جارہی ہے۔“

”یار، یونیورسٹی میں مجھے سب جانتے ہیں۔ خواجواہ باتیں نہیں کی۔ رہی نگرانی تو نگرانی کرنے والے وہاں بھی آسکتے ہیں۔“

”آپ سستے ہیں مگر وہاں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“
 ”اچھا تم ملو تو پھر دیکھا جائے گا۔“

دانش گاڑی سے اتر گیا۔ لائبہ اب زیادہ خوف محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اچھی طرح اندازہ کر لیا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد اس نے ایلیس لریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔

وہ گھر پہنچی تو اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ گزرے ہوئے واقعے پر غور کر رہی تھی۔ یہ اتفاقی حادثہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی کے پیچھے ہوئے آدمی تھے جنہیں صرف یہ معلوم

بیٹھی ہو۔“

میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا چاہتی تھی۔ اسی لیے دوبارہ ملاقات پر تیار ہو گئی تھی اور اب اس کا انتظار کر رہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔ باہر نکلے ہی اس کی نظر اس لڑکے پر پڑ گئی۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ وہ لڑکا اسے دیکھتے ہی ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ اسی وقت اسے دانش آتا دکھائی دیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں اس لڑکے کو موقع مل گیا۔ وہ کہیں غائب ہو گیا۔ لائبر نے دانش کو کچھ بتایا لیکن خود سوچ میں پڑ گئی۔ میری نگرانی کی جارہی ہے، آج وہ لڑکا سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے کام لینے والے نے یہ حسبِ نگرانی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب وہ خوف زدہ نہیں تھی کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔

”دانش ہم یہاں نہیں بیٹھیں گے۔“

”کیوں اندر سنا پھل آیا ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر تماشا بنانا نہیں چاہتی۔ یہ چابی لو اور میری گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ بعد میں آئی ہوں۔“

”یا الہی ما جرا کیا ہے۔ کل سے اب تک مجھے تو یہی لگ رہا ہے کہ میں جاسوسی فلم دیکھ رہا ہوں۔“

”جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر بتاؤں گی کہ بات کیا ہے۔“

دانش نے چابی لی اور پارکنگ کی طرف چل دیا جبکہ اس نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔ جو آنکھ ابھی اسے دیکھ رہی تھی اسے دکھانے کے لیے وہ پارکنگ کی مخالف سمت چل دی پھر اپنے ڈیپارٹمنٹ کا چکر کاٹتی ہوئی پارکنگ میں آ گئی۔

گاڑی نکالی اور جوبلی گیٹ سے ہوتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔

”آپ اتنی گھبراہٹ کیوں ہیں۔“

”اس لیے کہ وہ لڑکا مجھے پھر نظر آیا تھا۔“

”کون لڑکا۔ میرے علاوہ بھی کوئی لڑکا ہے اس یونیورسٹی میں؟“

”وہی لڑکا جو کل ایک اور لڑکے کے ہمراہ میرا چچا کر رہا تھا۔“

”اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ میں نے تم سے کل ہی کہا تھا کہ وہ یونیورسٹی ہی کا کوئی لڑکا ہوگا۔“

”ہاں شاید ایسا ہی ہو۔“ لائبر نے کہا۔

لائبر نے اس لڑکے کا ذکر ختم کر دینا ہی ضروری سمجھا۔

”میں آہستہ ہی تو نہیں چلی۔ یہی تو غلطی ہوئی۔ میں اتنی تیز چل کر اپنا اعما دکھو بیٹھی۔ وہ کیا کر رہا ہے، کیا سوچ رہا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے ایک گھر میں رہتے ہوئے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ وہ باتوں باتوں میں کچھ بتا جاتا تھا۔ اب میں اس سے بھی گئی۔“

”یہ جمال کس مرض کی دوا ہے۔“

”مجھے لگتا ہے لائبر نے باپ کے کان بھر دیے ہیں۔“

میری اور جمال کی دوستی کو غلط رنگ میں پیش کر کے اعجاز کو ہوشیار کر دیا ہے اب وہ جمال کو بھی کچھ نہیں بتاتا۔“

”پھر تو تمہیں اعجاز سے زیادہ لائبر پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں تو کہتا ہوں اسے راستے سے ہٹاؤ۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اعجاز کو اپنی عزت بہت عزیز ہے۔ میں اس کی عزت خاک میں ملاؤں گی۔“

”کیا انخوا کا پروگرام ہے؟“

”اگر اس کی ضرورت ہوگی تو یہ بھی کر گزروں گی۔“

ابھی تو کچھ اور سوچا ہے۔“

”کچھ بھی سوچو، میں اعجاز کو تلاش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اس سے ایک پرانا حساب چکنا ہے۔ میں تمہاری ہر طرح کی مدد کے لیے تیار ہوں۔“

”میں اس مدد ہی کا تو شکر یہ ادا کرنے آئی ہوں۔“

آپ نے جو دو لڑکے مجھے دیے تھے انہوں نے مجھے فون کر کے نہایت اہم معلومات دی ہیں۔ لائبر کو انہوں نے کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے۔ بس مجھے یہ اطمینان کرنا ہے کہ وہ لڑکا محض اس لیے اس کی گاڑی میں بیٹھا تھا کہ اس کے ساتھ پڑھتا ہے یا وہ دونوں دوستی کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔

بات ذرا صاف ہو جانے تو پھر دیکھو میں کیا کرتی ہوں۔

ان لڑکوں نے بس ایک غلطی کی ہے کہ لائبر کو اپنا چہرہ دکھا دیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آئندہ نگرانی کریں لیکن سامنے نہ آئیں۔“

☆☆☆

لائبر کو یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھنا پسند نہیں تھا۔

اس کے کہنے کے مطابق یہ کہنے اس کے معیار کا نہیں۔ یہ کیفے

ہی کیا، اسے تو یونیورسٹی میں کوئی بھی معیار کا نہیں لگتا تھا۔ ایک

دانش ہی تھا جو اس کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ اسے اندازہ

ہو گیا تھا کہ وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے

باوجود وہ اسے اچھا لگتا تھا۔

وہ اس کی خاطر اپنی ناپسندیدگی کے باوجود کیفے ٹیریا

اس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ دانش ڈر جائے اور اس سے ملنا ہی چھوڑ دے۔

”بائی دی وے یہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟“

”اگر کہیں نہ جائیں گاڑی میں ہی گھومتے رہیں تو کیا ہے۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن اگر آپ کے گمراہ محافظ آگے نہ تو کیا ہوگا۔“

”کوئی نہیں آتا۔ خواہ مخواہ کا میرا وہم تھا۔ کسی کو آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔“

”یہ ہونی باتا۔ تو پھر چلو کہیں چل کر بیٹھے ہیں۔“

”چلیے میں آپ کو اپنے من پسند ریٹورنٹ میں چائیز کھلاتی ہوں۔“

اس نے گاڑی وینفیس کی طرف موڑ دی۔

☆☆☆

دانش کوئی عام لڑکا نہیں تھا۔ اس کی شاعری کی بدولت یونیورسٹی میں اسے بھی جانتے تھے۔ دو چار بار اسے لائبہ کے ساتھ دیکھا گیا تو ہر طرف چرچے ہو گئے۔ اب لائبہ اور دانش دونوں فاضل ایئر میں آگئے تھے۔ تقریباً ایک سال کے تعلقات نے دونوں کو اتنا قریب کر دیا تھا کہ دونوں شادی کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ دو دفعہ آنکھیں برابر ان کی نگہرائی کر رہی تھیں۔

راحیلہ کی نئی حکمت عملی نے انہیں یہ فرصت دے دی تھی کہ وہ آرام سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے جائیں۔ پہلے اس نے یہ سوچا تھا کہ لائبہ کو راستے سے ہٹا دے۔ اعجاز کے لیے یہ صدمہ اتنا بھیاں تک ہوگا کہ شاید وہ اپنے ہوش ہی کو بیٹھ لیکن پھر اس نے سوچا تھا کہ جلد باز یوں نے پہلے بھی اسے نقصان پہنچایا ہے۔ اسے موقع دیکھ کر وار کرنا چاہیے۔ دراصل سوتیلی ماں ہونے کی وجہ سے اس کی پوزیشن بھی کمزور تھی۔ اعجاز نے اگر الزام اس پر رکھ دیا تو دنیا کو یقین آجائے گا۔ جو رپورٹیں اسے مل رہی تھیں وہ بھی حوصلہ افزا تھیں۔

ان رپورٹوں کی روشنی میں اس نے نئی حکمت عملی یہ مرتب کی کہ باپ بیٹی کے درمیان جنگ کرا دی جائے۔ اس لڑکے کے حوالے سے اعجاز احمد کو اتنا بھڑکا دیا جائے کہ وہ لائبہ کی صورت دیکھنے کا روادار نہ رہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ لائبہ کے دل میں جگہ پیدا کرے۔ ان مٹی جذبات کو ٹھنڈا کرے جو اس کے منہ کی روپیوں کی وجہ سے لائبہ کے دل میں بھڑک اٹھے ہیں۔ وہ لائبہ کو یقین دلائے کہ وہ سوتیلی ضرور ہے لیکن اس کی دشمن نہیں۔ وہ اس کا بھلا چاہتی ہے۔

راحیلہ کے بھیجے ہوئے لڑکوں نے ابھی ابھی اسے اطلاع دی تھی کہ لائبہ اپنے بوائے فرینڈ کو اعجاز احمد سے ملوانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔

راحیلہ کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اگر کسی وجہ سے اعجاز احمد اس لڑکے سے متاثر ہو گیا اور شادی پر رضامند ہو گیا تو میری ساری پلاننگ فیل ہو جائے گی۔ اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو مجھ پر یہ الزام آئے گا کہ میں سوتیلی ہوں اس لیے لائبہ کی نگہرائی نہ کر سکی۔ اس سے پہلے کہ یہ سب ہو میں اعجاز کے سامنے اس انداز سے باتیں پہنچاؤں کہ وہ بھڑک جائے۔ میں اچھی بھی بنی رہوں اور اپنا مطلب بھی نکال لوں۔

لائبہ ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا راحیلہ اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ بہت دن بعد ایسا ہوا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں آئی تھی اور وہ بھی اس قدر خوشگوار موزوں جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ لائبہ حیران ضرور ہوئی تھی۔ اس کا آنا نا گوار بھی لگا تھا لیکن نکال بھی نہیں سکتی تھی۔

”لائبہ بڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“

”آج آپ کو میرا خیال کیسے آگیا؟“

”تمہارا خیال مجھے کب نہیں آتا۔ میں تو ہر وقت

تمہارے ہی بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔“

”اسی لیے میری نگہرائی پر لوگ مامور کیے ہوئے ہیں۔“

”تو تمہیں معلوم ہو گیا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ بات یہ ہے لائبہ کہ ماؤں کو بیٹیوں کی فکر ہوتی ہے۔ میں کسی دشمنی میں نہیں تمہارا بھی بھلائی کے لیے نگہرائی کر رہی تھی۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے اس لیے ہر وقت ایک آدمی تمہارے ساتھ رہتی ہوں۔“

”یہ میری پرائیویسی میں دخل دینے کے مترادف نہیں ہے؟“

”ماں بیٹی کے درمیان کیسی پرائیویسی میری بیٹی۔ یہ بتاؤ ان لوگوں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا؟ تمہارے ڈیڈی تک کوئی بات پہنچی؟“

”کوئی بات ہے ہی نہیں تو پہنچتی کیا۔“

”بیٹی یہ میری غلطی ہو سکتی ہے لیکن میری نیت میں فتور نہیں تھا۔ تم اپنا دل میری طرف سے صاف کرلو۔“ یہ کہتے ہوئے راحیلہ کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

”ممی، میں آپ کو معاف کرتی ہوں لیکن آپ کو ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔“

گے۔ خیر تم فکر مت کرو میں کچھ کرتی ہوں۔“

اس نے لائبر کا دل جیت لیا۔ اب اسے اعجاز سے بات کر کے اس کے دل میں لائبر کی طرف سے گرہ ڈالنی تھی۔ اس نے اپنی اسکیم کے بارے میں جمال سے بھی مشورہ کیا۔ کبھی اس کی بھی تو ضرورت پڑ سکتی تھی۔ جمال نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔

”کوشش ہے کہ رانا کی شادی ہونے نہ پائے۔ لائبر اپنی ضد پراڑی رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لائبر اس لڑکے سے کورٹ میرج کر لے یا اعجاز صاحب اس لڑکے کو مرادیں۔ دونوں حالتوں میں لائبر ان سے باغی ہو جائے گی۔ یہی آپ کے لیے فائدہ مند ہوگا۔“

راجیلہ کی اعجاز سے بات چیت بالکل بند ہو چکی تھی لیکن اس وقت اس کے لیے اپنی قسم توڑنا ضروری تھا۔

”میں آپ کے پاس بھی نہ آتی لیکن جب گھر میں آگ لگی ہو تو مدد کے لیے دشمن کو بھی پکار لیا جاتا ہے اور یہ آگ تو آپ کے گھر میں لگی ہوئی ہے، میں تو صرف آپ کو اطلاع دینے آئی ہوں کہ مناسب تمہیں تو اسے بجھالیں۔“

”اب کوئی نئی چال سوچیں؟“

”آپ اسے میری چال ہی سمجھ لیں لیکن میں آپ کو یہ اطلاع دینے آئی ہوں کہ بہت جلد آپ کی بیٹی آپ کا نام اچھالنے والی ہے۔“

”خبردار جو لائبر کے نام پہ کچھ اچھالنے کی کوشش کی۔“

انسان کی شکل اچھی نہ ہو تو بات ہی اچھی کر لیا کرے۔“

”آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اسے آپ کے علم میں لے آئی۔ لڑکا کسی امیر گھرانے کا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ وہ جس کی محبت کا دم بھر رہی ہے وہ غریب لڑکا ہے۔ آپ نے اگر مجھ سے شادی کی کبھی تو میں ایک امیر باپ کی بیٹی تھی۔ میری آپ نے قدر نہیں کی۔ اب وہ آپ کی عزت اچھالے گی۔“

”تم طنز کر رہی ہو یا ماں کا کردار ادا کر رہی ہو۔“

”آپ کو خطرے کا احساس دل رہی ہوں۔“

”تمہیں یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے شادی کرنی ہوگی تو مجھ سے بات کر لے گی۔“

راجیلہ کو اس کے جذبات کو بھڑکانا تھا۔ وہ اس میں کامیاب رہی تھی۔ اب اسے پیتر ابلانا تھا۔

”اعجاز اچھ، جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ لڑکا نہ صرف غریب ہے بلکہ سنا ہے شاعر بھی ہے۔“

”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اچھا یہ بتاؤ وہ لڑکا کون ہے۔“

”کون سا لڑکا مہی۔“

”جس کے ساتھ آج کل تم دیکھی جا رہی ہو۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ اپنی ماں کو نہیں بتاؤ گی تو کسے بتاؤ گی۔ ایسی باتیں باپ کو نہیں ماں کو بتائی جاتی ہیں۔ اگر تمہاری سگی ماں ہوتی تو اسے ضرور بتاتیں۔ میں سوچتی ہوں اس لیے مجھے بتانا مناسب نہیں مجھتیں مگر یاد رکھو، بڑوں کا تجربہ بچوں کو غلط راہ پر جانے سے بچاتا ہے۔ مجھے اپنی پسند کے بارے میں بتاؤ اور اگر اس سے شادی کرنا چاہتی ہو تو بھی بتاؤ تاکہ میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں۔“

”آپ نے آج اندازہ لگایا مہی۔“

”میری بیٹی، میں ایک مرتبہ پھر تجھ سے معافی مانگتی ہوں کہ میں نے تیرے راز جاننے کی کوشش کی لیکن یہ بڑا ضروری تھا۔ تمہاری کوئی بہن بھی نہیں ہے جو تم اس سے کہہ لیتیں۔ نادانستی میں کوئی قدم اٹھا لیتیں تو کتنا برا ہوتا۔“

لائبر کیکل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ راجیلہ کے بارے میں غلط سوچتی رہی تھی۔ اس کی ماں کا اپنے شوہر کے ساتھ کوئی بھی سلوک ہو لیکن وہ اس سے محبت کرتی ہیں۔ اس کا بھلا چاہتی ہیں۔

”مہی، وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔“

”اور تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے لیکن ڈیڈی اور آپ کی مرضی ضروری ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم کسی کو پسند کرو اور ہم تمہاری پسند کا خیال نہ کریں۔“

”مہی، آپ کتنی اچھی ہیں۔ میں خواہاں آپ کو غلط سمجھتی رہی۔“

”بچوں سے ایسی غلطیاں ہوتی جاتی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ اس لڑکے کا فیملی بیک گراؤ کیا ہے۔“

”میں اس کے گھر تو کبھی نہیں گئی لیکن وہ لڑکا ہماری طرح امیر نہیں۔“

”تم کہو تو میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں؟“

”مہی، آپ نہیں تو اور کون بات کرے گا۔“

”بس ایک مشکل ہے، تم جس لڑکے کا بتا رہی ہو وہ غریب ہے۔ ابھی کہیں تو کڑی تنک نہیں کرتا۔ تم اپنے ڈیڈی کو جانتی ہو۔ وہ کسی بڑے بزنس مین کے بیٹے سے تمہاری شادی کرانا چاہیں گے۔ اس رشتہ پر اتنی آسانی سے تیار نہیں ہوں

کر قبول کر لیتا۔ اگر تم نے ان کی بات نہ مانی تو نہ جانے وہ کیا قدم اٹھا بیٹھیں۔“

”آخر انہیں اعتراض کیا ہے؟“

”انہیں اس لڑکے کی غربت پر سخت اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ لڑکا تمہاری دولت کی وجہ سے تم سے شادی کر رہا ہے۔“

”غریب کیا انسان نہیں ہوتے؟“

”یہ تو تم انہی سے پوچھنا۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر دہل رہی ہوں کہ وہ تمہاری طرف سے مایوس ہو کر کہیں اس لڑکے کو نقصان نہ پہنچائیں۔“

”ان کی کیا مجال جو وہ اسے کوئی نقصان پہنچائیں۔“

”تم ان سے لڑ نہیں سکتیں۔ اس لڑکے کو نقصان پہنچانے کے لیے ان کے پاس بہت سے ذرائع ہیں۔ کئی غنڈے ہیں جو ان سے باقاعدہ خواہ لیتے ہیں۔ جمال مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔“

”میں بھی انہی کی بیٹی ہوں۔ دیکھتی ہوں وہ کیا کرتے ہیں۔ میں ابھی ان کے پاس جاتی ہوں۔“

”میرا تو خیال ہے ابھی ان کے سامنے مت جاؤ۔ اس وقت وہ بھی غصے میں ہیں اور تم بھی۔ ان کا غصہ اترنے دو پھر ان سے بات کرنا۔“

”نہیں، میں ان سے ابھی بات کروں گی۔“

”تم کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ میں ہوں گی تو معاملہ سنبھال لوں گی۔“

اعجاز احمد نے لائبہ کو اس لیے بلایا تھا کہ وہ اسے اونچ نیچ سمجھائے گا لیکن راجیلہ نے لائبہ کو اتنا بھڑکا دیا تھا کہ سمجھنا تو درکنار وہ کوئی بات سننے کو بھی تیار نہیں تھی۔ آتے ہی باپ سے الجھ پڑی۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار ہوئی۔ اعجاز احمد نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بھی ان سے اس انداز میں بات کرے گی۔ انہوں نے اس کو پھولوں میں تولاتھا، پلکوں کے سائے میں رکھا تھا، سر آکھوں پر بٹھایا تھا اور اب اس کی زبان سے نکلے ہوئے تیروں سے چھلنی پور ہے تھے۔

”میں نے تمہیں اس لیے پال پوس کر بڑا نہیں کیا تھا کہ تم میری عزت بازاروں میں اچھالتی پھرو۔ غریب فقیریوں کو میرا داماد بناتی پھرو۔ میں تمہیں ہرگز یہ اجازت نہیں دوں گا کہ تم اس نادار لڑکے کو میرا داماد بنا دو۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ آپ اسے داماد تسلیم کریں۔ میں تو آپ سے صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ میں اس سے شادی کرنے والی ہوں۔“

”اگر وہ شاعر ہے تو میں ہرگز لائبہ کی شادی اس سے نہیں کروں گا۔ شاعروں کی زندگی کسی گزرتی ہے مجھے معلوم ہے۔“

”اتنے پریشان مت ہوا عجاز احمد۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس مسئلے کو سلجھایا کیسے جائے۔ سختی سے کام نہیں چلے گا۔ یہ تو بے کس اس لڑکے نے لائبہ کی دولت کو دیکھ کر اسے پھانسا ہے لیکن کیا کریں۔ کچھ دنوں میں لائبہ کو خود احساس ہو جائے گا کہ وہ غلطی پر تھی۔“

”میں لائبہ کی یہ بے جا ضد بھی پوری نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے اس کی ہر خواہش پوری کی ہے لیکن اب نہیں۔ میں نے دولت اس لیے جمع نہیں کی ہے کہ وہ دوسروں پر لڑائی پھرے۔ اگر اسے شادی ہی کرنی ہے تو جہاں میں چاہوں گا وہاں کرے گی۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ ایسی نہیں ہے کہ آپ کی ہر بات مان لے۔ اس کی نظروں میں میری عزت آپ نے رہنے نہیں دی کہ میری بات مان لے گی۔“

”اسے ماننا پڑے گا ورنہ میں اسے ایک پھوٹی کوڑی دیے بغیر رخصت کروں گا۔“

”ایک مشورہ میں آپ کو دوں۔ اس وقت آپ کو اس کی پسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر آپ نے اپنی پسند سے اس کی شادی کر بھی دی تو وہ بھی خوش نہیں رہے گی۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔ تم تو یہی چاہو گی کہ وہ غریب گھرانے میں بیاہ کر جائے۔ اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔“

”آپ نہیں تو لائبہ کو آپ کے پاس بھیج دوں۔ آپ خود اس سے بات کر لیں۔“

”ہاں سمجھو، میں خود اس سے بات کروں گا۔“

راجیلہ اپنا ہنر دکھا بھی گئی۔ نفرت کے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ وہ اس وقت لائبہ کو اس کے پاس بھیجنا چاہتی تھی تاکہ غصے میں بھرا ہوا عجاز احمد اس پر برس پڑے۔

اب اسے دوسری طرف شعلے بھڑکانے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی افسردگی طاری کی اور لائبہ کے پاس پہنچ گئی۔

”کیا ہوامی، ڈیڈی سے بات ہوئی؟“

”ہیٹی میرا قصور یہ ہے کہ میں سو تیلی ہوں۔ تمہاری سگی ماں آج زندہ ہوئی تو اپنا اختیار استعمال کر کے تمہاری شادی کر دیتی۔ میں سو تیلی ہوں اس لیے اعجاز کے انکار کو اقرار میں نہیں بدل سکتی۔“

”انہوں نے انکار کر دیا؟“

”ہاں، مگر تم ان سے ضد مت کرنا۔ قسمت کا فیصلہ سمجھ

”ہمیں ملتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے اور میں ایک مرتبہ بھی تمہارے گھر نہیں گئی۔“
”اس کی کوئی وجہ ہے جو میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گا۔“

”اس لیے لے کر جانا نہیں چاہتے تا کہ تم غریب ہو، میں تمہیں غربت کا طعنہ نہ دے دوں۔“
”یہی سمجھ لو۔“

”جہاں اعتماد نہ ہو وہاں محبت نہیں ہوتی۔ تمہیں مجھ پر اعتماد ہی نہیں۔ تم سمجھتے ہو تمہاری غربت دیکھ کر میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ اگر ایسا ہوتا تو میں پہلے دن ہی تم سے پوچھتی کہ تم کس سیٹھ کے بیٹے ہو۔ اگر میں امیر باپ کی بیٹی ہوں تو اس میں میری بڑائی نہیں اور اگر تم غریب ہو تو اس سے تم کم نہیں ہو جاؤ گے۔ یہ تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں تمہاری غربت جانچنے تمہارے گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”تم اتنی سنجیدہ ہو جاؤ گی، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب سچ سچ بتاؤ تمہیں میرے گھر جانے کا اچانک خیال کیوں آ گیا؟“

”پھر تم سچ سچ سنو، میرے گھر والوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میرے والد نے تمہارے بارے میں مجھ سے معلوم کیا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ تم مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہو تو انہیں تمہارے خلوص پر شک ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ تم میری دولت کی وجہ سے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو اب تمہیں نہ صرف انہیں مطمئن کرنا ہے کہ تم میری دولت سے نہیں مجھ سے محبت کرتے ہو بلکہ مجھے بھی اطمینان دلانا ہے کیونکہ اس موضوع پر آج تک ہماری کوئی بات نہیں ہوئی۔“

”میں تمہارے والد سے ملنے کو تیار ہوں اور تمہیں بھی یقین دلانا ہوں کہ میری نظر تمہاری دولت پر نہیں۔ مجھے تم سے ملاقات کے چند روز بعد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ تم سیٹھ اعجاز احمد کی اکلوتی صاحبزادی ہو لیکن سچ بتاؤ میں نے تمہاری حیثیت سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی؟ تمہیں گھر نہیں لے جا رہا ہوں اس کی بھی کوئی وجہ ہے جو میں تمہارے والد سے ملنے کے بعد بتا بھی دوں گا۔“

”میرے والد تم سے ملنے کے بعد ضرور یہ چاہیں گے کہ تمہارے گھر والے بھی ان سے ملیں۔ اس وقت کیا کرو گے؟“
”اس وقت کی اس وقت دیکھی جائے گی۔“

”تم ڈیڈی سے ملنے کب آرہے ہو۔“
”کل کا دن تم مجھے دے دو۔ پرسوں پانچ بجے شام

”میری مرضی کے بغیر۔“
”آپ اگر میری بات مان لیں تو آپ کی مرضی بھی شامل ہو جائے گی۔“

”وہ تمہاری دولت کے لیے تم سے شادی کر رہا ہے۔ ذرا اس سے یہ کہہ کر دیکھو کہ تمہارا باپ تمہیں ایک پالی بلی دینے کو تیار نہیں۔ پھر دیکھو وہ تم سے شادی کرتا ہے یا نہیں۔“
”اگر آپ کو اپنی دولت پر گھمنڈ ہے تو میں یہ بھی کر کے دیکھ لوں گی۔ وہ آپ کی دولت پر ٹھوکر مار کر مجھ سے شادی کرے گا۔“

”تم یہ شوق پورا کر کے دیکھ لو، وہ کبھی تیار نہیں ہوگا۔“
”مجھے آپ دو تین دن کا وقت دیں۔ میں اسے آپ کے پاس لے آؤں گی۔ اس سے جو پوچھنا ہے آپ جو بھیجے گا۔“
اس وقت راحیلہ نے بھی اس کی تائید کی تھی بلکہ اعجاز احمد سے یہ بھی کہا تھا کہ جب وہ لڑکا آئے تو ذرا نرمی سے بات کیجیے گا۔

دوسرے دن وہ یونیورسٹی گئی تو اپنی کلاس میں جانے سے پہلے دانش کے ڈیپارٹمنٹ میں پہنچی۔ وہ آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں تھی جبکہ دانش شاعر ہوتے ہوئے کامرس کا طالب علم تھا۔

”کیا بات ہے لائبہ۔ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“
”ابھی میرے ساتھ چلو، تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”یار اب تو یونیورسٹی آگئی ہو۔ کچھ دیر بعد ملیں گے۔ کلاس ختم ہونے دو۔“
”تمہیں میں اتنا انتظار نہیں کروں گی۔ تمہیں ابھی چلنا ہوگا۔“

”اچھا چلتا ہوں بابا۔ میں سر سے کہہ کر آتا ہوں کہ میرے گھر میں کسی کی طبیعت خراب ہے۔ میں کلاس نہیں لے سکتا۔“

”کہنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ بس چلو۔“

”میری کتابیں اندر پڑی ہوئی ہیں۔“

”اچھا جاؤ لے آؤ مگر جلدی آنا۔“

وہ اسے لے کر آئی تو اس کے قدم پارکنگ کی طرف اٹھ رہے تھے۔ دانش حیران تھا کہ ابھی تو وہ آئی ہے ابھی واپس کیوں جا رہی ہے اور وہ بھی اسے ساتھ لے کر آئی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟“

”مجھے فوراً تمہارے گھر جانا ہے۔“

”میرے گھر؟ مگر کیوں؟“

میں تمہارے گھر پر ہوں گا۔“

لائبہ نے کھڑے بیٹے ہی پر خوش خبری راجیلہ کو سنا دی۔ اس کے بعد وہ اعجاز احمد کے پاس گئی۔ انہیں بھی بتا دیا کہ دانش ان سے ملنے آ رہا ہے۔ راجیلہ نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن یہ خبر اس پر بجلی بن کر گر گئی تھی۔

☆☆☆

جس روز دانش کمال کو لائبہ کے گھر جانا تھا اسی دن دوپہر کے وقت وہ کسی کام سے گھر سے باہر نکلا۔ ابھی وہ گلی سے نکل کر سڑک تک پہنچا تھا کہ دو آدمی اس کے پاس آئے۔

”آپ کا نام دانش کمال ہے؟“

”جی ہاں۔“

”تم لائبہ کو جانتے ہو؟“

”جی ہاں۔“

”اور اس کے والد سیٹھ اعجاز احمد؟“

”میں نے ان کا نام سنا ہے مگر دیکھا نہیں ہے۔“

”وہ جو سامنے گاڑی کھڑی ہے وہ اس میں بیٹھے ہیں اور جنہیں بلارہے ہیں۔“

”مجھے ان سے ملنا ضرور تھا مگر انہوں نے تو مجھے شام پانچ بجے بلایا تھا اور وہ بھی اپنے گھر۔ پھر وہ یہاں کیوں آ گئے۔“

”ہم تو جی ان کے نوکر ہیں۔ ہمیں کیا معلوم وہ یہاں کیوں آ گئے۔ آپ خود چل کر ان سے پوچھ لیں۔“

”چلو بھائی پوچھ لیتے ہیں۔“

اس نے سوچا شاید سیٹھ صاحب لائبہ کی موجودگی میں اس سے ملنا نہ چاہتے ہوں۔ اسی لیے یہاں آ گئے۔ شاید انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ میں کس کا بھائی ہوں اس لیے گھر ڈھونڈنے میں بھی دشواری نہ ہوئی ہو۔ گاڑی کو کھلی میں لانا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اپنے آدمیوں کو میرے گھر کی طرف بھیجا ہو۔ اتفاق یہ ہوا کہ میں انہیں راستے ہی میں مل گیا۔

یہی سوچتا ہوا وہ گاڑی تک پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر ادھیڑ عمر کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ وہ سمجھا یہی اعجاز احمد ہے۔ اسے دیکھ کر اسے سخت مایوسی ہوئی تھی کیونکہ وہ شخص شکل سے غنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ اتنی حسین بیٹی کا ایسا باپ اس نے سوچا اور اس سے بات کرنے کے لیے اس کے دروازے کی طرف بڑھا۔

”گاڑی میں بیٹھ جاؤ آرام سے بات کر لیتا۔“ ان دو آدمیوں نے کہا جو اسے لے کر آئے تھے۔

دانش کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ آرام سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اس کے بیٹھے ہی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔

”جی اعجاز احمد صاحب، میں حاضر ہوں کیسے کیا بات کرنی ہے۔“

اس کا یہ کہنا تھا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کی بے

ہنگم آواز نے پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کو لکڑا کر۔

”اے، ہم لوگوں نے ابھی تک اسے سمجھایا نہیں۔“

ان لوگوں نے اسے اس طرح سمجھایا کہ ایک نے اس کی پسیلوں پر پوسٹول رکھ دیا اور دوسرے نے اس کی آنکھوں

پر پٹی باندھ دی۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ پھنس چکا ہے۔

یہاں کوئی اعجاز احمد نہیں۔ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ مزاحمت کا

کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے دو تین بار پوچھنے کی کوشش کی کہ

اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ جواب یہی ملا کہ جہاں

ہمارے سیٹھ اعجاز نے تمہیں لے جانے کو کہا ہے وہاں لے

جارہے ہیں۔“

”انہوں نے تو مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔“

”ان کے کئی گھر ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان میں

سے کسی گھر میں لے جا کر تمہاری خوب خاطر تواضع کریں۔“

گاڑی میں ایک ساتھ کئی قہقہے گونجے۔ وہ خاموش

ہو گیا لیکن سوچ ضرور رہا تھا کہ سرمایہ دار کی ذہنیت نے کام

دکھا دیا ہے۔ لائبہ کے باپ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔

لائبہ کو یہ تاثر دیا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے اور اب اس

سے یہ کہے گا کہ لڑکا جھوٹا تھا۔ جب میں شادی پر تیار ہوا تو وہ

غائب ہو گیا۔ لائبہ تو یہی سمجھ گئی کہ میں نے بے وفائی کی

ہے۔ ”سیٹھ کے بچے میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ بے

اختیار چیخ پڑا۔ قہقہے پھر گونجنے لگے۔

گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ شیشے چڑھے

ہوئے تھے اس لیے باہر کا شور اندر نہیں آ رہا تھا لیکن اب

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شہر سے باہر آ گیا ہے یا کم از کم ایسی

جگہ ہے جہاں ٹریفک نہیں ہے کیونکہ گاڑی ایک ہی رفتار سے

چلی جا رہی تھی۔ پھر گاڑی کی رفتار ٹوٹی اور اس نے ایک موڑ

کاٹا۔ کچھ دور چل کر ایک جھکے سے رک گئی۔ اس کی آنکھوں

پر پٹی اب بھی بندھی ہوئی تھی لیکن دروازہ کھلتے ہوئے اسے

احساس ہوا کہ وہ کسی ایسی جگہ ہے جہاں ٹریفک بالکل نہیں۔

چیننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں نے اسے نیچے اتارا

اور پوسٹول کی نوک پر اسے آگے چلنے کا حکم دیا۔ اسے محسوس ہوا

موٹاپا کریں کم...
 رہیں slim، فٹ اور Young!!

(مصنوعی رنگ اور
 کیمیکل سے پاک)

طیبی

عرقِ
 اوبیسول



موٹاپے میں کمی کی قدرتی دوا

100 فیصد قدرتی جزی بوٹیوں سے تیار شدہ

• جسم سے زائد چربی خارج کرتا ہے • ہاضمہ درست اور میکر کو قوی کرتا ہے

• اجابت صاف لاتا ہے • آنتوں کی سوزش دور کرتا ہے

• ہاتھ اور پاؤں کی سوجن میں فائدہ مند

طیبی

دواخانہ (پرائیویٹ) لمیٹڈ

کراچی - پاکستان www.tayyebi.com.pk



ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچنے لگا کہ یہ لوگ مجھے کب تک یہاں رکھیں گے۔ یقیناً اس وقت تک جب تک کہ لائبہ کو میری بے وفائی کا یقین نہیں آجاتا۔ کوئی بات نہیں یہاں سے رہائی ملنے ہی میں لائبہ کو تمام حالات سے آگاہ کروں گا۔

☆☆☆

پانچ بج چکے تھے۔ دانش ابھی تک نہیں آیا تھا۔ گھڑی کی طرف دیکھتے دیکھتے لائبہ کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ جب ساڑھے پانچ بجے تو وہ کمرے سے نکلی۔ وقت گزاری کے لیے پوری گھنٹی کا چکر لگایا۔ اب چھ بج گئے تھے۔ وہ ٹہلتی ہوئی لان میں آئی۔ فرش پر بچی ہوئی گھاس اسے کانٹوں کا پھوٹا معلوم ہو رہی تھی۔ پھول انکارے لگ رہے تھے۔ دانش اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ وہ ٹہلتی رہتی ٹہلتی رہی۔ باپ کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ شرمندگی نے اندر قدم نہیں رکھنے دیا۔ تھک ہار کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اگر اس کا گھر دیکھ لیا ہوتا تو ابھی گاڑی لے کر پہنچ جاتی۔ اسے لے کر آئی مگر کیوں لے کر آئی۔ وہ خود کیوں نہیں آیا؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ کمرے سے نکلی اور راحیلہ کے کمرے کی طرف چل دی۔ شاید وہ کچھ بتا سکیں۔ انہوں نے دنیا دہی ہے۔ شاید وہ کوئی ایسی ترکیب بتا سکیں کہ میں ڈیڈی کو مطمئن کر سکوں۔

”دھی، دانش نے آج آنے کو کہا تھا۔“

”کیا وہ آگیا۔“ انہوں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”جی تو کہنے آئی ہوں، ڈیڈی تیار ہوئے بیٹھے ہیں۔

اس کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ ابھی تک پہنچا ہی نہیں۔“

”کب تک آنے کو کہا تھا اس نے؟“

”کہہ رہا تھا ٹھیک پانچ بجے آجاؤں گا۔“

”ارے ہاں، اب تو بہت وقت ہو گیا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی مصیبت میں ہو۔ میرا مطلب ہے اسے کوئی کام پر گیا ہو۔“

”یہاں آنے سے زیادہ ضروری کون سا کام ہو سکتا تھا۔

اب میں ڈیڈی کو کیا جواب دوں۔ آپ ہی کوئی مشورہ دیں۔“

”اپنے ڈیڈی کے سامنے غم مت جاؤ۔ میں جا کر

انہیں سمجھائے دیتی ہوں۔“

لائبہ وہیں بیٹھی رہی اور راحیلہ، اعجاز کے کمرے میں

چلی گئی۔

”لائبہ میرے پاس آئی تھی۔ بہت پریشان ہے۔

دانش ابھی تک نہیں آیا۔“

”بھئی آج نہیں توکل آجائے گا۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی

کہ وہ کسی عمارت میں داخل ہو گیا ہے۔

”آگے بیڑھیاں ہیں آرام سے اترتے جاؤ۔“

نیچے اترنے کے بعد اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی

گئی۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا بلکہ اسے کمرہ نہیں ہال ہی کہنا

چاہیے۔ لوہے کا ایک پلنگ اور ایک صوفہ پڑا تھا۔ ایک طرف

ایک کرسی پڑی تھی جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک

طرف چھوٹا فرنیچ رکھا تھا۔ چیمٹ پر کچھ فاصلہ دے کر دو پتھر

لنک رہے تھے۔ روشن دان تھا جسے لوہے کے سڑیوں سے بند

کر دیا گیا تھا۔

”ہر دو گھنٹے بعد ایک آدمی آئے گا۔ کوئی ضرورت ہو تو

اس سے کہہ دیا کرتا۔“

”جو آدمی مجھے یہاں انگو اکر کے لایا ہے اسے بلاؤ۔

میں اس سے بات تو کروں۔“

”چپ چاپ پڑے رہو۔ کوئی تمہارے باپ کا نوکر

نہیں ہے جو تم سے بات کرنے آئے گا۔“

”اعجاز احمد کو بلاؤ۔ میں اس سے اپنا جرم تو پوچھوں۔“

”جب وہ کہے گا، تمہیں اس کے پاس بھیج دیا

جائے گا۔“

وہ دونوں آدمی بیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔

بیڑھیوں کا دروازہ بند ہو گیا۔

اس نے کوئی مشقت نہیں کی تھی لیکن اس کا بدن ٹوٹ

رہا تھا۔ یہ اس کے اعصاب تھے جو پٹخ رہے تھے۔ وہ لوہے

کے پلنگ پر پڑے ہوئے گدے پر لیٹ گیا۔ تنہائی میں

سوچنے کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ وہ بھی سوچنے لگا۔ سوچنا کیا

تھا۔ اس کا خیال گھر کی طرف چلا گیا تھا۔ میں جب گھر نہیں

پہنچوں گا تو میری ماں پر کیا گزر جائے گی۔ بہنیں تو رو کر برا

حال کر دیں گی۔ اس وقت میرا بھائی میرے کام آسکتا تھا مگر

اسے کیا معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ وہ سیٹھ اعجاز کا سیکرٹری

ہے۔ سیٹھ اعجاز اس سے خوش بھی بہت ہیں۔ انہیں معلوم نہیں

ہوگا کہ میں ان کے سیکرٹری کا بھائی ہوں ورنہ وہ یہ حرکت بھی

نہ کرتے۔ میرا بھائی ان سے کہے گا تو مجھے ضرور رہائی مل

جائے گی مگر رہائی ملے گی کہاں سے۔ غلطی تو میری ہے، میں

نے گھر میں کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ اعجاز احمد کی بیٹی سے

میری دوستی ہے اور ہم دونوں شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میں

کچھ رہا تھا ابھی وقت نہیں آیا۔ بھائی کو اچانک بتاؤں گا تو

انہیں زیادہ خوشی ہوگی۔ اب وہ اندھیرے میں ہیں ہوں گے

زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہیں گے کہ پولیس کے پاس جائیں

گے لیکن پولیس اگر اہل ہوتی تو یہ یہ خانہ سلامت ہی کیوں

مصروفیت ہوگئی ہو۔“

سے ملواتا۔ وہ اتنے اہم معاملے کو بڑوں تک لانا ہی نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ میرے پاس نہیں آیا۔ اب میں صاف کہہ سکتا ہوں کہ وہ صرف تمہیں درغلنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ سب کچھ سمیٹ کر اس کے ساتھ چل دوگی۔ وہ تو شکر بھیجو راجیلہ نے تمہاری نگرانی کی اور تم سے بچ اگلوایا ورنہ ہم سب اندھیرے میں رہتے اور تم اس کی باتوں میں آکر وہ سب کچھ کر گزرتیں جو وہ چاہتا تھا۔“

”وہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ضرور کچھ زری ہے۔ میں اس کا ایڈریس تلاش کر کے اس سے ضرور ملوں گی۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔ اگر اسے زبردستی تلاش کر کے یہاں لے بھی آئیں تو کیا فائدہ۔ اب میں تمہاری شادی اس سے نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ یہ سوچ کر کمرے سے نکل آئی کہ اس وقت ڈیڈی غصے میں ہیں۔ میں پہلے دانش کو خیر خبر لے لوں، اس کے بعد انہیں بھی منالوں گی۔

وہ رات بھر مختلف اندیشوں سے لڑتی رہی۔ دانش کبھی اسے بے وفائے قرار دیتا تھا کبھی بے قصور دکھائی دیتا تھا۔ کبھی سوچنے لگتی تھی اس نے اپنا گھر اسی لیے نہیں دکھا یا تھا کہ میں کبھی وقت پڑے تو وہاں پہنچ نہ سکوں۔ کبھی وہ بے وفائے قرار دیتا تھا کبھی جھوٹا۔ وہ رات بھر جاگتی رہی۔ صبح ہوتے ہی آنکھوں میں جلن بدن میں تھکن لیے یونیورسٹی پہنچ گئی۔ یہاں اسے اس کے کچھ ایسے دوستوں کو تلاش کرنا تھا جو اس کے گھر سے واقف ہوں۔ اسے امید نہیں تھی کہ کوئی اس کا گھر جانتا ہوگا کیونکہ وہ لیے دیے رہتا تھا۔ وہ اس کے کسی ایسے دوست سے واقف نہیں تھی جس کے ساتھ دانش کو گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہو۔ لڑکے اگر ہوتے بھی ہیں تو باہر کے دوست ہوتے ہیں۔ کون ہوگا جو اس کے گھر سے واقف ہو۔ وہ صوبہ سی امید لیے کامرس ڈیپارٹمنٹ میں چل گئی۔

ایک ایک لڑکے سے پوچھ لیا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ لڑکیوں سے پوچھنا غیر مہذب تھا۔ اس نے اب یہ سوچ لیا تھا کہ وہ چیئر مین کے پاس جائے گی اور سرکاری ریکارڈ سے اس کا ایڈریس نکلائے گی کہ اپنی دیر میں ایک لڑکا اس کے پاس آیا۔

”آپ دانش کا ایڈریس معلوم کر رہی ہیں؟“

”ہاں۔“

”یہاں اگر کسی کو معلوم بھی ہوگا تو وہ آپ کو بتائے گا نہیں۔ دانش نے سب کو منع کر دیا ہے۔ فزکس ڈیپارٹمنٹ میں ایک لڑکی نگار ہے۔ وہ آپ کو بتا سکتی ہے۔“

”بڑے اس نواب زادے کے کارخانے چل رہے ہیں جو مصروفیت ہوگئی ہوگی۔ اسے آنا ہوتا تو آچکا ہوتا۔ آپ مائیں نہ مائیں وہ لڑکا مجھے فراڈ معلوم ہوتا ہے۔ اسے شادی کرنی ہی نہیں ورنہ ضرور آتا۔ لائبرے اس سے کہہ دیا ہوگا کہ اسے پھوٹی کوڑی بھی ملنے والی نہیں صرف شادی کر لے۔ وہ پاگل تھا جو یہ کہنے آتا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ معاف کیجیے گا اسے آپ کی بیٹی سے تفریح لینی تھی۔ اس کا مطلب نکل گیا۔ اب کیوں آئے گا۔“

”راجیلہ اتنی بے رودی سے بات کیوں کرتی ہو۔“

”سوئٹی ہوں اس لیے میری بات کڑوی معلوم ہو رہی ہے ورنہ حقیقت تو یہی ہے۔“

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ لائبرے کو میرے پاس بھیجو۔“

”لائبرے تو اس کی حمایت ہی کرے گی مگر تم اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ کسی دن اس کے ساتھ بھاگ گئی تو ہاتھ ملنے رہ جاتا۔“ اس نے کمرے سے نکلے ہوئے کہا تھا اس لیے اس کا رد عمل نہ دیکھ سکی۔

”جاؤ تمہارے ڈیڈی بلا رہے ہیں۔ غصے میں ہیں مگر تم غصے میں مت آنا۔ اس وقت تمہارا مطلب ہے۔ میں تو سوئٹی ماں ہوں، میری بات تو ان کی سمجھ میں آئی نہیں سکتی۔“

لائبرے نے روتے روتے باپ کے کمرے میں قدم رکھا۔

”تم تو کہہ رہی تھیں کہ اسے تمہاری دولت سے غرض نہیں۔ وہ یہ کہنے میرے پاس آئے گا کہ اسے تمہاری یا میری دولت سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔“

”میں یہ بات اب بھی کہہ رہی ہوں۔“

”پھر وہ کیوں نہیں آیا۔“ ان کی آواز اونچی ہوگئی۔

”اس نے میری بے عزتی کی ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں اور وہ نواب صاحب غائب ہیں۔“

”وہ ایسا نہیں ہے ڈیڈی۔ ہو سکتا ہے اس کی طبیعت خراب ہوگئی ہو یا کوئی اور بات ہو۔“ اتنا کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”ڈرائیور کو لے کر ابھی اس کے گھر جاؤ۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا وہ کتنا سچا ہے۔“

”ڈیڈی، میں اس کا گھر نہیں جانتی۔ ہماری ملاقاتیں تو یونیورسٹی میں ہوتی ہیں۔“

”ویلڈن یہ بات یہاں تک پہنچ گئی اور تم نے اس کا گھر تک نہیں دیکھا۔ وہ اگر تنہا ہوتا تو تمہیں اپنے والدین

”اب میں آپ سے کچھ پوچھوں؟ صرف اس لیے کہ آپ کے تجربے سے مجھے فائدہ ہو۔“

”آپ کیا پوچھیں گی میں خود ہی بتائے دیتی ہوں۔ میں تعلیم کے لیے پہلے سال میں کئی کئی دانش سے میری دوستی ہوئی۔ میں اس کی شاعری پشیدہ تھی۔ اس سے اس نے فائدہ اٹھایا۔ شاعر تو ہوتے ہی حسن پرست ہیں۔ اسے کوئی اور لڑکی پسند آگئی۔ تیسری غالباً آپ ہیں شاید وہ آپ سے مخلص ہو لیکن مجھے لگتا نہیں۔“

”میرا اس سے وہ تعلق نہیں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ میرے کچھ خاندانی مسئلے ہیں جن کا حل اس کے پاس ہے۔ میں اسی سلسلے میں اس سے ملنے کی خواہاں ہوں۔“

”ایک دن میں بھی کسی سے یہی کہتی ہوئی اس کے گھر تک گئی تھی۔ آپ شوق سے ہو آئیں وہ گھر پر ہو گئی نہیں اور پھر اچانک نمودار ہو جانے لگا۔ کوئی نہ کوئی کہانی گھڑ دے گا۔“

لائبہ نے اس سے اجازت لی۔ اب اسے پارکنگ کی طرف جانا تھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ نگار نے جو انکشافات کیے تھے اس کی رگوں میں اس کا خون منجمد کرنے کے لیے کافی تھے۔ پاؤں رکتی نہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ اسے اپنے ڈیڈی کی باتیں نظر آ رہی تھیں۔ دانش جان بوجھ کر غائب ہوا ہے۔ اب وہ مجھ سے تعلق رکھتا نہیں چاہتا۔ یہ واردات اس نے پہلی مرتبہ نہیں کی ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ فیصلہ دیا کہ دانش عادی جرم ہے۔ اسے شاعروں کی حسن پرستی کے قصے یاد آنے لگے۔ میں نے اسے اس کس شدت سے چاہا تھا اور اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اب میں اس کے گھر کیا لینے جا رہی ہوں۔ اس نے خود سے سوال کیا۔

چلنا تو چاہیے، ممکن ہے کوئی اور انکشاف میری آنکھیں کھول دے۔ وہ گاڑی میں بیٹھی اور نگار کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف چل دی۔ دل میں سوچ رہی تھی میں اچانک جا رہی ہوں۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کے گھر پہنچ سکتی ہوں ممکن ہے وہ گھر پر مل جائے۔

چند گلیوں میں گھومنے کے بعد وہ اس کے مکان تک پہنچ گئی۔ اطلاعی کھنی کے جواب میں ایک لڑکی دروازے پر آئی۔

”فرمائیے، آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”دانش کمال کا گھر یہی ہے نا۔“

”جی ہاں۔ آپ کو کس سے ملنا ہے۔“

”انہی سے ملنا ہے۔“

”وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔“

”مجھے اندر آنے دو۔ مجھے تم لوگوں سے بہت سی باتیں

”اسے بھی دانش نے منع کر دیا ہوگا۔“

”ان دنوں دانش کی اس سے بول چال نہیں ہے۔“

”شاید اسے منع نہ کیا ہو۔“

”وہ کیسے جانتی ہے۔“

”ایک زمانے میں دانش کا اس سے کمال کا فیئر چلا

تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ مجھے معلوم ہے وہ اس کے گھر جاتی رہی ہے۔“

اس نئے انکشاف نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ میں دانش کا پہلا شکار نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے وہ کسی اور کو بھی دھوکا دے چکا ہے۔

”کیا سوچنے لگیں آپ۔ چلیے میں آپ کی ملاقات نگار سے کروادوں۔ میرے محلے ہی میں رہتی ہے اس لیے میری اس سے دعا سلام ہے۔“ لڑکے نے کہا۔ ”بلکہ آپ ایسا کریں، یہ سامنے جو کولڈرنگ شاپ ہے یہاں کھڑی ہو جائیں۔ میں نگار کو لے کر وہیں آتا ہوں۔“

وہ ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ فرکس ڈیپارٹمنٹ کا مرس ڈیپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ کچھ دیر میں وہ لڑکا نگار کو بائیک پر بٹھا کر لے آیا۔ وہ نیچے نقوش اور بڑی بڑی آنکھوں والی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ جگہ جگہ بنائے ہوئے تھی۔ یہ مسکراہٹ لائبہ کو دیکھ کر ابھری تھی۔

”دانش کتا آپ کو کیوں درکار ہے؟“

”میرے خیال میں یہ آپ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔“

”سائل سے اس کی مجبوری پوچھ لی جائے تو دور کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔“

”ایک قرض ہے جو اس سے وصول کرنا ہے۔“

”قرض راہ چلنے کو نہیں دیا جاتا۔ آپ کا کوئی تعلق اس سے رہا ہوگا۔“

”جب آپ یہ جانتی ہیں تو پوچھ کیوں رہی ہیں۔“

”اس لیے کہ اس نے مجھ سے بھی قرض لیا تھا۔ گھر جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دو چار دن انتظار کر لیں۔ وہ یونیورسٹی آنے لگے گا۔ پھر اس سے خود ہی پوچھ لیجیے گا۔“

”شاید وہ اب بھی نہ آئے کیونکہ قرض بہت بڑا ہے۔ آپ مجھے اس کا پتا دے دیجیے۔ میں اگر وصول نہ کر سکی تو جتا

تو دوں گی۔“

اس لڑکی نے ایک کاغذ پر اس کا ایڈریس لکھ دیا۔ جتنا زبانی سمجھا سکتی تھی زبانی بھی سمجھا دیا۔

کر رہی ہیں۔“

آتا تھا۔

”اب میں چلتی ہوں۔“

”بس اماں آتی ہی ہوں گی۔“

”نہیں اب میں چلوں گی۔ میرے ہر سوال کا جواب

مجھے مل گیا۔“

اتنا کچھ جاننے کے بعد وہ وہاں نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس

کا مطلب ہے دونوں بھائیوں نے مل کر مجھے بے وقوف بنایا

ہے اور ہو سکتا ہے اس میں میری سوتیلی ماں بھی شریک ہو۔

اب اگر دانش مجھے مل بھی جائے تو میرے لیے بے کار ہے۔

میں اس گھر میں کیسے رہ سکوں گی جہاں جمال بھی رہتا ہو۔ نہ

مجی رہتا ہو تو اس سے ایک رشتہ تو ہو ہی جائے گا۔

اب اس کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا کہ دانش اسے اپنا

گھر کیوں دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ میں

اس کے گھر آؤں اور یہ راز مجھ پر کھل جائے کہ جمال اس کا

بھائی ہے۔

وہ اپنے بھائی کے کہنے پر محبت کا ڈراما اتنی ہی دیر

کھیل سکتا تھا جتنی دیر کھیل لیا۔ اب میں زیادہ بے وقوف

بننے والی نہیں۔

☆☆☆

لائب کے یونیورسٹی روانہ ہوتے ہی راحیلہ نے

گاڑی دکلائی تھی اور تیزی سے کونجی کا گیٹ پار کر گئی تھی۔

اس نے ملازموں میں سے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں

جا رہی ہے۔

اس کی گاڑی شہر سے باہر نکل کر ایک کچی بستی سے گزر

رہی تھی۔ ان چھوٹے چھوٹے مکانوں سے ذرا ہٹ کر ایک

عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس نے گیٹ کے سامنے پہنچ کر گاڑی کا

بارن دیا۔ جواب میں کسی نے گھر کی چیمٹ سے جھانک کر

دیکھا۔ اس کی گاڑی پہچان کر کسی نے دروازہ کھول دیا۔

گاڑی اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ دو بندوق بردار

اس کی گاڑی کے ارد گرد آکر کھڑے ہو گئے۔

”شیر دادا کہاں ہیں۔“

”جب سے آپ کا فون آیا ہے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”مجھے ان کے پاس لے چلو۔“

یہ عمارت دراصل ظالم خان کا اڈا تھا۔ ظالم خان تو

ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ اب یہ اڈا اس کا ایک

ساتھی شیر و چلا رہا تھا۔ اس کی بھی دہشت ایسی تھی کہ پولیس

اس طرف کا رخ نہیں کرتی تھی۔ سر شام جواری آتے تھے۔

لاکھوں روپے کا جو چلتا تھا۔ راحیلہ کے ایک دوست سیٹھ

”جب وہ گھر پر ہوں اس وقت آئے گا۔“

”اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ میں چند

باتیں پوچھوں گی اور چلی جاؤں گی۔“

”میں دروازہ بند کروں یا آپ جا رہی ہیں۔ اس

وقت اماں بھی گھر پر نہیں ہیں ورنہ بلا لیتی۔“

”ڈرو نہیں۔“ لائبہ نے دروازے میں ہاتھ پھنساتے

ہوئے کہا۔ ”میں دانش کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔

اس کی دوست ہوں۔ اس سے مجھے شکایت ہے جو میں تمہیں

بتانے آئی ہوں۔“

”ان کی دوستی تو ہمارے گھر آتی رہتی ہیں۔ آپ تو

کبھی نہیں آئیں۔“

”میں ان کی نئی دوست بنی ہوں۔ تمہیں یقین نہیں تو

یونیورسٹی کا کارڈ دکھ لو۔“ اس نے کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔

”اچھا اندر آ جائے۔“

وہ اس کے ساتھ گھر میں چلی گئی۔ گھر سے کوئی ایسی

غربت بھی نہیں جھلک رہی تھی کہ مجھے چھپانے کے لیے دانش

اسے اپنے گھر نہیں لایا تھا۔ گھر چھوٹا ضرور تھا لیکن ضرورت کی

ہر چیز موجود تھی۔ ڈرائنگ روم بھی سلینے کا تھا۔

”تمہارے دانش بھائی کہاں گئے ہوئے ہیں۔ میں

انتظار کروں تو آجائیں گے؟“

”وہ تو دو دن سے گھر نہیں آئے ہیں۔“

”کیا اس سے پہلے بھی اس طرح غائب ہوئے ہیں؟“

”ان کی یہی عادت ہے۔ غائب ہو جاتے ہیں پھر

فون کرتے ہیں کہ میں دوستوں کے ساتھ ہوں یا خود ہی

آ جاتے ہیں۔ شاعروں کا تو ایسا ہی ہے۔ کسی کا خیال نہیں

بس اپنے مشاعروں کی فکر ہے۔ آپ سے بھی ملنے کا وعدہ کیا

ہوگا اور ہو گئے غائب۔“

”ان عادتوں پر کوئی انہیں ٹوکتا نہیں؟“

”سب ٹوکتے ہیں مگر وہ ہیں ہی ایسے۔“

”آپ لوگوں کو ان کی شادی کر دینی چاہیے۔“

”معنی تو ہو گئی ہے مگر شادی ایک دو سال بعد ہی

ہوگی۔ بڑے بھائی کی شادی کے بعد۔“

”ان سے بڑے بھائی بھی ہیں۔“

”ہاں ہیں نا جمال بھائی۔ یہ لگی تو ہے ان کی تصویر۔“

لائبہ نے اس لڑکی کے اشارے کی طرف گردن گھما کر

دیکھا اور خود تصویر بن گئی۔ یہ وہی جمال احمد تھا جو اس کے

باپ کا کیکیری تھا جسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر

برالدین بھی یہاں کے مستقل آنے والوں میں سے تھے۔ ایک دوسرے بھال بھی یہاں آچکا تھا۔ راحیلہ عورت ہونے کی وجہ سے یہاں صرف اس وقت آتی تھی جب اسے شیر وے کوئی خاص کام پڑتا تھا۔ وہ اس وقت فون کر کے آئے تھی اس لیے شیر و اس کا منتظر تھا۔

ظالم خان راحیلہ کے باپ کرم نواز کا تنخواہ دار تھا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ خدمت راحیلہ انجام دیتی رہی تھی۔ ظالم خان کے بعد جب شیر و نے تخت سنبالا تو راحیلہ ایک مخصوص رقم اسے بھیجے لگی تھی۔ اعجاز احمد اسی لیے اس سے ڈرتے رہتے تھے۔ انیس شیر و اور راحیلہ کے روابط کا علم تھا۔ راحیلہ نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا شیر و کی نشے میں جھولنے آواز گونجی۔

”ام سالہ آج تک کسی سے نہیں ڈرا۔ تمہارا فون نے ام کو ڈرا دیا۔ ایسا کیا حالات ہو گیا کہ تمہارا منہ سے الفاظ نہیں نکل رہا تھا۔ ام زندہ ہے اور تم اتنا گھبرا گیا۔“

”خان صاحب، بات ہی ایسی ہے کہ سنو گے تو تم بھی اچھل جاؤ گے۔“

”تو پھر سناؤ۔“

”تمہارے آدمی جس لڑکے کو اٹھا کر لائے ہیں وہ کم بخت میرے خیال میں بھال صاحب کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ میرے پاس آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، اس کا بھائی دو دن سے گھر نہیں آیا۔ وہ پولیس میں رپورٹ درج کرانے گا۔“

”تم ام کو یہ بتانے آیا ہے کہ پولیس والا ام پر ہاتھ ڈالے گا۔ ام یہاں سے فرار ہو جاوے۔“

”نہیں خان صاحب، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”پھر کیا مطلب ہے، بولو۔ اس لڑکے کو چھوڑ دے۔“

”ایسا کرتا بھی مت۔ وہ یہاں سے جا کر اپنے بھائی کے سامنے سب اگل دے گا کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا۔“

”آپ بولو تو بھال صیب کو بھی اس کے بھائی سے ملا دے۔“

”نہیں، ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ ابھی تو تم ایسا کرو اس سے دو خط لکھواؤ۔ ایک اس کی ماں کے نام اور دوسرا لائیب کے نام۔ اس کے بعد میں بتاؤں گی کہ اسے رہا کرنا ہے یا نہیں۔“

”ابی بولو، خط میں کیا لکھوانا ہے۔“

”میں وہ خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیتی ہوں۔ دانش سے بولنا دو دنوں خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے دستخط کر دے۔ وہ دو دنوں خط ابھی مجھے لا کر دے دو۔“

راحیلہ نے پہلا خط دانش کی ماں کے نام لکھا۔ ”اماں، میں دوستوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ چند روز بعد خود ہی آ جاؤں گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

دوسرا خط اس نے دانش کی طرف سے لائیب کے نام لکھا۔

”تم سوچ رہی ہو گی کہ میں تمہارے سر مایہ دار باپ سے ملنے کیوں نہیں آیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ نام پاس کر رہا تھا۔ تم تو تنہید ہو گئیں۔ شادی کا سوچنے لگیں۔ میں شاعر ہوں۔ حسن پرست ہوں لیکن یہ پرستش ایک حد تک ہی اچھی لگتی ہے۔ میری عادت یہ بھی ہے کہ ایک صورت سے میرا دل بہت جلد بھر جاتا ہے۔ ویری سوری یار، میرا دل بھر گیا ہے اب کسی اور چہرے کی تلاش ہے۔

کیا تم نے بھی سوچا کہ میں نے تمہیں اپنے گھر والوں سے کیوں نہیں ملا یا۔ اس لیے کہ جب میں غائب ہو جاؤں تو تم میرے گھر نہ پہنچ سکو۔ اگر تم پہنچ بھی گئیں جان من تو میں تمہیں پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔ اگر اس بے عزتی سے بچنا چاہتی ہو تو مجھے ڈھونڈنی ہو گی میرے گھر بھی نہ آنا۔ اگر تم نے یہ غلطی کی تو تمہارے بارے میں ایسی ایسی من گھڑت کہانیاں پریس کو دوں گا کہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ اتنے دن ساتھ رہنے اور اچھی اچھی غزلیں عطا کرنے کا شکر یہ۔ بہت جلد میرا نیا دیوان شائع ہو گا۔ اسے پڑھ لیتا۔ تمہارا ماضی تمہارے سامنے آ جائے گا۔“

”یہ دو خط ہیں۔ دانش سے بولنا ان دونوں خطوں کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے دستخط کر دے۔“

”ام سمجھ گیا۔“

”اور یہ بولو، پورے ایک لاکھ ہیں۔“ راحیلہ نے نوٹوں کی گڈی میز پر رکھ دی۔

”ام یہ بھی سمجھ گیا۔“

”خان صاحب تم خود جاؤ گے اس کے پاس۔“ راحیلہ نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”ہاں ام جائے گا۔ کوئی اور گیا تو وہ جیس ہیں کرے گا۔ میں جائے گا تو اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔ تم جب تک نشہ پانی کر دو۔ میں آتا ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے میں دن میں نہیں پیتی۔“

”تمہارا مرضی۔“

شیر و نے اپنے چند ساتھیوں کو ساتھ لیا اور تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر دانش کے پاس پہنچ گیا۔

”بچہ، یہ دو خط کا نقل تم اپنا ہاتھ سے کرے گا۔“

شیر خان نے دونوں خط اس کے حوالے کر دیے۔

سینہ اعجاز احمد کا نام لے رہے تھے تاکہ دانش بھی سمجھے کہ اس کے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے وہ اعجاز کے حکم پر ہو رہا ہے۔ وہ باہر جا کر کسی کو بتائے بھی تو اعجاز کا نام لے۔

ان کے جاتے ہی دانش نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا۔ ”سینہ اعجاز احمد، تیرا دماغ تو میں باہر نکل کر درست کروں گا۔“

شیر و کامیاب واپس آیا تھا۔ اس نے آتے ہی دونوں خط را حیلہ کے حوالے کر دیے۔

راحیلہ نے اپنے پرس سے ایک گڈی اور نکالی اور بستر پر رکھ دی۔ ”یہ ایک لاکھ میں اس نیت سے لائی تھی کہ کام ہونے کے بعد دوں گی یہ اور رکھ لو۔“

”ابھی پولیس کو چھوڑنا تک ہے۔ وہ پوچھ رہا تھا۔“

”جب اسے چھوڑنا ہوگا، میں خون کر دوں گی۔ اور ہاں، ایک کام اور کر دو۔ اس کی ماں کے نام جو خط ہے وہ اپنے کسی آدمی کے ہاتھ پہنچا کر اس کے گھر پہنچا دو۔“

”میں ابھی کسی کو بھیجتا ہے۔ وہ لڑکا اپنا ایڈریس خود اگل دے گا۔“

راحیلہ وہاں سے نکلتی تو اتنی خوش تھی کہ گھر پہنچنے ہی اس نے پہلے یہ چیک کیا کہ لائبہ واپس آ چکی ہے یا نہیں اور پھر اعجاز کو فون کر دیا کہ وہ تمام کام چھوڑ کر فوراً گھر پہنچے۔

لائبہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کہ اس کے ڈیڈی کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ وہ وقت سے پہلے دفتر سے واپس آ گئے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر آ جاتے تھے۔ غیر معمولی بات تو اس وقت بن گئی جب اسے بلایا گیا۔ ڈیڈی نے آتے ہی اسے بلایا ہے، خدا خیر کرے۔ وہ ان کے کمرے میں پہنچی۔ راحیلہ اس کے پہنچنے سے پہلے وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا ہاتھ ٹھنکا۔ اعجاز احمد اور اس کے تعلقات ایسے نہیں تھے کہ وہ ان کے استقبال کے لیے ان کے کمرے میں آگئی ہو۔ ضرور کوئی اہم بات تھی۔

”آؤ بیٹھو لائبہ۔“ راحیلہ نے اسے بٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر اعجاز احمد سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ دونوں بہت پریشان تھے کہ دانش کمال وعدہ کر کے کیوں نہیں آیا۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے۔ لائبہ کو میں نے اس لیے بلایا کہ وہ جس صدمے سے دوچار ہے اس سے باہر نکل آئے اور آپ کو بھی آئندہ کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے کوئی شخص مجھے یہ خط دے کر گیا ہے۔ اسے آپ بھی بڑھائیں اور لائبہ کو بھی پڑھوادیں۔ میں اس خط کو چھپا بھی سکتی تھی لیکن ضروری ہے کہ آپ دونوں اسے پڑھ لیں۔“

دانش نے دونوں خطوں پر ایک نظر ڈالی۔ پہلے خط پرتو اسے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا لیکن لائبہ کے نام لکھے گئے خط پر نظر ڈالتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس خط پر دستخط کرنا لائبہ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کے مترادف تھا۔ ”میں ان خطوں کی نقل نہیں کروں گا۔“

”مستان!“ شیر و کی آواز یوں گونجی جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ”اس خنزیر کا ہاتھ پاؤں باندھ دو۔“ ایک آدمی اوپر گیا اور رسی لے کر آگیا۔ شیر و کے آدمیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور کٹھری بنا کر ڈال دیا۔ دانش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔

”یار اسے سمجھاؤ۔“ شیر و نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں سے کہا۔

”ابھی دادا کا بات مان لو۔ اب بھی وقت ہے۔ دادا کا ہاتھ اٹھ گیا تو پھر کوئی نہیں روک سکے گا۔“

”نہیں، میں نہیں مانوں گا۔“

اس کے کانوں میں سانپ کی بھینکا روں جیسی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ شیر و کی دہکتی ہوئی سائیس تھیں۔ ”میرا ہنسر لے کر آؤ۔“

ہنسر کا نام سنتے ہی دانش کا بدن خود بہ خود کانپنے لگا۔ یہ لوگ میری چیزیں ادھر دیں گے۔ میری بیچیں سننے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ بالآخر مجھے ان کا حکم ماننا پڑے گا تو ابھی کیوں نہ مان لوں۔ خط پڑھ کر لائبہ مجھ سے بدظن ہی تو ہوگی۔

ہو جائے۔ میں یہاں سے نکلنے ہی اس کی غلط فہمی دور کر دوں گا بلکہ اس کے باپ کا چہرہ ایسا بے نقاب کروں گا کہ وہ باپ سے بدظن ہو جائے گی۔ اخبارات میں کئی دوست ہیں۔ پریس کا سہارا لوں گا لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب میں باہر نکل جاؤں گا۔ مجھے ضد چھوڑ کر باہر نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔

”نفسرو۔“ وہ زور سے چیخا۔ ”میں تیار ہوں۔“

”کھول دوا سے۔“ شیر خان نے کہا۔

وہ اپنے ساتھ کاغذ اور قلم لے کر آیا تھا۔ دونوں چیزیں دانش کے ہاتھ میں دے دیں۔ راحیلہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دونوں خط بھی اس کے سامنے رکھ دیے۔

دانش نے دونوں خطوں کی نقل کی اور اس کے حوالے کر دیے۔

”اب تو مجھے رہائی مل جائے گی۔“ دانش نے پوچھا۔

”اس کا فیصلہ ام نہیں سینہ صیب کرے گا۔ ان کے حکم پر تم کو لایا گیا تھا، ان ہی کے حکم پر چھوڑا جائے گا۔“

یہ لوگ ہدایت کے مطابق راحیلہ کے بجائے بار بار

اپنی ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ بچے اس پر ہنستے ہیں تو وہ سارا کھیل ہی بگاڑ دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ہار گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سب اسے بے وقوف سمجھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ اس نے بھی کھیل بگاڑ دیا۔

اگر میں یہاں رہی تو اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکوں گی۔ میں نے جب بھی دانش کو تلاش کر لیا اور اس سے باز پرس کی تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کرے گا۔ جھوٹی بچی باتیں پریس میں آئیں تو میرے خاندان کی کیا عزت رہ جائے گی۔ جو اپنے بے وفا ہونے کا اعلان کر رہا ہے، اس سے وفا کی امید کیوں رکھی جائے۔

وہ اگر مجھ سے آکر معافی بھی مانگ لے تو بھی اس زخم کا علاج نہیں ہو سکتا جو وہ مجھے دے چکا۔ وہ مرد ہے۔ رسوائی کا داغ تو مجھے ملا ہے۔ میری سگی ماں ہوتی تو چھپ کر روتی۔ سوتیلی ماں ہے کل کر بنے گی۔ میں سامنے ہوں گی تو زیادہ بنے گی۔ اب میں اس کی آوارگی پر طعنہ زن نہیں ہو سکوں گی۔ ڈیڈی سے یہ امید نہیں کرو کہ اس کا منہ بند کر دیں گے۔ یہی وہ موسم ہوتا ہے جب دلوں میں خودکشی کے بو دے بڑ پکڑتے ہیں۔ اس کے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا لیکن اس میں بھی رسوائی تھی۔ باتیں پھر بنیں گی کہ جوان لڑکی نے خودکشی کیوں کر لی۔ ڈیڈی کی کس کو جواب دیتے پھریں گے۔ ہنسنے والے اس وقت بھی نہیں گے۔

دانش کا بھائی جمال اسی طرح دندناتا ہوا میرے سامنے سے گزرا کر رہے گا۔ میں اتنی بے اعتبار ہو گئی ہوں کہ نہ اسے روک سکوں گی نہ ڈیڈی سے شکایت کر سکوں گی۔ میرا ثبوت تو مئی کے ہاتھ میں ہے۔ مئی کے اعمال کا میرے پاس کیا ثبوت ہے۔ میں تو وہ چاہی ہوں جس کی تلوار میں عالم جنگ میں ٹوٹ گئی۔ اب فرار ہی بقدر ہے۔

وہ صبح تک فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ یہ ملک چھوڑ کر چلی جائے گی۔ ہیڈش کے لیے نہیں تو کم از کم اس وقت تک کے لیے جب تک بے وفائی کے زخم بھر نہیں جاتے۔ وقت بڑا استاد بھی ہے اور بڑا معالج بھی۔

ایک زمانہ وہ تھا جب اعجاز احمد اسے دشمنوں کی نظروں سے بچانے کے لیے ملک سے باہر بھیجتا چاہتے تھے۔ ایک وقت یہ آیا کہ وہ خود یہ فیصلہ کر رہی تھی۔

رات میں کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو آنسو پھر اس کے آنکھ سے سرکھ کر رہے تھے۔ یہ بچھتاوا ہے یا سب سے بچھڑنے کا دکھ؟ ڈیڈی اکیلے رہ جائیں گے۔ اس کے دل میں ایک تیر سا بوسمت ہو گیا۔ میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ دور

اس خط کو پہلے اعجاز نے پڑھا اور پھر مردہ ہاتھوں سے لائبریری کی طرف بڑھا دیا۔ اعجاز تو کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن خط پڑھتے ہی لائبریری بھی۔

”یہ جملی خط ہے۔ کوئی ہے جو میرے خلاف سازش کر رہا ہے۔“ وہ کہہ ضرور رہی تھی لیکن اس کی آواز میں اعتدال نہیں تھا۔ وہ دانش کے گھر ہو آئی تھی اور بہت سی حقیقتیں اس پر ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس کی بے وفائی کے لیے نگار کی گواہی بہت تھی۔

”مجھے یہ پتا نہیں کہ جعلی ہے یا اصلی ہے۔ مجھے تو کسی نے لاکر دیا اور میں نے تمہیں دے دیا۔“

”دبی، آپ خود سوچیں، اسے اگر نہیں آتا تھا نہ آتا۔ خط کیوں لکھتا۔“

”اس لیے لکھتا کہ آئندہ تم اس سے نہ ملو۔“

”میں پھر جیتی ہوں یہ کوئی سازش ہے۔ یہ خط یا تو اس سے زبردستی لکھوایا گیا ہے یا کسی نے اس کے نام سے لکھا ہے۔ وہ یہی باتیں مجھ سے فون پر بھی کہہ سکتا تھا۔“

”اسے کیا کرنا چاہیے تھا کیا نہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم جانو تمہارے ڈیڈی کی جانتیں۔“

اعجاز بہت دیر سے خاموش تھا مگر اب خاموش نہ رہ سکا۔ وہ لائبریری پر برس پڑا۔

”دھوپ نکلی ہوئی ہے اور تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ تم اب بھی اس بے وقافتے کی حمایت کر رہی ہو۔ اس نے صاف لفظوں میں تمہاری حیثیت تمہیں جتنا دی اور تم اب بھی ہمیں جھوٹا سمجھ رہی ہو۔ اب اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ تم اسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کرو گی ورنہ وہ تمہاری عزت سرعام اچھالے گا۔ اگر اب بھی تم نہیں مانتیں تو میں تمہارا گھر سے لکھنا بند کر دوں گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور بیٹھ کر سوچو کہ اپنے باپ کو اور کتنا بے عزت کرو گی۔“

وہ اپنے کمرے میں اس طرح آئی جیسے تیز ہوا میں پتے اڑتے ہیں۔ بادل گھر کے آئے اور پھر بل ٹھل ایک ہو گیا۔ جتنی دیر وہ روکتی تھی روکتی۔

اس نے سب کے سامنے دانش کی حمایت ضرور کی تھی کہ کوئی اس کے انتخاب کی غلطی نہ اڑائے لیکن حقیقت یہ تھی کہ دانش کی طرف سے اس کے دل میں بھی بال آ گیا تھا۔ وہ اس کے گھر سے ہی مایوس ہو کر لوٹی تھی۔ واپس آئی تو یہ خط پڑھ لیا۔ خط کے الفاظ اسے پرتاڑتے تھے کہ جو بھی پڑھتا اسے دانش کی بے وفائی کا یقین آ جاتا۔ یقین لائبریری آ گیا تھا لیکن خود کو جھٹلانے کا عمل جاری تھا بالکل اس بچے کی طرح جو کھیل میں ہار جاتا ہے لیکن

جا کر خود فیصلہ کروں گی کہ مجھے کہاں داخلہ لیتا ہے۔ داخلہ ملنے تک کسی ہوٹل میں رہ لوں گی۔ داخلہ ملنے کے بعد ہوٹل میں شفٹ ہو جاؤں گی۔ بس آپ سے ایک درخواست ہے آپ کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ میرے خلاف سازشیں کرنے والے وہاں بھی میرا تعاقب کرتے رہیں گے بلکہ تھوڑے دنوں تک تو میں آپ کو بھی خبر نہیں ہونے دوں گی کہ میں کہاں ہوں۔ مئی سے ہوشیار رہیے گا اور اپنا خیال رکھیے گا۔“

اس کی ماں کو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بیرون ملک جا رہی ہے، کہاں؟ یہ صرف اسے معلوم تھا۔ وہ امریکا چلی گئی۔ کس شہر میں گئی ہے یہ اعجاز احمد کو بھی معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

لائبہ کے درمیان سے بٹتے ہی راحیلہ کو کئی بھولے ہوئے کام یاد آ گئے۔ اس کے تمام کام حسب منشا ہو گئے تھے۔ دانش نہ صرف راستے سے ہٹ گیا تھا بلکہ لائبہ کے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ دانش کے دل میں اعجاز کی طرف سے ایسی نفرت بھری تھی کہ وہ اسے قتل بھی کر سکتا تھا ورنہ یہ تو کر سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کو بھی اپنی بیوی نہ بنائے۔ ایک لائبہ کا کاٹنا تھا وہ بھی نکل گیا۔ اب اعجاز اکیلہ رہ گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اگر وہ اسے قتل بھی کر دیتی تو بھی الزام دانش پر ڈال سکتی تھی کیونکہ وہ یہ ثابت کر سکتی تھی کہ دانش کو اعجاز نے اغوا کر لیا تھا۔ جواز یہ تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے اس کی شادی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی وقت یہ بھی کر سکتی تھی کہ لائبہ کو یہ باور کرا دے کہ دانش کے اغوا میں اس کے باپ کا ہاتھ تھا۔ جعلی خط بھی اسی نے لکھوایا تھا۔ شیر و اس کی گواہی دے سکتا تھا۔ یہ سب ہتھیار اس کے پاس محفوظ تھے۔

اس نے شیر و کو فون کر دیا۔ ”چچی کو آزاد کر دو۔“ یہ پیغام ملنے ہی شیر و نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ دانش کی آنکھوں پر پٹی باندھوا دو اسے تھانے سے باہر لے آؤ۔ ”ہم تمہیں تمہارے گھر کے قریب چھوڑ آئیں گے۔“

تم صرف ایک نام یاد رکھو گے اور وہ نام ہوگا سیٹھ اعجاز کا۔ اگر تم نے ہم میں سے کسی کا نام لیا تو تمہاری زندگی کا وہ آخری دن ہوگا۔ تم سبق کی طرح یاد کرو کہ تمہیں سیٹھ اعجاز نے اغوا کر لیا تھا اسی نے تم سے خط لکھوایا تھا تاکہ تم اس کی بیٹی سے بدظن ہو جاؤ۔“

جس طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے لایا گیا تھا اسی طرح اندھیرے میں واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ اسے کچھ

بیٹھ کر بھی ان کی خیریت سے باخبر رہوں گی۔ اس دکھ میں نفرت کی ایک لہر بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دانش نے مجھے کس حال پر پہنچا دیا ہے۔ کیا بھی اسے اپنا کہہ سکوں گی؟ وہ رات کو نہ جانے کب تک جاگتی رہی تھی۔ صبح بھی تو اعجاز احمد آفس جا چکے تھے۔ اس کا جی نہیں چاہا کہ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے اور ماں کا سامنا کرے۔ ان کی آنکھوں سے نکلے ہوئے تیر اس کے دل میں ہیوست ہوتے تھے۔ وہ خاموشی سے نگلی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اعجاز احمد نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو اتنے پریشان ہوئے کہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا پریشان ہونا جائز تھا۔ وہ شاید ہی ان کے آفس بھی آئی ہو اور وہ بھی اس عالم میں کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جیسے بستر سے اٹھ کر سیدی چلی آئی ہو۔ انہیں یوں لگا جیسے لائبہ کا بچپن ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔ بچپن میں جب اس کے بال بکھرے ہوتے تھے تو وہ راحیلہ کو ڈانٹتے تھے۔ اب وہ کس کو ڈانٹتے۔

”بیٹا، تم اور میرے آفس میں اور یہ بال کیوں بکھرے ہوئے ہیں۔ شریر پٹی، کوئی اس طرح بھی کھرے لگتا ہے۔“

”ڈیڈی، میں تو پوری بکھر گئی ہوں آپ بال دیکھ رہے ہیں۔“

”بیٹا میں نے اپنی پوری زندگی تمہاری حفاظت کرتے ہوئے گزاری ہے۔ اب بھی تمہاری حفاظت کروں گا۔ تم پریشان کیوں ہوئی ہو۔ زندگی میں آدمی بہت سے غلط فیصلے کر بیٹھتا ہے۔ تم سے بھی ایک غلط فیصلہ ہو گیا تھا۔ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح اسے بھول جاؤ۔“

”اسے بھلانے کے لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”آؤ آنکسی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ انہوں نے چہرہ اسی کو بلا کر تائید کر دی کہ کسی کو اندر نہ بھیجے۔ آنکسی میں پہنچ کر لائبہ نے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔

”آپ کو یاد ہوگا، میرے بچپن میں آپ مجھے تعلیم کے لیے باہر بھیجتا چاہتے تھے۔ میری تعلیم اب بھی ادھوری ہے۔ میں باہر جا کر اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔“

”لائبہ، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ اس وقت بڑا ضروری ہے کہ تم سال دو سال کے لیے باہر چلی جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں تمہارے لیے کون سا ادارہ اچھا رہے گا۔“

”نہیں اس میں بہت دیر ہو جائے گی۔ میں وہاں

”اے کان جیب میں رکھ کر آنا ورنہ خوب کان کھینچیں گی۔“
وہ غسل خانے سے نکلا تو بالکل بدلا ہوا تھا لیکن بہت
دلانظر آتا تھا۔

”بھائی، تم جہاں کہیں بھی تھے کسی اچھی جگہ نہیں تھے۔
کھانے تک کو نہیں مل رہا تھا۔ اہنا منہ دیکھو کیا پیلا پڑ گیا ہے۔“
وہ ماں کے پاس پہنچا تو وہ بھری بیٹھی تھیں۔ وہ اگر
مشاعرے وغیرہ میں جاتا جانتی تھا تو دو تین روز میں واپس
آ جاتا تھا، اس مرتبہ اس نے پندرہ دن لگا دیے تھے۔
ماں نے جب اپنا دل خوب ہلکا کر لیا تو وہ ان کے
قدموں میں بیٹھ گیا۔

”اماں، میں کسی غلط جگہ نہیں گیا تھا۔ مشاعرے میں
گیا تھا۔ پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہا۔ دوستوں اور
پرستاروں میں گھرا رہا۔ میں نے خط لکھ تو دیا تھا۔“
”اچھا اب زیادہ سچی بھگوانے کی ضرورت نہیں ہے۔
جمال بہت غصے میں ہے۔ اس سے ذرا نرمی سے بات کرنا۔“
”بھائی سے تو میری یاری ہے انہیں منالوں گا۔“

”بیٹا، وہ میری پڑھائی کا خرچ اٹھا رہا ہے اور تو پندرہ دن
سے یونیورسٹی ہی نہیں گیا۔ کچھ فوڈ سے داری کا احساس کرو۔“
”اب میں آگیا ہوں۔ پابندی سے یونیورسٹی جایا
کروں گا۔“

پندرہ دن سے اس نے ٹھیک طرح سے آسمان بھی
نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سوچا گھر میں رہا تو طرح طرح کے
سوالات ہوتے رہیں گے۔ وہ باہر نکل گیا۔
وہ باہر اس لیے بھی جانا چاہتا تھا کہ کھلی ہوا میں یہ سوچ
سکے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا، اس نے بہن
اور ماں کو تو کسی نہ کسی طرح بہلایا لیکن بھائی سے کیا کہے گا۔
ان غنڈوں نے اسے دھکی دی ہے کہ ان کا نام درمیان میں
نہ آئے۔ وہ بھائی سے کیا کہے گا کہ اسے کون لوگ اٹھا کر لے
گئے تھے۔ پھر اسے یاد آیا کہ ان غنڈوں کے کہنے کے مطابق
اعجاز احمد نے اسے اغوا کر لیا تھا۔ وہ ان غنڈوں کا نام نہیں
لے سکتا لیکن اعجاز احمد کا نام تو لے سکتا ہے۔ بھائی کو بھی تو
معلوم ہو کہ وہ کس درندے کی نوکری کر رہے ہیں۔ وہ جس کی
شرافت کا دم بھرتے ہیں انہیں معلوم تو ہو کہ وہ شخص اندر سے
کتنا زہریلا ہے۔

وہ ٹھٹھار رہا اور سوچتا رہا اور پھر گھر آ گیا۔ اب اسے
بھائی کے آنے کا انتظار تھا۔ جمال گھر پہنچا تو دانش کو دیکھ کر
حیران رہ گیا۔ ابھی وہ کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ دانش نے اس
کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور

معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں آیا تھا اور کن راستوں سے واپس
جارہا ہے۔

اسے ایک جگہ اتار دیا گیا۔ اترنے سے پہلے آنکھوں
سے پٹی اتار دی گئی تھی۔ اس نے اترنے کے بعد یہ غور کرنا
شروع کیا کہ وہ کہاں ہے، اتنی دیر میں گاڑی اس کی آنکھوں
سے دور ہو گئی۔ وہ تو گاڑی کا نمبر نوٹ کر سکا اور نہ یہ دیکھ سکا
کہ کون لوگ تھے جو اسے چھوڑ کر گئے ہیں۔

وہ اپنے دروازے پر بھکاریوں کی طرح کھڑا ہوا تھا۔
پندرہ دن سے وہ نہایا نہیں تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے
میلے تھے۔ وہ اپنی حالت پر غور کر رہا تھا۔ دستک دینے کی
ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا پڑوی اپنے گھر سے نکلا اور اسے
دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ شاید وہ بھی اسے پہچان نہیں سکا
تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ڈور تیل پر ہاتھ رکھ دیا۔
اس کی بہن دروازے پر آئی۔ کچھ دیر انجینوں کی
طرح اس کی طرف دیکھتی رہی پھر زار و قطار رونے لگی۔
”بھائی، تم کہاں چلے گئے تھے اور اپنی یہ حالت کیا
بنائی ہے۔“

”میرا خط نہیں ملا تھا؟“
”ملا تھا مگر تم تھے کہاں۔ اپنے کپڑے دیکھ رہے ہو
جیسے جیل سے چھوٹ کر آئے ہو۔“

”جلی اندر تو آنے دے۔ یہاں کھڑے کھڑے تماشا
بن رہا ہوں۔ اماں کہاں ہیں؟“
”اپنے کمرے میں ہوں گی۔“

”تو ایسا کر الماری سے میرے کپڑے نکال کر لے
آ۔ میں پہلے غسل کر کے انسان بن جاؤں۔ شیو بھی بنالوں
اس کے بعد اماں کو بتانا کہ میں آگیا ہوں۔“
”ٹھیک ہے تم جلدی سے نہالو۔ میں تمہارے کپڑے
لے کر ابھی آتی۔“

وہ کپڑے لینے کمرے میں گئی تو اس کی ماں نے پوچھا۔
”تو کس سے باتیں کر رہی تھی؟ کون آیا ہے؟“
”اماں، دانش بھائی آگئے۔ انہی سے باتیں کر رہی تھی۔“
”اے ہے، آگیا میرا بچہ، ذرا اسے میرے پاس تو بھیج۔
کھینچتی ہوں اس کے کان کے۔ بھیا اس نے بڑا تنگ کیا ہے۔“
”جیسے ہی نہا کر نکلتے ہیں انہی بھیجتی ہوں۔ اچھی طرح
خبر لیتا۔ سچی بڑا مزہ آئے گا۔“

وہ کپڑے لے کر گئی اور غسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹا
کر کپڑے دے دیے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اماں پوچھ
رہی تھیں۔

دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”آپ مجھ سے یہ ضرور پوچھیں گے کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے سب کو تو مختلف کہانیاں سنا دیں لیکن آپ کو حقیقت بتانا ضروری ہے تاکہ ہم دونوں مل کر کوئی فیصلہ کریں کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ بھائی، میں گیارہ گھنٹے پہلے گوا گیا تھا اور اغوا کرنے والا کوئی اور نہیں، اعجاز احمد تھا جس کی آپ نوکری کرتے ہیں۔“

”تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”میں پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے یقین بھی تھا کہ وہ یہ حرکت کرے گا۔ مجھے اغوا کرنے والے بھی بار بار کہہ رہے تھے کہ انہوں نے مجھے سیٹھ اعجاز احمد کے حکم پر اغوا کیا ہے۔“

”تمہیں ان غنڈوں کی بات کا یقین کیسے آگیا۔“

انہوں نے خود اغوا کیا ہو اور نام اعجاز احمد لے رہے ہوں۔“

”اس لیے یقین آ گیا کہ ان غنڈوں سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی جبکہ اعجاز احمد سے دشمنی تھی۔“

”اعجاز احمد سے تمہاری کیا دشمنی ہوئی جناب۔“

”مجھے کچھ باتیں اب تک آپ سے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن اب بتانا ضروری ہو گیا ہے۔ ان باتوں کے بغیر آپ میرا یقین نہیں کریں گے۔ اعجاز احمد کی بیٹی لائبہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ ہم دونوں میں دوستی پروان چڑھی، وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میری اور اس کی مالی حیثیت میں بہت فرق تھا۔ میں چاہتا تھا بات شادی تک نہ پہنچے صرف دوستی کی حد تک رہے لیکن وہ بغدھی۔ اس نے اعجاز احمد سے بات کی۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے مجھے ملاقات کے لیے بلایا اور راستے ہی سے اغوا کر لیا۔ مجھے اغوا کرنے والے یہی کہہ کر مجھے لے گئے تھے کہ سیٹھ صاحب تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں لیکن کہیں اور لے گئے۔“

”تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ تمہیں کہاں لے کر گئے تھے۔“

”ان لوگوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ مجھے مقام کا اندازہ تو نہیں ہو سکا لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ جو شخص مجھے اٹھا کر لایا تھا اس کا نام شیر و تھا۔ وہ لوگ مجھے ڈرانے کے لیے یہی نام لے رہے تھے۔“

”تمہیں شیر و نے اٹھایا تھا۔ اف میرے خدا! اس بھڑے نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا۔ یہ کوئی معجزہ ہی ہوا ہے اور اب ایک بات اور غور سے سن لو۔ یہ اعجاز احمد کی نہیں اس کی بیوی راجیلہ کی حرکت ہے۔ اسی نے تمہیں اغوا کر لیا تھا۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ شیر و اعجاز احمد کا نہیں اس کی بیوی کا تنخواہ دار ہے۔ اس کے لیے کام کرتا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا بلکہ راجیلہ نے خود مجھے بتایا تھا کہ لائبہ کسی غریب لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ تم ہو اور شاید راجیلہ کو بھی نہیں معلوم تھا ورنہ وہ یہ حرکت نہ کرتی۔ اسی نے لائبہ کو تم سے بدلتی کرنے کے لیے خط لکھوایا تھا۔ وہ خط میں نے پڑھا نہیں تھا لیکن راجیلہ نے مجھے بتایا ضرور تھا۔ اب تصدیق بھی ہو گئی کہ واقعی ایک ایسا خط لکھا گیا تھا؟“

”یہ تو ایسی بات ہے کہ اعجاز احمد کے علم میں ہونی چاہیے۔ مجھے آپ ان کے پاس لے چلیں۔ میں انہیں ان کی بیوی کی حرکتوں کے بارے میں بتاؤں تو سہی۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اعجاز احمد اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔“

”کچھ نہ کر سکیں معلوم تو ہوا نہیں۔“

”اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اعجاز احمد تمہیں پسند نہیں کرتے۔ وہ لائبہ کی خدمت سے مجبور ہو گئے تھے اور اب لائبہ سے نہیں جو تمہاری حمایت میں کھڑی ہو جائے گی۔“

”کیا ہوا لائبہ۔“

”وہ ملک سے باہر چلی گئی ہے۔ غالباً امریکا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اعجاز احمد نے خود اسے بھیجا ہو۔ میری بات مانو تو اس واقعے کو بھی بھول جاؤ اور لائبہ کو بھی۔ شیر و اتنا خطرناک آدمی ہے کہ نہ میں اس سے لڑ سکتا ہوں نہ قانون۔ راجیلہ اس سے تمہاری شادی نہیں ہونے دے گی۔ وہ ایسی عورت ہے کہ لائبہ کو بھی مروا سکتی ہے۔ تم خاموشی اختیار کر لو۔ لائبہ اگر کسی وقت واپس آئی اور تم سے رجوع کیا تو اسے حقیقت بتا دینا۔“

”میرا فرضی خط پڑھنے کے بعد اس کے دل میں میرے لیے اتنی نفرت پیدا ہو چکی ہوگی کہ واپس آنے کے بعد بھی مجھ سے رابطہ نہیں کرے گی۔ رابطہ کرنا ہوتا تو جاتی ہی کیوں۔“

”وہ واپس آگئی تو میں خود تمہیں اس کے پاس لے کر چلوں گا اور اس کی غلط فہمی دور کروں گا۔ اس کی غیر موجودگی میں کوئی بات اٹھانا خطر سے خالی نہیں ہوگا۔“

”وہ امریکا کے کس شہر میں ہے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”میں نے اعجاز صاحب سے پوچھا تھا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ خود انہیں بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ میرے خیال

میں مکمل رازداری برقی جارہی ہے۔“

”بیگم صاحبہ کا تنخواہ دار ہے۔“
”تم اپنا استعفیٰ واپس لے لو۔ میں راحیلہ سے بات کروں گا۔“

”ابسا غضب مت کیجیے گا۔ وہ ظاہر ہے انکار کر دیں گی اور میری پہلے سے زیادہ دشمن بن جائیں گی کہ میں نے آپ کو کیوں بتادیا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے گھر میں کوئی تنازع پیدا ہو۔ میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں۔ اپنی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ آپ کو بہت ملازم مل جائیں گے۔ مجھے اجازت دیں۔“

اعجاز احمد، شیر و کا نام سن کر اتنا ڈر گئے تھے کہ انہوں نے اسی میں عافیت بھیجی کہ جمال کا استعفیٰ منظور کر لیں۔

یہاں سے رخصت ہونے کے بعد وہ پریشان صورت لیے راحیلہ کے پاس گیا۔ اسے یہ بتایا کہ اعجاز احمد نے نوکری سے نکال دیا ہے۔

”صاحب نے اس شک میں مجھ سے استعفیٰ لکھوایا کہ میں ان کے کاروباری راز آپ کو بتاتا ہوں۔“

”ارے یہ تو بہت برا ہوا حال کدہم بہت سی باتیں چھپا جاتے تھے مثلاً یہی کہ تم نے مجھ سے بھی چھپایا ہوا ہے کہ لائبہ امریکا کے کس شہر میں ہے۔“

”آپ یقین کریں۔ مجھے خود معلوم نہیں۔ اعجاز صاحب سے معلوم کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن وہ کہتے ہیں انہیں خود معلوم نہیں۔“

”خیر، اب نکال ہی دیا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میرے کہنے سے دوبارہ تو رکھ نہیں لیں گے۔ رابطہ رکھنا۔ شاید تمہیں مجھ سے کوئی کام پڑ جائے۔ ہم نے جو اچھا وقت گزارا ہے اسے یاد رکھوں گی۔“

جمال کو شدت سے اپنی شکست کا احساس ہوا تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا راحیلہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گی لیکن اس کے رویے سے تو یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے خوشی ہوئی ہو۔ اس کا یہ رویہ کیوں تھا، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس کے جاتے ہی راحیلہ نے سیٹھ بدرالدین کو فون کیا۔
”آپ نے اپنے بیٹے کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ اے نوراً

میرے پاس بھیج دیں۔ جمال نوکری چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اعجاز کو نئے سیکرٹری کی ضرورت ہوگی۔ میں اعجاز سے کہہ کر اسے وقت دلا دوں گی۔ لندن سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری لے کر آجائے۔ اعجاز کو اور کیا چاہیے ہوگا۔“

”یار بیج تو دودن لیکن نہایت خوب صورت لڑکا ہے اور مجھے تمہاری سن پرستی سے ڈر لگتا ہے۔“

جمال ان واقعات کو سن کر کانپ اٹھا تھا۔ اسے اپنے بھائی کی جان خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست جلد سے جلد کرنا تھا۔ اس نے دانش کا غصہ اس وقت تو بھنڈا کر دیا تھا لیکن کسی وقت باسی کڑی میں ابال آ سکتا تھا۔ اگر اس دوران لائبہ واپس آئی اور دونوں میں پھر رابطہ ہو گیا تو بات صرف اغوا تک نہیں رہ جائے گی۔ اب اسے اعجاز احمد پر بھی اعتماد نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔ راحیلہ اور وہ دونوں مل بھی سکتے تھے۔ اعجاز احمد کیوں چاہنے لگا تھا کہ لائبہ کی شادی کسی غریب گھر میں ہو۔ اسے جو کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔

اس نے پہلے مرحلے کے طور پر یہ کیا کہ کسی نئی نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ اس کی تعلیم اور شخصیت ایسی تھی کہ اسے کہیں بھی نوکری مل سکتی تھی۔

وہ نوکری ڈھونڈتا رہا لیکن راحیلہ کو ہوا نہیں لگنے دی۔ اس نے راحیلہ کو یہ تو بتایا تھا کہ اس کا بھائی دودن سے گھر نہیں پہنچا۔ راحیلہ نے خود ہی اندازہ لگالیا تھا جس لڑکے کو اٹھا یا گیا ہے وہ اس کا بھائی ہے۔ اس کے بعد راحیلہ نے پوچھا بھی تھا تو جمال نے ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اغوا نہیں ہوا تھا

دوستوں کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ راحیلہ کو اطمینان ہو گیا تھا کہ اغوا ہونے والا کوئی اور لڑکا ہے۔ جمال کوئی نوکری مل گئی تھی۔ تنخواہ بھی اس سے زیادہ تھی جو وہ اعجاز احمد سے لے رہا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ نوکری چھوڑے کیسے۔ راحیلہ سے کیا کہے۔ اس کی ترکیب اس نے پہلے ہی سوچ رکھی تھی۔ وہ اعجاز احمد کے پاس گیا اور اپنا استعفیٰ ان کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے جمال صاحب۔ مجھ سے کیا شکایت ہوئی آپ کو۔“

”آپ سے نہیں، مجھے آپ کی بیگم سے شکایت ہے۔“

”ان سے آپ کا کیا تعلق آپ تو میرے ملازم ہیں۔“

”وہ کہتی ہیں کہ آپ کے کاروباری راز میں ان تک پہنچاؤں۔“

”آپ نہ پہنچائیں۔“

”اب تک میں یہی کرتا رہا ہوں لیکن اب وہ دھکیوں پر اتر آئی ہیں۔ میرے گھر شیر و نام کے کسی غنڈے کو بھیجا تھا۔“

شیر و کا نام سننے ہی اعجاز احمد کا رنگ اڑ گیا تھا لیکن وہ جمال کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

”یہ شیر و کون ہے؟“

تھا جب وہ اس سے خوب متاثر ہو چکے ہوں گے اور تعریف کریں گے اس وقت وہ ان سے اس کی سفارش کرے گی۔ اجازت ملتے ہی وہ اسے ڈائنگ ٹیبل پر لے آئی۔ ملازموں نے ناشتا چن دیا۔ راحیلہ کی آنکھیں ناشتے سے زیادہ اس کا طواف کر رہی تھیں۔ گرم آنکھوں کی مسلسل پیش آنے لڑکے پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی لیکن لندن کی آب و ہوا میں پانچ سال گزار کر آکر آیا تھا۔ ڈھیت بن کر ڈٹا بھی رہا۔ اعجاز احمد ٹیبل پر آئے تو اس نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ براہ راست یہ پوچھنا بدھند ہی تھی کہ کیسے آتا ہوا۔ گفتگو بھی کرنی تھی لہذا وہ اس کی تعلیم کے بارے میں پوچھنے لگے۔ اس کے مشغول کی بات نکل آئی۔ انگریزوں کے لب و لہجے میں اس کی شستہ انگریزی سن کر وہ بے حد متاثر ہوئے۔ اس کا تعمیری ریکارڈ بھی شاندار تھا۔

”آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”آج کل تو آرام کی چٹھوں پر ہوں۔ نوکری کرنے کا ارادہ ہے۔“

”نوکری؟ تمہارے چچا اتنے بڑے بزنس مین اور تم نوکری کرو گے؟“

”کاروبار میرا حجاز نہیں ہے۔ میرے والد بھی سرکاری ملازم تھے۔ ایک ایکسڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا۔“

”اوہ، ویری سیڈ، معاف کرنا ان کا ذکر کر کے میں نے تمہیں رنجیدہ کر دیا۔“

”نہیں انکل۔ موت بھی تو زندگی کا حصہ ہے۔ اب وہ میری شکل میں زندہ ہیں۔ میری ممی کہتی ہیں میں بالکل ان کی طرح ہوں۔“

”میرا تو خیال ہے تمہیں بزنس کرنا چاہیے۔ ملازمت میں کیا رکھا ہے۔“

”انکل میں اپنی تعلیم کے بل بوتے پر مشورے تو بہت اچھے دے سکتا ہوں لیکن عمل کرنا میرے بس کی بات نہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر عمل کرنا بھی سیکھ لوں لیکن ابھی نہیں یا شاید کبھی نہیں۔“

”تم بدرالدین سے کہو۔ ملازمت تو وہ بھی دے سکتے ہیں۔“

”انہوں نے کہا تھا لیکن میں انہوں کے احسان کا قائل نہیں۔ مجھے یہ بھی احساس رہے گا کہ تاپا کا آفس ہے۔ کام کروں نہ کروں ہر کام کو ”ایزی وے“ میں لوں گا۔ غیر جگہ ہوگی تو خود بخود دھخت کروں گا۔“

”بدرالدین، اب میں ایسی بدینت بھی نہیں ہوں کہ تمہارے جینے پر ہاتھ صاف کروں۔“

”اس لیے اور بھی ڈر لگ رہا ہے کہ جمال سے تمہارا دل بھر گیا ہے۔“

”وہ اور معاملات ہیں۔ تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ ویسے تمہارے جینے کا نام کیا ہے۔ تم نے بتایا تو تھا۔“

”نام ذرا پرانا ہے ویسے وہ خود دیا ہے۔“

”آپ اسے شام تک بھیج دیں۔ اعجاز گھر پر ہوں گے۔ ان سے بات ہو جائے گی۔“

اعجاز ابھی گھر نہیں پہنچا تھا کہ شمس الدین پہنچ گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو ستائیس اٹھائیس سال کا ایک لڑکا مردانہ دلکش خدو خال کا نمونہ، وجاہت سے بھرپور اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ٹھوڑی دیر بعد معلوم ہوا زندہ دل اور بانداق بھی ہے۔ راحیلہ نے گھبرا کر سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ڈن بل کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگالی اور پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”نو ٹھینک یو۔ میں نہیں پیتا۔“

”بٹے لگو گے۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔“ راحیلہ نے کہا اور جلا ہوا لائٹسگریٹ کو دکھا دیا۔

اس کی حسن پرست طبیعت نے ایک ساتھ کئی خواب دیکھ لیے تھے۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی کہ اسے اعجاز احمد کی آمد کی اطلاع ملی۔ وہ خاص مواقع پر ہی ان کے کمرے کا رخ کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ خاص موقع آ گیا تھا۔

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اعجاز احمد نے پوچھا۔

”ڈرائنگ روم میں کون آیا ہے۔ کیا بتانے آئی ہو تم مجھے۔“

”کوئی سیٹھ بدرالدین طبیب ہیں۔ یہ لڑکا ان کا بھتیجا ہے۔“

”سیٹھ بدرالدین کو میں جانتا ہوں لیکن ایسا نہیں کہ ان کا بھتیجا مجھ سے ملنے آجائے۔ کیا کہتا ہے؟“

”میری تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ آپ فریش ہو کر آجائیں۔ شاید آپ سے کچھ کہے۔“

”وہ سیٹھ صاحب کا بھتیجا ہے۔ اس کی اچھی طرح خاطر تواضع کرو۔ جب تک میں نہ آؤں سیدھے منہ بات کر لیتا۔ بدرالدین مجھے یونین کے اجلاسوں میں ملتے رہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں شکایت ہو۔“

راحیلہ نے جان بوجھ کر انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے اس نے بلایا ہے اور وہ کس مقصد سے آیا ہے۔ اس نے سوچا

اسے دراصل یہ اُمید تھی کہ اعجاز اس کی سفارش قبول نہیں کرے گا۔ وہ بدرالدین سے کہہ گئی کہ اس نے تو کوشش کی تھی اعجاز نہیں مانا۔ خود اچھی بن رہے گی اعجاز کو برابنا دے گی لیکن اب اعجاز نے خود ہی اسے رکھ لیا تھا۔ وہ تو اب یہ سوچ کر پریشان تھی کہ شمس الدین اس کے لیے کام کرے گا یا بدرالدین کے لیے۔

☆☆☆

جمال نے دراصل نوکری اس لیے چھوڑی تھی کہ اس کا رابطہ راحیلہ، اعجاز یا لائبہ سے بالکل ہی ختم ہو جائے۔ اس کا بھائی اس سے یہ نہ پوچھ سکے کہ اب وہاں کیا ہو رہا ہے۔ نوکری نہیں رہے گی تو اس کے بھائی کے ذہن سے اعجاز احمد کا نام بھی فراموش ہوتا چلا جائے گا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ دانش کا بھائی ہونے کی سزا راحیلہ سے نہ دے۔

دانش کے دل میں لائبہ کی طرف سے نفرت ڈالنے کے لیے اس نے دانش سے یہ کہا کہ لائبہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ وہ جب تم سے کوئی تعلق نہیں چاہتی تو میرا وجود کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے اعجاز احمد کو کون کیا اور انہوں نے مجھے ملازمت سے نکال دیا۔

”ایسے لوگوں کی ملازمت آپ کو کرنی بھی نہیں چاہیے۔ ملازمت کرنی ہی ہے تو کہیں اور سہی۔ اب میں نے سوچ لیا ہے۔ میں بھی ملازمت کروں گا۔ آپ کب تک ہمارا بوجھ اٹھاتے رہیں گے۔“

”نہیں تمہیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاہدہ کے گھر والے شادی کی ضد کر رہے ہیں۔ پہلے شادی کرو۔ اس کے بعد ملازمت ڈھونڈتے رہنا۔“

”شادی تو آپ کی ہونی چاہیے۔“

”بالکل ہونی چاہیے لیکن تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ وہ لوگ تمہارے انتظار میں ہیں۔ خاندان کی بات ہے انہیں زیادہ دن ٹالنا بھی نہیں جاسکتا۔“

”میں ایم لی اے کرنے کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد شادی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“

”تم شادی کے بعد بھی باہر جاسکتے ہو۔“

”شادی کے بعد دس مسئلے اور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ باہر کی ڈگری جیب میں ہوگی تو ملازمت بھی اچھے ملے گی۔“

جمال اپنے بھائی کو سمجھا تا رہا کہ وہ شادی کر لے۔ ایم لی اے کراچی یونیورسٹی سے کر لے یا باہر ہی جانا ہے تو شادی کے بعد باہر چلا جائے۔ ماں نے بھی سمجھایا لیکن وہ کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے دل میں اب بھی لائبہ کی

”بہت اچھے خیالات ہیں تمہارے۔ جگہ تو میرے پاس بھی خالی ہے۔ میرا ٹیکہ ٹری چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ تم آ جاؤ لیکن میں پہلے بدرالدین سے بات کر لوں۔“

”جتنی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ مجھے ”بک“ کر لیں۔ آپ کے کسی آفس میں اگر کوئی جگہ خالی ہو۔“

”تم میرے پاس آ جاؤ مگر شرط وہی ہے کہ پہلے میں بدرالدین سے بات کروں گا بلکہ اس سے کہوں گا کہ تمہیں میرے پاس بھیج دے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

راحیلہ بیٹھی ضرور تھی لیکن گفتگو میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ دونوں کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ کسی نے اس سے کچھ پوچھنے کی زحمت کی بھی نہیں تھی۔ شمس الدین رخصت ہوا تو راحیلہ کو موقع مل گیا۔

”آپ نے اتنی جلدی اسے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔“

”یہ کاروباری معاملات ہیں، تم سے کیا پوچھتا۔“

”یہ تو سوچا ہوتا کہ وہ بدرالدین کا بھتیجا ہے۔ دفتر کی باتیں اس تک پہنچیں گی۔“

”تمہارا ذہن سازشوں کی آماجگاہ ہے۔ جب سوچو گی منفی سوچو گی۔ بدرالدین کا کاروبار مجھ سے بڑا ہے۔ انہیں مجھ سے کیا دلچسپی ہوگی۔ انجمن تاجران کے صدر ہیں، میرے کچھ کام ہی آئیں گے۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے سوچ کچھ کر لیا ہے۔“

”میں بھی بزنس مین کی بیٹی ہوں۔ میرے پاس بھی عقل ہے۔ میں بھی سمجھتی ہوں ان باتوں کو۔“

”تم بزنس مین کی نہیں اسٹگر کی بیٹی ہو۔ سوچنے کا انداز بھی وہی ہے۔“

”تم سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے۔“

راحیلہ پاؤں جھینچے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ مصنوعی اختلاف کر رہی تھی۔ اس کی پلاننگ تو یہ تھی کہ جب وہ اٹھ کر چلا جائے گا تو وہ اعجاز احمد کو مشورہ دے گی کہ اس لڑکے کو جمال کی جگہ رکھ لے لیکن جب اعجاز نے اسے خود ہی پیش کر دی تو وہ اختلاف کرنے لگی تاکہ یہ تاثر ملے کہ شمس الدین کو ملازمت اس نے نہیں دلوائی اور اگر کل کلاں کو کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو وہ بری الذمہ ہو۔ اعجاز سے کہہ سکے کہ تم نے خود رکھا تھا اب خود ہی بھگتو۔ بدرالدین کی طرف سے اسے کھانا ہی لگا رہتا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کیا خبر اس نے کسی خاص مقصد سے اپنے بیٹے کو بھیجا ہو۔

گوئی لگا۔ شمس الدین کو بھی اس نے ممبر شپ دلادی تھی تاکہ کلب میں اس سے ملاقاتیں ہو سکیں۔ وہ بھی اس وقت موجود تھا۔ بڑے گھرانوں کی بڑی نیگات شمس الدین کی وجاہت سے متاثر بھی ہو رہی تھیں اور راجیلہ کی قسمت پر رشک بھی کر رہی تھیں۔ ایک خاتون نے تو چپکے سے کہہ بھی دیا کہ کس بوڑھی کے ساتھ بیٹھے ہو، کئی لڑکیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا ”دولت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔“

راجیلہ اس کے لیے ایک قیمتی گھڑی لائی تھی۔ ابھی تک اسے دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔

”چلو کسی اکیلی بیچ پر چل کر بیٹھے ہیں۔ میں تمہیں کوئی چیز دینے والی ہوں۔“ وہ اسے لے کر نسبتاً ایک تاریک گوشے میں چلی گئی۔

”دیکھو میں تمہارے لیے گھڑی لائی ہوں۔“ گھڑی میں لگے ہوئے ڈائمنڈ انڈیرے میں روشنی کر رہے تھے۔

”آپ کو میرا کتنا خیال ہے۔“

”تم میرے خیالوں میں آباد ہو رہے ہو۔“

”اگلے تینے اعجاز صاحب امریکا جا رہے ہیں۔“ شمس الدین نے مطلع کیا۔

”وہ ضرور لائبرے سے ملنے جا رہے ہوں گے۔ مجھ سے کہتے ہیں انہیں خود خبر نہیں کہ لائبرے کہاں ہے حالانکہ ان سے اس کا رابطہ ہوگا۔“

”مجھ سے تو کہہ رہے تھے وہاں کوئی نمائش ہے۔“

”تم سے اور کیا کہتے۔ خیر یہ باتیں چھوڑو۔ اپنا منہ کیوں کڑوا کرتے ہو۔ وہ جب تک امریکا میں رہیں گے تم میرے پاس رہو گے۔ کہو اس دعوت سے منہ کی کڑواہٹ دور ہوئی؟“

”اب تو میں کوشش کروں گا وہ اگلے تینے نہیں کل ہی چلے جائیں۔“

”چلاؤ کوئی چکر۔ مجھے بھی جلدی ہے۔ وہ بوڑھا اب مجھے زہر لگنے لگا ہے۔“ راجیلہ نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی

”میں باروم کی طرف جا رہی ہوں۔ تم تو پتے نہیں ہو۔ میرے ساتھ بیٹھو گے تو وہ دھوپا لایا ہو جائے گا۔ آؤ چلیں۔“

کھانے کے بعد موسیقی کا دور شروع ہوا۔ ”وہ کچھ تو پان کی بو اور کچھ شراب کی بو“ والا معاملہ تھا۔ شراب کے نشے میں موسیقی کا نشہ شامل ہوا تو کسی کو کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ بھی بے خود ہوئی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ شمس الدین کس وقت

محبت آباد تھی۔ وہ باہر رہ کر دراصل کچھ وقت لینا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ واپس آئے گا اس وقت تک ہو سکتا ہے لائبرے بھی واپس آجائے۔ وہ اس سے مل کر اس کی غلط فہمی تو دور کر سکتے گا۔ اس کے بعد اگر اس کا دل صاف نہ ہوا تو پھر وہ شاہدہ سے شادی کر لے گا۔

بڑوں کے درمیان بہت دن اجلاس ہوتے رہے بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ نکاح کر دیا جائے۔ رخصتی اس وقت ہو جب وہ باہر سے پڑھ کر آئے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ زنجیر پاؤں میں ڈال کر دیوانے کو چھوڑ دیا جائے۔ اب وہ بے چارہ بھاگے تو کہاں بھاگے۔

دانش کو یہ فیصلہ قبول نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر لائبرے کی غلط فہمی دور ہو گئی اور وہ اس سے شادی پر تیار ہو گئی تو وہ تو نکاح کی زنجیر میں بندھ چکا ہوگا۔ شاہدہ بے چاری کی تو زندگی برباد ہو جائے گی۔ میں اسے آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ ممکن توڑی جاسکتی ہے، نکاح کے بعد تو طلاق کا داغ لگ جائے گا۔

اس نے قسمیں کھا کر وعدہ کیا کہ وہ واپس آ کر شاہدہ سے ضرور شادی کر لے گا۔ جمال کو اس کی خند کے سامنے مجبور ہونا پڑا۔ دانش باہر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ پیسوں کے حصول اور یز اوغیرہ میں چھ مہینے لگ گئے۔

جمال مقروض ہو گیا تھا لیکن اس نے دانش کو امریکا بھیجوادیا۔

دانش نے امریکا کو اس لیے بھی منتخب کیا تھا کہ اسے ایک مہموں سی امید تھی کہ شاید وہاں لائبرے سے ملاقات ہو جائے۔ شاید وہ اسی شہر میں ہو جہاں وہ جا رہا تھا۔

☆☆☆

راجیلہ جس کلب کی ممبر تھی وہاں عشاء یہ تھا۔ عشاء کے بعد محفل موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ تو ایسی محفلوں کی ریسائی انکار کیے کرتی۔ اس نے اعجاز سے بھی کہا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے لیکن اعجاز نے انکار کر دیا۔

”ڈرائیور کو ساتھ لے جانا۔ واپسی میں رات ہو جائے گی۔“

اعجاز نے کہا ضرور تھا لیکن اسے تو جس کام کے لیے کہہ دیا جاتا تھا اس کے برعکس ہی کرتی تھی۔ یوں بھی وہ ڈرائیور کو ساتھ لے جانے کی قائل نہیں تھی۔ اس نے گاڑی نکالی اور خود ہی ڈرائیور کرتے ہوئے کلب چلی گئی۔ وہ جب پہنچ جاتی تھی کلب میں جان سی پڑ جاتی تھی اس وقت بھی اس کے پیچھے ہی مہمان اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس کے قہقہوں سے کلب

اس کے پہلو سے اٹھ کر چلا گیا۔

ساز خاموش ہوئے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ ڈرائیور اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ راحیلہ کا شراب اثر چکا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ڈرائیور کے ساتھ نہ آکر بڑی غلطی کی ہے۔ شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اور وہ اس وقت اکیلی ہے۔ خدا کرے کوئی ڈاکو بھی ملے تو جوان اور حسین ہو۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے منہ منہ میں بڑبڑاتی۔ ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھی اور وہ ہوا ہو گئی۔ سڑکیں سنان پڑی تھیں۔ وہ فل اسپڈ سے گاڑی دوڑا رہی تھی۔ ایک گاڑی مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھی لیکن شاید راحیلہ کی اسپڈ زیادہ تھی جو اس گاڑی کو قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر راحیلہ کو یونٹن لینا تھا۔ اس کے لیے اسے گاڑی کو آہستہ کرنا پڑا۔ بس یہی غضب ہو گیا پیچھے آنے والی گاڑی اس کے سر پر آ گئی۔ یونٹن لینے ہی وہ گاڑی اس کے سامنے آ گئی۔ راحیلہ کو بریک لگانے پڑے۔ اس گاڑی سے دو آدمی باہر نکلے۔ ایک نے پتول کا دست مار کر شیشہ توڑا۔ دوسرے نے نہایت قریب سے یکے بعد دیگرے تین گولیاں اس کے سر میں اتا دیں۔

راحیلہ کی گاڑی اور گاڑی میں اس کی لاش صبح تک سڑک پر پڑی رہی۔ صبح ہوئی تو کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔ مردہ راحیلہ اسپتال اور گاڑی پولیس اسٹیشن پہنچا دی گئی۔ اعجاز صبح سو کر اٹھا تو ملازموں نے اسے بتایا کہ راحیلہ رات گھر نہیں آئی۔ اس نے سوچا ضرور تھا کہ صبح تک وہ کلب میں کیا کر رہی ہے لیکن ایک امکان یہ بھی تھا کہ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی دوست کے گھر چلی گئی ہو۔ وہ آفس جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ پولیس اسٹیشن سے فون آ گیا۔ راحیلہ کی لاش کو شناخت کیا جا چکا تھا۔ فون پر اس سے کہا گیا تھا کہ وہ فلاں اسپتال میں جا کر اپنی بیوی کو شناخت کر لے۔

دونوں میں تعلقات کشیدہ تھے۔ راحیلہ کی طرف سے اس کے دل میں نفرت کے سوا کچھ نہ تھا لیکن بہر حال وہ اس کی بیوی تھی، فون سن کر وہ کہتے میں آ گیا۔ ملازموں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ کیا حادثہ پیش آ چکا ہے۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے اپنے سیکرٹری مس الدین کو فون کیا۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ اور سیٹھ بدرالدین اس کے گھر پہنچ گئے۔ ان کے آنے سے اسے بڑا ہمارا ہو گیا۔ اسپتال جا کر لاش کو شناخت کیا گیا۔ اب رپورٹ درج کرانے کا مرحلہ تھا۔

پولیس نے نامعلوم قاتلوں کے خلاف رپورٹ درج کر لی۔ پوسٹ مارم اور دوسری قانونی کارروائیوں کے بعد راحیلہ کی لاش کو اعجاز کے حوالے کر دیا گیا۔

پولیس نے جانے تو وعدہ کا معائنہ کیا۔ اعجاز سے ضروری معلومات لیں۔ وہی روایتی سوالات تھے کہ آپ کو کس پر شک ہے۔ مرحومہ کی کسی سے دشمنی تو نہیں تھی وغیرہ وغیرہ۔ پولیس کی نفیشت جاری تھی۔ اعجاز کو یہ خبریں اخباروں سے مل رہی تھیں۔ پولیس یہ دعویٰ کر رہی تھی کہ وہ مجرم کے قریب پہنچ گئی ہے۔ بعض ذرائع یہ بھی کہہ رہے تھے کہ پولیس کو کوئی گناہ فون موصول ہوا ہے جس نے پولیس کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ پھر ایک دن پولیس نے اعجاز کی کبھی میں قدم رکھ دیا۔

تمام ملازموں سے ایک ایک کر کے پوچھ گچھ کی گئی۔

سب کے بیانات سے جو نتیجہ پولیس نے اخذ کیا وہ یہ تھا کہ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ تھے۔ برسوں سے دونوں کے بیڑوم الگ تھے۔ دونوں کا رو بہ ایک دوسرے کے لیے نہایت نفرت آمیز تھا۔ راحیلہ سوتیلی ماں تھی۔ اس لیے اعجاز کو اپنی بیٹی کی حفاظت کا خیال بھی رہتا تھا۔ لائبہ کی شادی کے مسئلے پر دونوں کے شدید اختلافات ہوتے تھے۔ ایک ملازم نے یہ بھی بتایا کہ صاحب دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ راحیلہ ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ کلب جانے سے پہلے راحیلہ نے صاحب سے بھی کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلیں لیکن صاحب نے انکار کر دیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد صاحب بہت پریشان نظر آرہے تھے۔ ان کے کمرے کی لائٹ رات بھر چلتی رہی تھی۔ وہ بار بار کسی سے فون پر بات بھی کر رہے تھے۔ صبح اٹھ کر انہوں نے ایک ملازم سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ راحیلہ نہیں آئی اور پھر وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

ایک ملازم نے یہ بھی اطلاع دی کہ وہ فون پر کسی سے کہہ رہے تھے کہ وہ امریکا جا رہے ہیں۔ اس اطلاع کی تصدیق اس طرح ہوئی کہ جب پولیس نے ان کے کمرے کی ہلکی پھلکی تلاشی کی تو ان کا پاسپورٹ مل گیا جس پر تازہ ویزا لگا ہوا تھا جو دونوں پہلے ہی لیا گیا تھا۔

پولیس اس کے آفس بھی پہنچی۔ وہاں اس کے سیکرٹری سے معلومات لیں۔ اس کی باتوں سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ راحیلہ کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ شاید اس وجہ سے اعجاز احمد نے اس سے تقریباً ترک تعلق کر لیا تھا۔ دونوں ایک چھت کے نیچے رہتے ضرور تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کے لیے

بے عزتی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اس احساس نے اس کی صحت کو تیزی سے متاثر کرنا شروع کیا۔ ایک بات البتہ ہوئی، سیٹھ بدرالدین سے اس کے تعلقات بڑھنے لگے۔ انہوں نے جو اس کا ساتھ دیا تھا وہ اسے ان کا احسان کہتا تھا۔ لائبہ کو لگے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ ان دو برسوں میں کئی انقلاب آ گئے تھے۔ راحیلہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ وہ اس الزام میں خیل جاتے جاتے بچا تھا۔ اسے دل کی تکلیف رہنے لگی تھی۔ لائبہ سے اس کا رابطہ تھا لیکن اس نے کوئی خیر اس تک نہیں پہنچائی تھی۔ یہ تک نہیں بتایا تھا کہ راحیلہ اب اس دنیا میں نہیں رہی بلکہ راحیلہ کے قتل کے بعد تو اس نے سوچ لیا تھا کہ لائبہ کے گھر بھی تو وہ اسے نہیں آنے دے گا۔ جن ہاتھوں نے راحیلہ کو قتل کیا وہ لائبہ کی طرف بھی بڑھ سکتے ہیں۔

شہر کے حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ کاروبار باری حالات تو بہت ہی دگرگوں تھے۔ راحیلہ بھی تھی اس کی بیوی تھی۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد وہ بالکل ہی تنہا رہ گیا تھا۔ سیٹھ بدرالدین اسے برابر مشورہ دے رہے تھے کہ وہ اپنا کاروبار اسٹاپ کرے اور ملائیشیا چلا جائے۔ لائبہ کو بھی وہیں بلا لے۔ انہی دنوں اس کی ایک فیکٹری میں آگ لگ گئی، لگی کئی گھنٹے لگی گئی تھی۔ کچھ دنوں پہلے اس کے پاس فون آیا تھا۔ اس سے دس لاکھ روپے بھتا مانگا جا رہا تھا۔ اس نے انکار کر دیا اور اس کی فیکٹری کو آگ لگا دی گئی۔ آگ سے جو نقصان ہوا وہ الگ۔ متعلقہ محکموں نے رشوت کے لیے منہ بھڑا دیے۔ لیبر قوانین پر عمل ہو رہا تھا یا نہیں، آگ بجھانے کے آلات مکمل تھے؟ عمارت کی تعمیر ایسی تھی یا نہیں کہ بوقت ضرورت مزدوروں کی جان بچائی جاسکے۔ انشورنس والے یہ تصدیق چاہتے تھے کہ آگ اس نے تو نہیں لگوائی۔ پولیس الگ رشوت طلب کر رہی تھی۔ اس وقت بھی سیٹھ بدرالدین اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ یہ ان کا دوسرا احسان تھا جو اس پر ہوا تھا۔

ایک فیکٹری میں انکشاف ہوا کہ لاکھوں روپے کا نمین ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی کوٹھی ملازموں پر چھوڑی ہوئی تھی۔ ایک روز معلوم ہوا ایک نہایت ہی با اعتماد ملازم لاکھوں ڈالر کے کرفرار ہو گیا۔

دو اور دو پانچ سو پنے والا ذہن دو اور دو تین کیسے سوچ سکتا تھا۔ اس کا دل یہ صدمے نہ سہہ سکا۔ ایک روز اسے ہارٹ اٹیک ہوا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس وقت وہ آفس میں تھا۔ اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کی

انجینی تھے۔ یہ خوفناک انکشاف بھی ہوا کہ اعجاز احمد اپنا آدھے سے زیادہ سرمایہ بیرون ملک منتقل کر چکا ہے۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا لیکن راحیلہ کے قتل کے بعد اس کے دوسرے معنی ہو گئے تھے۔ پولیس نے یہ سمجھا کہ وہ باہر بھاگنے کا منصوبہ تیار کر رہا تھا۔ لائبہ امریکا چلی گئی تھی۔ اس کے امریکا چلے جانے کو بھی اس منصوبے کا حصہ سمجھا گیا۔ پہلے بیٹی کو باہر بھیجا یا خود فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ان معلومات کے بعد پولیس نے اعجاز احمد کو راحیلہ کے قتل کے الزام میں باقاعدہ گرفتار کر لیا۔ اس سے جو ابتدائی پوچھ گچھ کی گئی۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوا کہ راحیلہ اور اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اس نے یہ تو انکار کیا کہ راحیلہ کے قتل میں اس کا ہاتھ ہے لیکن دوسرے شواہد سے انکار ممکن نہ تھا۔

پولیس ایک گناہ منی فون کے بعد حرکت میں آئی تھی۔ فون کرنے والے نے بتایا تھا کہ وہ اس کا قریبی دوست ہے اور پورے دو سو قے کے برابر ہے کہ راحیلہ سے جان چھڑانے کے لیے اس نے راحیلہ کو قتل کرایا ہے۔ اب پولیس کو صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ اس نے کرائے کے کن قاتلوں کو استعمال کیا۔

پولیس نے اپنی مددیت میں مقدمہ درج کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا اور مزید تفتیش کے لیے ریمانڈ بھی حاصل کر لیا۔ معاملہ اتنا دلچسپ تھا کہ ان خبروں سے اخبارات بھر گئے۔ ہر زبان پر یہی چرچے تھے۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ اخبارات نمک مرچ لگا کر ان واقعات کو اچھال رہے تھے۔

سیٹھ بدرالدین، اعجاز احمد کی ہمدردیاں خریدنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے انجمن تاجران کی طرف سے احتجاجی مظاہروں کا آغاز کر دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ سیٹھ اعجاز کو بے قصور گرفتار کیا گیا ہے اسے رہا کیا جائے۔

سیٹھ بدرالدین نے اپنی طرف سے ایک وکیل بھی کھڑا کر دیا۔ ریمانڈ کی مدت ختم ہونے کے بعد جب ساعت کا آغاز ہوا تو وکیل نے دلائل پیش کیے اور عدالت کو باور کرایا کہ چونکہ سیٹھ اعجاز احمد ایک معزز شہری ہیں اور ابھی ان پر کوئی الزام ثابت بھی نہیں ہوا اس لیے انہیں ضمانت پر رہا کیا جائے۔ یہ ضمانت دی جاتی ہے کہ وہ ملک سے فرار نہیں ہوں گے۔

اعجاز احمد کو ضمانت پر رہائی مل گئی۔ چند ساعتیں اور ہوئیں۔ اس پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ وہ باعزت بری ہو گیا لیکن وہ باعزت عدالتوں کے نظموں میں تھا۔ اسے اپنی

گھونے نکل جاؤں گا۔ کاروبار تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔“
 ”آپ فگر نہ کریں میں کل ہی آفس جاتی ہوں۔ آپ
 کی تمام فیکٹریوں کا دورہ بھی کروں گی۔“
 ”شمس الدین کو ساتھ لے لیتا۔“

وہ اپنے کمرے میں آئی تو ہر چیز اسی طرح جی ہوئی
 تھی۔ ایک ایک چیز کو دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔
 صرف دو سال بعد آئی تھی لیکن ہر چیز بدل گئی تھی۔ اسے
 راجیلہ یاد آئی۔ وہ کیسی بھی نہیں مگر ان کے دم سے کتنی رونق
 رہتی تھی۔ اب تو اتنی بڑی کوٹھی میں دل لگانا محال ہے۔
 دوسرے دن وہ آفس گئی۔ شمس الدین اسے پہلی مرتبہ
 دیکھ رہا تھا۔

سیٹھ بدر الدین نے سنا کہ لائبہ آگئی ہے تو وہ بھی اس
 سے ملنے آئے۔ اس سے پہلے انہوں نے لائبہ کو دیکھا تک
 نہیں تھا۔ وہ لائبہ سے ملے اور اس سے گفتگو کی تو کچھ اور
 سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اب طریقہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ اس
 نے کاروبار سنبھال لیا تو اعجاز احمد کو استعمال کرنا مشکل
 ہو جائے گا۔ اگر طریقہ یہ استعمال کیا جائے کہ سائبہ بھی مر
 جائے اور لائبہ بھی نہ ٹوٹے تو اس سے بہتر اور کیا ہوگا۔ شمس
 الدین تو میری مٹھی میں ہے۔ اگر اعجاز احمد کی دولت شمس
 الدین کی ہو جائے تو سمجھو میری ہی ہوگی۔ اب راجیلہ تو ہے
 نہیں جو حصہ دار بنے گی۔ جو کچھ ہے لائبہ ہی کا ہے۔ اگر
 سونے کی اس چڑیا کو نظر بند کر دیا جائے تو اعجاز احمد کا تمام
 کاروبار میرا دوسرا شمس الدین ہی کا ہوگا۔

لائبہ کو پاکستان پہنچنے ہی ماضی کا وہ دردناک باب بھی
 یاد آیا تھا جو دانش کمال نے اپنے قلم سے تحریر کیا تھا لیکن اب
 اس تحریر کو دانش کمال کی بے وفائی نے دھندلادیا تھا۔ اس
 نے نفرت کا قلم اٹھایا اور اس تحریر کو جگہ جگہ سے کاٹ دیا۔ وہ
 اپنے باپ سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ میری غیر موجودگی میں وہ
 بے وفائی مجھے پوچھے آیا؟

☆☆☆

”اعجاز احمد، میرا منہ چھوٹا ہے لیکن بات بڑی کر رہا
 ہوں۔ اگر ناگوار ہوئی تو امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔“
 سیٹھ بدر الدین نے کہا۔

”بدر الدین کیوں مجھے شرمندہ کرنے پر تلے ہوئے
 ہو۔ تمہارے تو مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ اتار نہیں سکتا۔ تم
 مجھ سے کچھ کہو اور میں نہ سنوں۔ تم مجھ سے کچھ مانگو اور میں نہ
 دوں یہ تو احسان فراموشی ہوگی۔“
 ”میرے پیچھے شمس الدین کو تم نے کیسا پایا؟“

جان بچائی لیکن یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ اگر اب اسے ایک
 ہوا تو اس کا جانبر ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اسے مکمل بیدار
 کا مشورہ دیا گیا تھا۔

اسے شمس الدین پر بھروسہ تھا۔ اسے بیٹوں کی طرح
 عزیز رکھنے لگا تھا۔ تمام کام اس کے سپرد کر کے خود ستر پر چلا
 گیا۔ ضروری دستخطوں کے لیے وہ گھر آ جاتا۔ کوئی مشورہ کرنا
 ہوتا تو فون پر کر لیتا۔

ان بے بسی کے دنوں میں اسے لائبہ بہت یاد آ رہی
 تھی۔ وہ اگر ہوئی تو میری جگہ آفس میں بیٹھ جاتی۔ کام تو
 ملازم ہی کرتے لیکن نگرانی کے لیے کوئی اپنا تو ہوتا۔ وہ کبھی
 کبھی فون کر لیا کرتی تھی، بہت دنوں سے اس کا فون بھی
 نہیں آیا تھا۔ وہ ہر فون پر اسے سب خیریت ہے کی نوید
 سناتا رہا تھا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ اب بات ہوئی تو نہ
 صرف اپنی طبیعت کا بتائے گا بلکہ زور دے کر کہے گا کہ
 اب وہ واپس آ جائے۔

وہ اس کے فون کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے خود اسے
 فون کیا۔ راجیلہ کی موت سے لے کر اپنی بیماری تک کے تمام
 حالات اسے بتا دیے اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ اسے زندہ
 دیکھنا چاہتی ہے تو فوراً چلی آئے۔

لائبہ پہلی فلائٹ سے چلی آئی۔ دیکھا تو گھر کا نقشہ ہی
 دوسرا تھا۔ اس کے دل کی طرح جاڑ، ویران، سناں۔ ہر
 کردار اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا۔ راجیلہ نہیں رہی تھی۔ جمال
 نوکری چھوڑ گیا تھا۔ دانش تو کب کا جا چکا تھا۔ اعجاز احمد بھی
 کوئی دوسرا ہی کردار لگ رہا تھا نہایت کمزور۔ بات کرے تو
 سانس پھولتی تھی۔ صرف دو سال میں صدیاں گزر گئیں۔ اس
 نے آتے ہی باپ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بیرون ملک جا کر اپنا
 علاج کرائے لیکن وہ اپنی طرف سے اتنے مایوس ہو گئے تھے
 کہ باہر جانے پر تیار نہیں تھے۔
 ”اب تم آگئی ہو تو دیکھنا کتنی جلدی ٹھیک ہوتا ہوں۔
 تھوڑے ہی دن میں دیکھنا پہچان نہیں سکو گی۔“

”آپ ٹھیک ہو جائیں پھر ایک بڑی سی تقریب
 کر کے سب کو بتاؤں گی کہ میرے ڈیڑی اب پہلے سے بھی
 زیادہ جوان ہو گئے ہیں۔“

”میں تو اس وقت ٹھیک ہوں گا جب تم میرے آفس
 میں جا کر بیٹھو گی۔ آفس والوں کو بھی تو پتا چلے کہ ان کی نگرانی
 کرنے والا کوئی ہے۔ میرا سیکرٹری ہے شمس الدین۔
 بڑا لائق لڑکا ہے۔ وہ تمہیں بریفنگ دیدے گا۔ ابھی سے
 کاروبار سنبھالنا شروع کرو۔ میں ٹھیک بھی ہو گیا تو دنیا

”جی ہاں، اس دن آپ کے پاس آئے بھی تھے۔“
 ”میں الدین جو میرا سکرٹری ہے وہ بدرالدین کا
 بھیہتا ہے۔ اچھا خاندانی لڑکا ہے۔ کاروباری لوگ ہیں ہماری
 طرح، بدرالدین کا کاروبار تو مجھ سے بھی وسیع ہے۔“
 ”ڈیڈی، ان میں سے بہت سی باتیں مجھے پہلے ہی
 سے معلوم ہیں۔“

”میں یہ سب باتیں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ سیٹھ
 صاحب اپنے بھتیجے محسن الدین کا رشتہ تمہارے لیے لے کر
 آئے تھے۔“

”وہ سرمایہ دار ہیں۔ رشتہ لاسکتے ہیں اور آپ قبول بھی
 کر سکتے ہیں۔“

”لائبہ تمہیں نہیں معلوم ان کے مجھ پر بڑے
 احسانات ہیں۔ جب سب میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے انہوں
 نے میرا ساتھ دیا تھا۔“

”ڈیڈی، ایک وقت وہ تھا جب میں شادی کرنا چاہتی
 تھی اور آپ نہیں چاہتے تھے۔ اب میں شادی کرنا نہیں
 چاہتی۔“

”میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں لیکن تمہیں زندگی
 گزارنے کے لیے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت
 پڑے گی۔“

”میں الدین سے بلا کر پوچھ لیں، وہ آپ کی دولت
 کے بغیر مجھے قبول کرے گا؟“

”تم مجھ پر طنز مت کرو۔ جس لڑکے سے تم شادی کرنا
 چاہتی تھیں، اس کا خاتمہ نہ پڑھا لیا تھا۔ میں نے انکار نہیں کیا
 تھا۔ وہ خود ملاقات کے لیے نہیں آیا۔“

”کبھی اس سے ملاقات ہوئی تو خط کی بھی وضاحت
 ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے اسے آپ تک نہیں آنے دیا
 گیا تھا۔“

”وہ بعد میں بھی آسکتا تھا۔“

”کیا خبر وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔“

”لائبہ زندگی پیچھے پلٹ کر دیکھتے رہنے کا نام نہیں ہے
 آگے بڑھنے کا نام ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ
 نہیں۔ میرے بعد یہ کاروبار تمہیں سنبھالنا ہے، تمہیں کسی مرد
 کے سہارے کی ضرورت ہوگی۔“

”ڈیڈی میں آپ سے بعد میں بات کروں گی۔“

اعجاز احمد بھی اسے سوچنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔
 انہوں نے بھی ضد نہیں کی۔

لائبہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے گاڑی لی اور گھر سے

”میں الدین بھی تمہارے احسانوں میں سے ایک
 احسان ہے۔ میرا اپنا بیٹا ہوتا تو وہ بھی میرے اتنے کام نہ آتا
 جتنا وہ آیا ہے۔“

”میں نے بھی تمہاری بیٹی لائبہ کو بچپن میں کبھی
 دیکھا ہوگا یا اب دیکھا ہے۔ مجھے نہایت ذہین اور معاملہ فہم
 معلوم ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں اگر محسن الدین اور لائبہ کی شادی
 ہو جائے تو ہم دونوں کے لیے اس سے بڑی خوشی کی اور کوئی
 بات نہیں ہوگی۔“

”وہ تو ہے بدرالدین لیکن.....“ اعجاز احمد کچھ کہتے
 کہتے رک گئے۔ وہ یہ کہتے کہتے کہ لائبہ نے اتنی بڑی ٹھوکر
 کھائی ہے کہ شاید اب وہ کسی سے شادی نہ کرے۔

”لیکن وہیں کچھ نہیں۔ جو تم کہنا نہیں چاہتے وہ مجھے
 معلوم ہے۔ راجیلہ نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اعجاز کی بیٹی
 لائبہ نیو یارک میں کسی لڑکے سے ملتی رہی ہے۔ شاید محبت
 و جنت کا چکر تھا۔ راجیلہ نے کچھ لوگوں کو اس کی گمانی پر بھی
 مقرر کیا تھا۔“ بدرالدین نے جان بوجھ کر یہ باتیں کہیں تاکہ
 وہ اعجاز احمد کو اس کی حیثیت یاد دلانے۔

”جب تمہیں یہ معلوم ہے بدرالدین تو پھر یہ بھی معلوم
 ہوگا کہ وہ جس لڑکے سے محبت کرتی تھی میں نے اس سے اس
 کی شادی نہیں ہونے دی۔“

”نہیں، یہ نہیں معلوم۔ بات اتنی بڑھ گئی تھی۔ یہ مجھے
 معلوم نہیں۔“

”تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لائبہ کے دل میں میری
 طرف سے غصہ ہوگا۔ چنانچہ بات مانے یا نہ مانے۔“

”تم کہتو میں اسے سمجھاؤں۔ میری بھی تو بیٹی ہے وہ۔“
 ”نہیں۔ وہ گھر کی باتیں گھر تک محدود رکھنے کی عادی
 ہے۔ میں ہی اس سے بات کروں گا۔“

اعجاز احمد نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ لائبہ کے
 لیے اس سے اچھا رشتہ کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ محسن الدین
 آئیڈیل لڑکا ہے اور پھر سیٹھ بدرالدین کی سرپرستی حاصل
 رہے گی۔ ان کے تجربے سے لائبہ فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ لائبہ
 کے بارے میں بہت سی باتیں جانتے بھی ہیں۔ اگر بعد میں
 کوئی بات کھلی تو انہیں پہلے سے معلوم ہوگا۔

سوال یہ تھا کہ لائبہ کیسے تیار ہو۔ انہیں یقین سا تھا کہ
 ایک مرتبہ انہوں نے اس کے انتخاب کی مخالفت کی تھی اب وہ
 ان کے انتخاب کو ٹھکرا دے گی۔ اس کے باوجود انہوں نے
 لائبہ سے بات کی۔

”بیٹا بدرالدین انکل کو تو تم جانتی ہی ہو۔“

”یہ تصویر دیکھنے کے بعد آپ یہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ دانش سے ملنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو ایک معصوم لڑکی کا گھر خراب کریں گی اور اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دانش نے یہ شادی اس وقت کی تھی جب آپ امریکا گئی تھی نہیں تھیں۔ اگر اسے آپ سے واپسی ہوئی تو وہ شادی بھی نہ کرتا۔ میری اس سے تفصیلی بات ہوئی تھی۔ وہ آپ میں صرف اتنی دلچسپی رکھتا تھا جتنا لڑکے ہر لڑکی میں رکھتے ہیں۔“

وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتا، لائبرہ نے کرسی چھوڑ دی۔ بے وفائی کے وہ نقش جو اس نے امریکا میں رہ کر منادے تھے پھر ابھر آئے۔ اس نے منکبتر کے ہوتے ہوئے میرے ساتھ وقت گزارا۔ اس کی بے وفائی کے لیے یہی ثبوت کافی ہے۔ جمال ٹھیک کہتا ہے، اگر میں اب دانش کے قریب سے بھی ہو کر گزری تو یہ میری خود غرضی ہوگی۔ ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں۔ دانش اب میرا رخ ماضی بن چکا۔ اسے بھلا دینا ہی بہتر ہوگا۔

وہ گھر پہنچی تو پھر اہو طوفان تھم چکا تھا۔ اس نے چند دنوں اور انتظار کیا کہ یہ طوفان پھر تو سر نہیں اٹھائے گا۔ اب اسے صبر آچکا تھا۔ جب نہ کئی اپنی ہونہ ملاح اپنا تو دریا پار کرنے کا خیال ہی کیا۔ اب کوئی نہیں جسے خوش کروں۔ ایک ڈیڈی ہیں۔ اگر انہیں بھی خوش نہ رکھ سکے تو پھر میرے وجود کا مقصد ہی کیا۔ وہ بچپن کے ایک ایک لمحے کو یاد کرتی رہی۔ ہر طرف اس کے باپ کا پیار بکھرا ہوا تھا۔ ڈیڈی نے میری ہر فرمائش پوری کی۔ بے جا ضدیں تک پوری کیں۔ اب وہ مجھ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ وہ مانگ رہے ہیں جو میرے اختیار میں ہے۔ کیا میں انہیں یہ خوشی نہیں دے سکتی؟ میری زندگی تو یوں بھی بجز ہے۔ گرم ہوا کے چند پھیرے اور لگ جائیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔

وہ اعجاز احمد کے پاس گئی اور سر بھکا کر خاموش کھڑی ہو گئی۔

”ہی، میں نے تو یہ آرزو کی تھی کہ تم ہر وقت مسکراتی، کھل کھلاتی رہو گی۔ میں نے نہیں اس لیے نہیں پالا تھا کہ یوں اداس میرے سامنے کھڑی ہو جاؤ۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔ اگر تم شادی نہیں کرنا چاہتیں تو نہ کرو۔ میری بات رکھ لیتیں تو مجھے وہ خوشی مل جاتی جو مجھے کبھی نہیں ملی تھی۔“

”ڈیڈی، میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں۔ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ آپ کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ مجھے قول ہے۔“

نکل گئی۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ سڑکوں پر بے مقصد گاڑی گھماتی رہی۔ پھر یوں ہی بے مقصد اعجاز احمد کے آفس کی طرف نکل گئی اور سیدھی جس الدین کے پاس پہنچی۔

”آپ کو معلوم ہے جمال احمد نے استعفیٰ کیوں دیا تھا۔“

”مجھے معلوم نہیں کیونکہ یہ میرے آنے سے پہلے کی بات ہے۔“

”کہیں ایسا تو نہیں آپ کو لانے کے لیے انہیں نکالا گیا ہو۔“

”میرے خیال میں ایسا نہیں ہے کیونکہ مجھے اعجاز صاحب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ نوکری چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ میں نے تو اعجاز صاحب سے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ ان کا سیکرٹری چلا گیا ہے میں اس کی جگہ لے لوں۔“

”یہ آپ بتا سکتے ہیں کہ اب وہ کہاں نوکری کر رہے ہیں۔“

”ہاں، مجھے معلوم ہے۔ اعجاز صاحب نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔“ جس الدین نے اسے جمال کے آفس کا پتا بتا دیا۔

”بس مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔“

وہ وہاں سے نکلی اور سیدھی جمال کے آفس پہنچ گئی۔

”آپ مجھے بتا سکتے ہیں، آپ نے ڈیڈی کے آفس سے استعفیٰ کیوں دیا؟“

”مجھے وہاں سے اچھی آفر فیملی میں یہاں چلا آیا۔“

”آپ مجھ سے اصل بات چسپا رہے ہیں۔“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، آپ کو زیادہ دلچسپی لینے بھی نہیں چاہیے۔ یہ تو آپ اپنے ڈیڈی سے جا کر پوچھیے کہ انہوں نے میرا استعفیٰ قبول کیوں کیا۔“

”دانش کہاں ہے؟“

”آپ اس کا تعاقب چھوڑ دیں۔ اس نے شادی کر لی ہے اور بیرون ملک شفٹ کر گیا ہے۔“

”آپ پھر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔“

”اتفاق سے اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے ایک ثبوت میرے پاس موجود ہے۔“

جمال نے اپنے والٹ سے ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس تصویر میں دانش کمال اپنی منکبتر شاہدہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شاہدہ دلہن بنی ہوئی تھی اور دانش کے گلے میں ہار پڑا ہوا تھا۔

یہ اس وقت کی تصویر تھی جب وہ بیرون ملک جا رہا تھا۔ اس کی ماں نے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے شاہدہ کو دلہن بنا دیا تھا۔ تصویر سے یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے یہ تصویر دانش کی شادی کی ہے۔

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پیکھلہیری
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایجنٹ زیدی
کیرل و ریڈیا کسٹار کا مستقل و بروکھلیم
ملٹی ایوارڈ بولڈر



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

کان نمبر 62، ستریت نمبر 20، بکس 81-G
برائے (کسی پاک ایس ایم ایف)
فون: 2854595 - 2255880 (051)
موبائل: 0300-8566188
فکس: 2261636

مستقل
پتہ

9- اپریل 30 تا مئی
9- اگست 30 تا ستمبر
9- دسمبر 30 تا جنوری



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

گلف سینٹر

14- فروری تا 27 فروری

آفس نمبر: 16

فیروز پور روڈ، سٹریٹ چنگی

نور کسمپوت (آرٹیکل) لاہور

موبائل: 0300-8566188

قیام

14- جون تا 27 جون

14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

ہیٹل السین

کیم فروری تا 11 فروری

قیام

کیم جون تا 11 جون

کیم اکتوبر تا 11 اکتوبر

فون: 2218215-9 (0521)

موبائل: 0300-8566188

ملتان

کراچی

ہیٹل سلیو سٹیٹ

13- مارچ تا 27 مارچ

آفس نمبر: 706

نور کسمپوت (آرٹیکل) لاہور

فون: 4518061-62 (061)

4582803 (0300-8566188)

قیام

28- جولائی تا 6 اگست

28- نومبر تا 7 دسمبر

ہیٹل سلیو سٹیٹ

13- مارچ تا 27 مارچ

آفس نمبر: 706

نور کسمپوت (آرٹیکل) لاہور

فون: 021-7012068-9

موبائل: 0300-8566188

قیام

13- جولائی تا 27 جولائی

13- نومبر تا 27 نومبر

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

صفائی پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ اس کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تو تھیک ورنہ شاہدہ سے شادی کر لے گا۔

وہ تین سال بعد آیا تھا اور بڑی بات یہ کہ آگیا تھا ورنہ کوئی اور تو نہیں بھال یہ سمجھ رہا تھا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا کیونکہ اسے حقیقت معلوم تھی۔ جب وہ آگیا تو گھر میں خوشی کا طوفان آگیا۔ شاہدہ کی آنکھیں اس کے قدموں میں جھک گئیں۔ وہ چچا زاد بیٹی اس لیے معافی کے بعد بھی پردہ نہیں ہوا تھا۔ آزادانہ آتی جاتی تھی۔

دو تئوں کا سلسلہ شروع ہوا تو لائبر سے ملاقات کا دن ملتا رہا۔ وہ شاعر تھا، حساس تھا۔ بار بار شاہدہ کی طرف دیکھتا اور سوچتا تھا کہ اس بے چاری کا کیا تصور۔ جب میری مفتی ہوئی گئی تھی تو مجھے لائبر کے قریب نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب بھی اگر لائبر سے دوبارہ مراسم ہو گئے تو شاہدہ کا دل کتنا ٹوٹے گا۔ وہ سوچتا رہا لائبر سے ملے یا نہ ملے۔ اب اگر ایک مرتبہ ترک تعلق ہو ہی گیا ہے تو اسے بھول جائے۔ اس نے بھی اب تک بھلا دیا ہوگا۔ پھر سوچتا تھا بھلا تو دیا ہوگا لیکن میرے نام سے بھلا یا ہوگا۔ زندگی کے کسی موڑ پر اگر مل گئے تو اس کے دل میں نفرت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ پھر یہ سوچنے لگتا کہ اس کا ایک دل ہے جو ٹوٹے گا یہاں کتنے دل ہیں جو ایک ساتھ ٹوٹیں گے۔ ان میں میری ماں بھی شامل ہوگی۔ میں دنیا بنانے کے لیے آخرت خراب کر لوں؟ وہ مکشکش میں مبتلا تھا۔ دل کچھ اور کہتا ذہن کچھ اور کہتا تھا۔

ایک روز وہ اس مکشکش سے باہر نکل آیا۔ ذہن ہار گیا، دل کی جیت ہو گئی۔

”بھائی، آپ نے کہا تھا جب لائبر واپس آجائے گی تو آپ خود مجھے اس کے پاس لے کر چلیں گے تاکہ میں اپنی صفائی پیش کر سکوں۔“

”اب کوئی فائدہ نہیں۔ اب تم اسے بھول ہی جاؤ۔ وہ واپس ضرور آئے گی۔ لیکن اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اب تمہاری ہمدردی کی چھوٹی سی چنگاری بھی اس کے دھن کو جلانے کے لیے بہت ہوگی۔“

یہ خیر دانش کے دل پر بجلی بن کر گر گئی تھی۔ وہ ابتدا میں یہی سمجھا تھا کہ اس کا بھائی اس کی شادی کی فرضی خبر دے رہا ہے تاکہ وہ اس کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو جائے۔

”تم سمجھ رہے ہو گے میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک ثبوت دیتا ہوں لیکن وعدہ کرو اس کے بعد تم لائبر سے نہیں ملو گے۔ تمہاری شرافت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ

اجاز احمد نے آگے بڑھ کر اسے اپنی ہانہوں کی آغوش میں لے لیا۔ دونوں ہلک ہلک کر رو رہے تھے۔ کب کے رکے ہوئے آنسو تھے جو دونوں کو بھگور رہے تھے۔

”بہٹی میری طرف تو دیکھو۔ میں نے صرف تمہاری خاطر راجہ جیسی عورت کے ساتھ اتنے برس گزار دیے۔ میں کوئی کام اپنی مرضی سے نہ کر سکا۔ ایک کام تو مجھے اپنی مرضی سے کرنے دو۔ میں نے تمہاری ماں کے کہنے میں آکر تمہارے ساتھ کئی زیادتیاں کیں۔ اب ان کے ازالے کا وقت آگیا ہے۔ جس الدین بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گا۔“

”ڈیڈی، میری خوشی تو آپ ہیں۔ میں نے آپ کو خوش کر دیا۔ اس کے بعد کوئی دکھ میرا دکھ نہیں۔“

اجاز احمد سینٹھ بدرالدین کے سامنے سرخرو ہو گئے۔ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

شہر کے بہت بڑے گراؤنڈ میں قاتوں کے بازار لگے تو یوں لگتا تھا جیسے اجاز احمد کے پاس جتنی دولت ہے اس میں سے کچھ بھی نہیں بچائیں گے۔

مہمانوں کے ہجوم میں جمال احمد بھی تھا۔ اجاز احمد اسے بھی بلانا نہیں بھولے تھے۔

لائبر رخصت ہو کر اجاز احمد کی دی ہوئی سچی بھائی کوٹھی میں پہنچی تو اجاز احمد کا تمام کاروبار اپنے ساتھ جہیز میں لے کر گئی تھی۔

”اجاز احمد، کچھ تو اپنے لیے بھی بچا کر رکھ لو۔“ اس نے خود سے کہا تھا۔

”میں کتنے دن کا ہوں جو کچھ بچا کر رکھوں۔ لائبر کو میں نے کیا دیا ہے جو کچھ بچاؤں۔“ اس نے خود کو جواب دیا۔

جب کشتی ڈوبے لگتی ہے تب بوجھ اتار کر لے لیتے ہیں۔ وہ واقعی سارے بوجھ اتار چکا تھا۔ سانسوں کی کشتی تھی جو ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔ پھر ایک رات اس کشتی میں سوراخ ہو گیا۔ رات کو کسی وقت ہارٹ ایک ہوا۔ صبح جب وہ بہت دیر تک باہر نہ نکلا تو ملازمین نے دروازہ توڑا۔ وہ وہاں تھا کہاں جو آواز دیتا۔ وہاں تو ایک مردہ لیٹا ہوا تھا۔ سینٹھ اجاز احمد مرحوم۔

☆☆☆

دانش کمال تقریباً تین سال بعد ایم بی اے کی ڈگری لے کر آگیا۔ وہ اس نیت سے آیا تھا کہ اگر لائبر واپس آگئی ہوگی تو وہ آخری کوشش کے طور پر اس سے ملے گا اور اپنی

راحیلہ اس وقت ایسی خود سر نہیں تھی جیسی بعد میں ہوئی۔ اس کے باوجود اس نے بہت شور مچایا تھا۔ وہ مخالفت کرتی رہی اور اعجاز احمد جیت گیا۔

بدرالدین کو شکست اس لیے ہوئی تھی کہ اعجاز احمد کے پاس اس سے زیادہ دولت تھی۔ کم از کم وہ یہی سمجھتا تھا۔ اس نے اس دن کے بعد سے راحیلہ کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی تھی۔ ایسے منصوبے وضع کرتا رہتا تھا کہ اعجاز احمد قلاش ہو جائے۔ کئی مرتبہ وہ اعجاز کو نقصان پہنچانے میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن سمندر سے چند قطرے نکل بھی جائیں تو سمندر، سمندر رہی رہتا ہے۔

بدرالدین بالآخر یہ سمجھنے لگا کہ اعجاز احمد اسے اپنا دشمن تصور کرتا ہے اس لیے اس کی طرف سے ہوشیار رہتا ہے۔ اگر وہ اس کا ہمدرد بن کر اس کے قریب جائے تو زیادہ کامیابی مل سکتی ہے۔ راحیلہ کے قتل کے بعد اسے یہ موقع مل گیا کیونکہ اب اعجاز یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ راحیلہ کی وجہ سے اس کے قریب آ رہا ہے۔ اس میں بدرالدین کامیاب رہا۔ اعجاز احمد اسے نہ صرف اپنا دوست بلکہ محسن سمجھنے لگا۔ بدرالدین کی بڑی کامیابی تھی کہ وہ اس کی بیٹی لائبرہ کو اس کے تمام کاروبار سمیت اپنے خاندان میں لے آیا۔ اپنے منصوبے کے مطابق وہ اعجاز کی طرح لائبرہ کو بھی قلاش کر کے گھر سے نکلوانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اعجاز کی ساری جائیداد لائبرہ کے نام ہے لیکن شمس الدین گھر کا بھیدی بن کر لٹکا ڈھا سکتا ہے۔ شادی سے پہلے اس سلسلے میں شمس الدین سے اس کی بات بھی ہوئی تھی۔

لائبرہ کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ ابھی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی لہذا موقع اچھا تھا۔ اس نے شمس الدین کو اعتماد میں لے کر یاد دہانی کرائی۔

”میں اعجاز کی بیٹی کو اس کی دولت سمیت تمہارے گھر میں لے آیا ہوں۔ چاہیوں پاس ہوں تو تجوری کھولنا مشکل نہیں ہوتا۔ اب آہستہ آہستہ لائبرہ کی تجوریاں خالی کرنا شروع کر دو۔ وہ تمہاری بیوی ہے اسے شیشے میں اتارنے کے کئی مواقع ملیں گے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اعجاز احمد کو فٹ تھم پر لے آؤں گا۔ میں اس میں آدھا کامیاب ہوا، آدھا نہیں ہوا۔ اس کام کو مکمل کرو گے۔ ورنہ سبکی اس کی بیٹی سبکی۔“

”انکل وہ اتنی سیدھی نہیں کہ اپنی دولت میرے حوالے کر دے گی۔ اس نے دنیا دہی ہے۔“

”میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ صبح اٹھتے ہی یہ کام

تم کسی شادی شدہ عورت کو اس کا ماضی یاد مت دلاؤ۔“

جمال نے لائبرہ کی شادی کا دعوت نامہ اسے دکھایا۔

”اعجاز صاحب نے مجھے بھی بلایا تھا اور یہ دعوت نامہ میں نے اسی لیے سنجال کر رکھا تھا کہ تمہیں دکھاؤں گا۔ میں خود اس شادی میں شریک تھا اس لیے قسم کھا سکتا ہوں کہ لائبرہ کی شادی ہو چکی ہے۔“

”میں اعجاز احمد کے پاس جاؤں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ خط میں نے نہیں لکھا تھا، مجھ سے لکھوایا گیا تھا اور اگر آپ نے مجھے اغوا نہیں کرایا تھا تو آپ کے نام پر مجھے کس نے اغوا کیا تھا۔“

”میری جان، اب ان سے بھی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ لائبرہ کی شادی کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔“

”اف میرے خدا! میرے تمام راستے بند ہو گئے۔ اب مجھے لائبرہ کی نظروں میں بے وفائین کر زندہ رہنا پڑے گا۔ کوئی میری فریاد سننے والا نہیں۔“

”میرے بیٹے، قدرت خود تیری صفائی کے ذرائع پیدا کرے گی۔ میری بات یاد رکھ کوئی ذریعہ ایسا ضرور نکلے گا کہ لائبرہ کو تیری حقیقت کا علم ہوگا اور وہ تجھ سے خلوص دل سے ملے گی۔ تیری قدر کرے گی۔ بس تو اس وقت یہ یقینی کر لے کہ لائبرہ کو اس طرح بھول جا جیسے وہ بھی تیری زندگی میں آئی ہی نہیں تھی۔ تیری محبت یقیناً یہ چاہے گی کہ وہ خوشگوار زندگی گزارے۔“

اس نے دلیلوں کے سب ہتھیار رکھ دیے اور شاہدہ سے شادی کر لی۔

☆☆☆

سینٹ بدرالدین کے تمام منصوبے بے آسانی پورے ہو گئے تھے۔ افسوس تھا تو یہ کہ مفلسی کا ڈانٹہ کھینچنے سے پہلے ہی اعجاز احمد دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ اعجاز احمد سے اس کی رفاقت کی کہانی بہت پرانی تھی جسے اس کے اور اعجاز احمد کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ جوانی کے دنوں میں بدرالدین اور راحیلہ کے درمیان زوردار عشق چلا تھا۔ اعجاز احمد بھی راحیلہ کے امیدواروں میں تھا۔ بدرالدین اس وقت معمولی سا تاجر تھا جبکہ اعجاز احمد کو محنت کے بغیر باپ کا تمام کاروبار ورثے میں مل گیا تھا۔ راحیلہ کے باپ کرم نواز نے جو اس وقت خود بھی معمولی درجے کا بزنس مین تھا، اعجاز کے حق میں فیصلہ دیا۔ حالانکہ اعجاز احمد کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔

شروع کر دو۔“

”میں یہ کام شاید کبھی نہ کر سکوں۔ اگر آپ کی کوئی دھنسی تھی تو اعجاز صاحب سے بھی۔ اب وہ نہیں رہے تو ان کی بیٹی سے کیوں بدلہ لیتے ہیں۔ اس بے چاری کا کیا تصور۔“

میں دیکھ رہا ہوں تمہاری نیت بدل گئی ہے۔ تم لائے کی تمام دولت اکٹیلے ہڑ کرنا چاہتے ہو جبکہ یہ طے ہوا تھا کہ اعجاز کی پانچ فیکٹریوں میں سے دو تم میرے حوالے کر دو گے۔ باقی اپنے پاس رکھو گے اور لائے کو بے ثمر چھوڑ دو گے۔“

”انکل، سچی بات تو یہ ہے کہ میں لائے کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھا تھا۔ اگر آپ کو یہ لانا نہ دیتا تو آپ اس سے میری شادی نہ کرتے۔ اب وہ میری بیوی ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے میرا ہے، میرے پاس جو کچھ ہے اس کا ہے۔ شادی ہوئی ہے تو پچھتی بھی ہوں گے۔ میں اپنے بچوں کو درہنیں کر سکتا۔“

اس صاف انکار کے بعد بدرالدین کو چپ ہو جانا چاہیے تھا لیکن انتقام کی آگ نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ وہ اپنی بد فطرت پر اتر آئے۔

”بھئی اپنی بیوی کا ماضی کرید ہے؟“

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اس کے ماضی میں جھانکوں۔ اس کا ”حال“ اچھا ہے میرے لیے یہی بہت ہے۔“

”اس سے کبھی پوچھ تو لیتا، دانش نام کے لڑکے سے تمہارا کیا تعلق تھا۔“

”اس سے کیا پوچھوں۔ آپ ہی بتا کر اپنا دل ہلکا کر لیں۔“

”دانش سے اس کے ناجائز تعلقات تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اعجاز احمد اس اوپاش لڑکے سے اس کی شادی نہیں کریں گے لہذا لائے نے اس لڑکے کے ساتھ بھاگنے کی تیاری کر لی۔ وقت مقام سب طے ہو چکا تھا۔ وہ چوراہیل کو ہوش آگیا۔ ماں سوتیلی تھی لیکن سچی تو ماں اور پھر اس کے شوہر کی عزت کا سوال تھا۔ اس نے عین وقت پر لڑکے کو اغوا کر لیا۔ لائے یہ سمجھی کہ لڑکے نے بے وفائی کی ہے۔ وہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر امریکا چلی گئی۔ اب بڑی مشکل سے باپ کے کہنے پر واپس آئی۔ اعجاز احمد نے اسے تمہارے سر قیوب دیا۔“

”انکل جب لائے اتنی خراب بھی اور آپ کو معلوم تھا تو آپ نے اس سے میری شادی کیوں کرائی؟“

”یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے شادی کرائی کہ تم آسانی سے اس کی دولت پر قبضہ کر سکو۔ تم جب بہت بڑے سیٹھ بن جاؤ تو اسے نکال باہر

کرو اور دوسری شادی اپنے معیار کی کرلو۔ تمہیں ایک راز میں نے دے دیا ہے۔ اسے بلیک میل کرتے رہو۔ وہ اپنی ساری دولت دے کر کبھی اپنی عزت بچانے پر مجبور ہو جائے گی۔ میرا کہنا نا اور کسی روز اس سے پوچھ کر تو دیکھو کہ دانش کون تھا۔“

”وہ ظاہر ہے انکار کرے گی۔ اس نے اگر جھٹلایا تو میرے پاس اسے جھٹلانے کے لیے کیا ثبوت ہوگا۔“

”تمہیں ثبوت چاہیے؟ وہ لڑکا مر نہیں گیا ہے۔ اسی شہر میں ہے۔ اس سے مل لو، وہ سب بتا دے گا۔“

”مجھے آپ اس کا ایڈریس دیں۔“

”وہ اعجاز احمد کے سابق سیکریٹری جمال کا۔ گاہ بھائی ہے اور ایک ملٹی نیشنل فرم میں اکاؤنٹس آفیسر ہے۔ یہ تو اب تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ اعجاز احمد نے جمال کو نوکری سے کیوں نکالا تھا۔ اس کا سبب بھی دانش اور لائے کا چکر ہی تھا۔“

جمال کا نام آیا تو وہ چونک اٹھا۔ اسے یاد آیا کہ شادی سے پہلے لائے اس کے پاس آئی تھی اور جمال کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ ڈیڈی نے اسے نوکری سے کیوں نکال دیا۔ پھر اس نے اس کا ایڈریس بھی لیا تھا۔ اس سے ملی بھی ہوگی..... کیوں؟

بدرالدین نے اس کے دل میں وہ شک کے بیج بو دیے تھے جو کسی بھی مرد کے لیے ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ وہ کئی دن الجھا الجھا رہا۔ کئی بار خیال آیا کہ لائے سے پوچھ لیکن یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بچانے اس کا دل برا کرنے کے لیے یہ قصے دل سے گھڑے ہیں یا نیک مرچ لگا کر سنائے ہیں اس لیے نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے لیکن ایک گناہم خلش اس کے دل میں شور بھی مچا رہی تھی کہ کسی طرح غلط ثابت کر کے چچا کو شرمندہ تو کرے۔ چچا کی بیان کردہ کہانی کے دو کردار دنیا سے اٹھ چکے ہیں ان سے تو کچھ معلوم ہو نہیں سکتا۔ دانش سے ملا جائے۔ دیکھا جائے کہ اس کے بیان اور چچا کے بیان میں کتنا تضاد ہے۔

وہ دو تین دن سوچنے کے بعد دانش کمال سے ملنے اس کے آفس چلا گیا۔

”میرا نام جس الدین ہے۔ میں لائے کا شوہر ہوں۔“

لائے کا نام سنتے ہی دانش کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کا شوہر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اسے دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب الگ سوال کیا ہوگا۔

”مشرد دانش، میں نے آپ سے اپنا تعارف کرایا ہے

اور آپ نے ہاتھ تک ملانے کی زحمت نہیں کی۔“

بیبی ایک لمحہ تجھ جب اسے ایک جواب سوجھ گیا۔

”مستر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ لائبہ میری خالہ زاد بہن

کا نام ہے۔ اس کے شوہر کو تو میں جانتا ہوں۔ آپ کس لائبہ

کی بات کر رہے ہیں اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

”آپ لائبہ کو نہیں جانتے؟“

”آپ کوئی اشارہ دیں۔ اس وقت تو اپنی کزن کے

علاوہ کوئی دوسری لائبہ میرے ذہن میں نہیں آ رہی ہے۔“

”یہ وہ لائبہ ہے جو یونیورسٹی میں آپ کے ساتھ پڑھتی

رہی ہے۔“

”اوہ! اب میں سمجھا۔ آپ سیٹھ بدرالدین کے بھتیجے تو

نہیں ہیں؟“ جمال اسے بتا چکا تھا کہ لائبہ کی شادی کس سے

ہوئی ہے۔

”جی، میں ان کا بھتیجا ہی ہوں۔“

”آئیے پھر بیٹہ کی بات کرتے ہیں۔“ وہ اسے کانفرنس

روم میں لے گیا۔ دانش کی ذہانت کو حرکت میں آنے کے لیے

اتنا وقت بہت تھا۔ اس کی ذرا سی لغزش لائبہ کی زندگی کو جہنم

بنا سکتی تھی۔ اس کے تخلیقی ذہن نے ایک کہانی گھڑ لی۔

”آپ کے بچا کو آپ سے کیا دمنی ہے؟“

”کوئی دشمنی نہیں۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”اس لیے کہ وہ کیوں چاہتے ہیں آپ اپنی بیوی کو

طلاق دے دیں۔ کیا نام بتایا آپ نے اپنی بیوی کا..... ہاں

لائبہ۔“

”وہ میرے بچا ہیں۔ وہ کیوں چاہیں گے کہ میں اپنی

بیوی کو طلاق دے دوں۔ اور یہ آپ ان کا ذکر لے کر کیوں

پوچھ گئے؟“

”اس لیے کہ وہ کل ہی میرے پاس ہو کر گئے ہیں اور

آج آپ آ گئے۔ آپ کو دیکھ کر وہ خود بخود یاد آ گئے، مجھے

آپ کی سادگی پر رحم آ رہا ہے۔“

”وہ آپ کے پاس کیوں آئے تھے؟“

”بتا دوں؟ آپ جا کر ان سے جھگڑا تو نہیں کریں گے؟“

”میں جو بھی کروں۔ آپ بتائیں وہ کیوں آئے تھے۔“

”آپ کی مرضی، بتائے دیتا ہوں۔“ دانش نے

کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”وہ مجھے دس لاکھ روپے سکے رائج الوقت کی پیشکش

کر کے گئے ہیں۔ اب یہ آپ کو بتانا ہوگا کہ قبول کر لوں یا

نہیں کر دوں۔“

”یہ پیشکش آپ کو کس کام کے لیے ہے۔ کیا کام لینا

چاہتے ہیں وہ آپ سے؟“

”وہ کہہ رہے تھے کہ تم سے کوئی پوچھنے آئے تو اسے

بتانا کہ لائبہ نام کی ایک لڑکی جو سیٹھ اعجاز احمد کی بیٹی تھی۔

تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ تم سے محبت کرنے

لگی تھی اور اپنا سب کچھ تم پر چھاد کر کے تمہارے ساتھ

بھاگنے پر تیار تھی تم بھی تیار ہو گئے تھے لیکن عین وقت پر تم

اغوا کر لیے گئے۔ لائبہ یہ بھی کہہ کر نے بے وفائی کی ہے۔ وہ

بدنامی کے ڈر سے امریکا چلی گئی۔ تمہیں اس سے دلچسپی نہیں

رہی تھی۔ تم نے بھی پلٹ کر نہیں پوچھا اور اب بتائیں لائبہ

کہاں ہے۔“

یہ سب وہی باتیں تھیں جو بدرالدین پہلے ہی شمس

الدین سے کہہ چکے تھے۔

”اس کہانی میں سچ کتنا ہے؟“ شمس الدین نے پوچھا۔

”سچ صرف اتنا ہے کہ لائبہ نام کی ایک لڑکی یونیورسٹی

میں تھی۔ بہت حسین تھی اس لیے لڑکے لڑکیوں میں بہت

مقبول تھی مغرور سمجھی جاتی تھی۔ لڑکیوں تک سے اس کی دوستی

نہیں تھی اور مجھ سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ میں

کامرس میں تھا اور وہ آرٹس کی طالبہ تھی۔ ایک دو مرتبہ اسے

دیکھا ضرور تھا لیکن اسے دوستی نہیں کہہ سکتے۔“

”سوال یہ ہے کہ میرے چچانے تمہارا ہی انتخاب

کیوں کیا۔ وہ تمہارے پاس ہی بیویوں آئے؟“

”وہ مجھے جانتے تھے۔ انہوں نے ایک مشاعرے

میں مجھے دیکھا تھا۔ آپ کو یہ بتا دوں کہ میں شاعر بھی ہوں۔

انہیں میرا کلام اتنا پسند آیا تھا کہ اپنی کوٹھی پر بلا کر مجھ سے میرا

کلام بھی سنا تھا اور انعام میں کچھ رقم بھی دی تھی جو مجھے اب

یاد نہیں۔ اس وقت میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ یہ بات سیٹھ

صاحب کو معلوم تھی۔ یہ بات تو یقیناً معلوم ہوگی کہ لائبہ بھی

یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ بس یہی سوچ کر وہ اب میرے

پاس چلے آئے۔ دس لاکھ کی پیشکش بھی کی کہ میں ان کی سنانی

ہوئی جھوٹی کہانی کو سچ بنا کر پیش کر دوں۔“

”آپ نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟“

”آپ خود سوچیں میں ایسی گھٹیا پیشکش قبول کر سکتا

تھا؟ اور اب تو بالکل نہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے

بھتیجے کے ساتھ یہ حرکت کر رہے ہیں ورنہ میں نہ صرف انکار

کرنا بلکہ انہیں ذلیل بھی کرتا۔“

”بس مجھے آپ سے یہی معلوم کرنا تھا۔ صرف ایک

بات اور بتا دیجیے، آپ کو اغوا کیوں کیا گیا تھا۔“

”سراسر جھوٹ۔ مجھے کسی نے بھی اغوا نہیں کیا۔

مشاعروں میں جاتا تھا تو کئی کئی دن گھر سے غائب ہو جاتا تھا۔ اب تو وہ بھی نہیں رہا۔“

نخس الدین مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے جمال کو فون کیا اور اسے تمام باتیں بتائیں۔ یہ تاکید بھی کی کہ اگر اس کے پاس کوئی آئے تو وہ بھی اس سے بڑکے۔ نخس الدین یہ سوچتا تھا کہ اس کے چچا اعجاز احمد کی دولت پر آنکھ لگائے بیٹھے ہیں لیکن وہ ایسا گھٹیا راستہ اختیار کریں گے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے لائبہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ صرف اتنا کہا کہ وہ اس کے چچا سے ہوشیار رہے۔ ”وہ ہر طرح سے ہمیں برباد کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان کی کسی بات پر عمل نہ کرنا اور کسی بات کا یقین نہ کرنا بلکہ ان سے اس بے رحمی سے ملوکہ ان کی یہاں آنے کی ہمت ہی نہ ہو۔“

”میں تو اس لیے ان کی عزت کر لیتی ہوں کہ وہ آپ کے چچا ہیں ورنہ مجھے وہ اچھے آدمی نہیں لگتے۔“

”میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں۔ تم یہ خیال مت کرنا کہ میرے چچا ہیں ورنہ دھوکا کھا جاؤ گی۔“

نخس الدین کے اپنے چچا سے تعلقات خراب ہوتے چلے گئے۔ اب دونوں کھلے دشمن تھے۔ بدرالدین نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھے گا۔

قدرت نے یہ موقع اسے دیا ہی نہیں۔ کسی کا پردہ فاش کرنا سب سے بڑا اخلاقی جرم ہے۔ اس نے لائبہ کو بے پردہ کرنا چاہا تھا۔ قدرت نے اس کی سزا دے دی۔ اس پر فاج کا حملہ ہوا۔ وہ زبان ہی بند ہو گئی جس سے اس نے بہتان لگائے تھے۔ اس دماغ ہی نے کام کرنا چھوڑ دیا جس سے وہ سازشیں سوچتا رہتا تھا۔ وہ نذرندہ تھا نہ مردہ تھا۔ ایک گوشت کا لوتھڑا تھا جو برسرِ پڑا رہتا تھا۔ منہ سے رال بہتی رہتی تھی۔ ایک ملازم تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے صاف کر دیا کرتا تھا۔ کچھ دنوں میں یہ ملازمین بھی تنگ آ گئے۔ اس کے منہ پر اسے گالیاں بکتے تھے۔ وہ سناتا تھا لیکن بول نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

لائبہ کی شادی کو پچیس سال ہو گئے تھے۔ اس کا بیٹا جوان ہو گیا تھا۔ پڑھنے کی طرف اس کا رجحان نہیں تھا۔ کاروباری ذہن تھا لہذا اگر بھویشن کے بعد باپ کے ساتھ آفس میں بیٹھنے لگا تھا۔ اس کی بیٹی تانیہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلی گئی تھی۔ وہ ابھی ابھی اسے ایئر پورٹ چھوڑ کر آئی تھی۔ اس کی

طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ بیٹی کے اتنی دور چلے جانے کا غم بھی تھا۔ کچھ ٹھیک بھی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا مران کو فون کر کے بتایا کہ تانیہ خیریت سے جہاز میں بیٹھ چکی ہے۔ اس کے بعد نخس الدین کو فون کیا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ لیکن اس غرض سے بھی کہ کچھ دیر سو جائے گی لیکن لیٹتے ہی تانیہ کا خیال آ گیا۔ وہ لائبہ کے ساتھ دو ایک مرتبہ امریکا کی ضرورت تھی لیکن گھونے پھرنے کے لیے جانے اور چند سالوں کے لیے مستقل قیام کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اسے ابھی سے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ الماری سے المم نکال کر تانیہ کی تصویریں دیکھنے لگی۔ دل پر عجیب سی گھبراہٹ تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی جیسے اس گھر میں مہمان آئی ہو۔ دل پھر بھی نہیں بہلاتو ڈرائنگ روم کو گاڑی دکالنے کا حکم دے کر کمرے میں آ گئی۔ اس نے سوچا تھا کچھ دیر کے لیے آفس چلی جائے۔ شاید وہاں طبیعت بہل جائے۔ اسی وقت چوکیدار نے انٹرکام پر اطلاع دی کہ کوئی بوڑھا آدمی ہے جو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ اپنا نام بتانے پر تیار نہیں ہے۔ کہتا ہے آپ نام نہن کر ملنے سے انکار کر دیں گی اور ملنا ضروری ہے۔

وہ سوچنے لگی ایسا کون ہو سکتا ہے جس کا نام مجھے ناپسندیدہ ہو اور ملنے سے انکار کر دوں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا نام میں جانتی ہوں ورنہ وہ یہ کیوں کہتا کہ نام نہن کر میں ملنے سے انکار کر دوں گی۔ اس نے کیمرا آن کیا۔ چھوٹے سے ٹی وی اسکرین پر گیت کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ ایک بوڑھا آدمی چوکیدار سے الجھ رہا تھا۔ آدمی بوڑھا ضرور تھا لیکن صحت بہت اچھی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن اسے شناخت نہ کر سکی۔ یہ گمان تک نہ ہوتا تھا کہ اس بوڑھے کو اس نے پہلے کیس دیکھا ہے۔

”اس بوڑھے سے کہو اگر کچھ امداد چاہیے ہے تو بتادے۔“ ”وہ کہتا ہے کہ، میں کچھ لینے نہیں لائبہ بی بی کو کچھ دے آ یا ہوں۔ اگر مجھے نہ ملے دیا گیا تو ان کا نقصان ہوگا میرا کچھ نہیں جائے گا۔“ چوکیدار نے بتایا۔

لائبہ کو تعجب ہوا کہ یہ بوڑھا تو اس کا نام بھی جانتا ہے اور کہہ رہا ہے کچھ دینے آیا ہے، ایسی کیا چیز ہے جو وہ مجھے دے سکتا ہے۔

”اس کی اچھی طرح تلاشی لو اور میرے پاس بھیج دو۔“ لائبہ نے اسکرین پر دیکھا۔ چوکیدار نے تلاشی لی اور اسے اپنے ساتھ لے کر اندر آیا۔ لائبہ نے کیمرا آف کیا اور

رہا ہوں۔ اب تو میں کچھ لوٹا نے آیا ہوں۔“
 ”میرے پاس سب کچھ ہے۔ مجھے کچھ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“
 ”مالکن آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں آپ کا گناہ گار ہوں۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے اور آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ آپ مجھ سے خوف زدہ نہ ہوں۔ میں شیر و ضرور ہوں لیکن میں اب پہلے والے شیر و کو دفن کر چکا ہوں۔ میں تو اس کی پرچھا میں ہوں۔ میں نے تمام برے کاموں سے توبہ کر لی ہے۔ اب تو میں رنج پر جارہا ہوں۔ رنج پر جانے سے پہلے آپ سے معافی مانگنا ضروری تھی۔ میں چلا آیا۔“
 ”میں نے تمہیں معاف کیا۔“

”ایسے نہیں۔ پہلے مجھے بتانے دو کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے۔ میرے گناہ من کر اگر تم نے مجھے معاف کیا تو مجھوں کا میری معافی ہوئی۔“
 ”جلدی کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔“
 ”مالکن، آپ کو وہ لڑکا یاد ہے جو آپ سے محبت کرتا تھا اور جسے آپ کے والد نے ملاقات کے لیے بلایا تھا؟“
 ”ہاں یاد ہے، کیا ہوا اسے۔ وہ زندہ تو ہے۔“
 ”اس کو آگوا کر لیا گیا تھا۔“
 ”بھی یاد ہے۔“

”آپ کی ماں راحیلہ کے کہنے پر میں نے ہی اسے اغوا کیا تھا۔ میں نے ہی دھمکی کے زور پر اس سے تمہارے نام خط لکھوایا تھا جو تم تک بھی پہنچا ہوگا۔ وہ الفاظ اس کے نہیں تھے۔ راحیلہ نے یہ خط لکھ کر دیا تھا کہ میں اس خط کی نقل اس لڑکے سے کرادوں۔ وہ بہت با وفا لڑکا تھا۔ کسی طرح خط کی نقل کرنے پر تیار نہیں تھا لیکن جب میں نے تشدد کے لیے ہنتر اٹھایا تو وہ ڈر گیا اور اس نے خط اپنے ہاتھ سے لکھ دیا۔ مجھے معلوم ہے یہ کتنا بڑا جرم تھا۔ اس خط نے تمہارا دل تو زودیا اور تم اسے بے وفا سمجھ لگیں، تمہیں اپنا گھر چھوڑ کر امریکا جانا پڑا۔ میں نے دو ملنے والوں کو جہاد کر دیا۔ اس سے بھیا تک جرم کیا ہوگا۔“

تمہاری ماں کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ وہ جاتے وقت اس لڑکے کا خط لے گئی تھیں اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے اڈے پر ہی چھوڑ گئی تھیں۔ میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ اب اپنے ساتھ لایا ہوں تاکہ آپ مجھے جھوٹا نہ سمجھیں۔ یہ دیکھیے۔“ اس نے وہ خط لائے۔

لائے۔ اس نے اس خط سے لبریز آنکھوں سے خط پڑھا۔

ملاقات کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد چوکیدار اسے لے کر آگیا۔ بوڑھے کو دیکھ کر لائے کے بدن میں خون جمنے لگا۔ اس کے چہرے پر بزرگ نہ شفقت نہیں کر سکتی اور دہشت تھی۔ اب کچھ کچھ یوں لگنے لگا جسے اس چہرے کو اس نے نہیں دیکھا ہے۔ وہ خوف زدہ سی ہوئی۔

”کیا چاہتے ہو؟“
 ”پہلے اپنے اس چوکیدار کو باہر بھیجو۔ اس کے سامنے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“
 ”تم کیا بتانا چاہتے ہو؟“
 ”میں نے کہہ دیا کہ اس کے سامنے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”اگر تم نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔“
 ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ اس تمہارے فائدے کی بات ہوگی۔ اگر میں نقصان پہنچانا چاہوں تو اب بھی مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ اس کی موجودگی میں بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ تم میری بیٹی کی طرح ہو۔“
 لائے نے دیکھا کہ بیٹی کا لفظ ادا کرتے ہوئے بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ہیں اور اس کی آواز کمزور پڑ گئی ہے۔ اس نے چوکیدار کو واپس بھیج دیا۔
 ”تم نے یہ ہوشیاری تو نہیں کی ہے کہ یہاں ہونے والی باتیں کوئی چھپ کر سن رہا ہو۔ کوئی آلہ ایسا تو نہیں لگا ہوا ہے کہ آواز باہر سن جائے۔“

”نہیں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔“
 ”اگر کوئی ہوشیاری کی تو نقصان تمہارا ہوگا۔“
 ”تم بات کو طول کیوں دے رہے ہو۔ جو کہنا ہے جلدی کہو۔“
 ”تم نے مجھے پہچانا؟“
 ”پہچان لیتی تو یا تو بلاتی نہیں یا اتنی احتیاط نہیں کرتی۔“

”میرا نام تو ضرور سنا ہوگا۔“
 ”تم نے اپنا نام اب تک نہیں بتایا۔“
 ”میرا نام شیر و ہے۔ ظالم خان کا گدلی نہیں شیر و۔“
 لائے کا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے چاہا کہ بیچ کر کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا لیں لیکن جینے کی طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے طاقت جمع کی۔
 ”تم کیوں آئے ہو۔ کیا چاہتے ہو، کتنی دولت چاہیے تمہیں؟“

”مالکن میں اب تک آپ ہی کے گھر کی دولت پر پلتا

ایک ایک لفظ وہی تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ”مئی آپ کا میں نے کیا بگاڑا تھا جو آپ نے میرے ساتھ یہ مہل کھلیا۔“

”را حیلہ مرہنگی ورنہ میں اس کے خون سے اپنی توبہ کا منہ دھوتا۔ اب آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی کا طلب گار ہوں۔ میں معافی کے قابل نہیں ہوں لیکن آپ مجھے معاف کر دیں۔ اعجاز صاحب بھی اس دنیا میں نہیں رہے ورنہ ان سے بھی معافی مانگتا۔“ لائبریری کے آئینوں تلے اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کی آواز ابھری۔

”شیرو، میں تمہیں دل سے معاف کرتی ہوں۔ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ کہیں میری معافی کے الفاظ تبدیل نہ ہو جائیں۔“

”مالکن، اس لو کے کو بھی معاف کر دینا جس کی طرف سے آپ کے دل میں برائی آگئی تھی۔ میں اس کا بھی مجرم ہوں لیکن میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔ میں اس کے گھر گیا تھا لیکن وہ وہاں سے نہیں اور شفٹ ہو چکا ہے۔“

”شیرو تم جرح پر چاؤ تو دعا کرنا کہ جس لو کے کو میں برا سمجھتی رہی اسے دونوں جہاں کی خوشیاں مل جائیں اور کبھی میرا اس سے سامنا نہ ہو تو میرے دل میں اس کے لیے نفرت نہ ہو۔“

شیرو نے اس سے اجازت لے کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

وہ چلا گیا تھا۔ لائبریری کے میں اس کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہوا اور اب کیوں ہوا، اس کے خلاف سازشیں ہوئی رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی یہ بھی کوئی سازش نہ ہو۔ کہیں شیرو مجھ سے ملنے کے بعد میرے بیٹے یا میرے شوہر کے پاس نہ گیا ہو۔ اس نے انہیں بتا نہ دیا ہو کہ میرے ساتھ کبھی کیا معاملہ پیش آیا تھا۔ وہ ان سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ انہیں وہ خط دکھا بھی نہیں سکتی تھی جو شیرو دے کر گیا تھا۔

وہ اس خط کو لے کر کمرے میں آئی۔ اس خط کو حفاظت سے رکھ دیا کہ شاید کبھی کام آئے۔ شاید کسی موٹر پر دانش سے ملاقات ہو۔ وہ اسے یہ خط دکھا کر کہہ سکے کہ وہ اسے بے وفائیں سمجھتی۔ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ ہم دونوں ایک نہ ہو سکے۔

بادل المذکر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا ہرے لگی۔ کرا اندر سے بند تھا۔ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ جتنا روکتی تھی روکتی پھر ایک عزم کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اب میں کسی کی بیوی ہوں۔ میری ہنسی بھی اسی کی ہے میرے آنسو بھی اسی کے ہیں۔

میں کسی کے لیے آنسو کیوں بہا رہی ہوں۔ اب کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ شیرو تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر چلا گیا میں کیوں گناہ گار ہو رہی ہوں۔ دانش اب میرے لیے خواب سے زیادہ نہیں اور خوابوں کو بار بار نہیں دہرایا جاتا۔ اب میرے لیے دانش ایک بے قصور آدمی ہے جو کبھی کبھار دو در میرے ساتھ چلا تھا۔ ایک ایسا مجرم ہے جسے پھانسی دینے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ وہ بے قصور تھا۔ اس کی کوئی نشانی بھی میرے پاس نہ ہوئے دیکھ کر اس کی یاد آجائے۔ وہ انہی اور وہ خط پرزے کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا جو شیرو دے کر گیا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ایک مرتبہ دانش نے اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ وہ بہت دیر تک اپنے ہاتھ کو دیکھتی رہی اور پھر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ اٹھ کر گئی بیئر آن کیا اور ہاتھ کی پشت کا وہ حصہ جس پر دانش کے ہونٹ ثبت ہوئے تھے بیئر پر رکھ دیا۔ ایک دلدوز بیج ابھری اور اس نے ہاتھ ہٹالیا۔ ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ اتفاق سے اسی وقت شخص الدین نے گھر میں قدم رکھا۔ اسے گاڑی میں ڈالا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ہاتھ زیادہ نہیں جلا تھا۔ تکلیف کا احساس ہونے ہی اس نے ہاتھ ہٹالیا تھا۔ ہاتھ کی رگیں متاثر نہیں ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے مہم پٹی کر کے رخصت کر دیا۔

”تمہیں سوچھی کیا بھی بیئر آن کرنے کی۔ کسی ملازم کو بلالیتیں۔ کوئی ایسی سڑی بھی نہیں تھی۔“

”مجھے شک تھا کہ بیئر کا نہیں کر رہا ہے۔ ذرا جلا کر دیکھوں۔ اسی وقت میں بیڈ سے کرائی اور ہاتھ بیئر پر چلا گیا۔“

”شکر ہے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ آئندہ خیال رکھنا۔ تانیہ جا چکی ہے۔ وہ اگر ہوتی تو کتنی پریشان ہو جاتی۔“

”اب اس کا فون آئے تو موت بتا دیجیے گا۔ سن کر اور پریشان ہو جائے گی۔“

تانیہ کے جانے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اسنے بڑے گھر میں وہ گھنٹوں بھتی رہتی تھی۔ پھر اس نے مصروفیت کا ایک طریقہ یہ وضع کر لیا کہ دوپہر کے وقت کس الدین کے آفس چلی جاتی اور شام کو اس کے ساتھ واپس آ جاتی۔

وقت دبے پاؤں گزرتا جا رہا تھا۔ اب اسے بیٹے کی شادی کی فکر تھی لڑکیاں دیکھنے کی دلچسپ مصروفیت نکل آئی تھی۔

☆☆☆

اس دوران بدر الدین کی ایڈیو میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بیٹے اپنی بیویوں کو لے کر بیرون ملک شفٹ ہو گئے۔ آخری وقت میں ان کی بیوی نے بھی ان سے وفاندگی البتہ قدرت کی مہربانی سے کچھ دیر کے لیے بولنے کی اجازت ملی تو انہوں نے کس

پلاٹ خالی پڑا ہوا ہے۔ میں کل ہی اس پر تعمیر شروع کرتا ہوں۔ اس ادارے کو ہم رجسٹرڈ بھی کرالیں گے۔“

”لائبہ۔“

”جی۔“

”کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جو میرے والے کی چٹلی ہو لیکن بچا جان کی ایک بات میں تم سے کبہ بغیر وہ نہیں سکتا۔ ان کی موت نے ایک بہت بڑا ابوجھ میرے دل سے اتار دیا ہے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں مجھ سے کچھ بے سرو پا باتیں کی تھیں۔ انہوں نے ایک جھوٹی کہانی مجھے سنائی تھی کہ شادی سے پہلے تمہارے کسی لڑکے سے تعلقات تھے اور تم اس کے ساتھ بھاگے والی تھیں کہ عین وقت پر تمہاری ماں کو علم ہو گیا۔ انہوں نے اس لڑکے کو اغوا کرالیا۔“

مجھے ان باتوں پر یقین تو نہیں آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ سب تم سے مجھے بدظن کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں بھی انسان ہوں۔ کچھ کچھ شک میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اب جو مرتے وقت انہوں نے تم سے معافی مانگی تو مجھے یقین کامل ہو گیا کہ ان باتوں میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ ”یہ بات میں نے تمہیں اس لیے بتادی کہ اگر کبھی اس شک کی وجہ سے میرے رویے میں تمہیں کوئی تبدیلی محسوس ہو یا میں نے کوئی زیادتی کی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔“

”اتنی بڑی بات سننے کے بعد آپ نے اپنے رویے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ یہ آپ کی عظمت ہے۔ بچا جان کی اللہ مغفرت کرے۔ میں انہیں معاف کر چکی۔ انہوں نے جو کچھ کیا، اللہ دیکھنے والا ہے۔ اگر اب بھی آپ کے دل میں کوئی بات ہے تو مزید تصدیق کر لیں۔“

”لائبہ، میں نے کبہ دیا میرے دل میں معمولی سا شک تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ مجھے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔“ اس نے جان بوجھ کر یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ اس لڑکے سے ملتا تھا۔

لائبہ یہ سوچ رہی تھی کہ دانش اسی شہر میں تو ہوگا۔ کہیں شمس الدین اس سے مل نہ لے۔ دونوں کے دل میں چور تھا۔ دونوں خاموش تھے اور پھر نیند نے انہیں آواز دے لی۔

دوسرے دن اس نے ایک تعمیراتی کمپنی کے لوگوں کو بلایا اور اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے ایک موزوں عمارت کی تعمیر کا ٹھیکہ انہیں دے دیا۔

تعمیر شروع ہوئی تو لائبہ نے کام کی نگرانی سنبھال لی۔ صبح ہوتے ہی پلاٹ پر چلی جاتی اور شام تک وہی جیسی ہوتی۔ وہ اس شوق سے نگرانی کر رہی تھی جیسے عبادت کر رہی ہو۔

الدین اور لائبہ کے سامنے اعتراف گناہ کرتے ہوئے ان سے معافی مانگ لی تھی، اور انہوں نے معاف بھی کر دیا۔

بدردین کی موت عبرت کا نمونہ تھی۔ انہوں نے لائبہ اور اس کے باپ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کی انہیں معافی مانگنی پڑی تھی۔ جو دولت انہوں نے جمع کی تھی ان کے کوئی کام نہ آسکی۔ اس دولت کا یہ مصرف الیتہ ہوا کہ ان کی بیوی فیجر کے ساتھ مل کر انہیں سلو پائزن کے انجکشن دیتی رہی۔ انہیں اپنے ہی پالے ہوئے سانپ ڈسنے سے بچنے کی دولت سانپ بن کر ڈستی ہے اگر یہ مثل صادق آتی تھی تو بدردین پر۔ سچ ہے آدمی جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ ان کی دولت کسی کے کیا کام آتی خود ان کے کام نہ آسکی۔

رات کو وہ دونوں سونے کے لیے لیٹے تو دونوں کے ذہنوں میں بدردین کی موت کا سماں گردش کر رہا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ پھر شمس الدین کی آواز ابھری۔

”لائبہ کیا سوچیں؟“

”نہیں تو۔ بچا جان کا خیال ذہن سے نہیں اتر رہا ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ انسان کتنی ہی دولت جمع کر لے سب یہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ انہیں دولت کی کتنی ہوس تھی مگر ہوا کیا۔ نہ خود زندگی بھر اچھا پہنا نہ محتاجوں کی مدد کی۔ گناہ ساتھ لے کر گئے، دولت یہیں چھوڑ گئے۔ ایسے لوگ عبرت کا سامان ہوتے ہیں، ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔“

دونوں طرف پھر خاموشی پھیل گئی۔ لائبہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ شمس الدین کی آواز پھر ابھری۔

”لائبہ، دولت تو ہمارے پاس بھی بہت ہے۔ ہم بھی صرف جمع کر رہے ہیں۔ ہماری ضرورت سے زیادہ دولت ہمارے پاس ہے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ کسی ادارے سے بات کرتا ہوں۔ یہ ادارہ ہمیں ایسی لڑکیوں کی نشاندہی کرے جو شادی کے لیے بیٹھی ہوئی ہیں اور ان کے والدین کے پاس اتنی رقم نہیں کہ شادی کر سکیں۔ ہم نے ہر مہینے دو لڑکیوں کی بھی شادی کرالیں تو سال میں چوبیس بار یہ نیک کام کر سکیں گے۔“

”آپ کسی ادارے کے محتاج کیوں ہوتے ہیں۔ اس میں کسی فراڈ کا بھی شائبہ ہے۔ آپ خود ایک ادارہ قائم کریں۔ ”مفت شادی دفتر“ لوگ وہاں آکر اپنی بیچوں کے نام رجسٹرڈ کرالیں۔ ہم چھان بین کے بعد ان کی شادی کا اہتمام کریں۔ اس دفتر کا انتظام آپ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میری مصروفیت بھی ہو جائے گی۔“

”آئیڈیا تمہارا بھی برا نہیں ہے۔ میرے پاس ایک

چھ مہینے میں عمارت تعمیر ہوگئی۔ فرخ پھر ڈال دیا گیا۔ چند ملازم رکھ لیے۔ اخباروں میں اشتہار دیے گئے اور لوگوں نے رجوع کرنا شروع کیا تو اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس کے ملک میں کتنی غربت ہے اور کتنی لڑکیاں ہیں جو شادی کیے بغیر بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

یہ کام ایک ادارے کے بس کا نہیں اس کے لیے کئی ادارے درکار ہیں۔ خدا اوروں کو بھی توفیق دے۔

اگلے چھ مہینوں میں اس نے کئی اجتماعی شادیاں کرائیں اور محسوس کیا کہ نیک کام کر کے دل کو ایسی تقویت ملتی ہے۔ یہ بھی دیکھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے دولت میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

انسان کو کتنا ہی سکھل جائے کوئی نہ کوئی دکھ اس کی زندگی میں رہتا ضرور ہے۔ تانیہ کو کتنے ہوئے تین سال ہو گئے تھے، اس کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی تھی لیکن وہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ فون پر بات ہو جاتی تھی لیکن تانیہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتی تھی۔ لائبرے کے لیے امریکا دور نہیں تھا لیکن اس کی مصروفیات ایسی ہو گئی تھیں کہ لکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس نے تنگ آ کر تانیہ کو فون کیا کہ اگر تم نہیں آ سکتیں تو میں آ رہی ہوں۔ تانیہ نے اسے خوش خبری سنائی کہ آپ کے آنے کی ضرورت نہیں میں اگلے ہفتے پاکستان آ رہی ہوں۔ فلائٹ کا دن اور وقت وہ اگلی کال اگلے ٹیلی فون پر بتاؤں گی۔

لائبرے کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے ایک ہفتے پہلے ہی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ کپڑوں کا انتخاب کر رہی تھی۔ جیولری نکال نکال کر دیکھ رہی تھی۔ یہ سب پہنچتی ہوئی کیا اچھی لگوں گی۔ اس نے ایک سادہ سا جوڑا نکال کر رکھ لیا۔

فلائٹ والے دن مس الدین اور کامران کی کوئی ایسی مصروفیت نکل آئی کہ دونوں ایئر پورٹ نہیں جاسکتے تھے۔ گورنری طرف سے تاجروں کو عشاء تیار دیا جاتا تھا۔ اسے اپنے ایک پروجیکٹ کی منظوری ملنی تھی لہذا وہ اس موقع کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کامران کو بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ کیونکہ کچھ لوگوں سے اس کا تعارف کرنا تھا۔

لائبرے کو ڈرائیور کے ساتھ تیار ایئر پورٹ جانا پڑا۔ فلائٹ آنے میں کچھ دیر لگی۔ وہ ادھر ادھر بٹل رہی تھی کہ ایک جگہ دو گھوڑی ہوئی آنکھوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ان آنکھوں میں مردانہ ہوس نہیں تھی بلکہ بچپن کی آرزو تھی۔ پھر ان آنکھوں میں چراغ جلنے لگے۔

”آپ لائبرے ہیں؟“

”اور آپ دانش کمال۔“

”ہم لوگ کتنے برسوں بعد مل رہے ہیں۔“

”اسی کو قسمت کہتے ہیں۔“

”آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں

وضاحت چاہتی تھی نہ کر سکا۔“

”اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اب تو ہمارے بچوں کی خوشیوں کے دن ہیں۔ ارے ہاں مجھے معلوم ہوا تھا تم نے شادی کر لی ہے۔“

”ایک بیٹا ہے۔ امریکا سے وہی تو آرہا ہے۔ اسی کو لینے آیا ہوں۔ اور کتنے؟“

”مجھے بھی شادی کرنی پڑی تھی۔ عجیب اتفاق ہے۔ میری بیٹی بھی امریکا ہی سے آ رہی ہے۔ اسی کو لینے آئی ہوں۔“

”فلائٹ آنے والی ہے۔ اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ تم میرے بیٹے کو بیکھنا، بالکل میری جوانی ہے۔“

”میری بیٹی تانیہ بھی بالکل میری کاپی ہے۔“ اچانک دو آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

”بھئی۔“

”پاپا۔“

تانیہ دوڑتے ہوئے آئی اور لائبرے کے گلے سے جھول گئی۔ لائبرے ابھی ابھی اپنے ماضی سے ملی تھی۔ دل تو بھر ہوا ہی تھا، بیٹی سے گلے ملی تو آنسو بہنے لگے۔

”مئی آپ رکیوں رہی ہیں؟“

”بیٹا روتھوڑی رہی ہوں۔ یہ آنسو تو تیرے استقبال کے لیے ہیں۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“

”آپ کی خوشی میں مزید اضافہ کروں۔ آپ کو اپنے شوہر سے ملو آؤں۔“

”تم نے شادی کر لی۔ میں تمہاری کچھ نہیں تھی۔ مجھے بتایا تک نہیں؟“

”بس مئی، ہم نے سوچا آپ کو سر پرانزدیں گے۔ بلال نے بھی اپنے پاپا کو کچھ نہیں بتایا۔ ابھی آپ سے ملواتی ہوں۔“ پھر اس نے آواز دی۔ ”بلال چھوڑ دو اپنے پاپا کی

جان۔ ادھر آؤ میری مئی سے ملو۔“

لائبرے نے دیکھا، ایک لڑکا تیز قدم اٹھاتے اس کی طرف آیا۔ اسے لگا دانش کمال اس کے سامنے آ گیا ہو

لیکن دانش کمال تو اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔

”بلال، یہ ہیں میری سویت مئی۔“

”اور یہ ہیں میرے پاپا۔ ایک مشہور شاعر دانش کمال۔“